جدید فن کاروں کے خیالات کا سلسلہ

سویرا

ترتیب دینے والے:

- احمد ندیم قاسمی
- نذیر چودھری
- فکر تونسوی

نیا ادارہ

ترتیب

سلسلہ [illegible] نے [illegible] پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔

ادارہ

جان پہچان

نذر جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر (دہلی)

اختر حسین رائے پوری

ترقی پسند ادب کا سنگِ بنیاد رکھنے والوں میں ان کی شخصیت ایک اہلِ نظر مجتہد کی سی ہے۔ رائے پوری کا نام سنتے ہی قارئین کی ذہنی فضا پر "محبت اور نفرت" کی گہری۔ رومانیت اور تشنا فانہ گرفت مسلط ہو جاتی ہے ـــــ بعد میں انقلابی تصورات کی شدت تنقید سے گذر کر افسانوں میں بھی پھیل جانے لگی۔ سنسکرت کے ممتاز سکالر ہیں بنگالی پر عبور حاصل ہے۔ کالی داس کے ناٹک "شکنتلا" اور باغی شاعر نذر الاسلام کے "پیام شباب" کا علی الترتیب سنسکرت اور بنگالی سے ترجمہ کر چکے ہیں مختصر افسانہ میں گجراتی اور پنجابی کے افسانوں کے فن کارانہ اختصار کا جامہ پہنا کر اپنے حسنِ انفرادیت کی چھاپ لگا دیتے ہیں۔
آجکل گورنمنٹ آف انڈیا کے تعلیمی شعبہ کے نگران ہیں۔

ممتاز مفتی

جنس (SEX) ان کا خاص موضوع ہے جنسی مدرسۂ فکر کے صحت مند اور بنیادی عناصر کے قائل ہیں، اور انہیں پر اپنے افسانوں کے جال بنتے ہیں۔ ہندوستان کی مسلم معاشرت میں سے کردار چن کر اپنے فن کی تجربہ گاہ میں لے آتے ہیں ـــــ افسانوں کے علاوہ نفسیاتی اور منطقی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ آج کل آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہیں۔

شفیق الرحمٰن

سماج کا خوشحال متوسط طبقہ ان کے فنی آئینہ میں جھلکتا ہے مسکراتا اور ناچتا ہے لیکن ان مسکراہٹوں اور ناچوں میں شفیق کی ہلکی سی سوداوی چاشنی کا احساس بھی نمایاں ہوتا ہے ایک چالاک فن کار کی طرح وہ اس زہر کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتا ـــــ لوگ اس کی ہنسی کو تفریحی سمجھتے ہیں، لیکن یہ ہنسی بڑی گہری اساسی نوعیت رکھتی ہے۔ آج کل فوج میں ڈاکٹری کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

باری

باری نے تصنیف و تالیف کی ابتدا اُس دور میں کی جب ہندوستانی سماج، سامراجی دہشت کا شکار تھی۔ اور انقلابی تصورات پیدا کرنا جرم ناسزا سمجھا جاتا تھا۔ تب باری نے انقلاب فرانس، کارل مارکس، سوشلزم اور کمپنی کی حکومت لکھی۔ اور اس کے بعد تاریخ کے جدید اور نئے سے نئے اصولوں پر اپنے افکار پیش کرتے رہے۔ نہایت سنجیدگی، متانت اور سچائی کے ساتھ کام کرنے کے قائل ہیں۔ علمی، سائنسی، تاریخی اور اقتصادی مسائل پر بڑی صفائی اور صحت کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔ "کمپنی کی حکومت" اُن کا ایک اہم تاریخی کارنامہ ہے۔

اُپندر ناتھ اشک

اشک افسانے بھی لکھتے ہیں اور ڈرامے بھی۔ اور ایک حساس فن کار کی طرح دونوں میں کامیاب ہیں۔ انہوں نے متوسط ہندو معاشرت کے بہت سے گھناؤنے پہلوؤں کے تجزیے کئے ہیں۔ ان تجزیوں میں ایک مخصوص انفرادیت، بیباکانہ تحقیق اور فنکارانہ خلوص پایا جاتا ہے۔ اپنے فن کے بناؤ سنگار پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ایڈیٹری سے شروع ہو کر ریڈیو سے ہوتے ہوئے فلمی صنعت میں جا پہنچے، لیکن کون بتائے کہ وہاں سے بھی...... ع

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ساحر لدھیانوی

ہم سب اُسے آوارہ کہتے ہیں۔ اُس کی یہ آوارگی، اضطرابی بلند مزاجی کی حامل ہے۔ ورنہ اُس کا ایک مخصوص نقطۂ نگاہ ہے۔ جو زمین اور آسمان کا مقامِ اتصال ہے۔ ساحر مارکسی فلسفے کو جب شعری قالب بخشتا ہے تو اُس کا وہ مخصوص نقطہ اتنا نمایاں، واضح، انفرادی اور [illegible] ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے قائل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اُس کے فن میں عوام کی طرف براہِ راست اپیل ہوتی ہے۔ ایک جاگیردار کا بیٹا جاگیروں پر لکھتا ہے تو اس میں تلخی اپنی مکمل سچائی کے ساتھ اُبھرتی ہے۔

فراق گورکھپوری

نئے دور کے ادب کی تاریخ میں فراق ایک اجتہادی حیثیت رکھتے ہیں۔ صنفِ غزل کا جس کے لیے پُر جدید تغزلیہ عناصر کی فکری بنیادوں میں اپنا صنم کدہ تعمیر کر رہی تھیں، فراق نے عاشقانہ [illegible] نئے معنے سے آشنا اور اس رفتار کے ساتھ آشنا کرانے سے پہلے بھی جوش [illegible] غزل کے علاوہ

ادارہ

بات چیت

اردو کے کسی نوجوان مگر مسلّمہ فنکار سے اگر پوچھا جائے، کہ اُس کے نظریات و احساسات کی آخری منزل کونسی ہے؟ تو وہ افق کو تکنے لگے گا، افق جو کہیں ختم نہیں ہوتا، افق، جو ایک غیر مختتم دائرہ ہے، افق جو ایک نئے افق کا امتداد ہے۔ "سویرا" ہندوستان کے نوجوان فنکاروں کے معجزات کا ایک دو ماہی انتخاب ہے، اس لئے یہ کسی معین منزل کی طرف اشارہ نہیں کرتا، بلکہ زندگی اور کائنات کی بیکراں وسعتوں کے نشیب و فراز اس کی جولانگاہ ہیں، ہر سویرا ایک نئے سویرے کا پیامی ہے، اس لئے ہمارے عزائم اور مقاصد صرف ان الفاظ میں پوشیدہ ہیں، کہ "سویرا" اردو کے نئے ادب کی ایک میزان ہوگا، اور جیسے بڑے بڑے یکسالہ یا دو سالہ منتخب مجموعوں کے سیلاب کا ایک حسین و لطیف رد عمل ہوگا، اس کی روح اور جسم کی خوبصورتی طباعت اور صباحت اردو کی کتابی دنیا میں مسابقہ یا مقابلہ کی بجائے ایک نئے پیام — ایک تعمیری اجتہاد — ایک ابدی حرکت کی پیشرو ہوگی، اور سال بھر میں اس نوع کی چھ کتابیں اردو ادب کی تاریخ میں چھ روشن اور ٹھوس واقعات کی حیثیت اختیار کر کے اپنے عقب میں ایک نئی کہکشاں کی تعمیر کرتی چلی آئیں گی۔

"سویرا" ادیبوں کے کسی خاص گروہ کا نمائندہ نہیں، یہ ہندوستان بھر کے اُن شاعروں کی تخلیقات کو اپنے دل میں جگہ دیگا، جو نئے تقاضوں سے شناسا ہیں اور سچے شاعر کی زبردست ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں، یہ ہندوستان کے اُن تمام ادیبوں اور نقادوں کی نگارشات کو مسرت اور فخر سے پیش کریگا، جو ایشیائی زندگی کے عکاس اور نباض ہیں، اور جنہیں گذشتہ عقائد سے پھیلائی ہوئی اس صدی کی جملہ بلندیوں اور گہرائیوں کا علم ہے۔ "سویرا" ہر اُس نئے اور پرانے مبتدی اور تجربہ کار رہرو ادب کو دعوت دیتا ہے، جسے ایشیا کی نشاۃ الثانیہ پر اعتماد ہے، جسے معلوم ہے کہ ہندوستان کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب بڑی قوتوں کے پنجے لپکے چلے آرہے ہیں، اور جسے اس کا بھی احساس ہے کہ ہماری زمین پر صرف ایشیا کے علاوہ سوئٹزرلینڈ بھی ہے، کشمیر کے علاوہ صحرائے اعظم بھی ہے اور زندگی لا محدود ہے اور کائنات بیکراں ہے اور یہاں سب کا منبع حسن ہے!

"سویرا" ایک ادبی ڈکٹیٹر کی طرح پرکھنے والوں پر اپنے نظریات کو نہیں ٹھونسے گا، بلکہ چند شمعیں پیش کر دینے کے بعد ان کے اثرات کا مطالعہ کریگا، اس کی پالیسی نئے ادب کے نظریات سے ہم آہنگ ہوگی، اس کے صفحات ادیبوں کی جگہ ادبیات سے عبارت ہونگے، اور یہ پڑھنے والے مضامین کے متعلق رسالہ کا ماہرانہ انداز میں گرجتی اور گونجتی ہوئی تعریف کر کے دیت بھی نہیں کرے گا، چند [illegible] کہ گذشتہ [illegible] میں ہم کو [illegible] کہ سویرا میں [illegible] زندگی [illegible] تمنا [illegible] ہے!

مجھے بھی کچھ کہنا ہے!

دوستوں نے سُنا تو انگشت بدنداں رہ گئے۔ بات بھی تو حیرت کی تھی۔ لیکن محنت و سرمایہ کے اس تصادم دور میں اس نوعیت کے تحیر بذاتہ خود تحیر خیز نہیں رہے۔ اصولوں کی خاطر لڑنے والے ہمیشہ اس قسم کے تعجب سے دوچار ہو جاتے ہیں اور سر جھٹک کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

"ادبِ لطیف" کو میں نے رگِ جاں بنا رکھا تھا۔ اور اس کے لیے فن و ادب کی نت نئی دنیا میں نت نئے چراغ اور نت نئی منزلیں پیدا کرتا، روشن کرتا اور طے کرتا چلا گیا ہوں۔ ان ہی اثرات کی تعمیری کوششوں اور ترقی پسند ادیبوں کی معاونت سے "ادبِ لطیف" کی مشعل روشن سے روشن تر ہوتی چلی گئی۔ قانون کی خداوندانہ گرفتیں، ادب کے رجعتی نمائندوں کا طوفانِ مخالفت، اور اپنے ناگوار شریکِ کار کا مسلسل عدم تعاون — سبھی کچھ برداشت کیا۔ لیکن اگر برداشت نہ ہو سکا تو صرف وہ وقت جب میرے شریکِ کار نے میرے بڑھتے ہوئے نظریاتی حوصلوں میں سدِ راہ بننے کی کوشش کی اور میرے سامنے اپنے آمرانہ مطالبے پیش کئے کہ یا تو اس رسالے کی ادبی پالیسی بدل دو یا اس سے الگ ہو جاؤ۔ میرے دوست میرے اس وقت کے تذبذب کا اندازہ لگا سکتے ہیں جب ایک طرف تو میرا بنیادی نصب العین تھا اور دوسری طرف اپنی "رگِ جاں" کی حفاظت۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے اپنے نصب العین پر اپنے "ادبِ لطیف" کو قربان کر دیا۔ یہ قربانی تاریخ کی قربانی ہے جو تاریخ کی ارتقائی منازل کو آئینہ دکھاتی ہے۔

"سویرا" اب میری نئی رگِ جاں ہے۔ اور میں ملک بھر کے ادب نواز اور ادب ساز حلقوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اسے فن کاروں کے جدید تر تجربوں، اور اشاعتی محاسن کی جدید تر قدروں کا وہ یادگار اور شاہکار بنا دوں گا جس کے نقوش ایک مدت تک سرمایۂ ادب رہیں گے۔ ارادے جو میرے ذہن کے نہاں خانوں میں بیٹھ گئے تھے — اب میں زیادہ جرأت، زیادہ خوبصورتی اور زیادہ سلیقے کے ساتھ اپنی دلکش صلاحیتوں کو آپ کے سامنے پیش کر سکوں گا — اب میں آپ کے اور زیادہ قریب آ گیا ہوں۔

نذیر چودھری

"سویرا" کی سالانہ ممبری

قبول فرمائیے۔ ہم آپ کو سال بھر میں "سویرا" کے سلسلہ کی چھ کتابیں دیں گے۔ ہر کتاب کی قیمت دو روپے ہوگی۔ لیکن مستقل ممبر کو سال بھر کے لئے دس روپے ادا کرنے پڑیں گے۔ (منیجر)

باری

...ستان کا مغربی ساحل

جنوبی ہندوستان کا وہ ساحلی علاقہ جو ڈیلی پربت سے شروع ہو کر راس کماری تک چلا جاتا ہے مالابار کہلاتا ہے۔ ہندوستان کے مغربی ساحل کا یہ علاقہ مغربی گھاٹ کی وجہ سے صدیوں تک ہندوستان کے مشرقی ساحل کے باشندوں سے الگ رہا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آج سیاسی لحاظ سے مالابار اگرچہ مختلف ریاستوں اور ضلعوں میں بٹا ہوا ہے۔ لیکن اس کی جغرافیائی اور نسلی وحدت صاف نمایاں ہے۔ جب جنوبی ہند کے اندرونی علاقوں کے لوگ چین اور یورپ کے شہروں کے نام تک نہیں جانتے تھے۔ تب مالاباری مشرق اور مغرب کے دور دراز شہروں سے تجارت کرتے تھے۔ مالابار یوں اور فونیقیوں کے تعلقات پر بھی حال ہی میں روشنی ڈالی جا چکی ہے بابل اور نینوا کے ساتھ بھی مالابار کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ یہودی اپنے سیاسی عروج کے زمانہ میں مالابار سے واقف تھے۔ ایک ہزار ق۔م میں مور کے لئے عبرانی زبان میں تامل زبان کا لفظ توکائی۔ توکی کی شکل میں رائج ہو چکا ہے۔ صدیوں تک بحر احمر، بحر عرب اور بحر ہند کی تجارت پر مصری اور مشرقی یونانی قابض رہے اس مدت میں مالابار کی تجارت نے بہت ترقی کی۔ پہلی صدی میں جب ایک یونانی نے موسمی ہواؤں کو دریافت کر لیا۔ تو اس سے ایک طرف سمندری سفر میں آسانی پیدا ہو گئی۔ اور دوسری طرف مالابار اور مغربی بندرگاہوں میں گہرا تجارتی تعلق قائم ہو گیا۔ رومیوں کے عروج میں بھی مالابار کی تجارتی حیثیت برقرار رہی۔ روم کے بہت سے سکے مالابار کی زمین سے نکالے جا چکے ہیں۔ اس زمانہ میں مالابار کی سب سے مشہور بندرگاہ موچیری (یونانیوں اور رومیوں نے اسے موزیرس لکھا ہے) تھی۔ اس بندرگاہ میں یہودی اور عیسائی بھی آباد تھے۔ عرب تاجر بھی مالابار کی بندرگاہوں میں آتے جاتے تھے۔ آٹھویں صدی کے شروع میں مالابار کی تجارت پر عربوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ مالابار کی بندرگاہوں کا قاہرہ، تونس، بصرہ اور دوسرے عرب شہروں کے ساتھ تعلق قائم ہو گیا۔ عربوں کی تاجرانہ سرگرمیوں نے مغربی ملکوں میں مالابار کی پیداوار کی مانگ کو بڑھا دیا۔

از منۂ وسطیٰ اور اس سے پہلے ہندوستان کا تجارتی مال خشکی کی راہ سے ایران سے ہوتا ہوا حلب تک پہنچتا تھا۔ حلب سے یہ مال اٹلی کی بندرگاہوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ ان بندرگاہوں سے یہ مال آل فوصل اور

ملکوں تک پہنچا دیا جاتا جنہیں اس کی ضرورت ہوتی تھی۔ صدیوں بعد خلیج فارس کی راہ سے ہندوستان کا تجارتی مال حلب تک پہنچایا جانے لگا۔ بحر احمر کی راہ سے بھی یورپ کے ملکوں تک ہندوستان کا تجارتی مال پہنچنے لگا۔ سویز سے یہ تجارتی مال قاہرہ پہنچایا جاتا۔ اور وہاں سے تجارتی قافلے اسے اسکندریہ تک پہنچا دیتے۔ اس تمام کاروبار میں جہاں مشرق کے کئی ایک شہر فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہاں اٹلی کی بندرگاہ وینس اس لین دین سے مالا مال ہو گئی۔ تحریک احیا کے دنوں میں وینس یورپ کا سب سے بڑا امالدار شہر بن چکا تھا۔ اٹلی کے سوداگر ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں کا مال مہنگے داموں پر فروخت کرتے تھے۔ اس اثنا میں یورپی ملک صدیوں کی بربریت سے رہائی حاصل کر کے تہذیب کے دائرے میں داخل ہو رہے تھے۔ تہذیب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے یورپی ملکوں کو ایشیائی مصنوعات خریدنی پڑتی تھیں۔ یورپ کے تمام سیانے بادشاہ اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح سے ان کی رعایا کو مشرق کے ساتھ تجارت کرنے کا موقعہ مل جائے۔ چنانچہ پرتگال کے شہزادے ہنری نے اپنی ساری زندگی پرتگال سے براہ راست ہندوستان تک سمندری راستہ تلاش کرنے میں گذار دی۔ پرنس چند معمولی قسم کے جہازوں کا ایک بیڑہ لے کر شمالی افریقہ کے ساحل کی طرف چل نکلا پرتگیزوں نے نہایت آسانی سے قیوطہ پر قبضہ کر لیا۔ پرنس ہنری نہ صرف ایک بہادر سپاہی تھا۔ بلکہ ایک طالب علم بھی تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو سائیرو، سینی کا اور پلینی کے مطالعہ سے روشن کر رکھا تھا۔ عرب جغرافیہ نگاروں کی کتابوں نے اس کے دل میں جہاں بینی کا شوق پیدا کر دیا تھا۔

پرنس ہنری کا قدم اب اس براعظم پر تھا۔ جس کی معدنی دولت اور جس کی صحرائی زندگی کے عجائب بھرے افسانے وہ بچپن سے سنتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے جنگی قیدیوں سے ملک کے اندرونی حصوں کے حالات پوچھے شہزادے کو بتایا گیا۔ کہ مراکش کے شہروں میں دولت کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ وہاں علم و فضل کے بڑے چرچے ہیں۔ صحرائے اعظم کے جنوب میں ایک بہت بڑا ملک ہے۔ جس میں حبشی رہتے ہیں جس میں بڑے بڑے دریا ہیں۔ اور جو مراکش سے خشکی کے ذریعہ سات دن کا سفر ہے۔ اور اگر اس ملک تک سمندر کے ذریعہ پہنچنا ہو۔ تو صحرائی ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف سفر کرنے سے اس ملک کے دریاؤں کے دہانوں تک پہنچ سکتے ہیں۔

قیدیوں کی اس بات چیت کے بعد پرنس ہنری نے صحرا کے جنوب میں واقع ممالک کی تلاش کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اس نے ایک رصدخانہ تیار کیا۔ ایک بحری اسکول جاری کیا گیا۔ اس کے دربار کی رونق طوفانی تباہ کاریوں سے بچے ہوئے ملاحوں اور جہازیوں سے تھی۔ مارکو پولو کا سفرنامہ اس کی بائیبل تھا۔ اپنے عرب دوستوں کی مدد سے اس نے دنیا کا نقشہ سنگِ مرمر پر کندہ کرا رکھا تھا۔ پرنس کے قبضہ میں بہت دولت تھی۔ دولت کی اس فراوانی نے ذوقِ سفر اور شوقِ جستجو کو آسان کر دیا۔

جب سارا سامانِ سفر تیار ہو گیا۔ تو شہزادے نے حکم سفر دیا۔ مہم پیمائی کے یہ جہاز افریقہ کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔ ان کے دائیں طرف اوقیانوس کی تاریکیاں اور بائیں جانب صحرائی شعلے تھے

شہزادے کے ساتھیوں کو اس امر کا بہت کم یقین تھا۔ کہ ریت کے اس سمندر کے جنوب میں روئیدگی کے کوئی آثار دکھائی دے سکتے ہیں — چنانچہ تیزی سے آگے بڑھنے کی جگہ یہ بحری قافلہ ساحل پر جہاں کہیں دیسی باشندوں کو دیکھ لیتا۔ وہیں رُک جاتا۔ پرتگالی، پرتگالی کہتے ہوئے باشندے اس قافلے پر حملہ کرتے۔ لیکن پرتگیزی ان میں سے چند ایک کو قید کر کے لے جاتے۔

پرنس ہنری اپنے قلعہ میں بیٹھا اس مہم کے نتائج پر غور کرتا بحیرہ اوقیانوس کے کنارے پر کھڑا ہو کر وہ کھولتی موجوں کا رقص و سرود دیکھتا۔ ساحل اوقیانوس کا یہ محل بین الاقوامی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے لیکن اس زمانہ کے عوام اس قلعہ کو کسی جادوگر کا غار خیال کرتے ہونگے۔ جب مسافر ایک دراز قامت شخص کو کمبل میں لپٹا ہوا اور ٹوپی پہنے ہوتے دیکھتے۔ تو مارے خوف کے بھاگ جاتے۔ چاندنی راتوں میں یہی شخص اپنی رصدگاہ میں ایک عجیب و غریب آلہ ہاتھ میں لئے آسمان پر نظر دوڑاتا ہوا دکھائی دیتا۔ پرنس ہنری کئی جہاز روانہ کر چکا تھا۔ لیکن اسی اثنا میں لزبن میں شہزادے کے خلاف یہ جذبہ پیدا ہو گیا۔ کہ وہ مقدس کلیسا کی دولت کو محض تسکین جنون کے لئے خرچ کر رہا ہے۔ اس زمانہ میں یورپی لوگوں کا یہ خیال تھا۔ کہ صحرائے اعظم کے جنوب میں جہنم ہے۔ اور پرنس پرتگیزوں کو دوزخ میں بھیج رہا ہے۔ لوگوں کے اس جغرافیائی عقیدے پر شہزادہ اپنے اوقیانوسی قلعہ میں بیٹھا مسکراتا ہوگا۔

ایک ایسا حادثہ ہوا۔ جس نے پرتگال میں پرنس ہنری کے متعلق رائے عامہ کو بدل دیا۔ صحرائی ساحل پر جن لوگوں کو قید کیا گیا تھا۔ انہوں نے سونے اور حبشی غلاموں کے بدلے اپنی رہائی حاصل کرنا چاہی۔ لزبن کے لوگوں کو معلوم ہوا۔ کہ جہنم میں سونے کی کثرت ہے۔ تو انہوں نے پرنس ہنری کی مخالفت ترک کر دی۔ لزبن میں جہنم سے تجارت کرنے کے لئے تجارتی کمپنیاں قائم کی گئیں۔ شہزادہ کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا۔ کہ افریقی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرنے سے انسان ہندوستان کے ساحل تک پہنچ سکتا ہے۔ وینس کے دو شخصوں نے شہزادہ کو مکتوب اور نقشے بھیجے۔ ان سے شہزادہ کا یقین مزید مستحکم ہو گیا۔ چنانچہ اس نے پوپ سے اس امر کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ کہ ہندوستان تک پرتگیزی جن علاقوں کو دریافت کریں۔ وہ پرتگال کے ماتحت ہوں گے۔

پرتگیزوں نے گولڈ کوسٹ دریافت کر لیا تھا۔ الیمنیہ میں ایک قلعہ اور ایک گرجا بنایا گیا۔ پرنس ہنری کے بعد شاہ جون ثانی نے ان مہموں کو جاری رکھا۔ لزبن میں ملاحوں، جہازرانوں، تقدیر آزماؤں اور مہم پردازوں کا بہت بڑا اجتماع تھا۔ مختلف مقامات کے تقدیر آزما اپنی خدمات پیش کر رہے تھے۔ ان تقدیر آزماؤں میں کولمبس بھی تھا۔ افریقی ساحل کی مہموں کی کامیابی کے پیش نظر شاہ پرتگال نے فیصلہ کر لیا۔ کہ سمندر کے ذریعہ ہندوستان پہنچنے کی مہم کو بہت جلد روانہ کرنا چاہیئے۔ لزبن میں جشن منایا جا رہا ہے۔ ہتھیار پھریرے لہرا رہے ہیں۔ مکانوں پر قیمتی کپڑے لٹک رہے ہیں۔ گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ گیت گائے جا رہے ہیں۔ چھتوں پر چلبلی لڑکیاں نیم مشرقی انداز میں جلوس کی منتظر ہیں۔ جلوس کے آگے ایک شخص قیمتی لباس پہنے ہوئے جا

رہا ہے اور اس کے پیچھے چند لنگ ملاحوں کا لباس پہنے ہوئے ننگے پاؤں جا رہے ہیں۔ واسکو ڈے گاما اور اس کے ساتھی ہندوستان کی تلاش میں نکل چکے ہیں۔ دو سال آٹھ مہینے گذر گئے۔ لزبن میں پھر وہی رونق تھی شہر میں چراغاں کیا گیا۔ ملاحوں نے ایک عام جلسہ میں لزبن سے کالی کٹ تک کے سمندری سفر کے واقعات بیان کئے اسی دن وینس کے سفیر نے اپنی حکومت کو لکھا۔ کہ اس نے لزبن میں ہندوستانی مال سے لدے ہوئے جہازوں کو دیکھا ہے۔ اس نے اپنے دوسرے خط میں لکھا۔ کہ ایک بہت بڑا جنگی بیڑا تیار کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ واسکو ڈے گاما ہندوستان فتح کرنا چاہتا ہے۔ جب وینس والوں نے دیکھا۔ کہ ان کی تجارت تباہ ہونے والی ہے۔ تو انہوں نے سلطان مصر کو مداخلت کے لئے لکھا۔ حکومت وینس نے سلطان مصر کو توپیں بھیجیں۔ تاکہ وہ انہیں ہندوستان کے شہزادوں تک پہنچا دے۔ انہوں نے سلطان سے درخواست کی۔ کہ انہیں نہر سویز کھودنے کی اجازت دی جائے۔ تاکہ ان کے تجارتی جہاز پرتگیزوں سے پہلے ہندوستان پہنچ سکیں۔ جب پرتگال کو وینس کے ان ارادوں کا پتہ چلا۔ تو البوکرک نے سلطان مصر کو ایک توہین آمیز خط لکھا۔ سلطان کمزور تھا۔ وہ وینس کی مدد نہ کر سکا۔ بحر ہند نے ایک پرتگیزی جھیل کی صورت اختیار کر لی۔ بحر ہند کے ساحل پر شاید ہی کوئی ایسا مقام تھا جہاں پرتگیزوں نے بمباری نہ کی ہو۔ بحر ہند کے پانیوں میں کوئی جہاز حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک کہ اس کے پاس پرتگیزی پاسپورٹ نہ ہوتا۔ وینس والوں نے شاہ پرتگال سے درخواست کی۔ کہ انہیں ایک بڑی رقم کے عوض ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن شاہ پرتگال نے وینس کی درخواست کو مسترد کر دیا۔ چنانچہ اس استرداد کے بعد ہندوستان کی مصنوعات کی منڈی وینس کی جگہ لزبن بن گئی۔ دجلہ۔ فرات اور نیل کے شہروں پر تجارتی زوال شروع ہو گیا۔ وسط ایشیا کی کاروانی تجارت کو بہت نقصان پہنچا۔ بین الاقوامی تجارت کی مرکزیت بحیرہ روم کے ساحل سے ہٹ کر اوقیانوس کے ساحل پر چلی گئی

پرتگال کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ افریقہ کے مغربی ساحل، مشرقی ساحل (بحر احمر کے ساحل تک) خلیج فارس سے ساحل مالابار تک، کورومنڈل، مجمع الجزائر، سیام اور برما سے کینٹن اور شنگھائی تک قلعوں کی ایک زنجیر قائم ہو گئی۔ پرتگیزوں نے مٹھی بھر سپاہیوں سے بڑی بڑی فوجوں کو شکست دی۔ چھوٹے چھوٹے قلعوں کے ذریعہ بڑی بڑی سلطنتوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن شروع سے آخر تک پرتگیزی وحشی، قاتل اور ڈاکو تھے۔ پرتگال کی حیرت انگیز کامیابی ہماری آنکھیں بند کر دیتی ہے۔ ہم اندھے ہو کر پرتگیزوں کی تباہ کاریاں اور ہولناکیاں نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن آہستہ آہستہ جب ہم آنکھیں کھولتے ہیں تو ہمارے سامنے پرتگیزی مظالم کی ایک لرزہ خیز تصویر ہوتی ہے۔

پرتگال اور ہسپانیہ کے وسیع مقبوضات کا الحاق فلپ دوم کے دور حکومت میں ہوا۔ اس نے لزبن کی بندرگاہ کو ہالینڈ کے بے دین اور باغی ولندیزیوں پر بند کر دیا۔ ولندیزی محض تسکین ذوق کے لئے طویل بحری سفروں کے عادی نہیں تھے۔ لیکن جب انہیں اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو ان کے جہاز بھی تلاش اور دریافت

میں چل نکلے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے بھی ان کا تتبع کیا۔ چنانچہ یہ قومیں منطقہ حارہ میں ایک دوسرے سے لڑنے لگیں۔

پندرھویں صدی کے آخری برسوں تک تقریباً ایک سو برس کی سمندری مہموں کے بعد پرتگالیوں نے افریقہ کے مغربی ساحل، راس امید اور کسی حد تک افریقہ کا جنوب مشرقی ساحل دریافت کر لیا تھا۔ افریقہ کے مشرقی ساحل کی بندرگاہوں پر پرتگالی جہازیوں نے عرب تاجروں اور جہازیوں سے بحرِ ہند کے تجارتی راستوں اور بندرگاہوں کے متعلق معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اب پرتگیزی اس قابل ہو گئے تھے۔ کہ وہ ہندوستان کا سمندری راستہ دریافت کرنے کیلئے آخری کوشش کرتے۔

ہندوستان دریافت کرنے کی یہ مہم ۲۷ برس کے ایک پرتگیزی جہازی واسکو دے گاما کے سپرد کی گئی۔ واسکو دے گاما تین جہازوں کے ایک چھوٹے سے بیڑے کو لیکر ۸ جولائی ۱۴۹۷ء کو پرتگال سے چل پڑا۔ ان میں سب سے بڑے جہاز کا وزن ایک سو پچاس ٹن تھا۔ راس امید کا چکر کاٹنے کے بعد یہ بیڑہ افریقہ کے جنوب مشرقی ساحل تک جا پہنچا۔ واسکو دے گاما کو موزنبیق کے حکمران کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اپریل ۱۴۹۸ء میں وہ زنجبار سے دو سو میل شمال میں واقع ملندہ کی بندرگاہ میں پہنچا۔ ملندہ کے سردار نے گاما کی آؤ بھگت کی۔ جنوب مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقوں کے عرب جہازی اس سمندری راستے سے واقف تھے۔ جو ہندوستان تک لے جاتا تھا ہندوستان (مالابار) اور جنوب مشرقی افریقہ میں اسی راستے سے تجارت ہوتی تھی۔ چونکہ پرتگیزی جہازیوں کے لئے بحرِ ہند میں جہاز چلانا بہت مشکل تھا۔ اس لئے واسکو دے گاما نے عرب جہازران احمد بن ماجد کی خدمات حاصل کر لیں۔ جون ۱۴۹۸ء میں واسکو دے گاما نے کالی کٹ (مالابار) سے آٹھ میل شمال میں واقع ایک چھوٹی سی بستی کے قریب لنگر ڈال دیئے۔

پرتگیزی آخر اس ملک کے ساحل پر پہنچ گئے۔ جس کی دولت کے افسانے سکندر کے زمانے سے یورپ میں سنتے جا رہے تھے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ یہ ملک اتنا بڑا ہے کہ اسے چھوٹا برِاعظم کہا جاتا ہے۔ اس کا ساحل پانچ ہزار میل ہے۔ خشکی کی سرحد کوئی چھ ہزار میل ہوگی۔ شمال میں ہمالیہ پندرہ سو میل تک پھیلا ہوا ہے۔ بندھیاچل نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ہندوستان اپنی زرخیزی کی وجہ سے قوموں کو اپنی طرف مائل کرتا رہا۔ صدیوں تک جنوبی قوموں کے تمدن نے شمالی ہندوستان کو متاثر کیا۔ حملہ آور قوموں کی نسلیں آج بھی بندھیاچل کے اس پار شمالی ہندوستان کی نسبت بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ مختلف قوموں کے یہاں آنے سے ہندوستان میں مختلف تمدنوں کا ایک آمیزہ تیار ہو گیا۔ ہر نسل ہندوستان کو متاثر کرنے کے بعد خود کسی دوسرے تمدن سے متاثر ہوتا رہا۔ قدیم عہد میں ہندوستان میں وہ قوم بستی تھی جس کی یادگار آج تک نیل گری کی پہاڑیوں میں ملتی ہے۔ اس کے بعد کول اور بھیل اقوام نے ہندوستان کو اپنا گھر بنایا۔ صدیوں بعد دراوڑوں نے ان قوموں کو جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ دراوڑ ابتدا میں شمالی ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ لیکن آریوں نے ان کے ساتھ بھی سلوک

گیا، جو وہ کولوں اور بھیلوں سے کر چکے تھے۔ آریوں نے دراوڑوں کو شمالی ہندوستان سے نکال لیا۔ وہ جنوبی ہندوستان میں چلے گئے۔ آج جنوبی ہندوستان میں دراوڑوں کی اکثریت ہے۔ ان کی زبانیں ہندی آریائی زبانوں سے مختلف ہیں۔ شمالی ہندوستان میں دراوڑ شہری تمدن کے مدارج تک پہنچ چکے تھے۔ ان کا تمدن سومیری تمدن سے ملتا جلتا تھا۔ ہڑپا اور موہنجوداڑو کی کھدائیوں نے ان کے تمدن کی عظمت کو ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ ان شہروں کا تمدن صدیوں کی آغوش میں پلا ہوگا۔ مصر، عراق اور ایران کی تہذیبوں کے پہلو بہ پہلو دراوڑی تہذیب بھی اپنی قدامت اور عظمت کا پھریرا لہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ موہنجوداڑو اور ہڑپا آریوں کے آنے سے صدیوں پہلے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ سندھ اور پنجاب کا تمدن مصر اور عراق کے ہم عصر تمدن سے کسی طرح پیچھے نہیں تھا۔ ان شہروں کے لوگ سوتی کپڑا بُننا جانتے تھے۔ گھروں میں غسل خانے تھے۔ شہریوں کے مکان اونچے اور صاف ہوتے تھے۔ ان کا مذہب مصریوں اور سومیریوں سے ملتا جلتا تھا۔ شمال کی راہ سے آریوں کی آمد کے ساتھ ساتھ یا ان سے پہلے شمال مشرقی ہندوستان کے دروں سے منگول قومیں بھی ہندوستان میں داخل ہوتی رہیں۔

آریہ شمال مغربی ہندوستان کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ شمالی ہندوستان میں وہ صدیوں تک دراوڑوں سے لڑنے کے بعد پنجاب پر قابض ہوئے۔ پنجاب سے وہ گنگا کی وادی میں پہنچے۔ جہاں آریوں کی سیاست اور تہذیب اپنے عروج پر پہنچی۔ مگدھ میں ایک عظیم الشان آریہ سلطنت کی بنیاد پڑی۔ مگدھ کی سلطنت کے زمانہ میں گوتم بدھ کا ظہور ہوا۔ بدھ نے اپنے زمانہ کی تمام مجلسی برائیوں کے خلاف بغاوت کی۔ اس کا مذہب عوام کی زبان میں عوام کے لئے تھا۔ ایران نے سندھ اور پنجاب کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ سکندر نے بھی ہندوستان کا رُخ کیا۔ پورس نے اس کا مقابلہ کیا۔ یونانی فوجیں بیاس کے کناروں سے واپس ہوئیں۔ پاٹلی پترا فتح کرنے کی ہوس لیکر سکندر کو واپس جانا پڑا۔ یونانی تہذیب نے شمالی ہندوستان کو متاثر کیا۔ سکندر کے جانے کے بعد پنجاب سے چندر گپت موریا اٹھا۔ اس کے وزیر چانکیہ نے اسے آئین جہانبانی بتائے۔ چانکیہ کی ارتھ شاستر سیاسیات پر غالباً پہلی کتاب ہے۔ موریا خاندان کے شہنشاہ اشوک کا عہد حکومت رفاہِ عامہ کے کاموں سے بھرا پڑا ہے۔ موریا سلطنت کی تباہی کے بعد پانسو سال تک ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت دکھائی نہیں دیتی۔ اس زمانہ میں ساکا اور یوچی قوموں نے ہندوستان پر دھاوا بولا۔ ساکا قوم کا سب سے مشہور بادشاہ کنشک تھا۔ اسی زمانہ میں بودھ مت اور برہمن مت میں کش مکش ہوئی۔ پُران بھی اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ چوتھی صدی عیسوی میں گپت سلطنت قائم ہوئی۔ اب پاٹلی پترا کی جگہ اجین کو ہندوستان کی مرکزیت حاصل ہوئی۔ یہ زمانہ برہمن مت کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔ بکرماجیت اسی خاندان کا ایک حکمران تھا۔ گپت خاندان کے عہد حکومت میں ہندوستانی علوم و فنون اور صنعت و حرفت نے خوب ترقی کی۔ ہندوستان اور روم میں تجارتی تعلقات قائم ہو گئے۔ جنوبی ہندوستان کے لوگوں نے جاوا اور سماٹرا میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ گپت خاندان کے زوال کے بعد ہندوستان پھر بیرونی حملہ آوروں کا شکار ہوا۔ ہن قوم نے شمالی ہندوستان کو تاخت

و تاراج کیا۔ راجپوت اور گوجر (گرجر) اسی قوم کے مشہور قبائل تھے۔ مہر گل ہن قوم کا مشہور بادشاہ تھا۔ وہ ہاتھیوں کو پہاڑوں سے گرا کر ان کے مرنے کا تماشا کرتا اور خوش ہوتا۔ ساتویں صدی میں ہرش نے ہندوستان کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نظم و نسق کو ہیون سانگ ہم تک پہنچاتا ہے۔ ہرش اگرچہ بدھ مت کا پیرو تھا لیکن اس کے عہد میں شمالی ہندوستان میں برہمن مت نے زور پکڑ لیا تھا۔ ہرش کی موت کے بعد ہندوستان کی سیاسی مرکزیت ختم ہو گئی۔

اسی زمانہ میں عرب میں ایک بہت بڑا انقلاب ہوا۔ ایسا انقلاب جس نے انسانی تہذیب کو بدل دیا۔ عرب صدیوں سے آزاد چلے آتے تھے۔ یمن، شام اور عراق بیرونی حکمرانوں کے ماتحت رہ چکے تھے۔ لیکن اندرونِ عرب ان سے بچا رہا۔ اسلام کا ظہور حجاز میں ہوا۔ اسلام صرف بت پرستی اور شرک کے خلاف توحید و وحدت کا ایک عقیدہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک معاشی اور اجتماعی تحریک تھی۔ مکہ میں جہاں دولت مند تاجروں کا ایک طبقہ تھا۔ وہاں حبشی غلاموں کی تعداد بھی کافی تھی۔ مکہ کا تاجر سود خوری میں کسی یہودی سے کم نہیں تھا۔ دولت کی کثرت نے ان تاجروں کو عشرت پسند بنا دیا تھا۔ لیکن مکہ کی غالب آبادی افلاس اور بدحالی کا شکار تھی۔ اسلام نے اس عشرت پسندی، بدکاری، سود خوری اور لوٹ کھسوٹ کے ختم کر دینے کا حکم دیا۔ اسلام کی مخالفت میں مکہ کے تاجر متحد ہو گئے۔ لیکن ان کا اتحاد بیکار ثابت ہوا مدینہ میں اسلام قبول ہو چکا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافتِ راشدہ کے عہد میں عربی فتوحات کا دور شروع ہوا۔ بازنطین اور ایران کی سلطنتوں اور فوجوں کا تازہ دم عرب مجاہدوں سے مقابلہ کرنا محال تھا۔ ان کے پاس ساز و سامان تو تھا لیکن ان کی روح مردہ ہو چکی تھی۔ عربوں نے آس پاس کے مفتوحہ ملکوں کی گری ہوئی آبادی کو سنبھالا۔ انہیں ذلت اور خواری سے نکال کر انسانیت کے دائرہ میں شامل کیا۔ ان کی روحانی اصلاح کی۔ ان کی معاشی حالت کو بہتر بنایا۔ عربوں کی یہ انقلاب آفریں فوجیں بہت جلد بنو امیہ کے اشرافیہ کے زیرِ نگیں ہو گئیں۔ بنو امیہ کے عہد میں عرب فتوحات معراجِ کمال تک پہنچ گئیں۔ لیکن اسلامی روح بدل چکی تھی۔ ....

.... بنو امیہ کے عہد میں بعض ایسے قبائل کو اسلام قبول کرنے سے صرف اس لئے روک دیا گیا تھا۔ کہ ان کے مسلمان ہو جانے سے شاہی خزانہ میں کمی ہو جائیگی۔ اسی عہد میں کئی ایک ایرانی قبائل کو مسلمان ہوتے ہوئے بھی جزیہ دینا پڑتا تھا۔ بنو امیہ کے عہد میں غیر عرب مسلمانوں کو اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھا جاتا تھا۔ اسی عہد میں اندرونی کشمکش اور طبقاتی بے چینی کے آثار پیدا ہوئے بنو عباس نے اسی بے چینی اور نچلے طبقہ کی مدد سے امویوں کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔ امویوں کا دمشق خالص عربی شہر تھا۔ عباسیوں کا بغداد عربوں اور ایرانیوں دونوں کا شہر تھا۔ عباسیوں کے عہد میں معاشی بے چینی عام رہی۔ بابک خرمی کی تحریک کو عباسیوں نے بڑی مشکل سے دبایا۔ اس تحریک کے دب جانے کے بعد اسماعیلی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کو ہر اس اسلامی ملک میں کامیابی ہوئی۔ جہاں کے عوام ذلیل حال

تھے۔ یہ تحریک معاشی اسباب کا نتیجہ تھی۔ یہ نئی تحریک پرانے جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت تھی۔ اسماعیلی زمین کو صرف کسانوں میں تقسیم کرنے کے مدعی تھے۔ یہ تحریک خواص کے خلاف عوام کی تحریک تھی۔ عباسیوں نے ترکوں کی مدد سے اس تحریک کو کچل دیا۔ اسماعیلیوں کی ایک جماعت قرامطہ نے اتنی طاقت حاصل کر لی تھی کہ بغداد کا شاہی جاہ و حشم ان کے نام سے لرزتا تھا۔ دسویں صدی میں ملتان قرامطہ کا بہت بڑا مرکز تھا۔ محمود چونکہ ترک تھا۔ اور اس زمانہ میں ترک عباسیوں کے محافظ تھے۔ اس لئے اس نے ملتان پر حملہ کر کے قرامطہ کی قوت کو ختم کیا موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں ہم قرامطہ کو اشتراکی جمہوریت کے حامی کہہ سکتے ہیں۔ معاشی بے چینی اور طبقاتی کشمکش نے عباسیوں کی وسیع سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ مرکز کے کمزور ہوتے ہی سلطنت میں کئی ایک آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ان میں سے غزنی بھی ایک ریاست تھی۔ اس ریاست کے حکمران سبکتگین کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے محمود کے عہد میں شمال کی طرف سے ہندوستان پر پھر حملہ ہوا۔ پرانے حملہ آوروں کی طرح انہیں بھی کامیابی ہوئی۔ یہ حملہ آور بھی ہنوں، ساکوں اور یوچیوں کی طرح ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ لیکن اب کے یہ حملہ آور اپنے ساتھ ایسی خصوصیات اور ایسا تمدن لاتے تھے۔ کہ وہ ہندومت میں جذب نہ ہو سکے محمود کے حملوں سے تین سو سال پہلے عرب سندھ پر قبضہ کر چکے تھے۔

ہرشہ کی موت کے بعد ہندوستان بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ محمود کے سپاہیوں کے لئے ان ریاستوں کو شکست دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ محمود غزنوی کے ڈیڑھ سو سال بعد محمد غوری نے ہندوستان پر حملے کئے ایبک نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ غلام بادشاہوں نے چنگیزی حملوں سے ہندوستان کو بچایا۔ خلجیوں نے بندھیاچل کے اس پار فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ تغلقوں نے رفاہ عام کی طرف توجہ کی۔ تیموری حملے نے تغلقوں کو ختم کر دیا۔ ہندوستان کی سیاسی مرکزیت ختم ہو گئی۔ جا بجا آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ان آزاد ریاستوں میں نیا ہندوستانی تمدن پھلا پھولا۔

قطب الدین ایبک کی تخت نشینی سے اس خاندان کا آغاز ہوتا ہے۔ جو ہندوستان کی تاریخ میں غلاموں کے نام سے مشہور ہے۔ اسی خاندان کے ایک حکمران بلبن نے ہندوستان کو منگولوں کے حملوں سے بچائے رکھا۔ اس خاندان کی دہلی میں دو یادگاریں ہیں۔ قطب مینار اور مسجد قوت الاسلام۔ منگولوں نے عراق اور ایران کو تباہ کر دیا تھا۔ ان ملکوں کے عالموں نے دہلی کا رخ کیا۔ ان کے آنے سے دہلی میں علم و حکمت کا چراغ روشن ہوا۔ امیر خسرو نے ہندی دوہے لکھ کر ایک نئی زبان کی بنیاد رکھی۔ خلجیوں نے سلطنت دہلی کو وسیع کیا۔ محمد تغلق کی اصلاحات اس کے زمانہ کے لئے نا موزوں تھیں۔ فیروز تغلق نے اپنی سلطنت میں ایسے شفاخانے کھولے جن میں مریضوں کو مفت دوا ملتی تھی۔ اس نے بہت سے نئے شہر آباد کئے۔ اس کے عہد میں سنسکرت کتابوں کے فارسی میں تراجم ہوئے۔ فقہ فیروز شاہی اسی عہد کی ایک مشہور کتاب ہے۔ ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی لکھی۔ فیروز شاہ نے اپنے زمانہ کے حالات کو فتوحات فیروز شاہی میں پیش کیا۔ تیمور کے حملے نے

سلطنتِ دہلی کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس حملے کے بعد ہندوستان میں بہت سی آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ان ریاستوں میں علم و حکمت نے خوب ترقی کی۔ بنگال کے مسلمان حکمرانوں نے بنگالی کو اس وقت فروغ دیا۔ جب کہ سنسکرت کے حامی ہندو بنگالی زبان کی مخالفت کرتے تھے مدیا پتی نے اپنی بہت سی کتابیں نصرت شاہ کے نام معنون کیں۔ بنگال کے ان آزاد حکمرانوں نے فن تعمیر کی طرف بھی خاصی توجہ کی۔ بنگال کی طرح جونپور، مالوہ، گجرات اور گلبرگہ نے بھی ادب اور آرٹ میں نمایاں ترقی کی۔ لودھیوں کے عہدِ حکومت میں ایک ایسی تحریک چلی جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو مشترکہ عقائد کی بنا پر خوشگوار بنانا تھا۔ بھگت کبیر، شیخ بھیکا اور بابا نانک اس تحریک کے علمبردار تھے۔

پرتگالی پہلے لوگ نہیں تھے۔ جو سمندروں کے سینوں کو چیر کر ہندوستان کی تجارت کے لئے پہنچے تھے۔ پرتگالیوں سے صدیوں پہلے عرب ہندوستان کے ساحلوں سے ہوتے ہوئے چین کی بندرگاہوں تک آتے جاتے تھے۔ مصر اور شام کے شہروں سے تجارتی مال لے کر عربوں کے اونٹوں کی قطار حجاز کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی یمن تک پہنچ جاتی۔ یمن کی بندرگاہوں پر عرب سوداگر کشتیوں میں سوار ہو کر افریقہ کے مشرقی ساحل کی طرف چل دیتے۔ اور کچھ سوداگر ہندوستان کے مغربی ساحلوں سے ہوتے ہوئے برما اور چین تک چلے جاتے۔ جب یونانیوں نے مصر پر قبضہ کیا۔ تو انہوں نے اس تجارتی شاہراہ کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان سے اسکندریہ تک کی تجارت پر یونانی قابض ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود عربوں کی جہازرانی کسی نہ کسی صورت میں باقی رہی جب یونانیوں کی جہازرانی کا بڑا زور تھا۔ تب بھی خلیج فارس کی راہ سے عرب تاجر اپنے پرانے راستے سے چین تک پہنچ جاتے تھے۔

اسلام نے جہاں عربوں کی زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ وہاں اس نے عربوں کی جہازرانی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ خلیفہ دوم کے عہد میں نیل اور قلزم کو ایک نہر کے ذریعہ ملا دیا گیا۔ اس عہد میں مصر کے حاکم عمرو بن العاص نے چاہا۔ کہ خاکنائے سویز میں سے ایک نہر کاٹ کر بحر قلزم کو بحر روم سے ملا دیا جائے لیکن اسے یہ نہر کھودنے کی اجازت نہ ملی۔ بہہرحال بہت جلد عربوں کی جہازرانی اپنے کمال تک پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ہی عربوں کا سمندری بیڑہ دنیا بھر کے ملکوں کے متحدہ بیڑے سے طاقتور بن گیا۔

عرب جہازران ہندوستان کے ساحلوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ عربی میں ہندوستان کی ساحلی زبانوں کے بہت سے الفاظ ان تعلقات کا کافی ثبوت ہیں۔ صندل، مسک، تنبول، کافور، قلفل، نیلوفر، طوطی، شیت، نلیج، نارجیل اور کئی دوسرے عربی الفاظ اپنے ہندی ہونے کی خود بخود گواہی دے رہے ہیں۔ سندھ، گجرات، ملیبار اور کارومنڈل کی بندرگاہوں کی رونق ان عرب جہازرانوں اور سوداگروں کے دم سے تھی۔ ہندوستان کے کئی ساحلی شہروں میں عربوں کی نوآبادیاں قائم ہو گئی تھیں۔ ہندوستان کی ساحلی ریاستوں کے حکمرانوں کو چونکہ عرب سوداگروں اور جہازرانوں کے آنے جانے سے بہت سا مالی فائدہ پہنچتا تھا۔ اس لئے

وہ عربوں کی بہت عزت اور قدر کرتے تھے۔
سراندیپ اور مالدیپ ہندوستان میں عربوں کا تیسرا تجارتی مرکز مالابار تھا۔ مالابار (ملیبار) کا ساحل گجرات اور کولم کے درمیان پھیلا ہوا ہے "تحفۃ المجاہدین" کے الفاظ میں "ہندوستان کے مغربی ساحل کی بندرگاہوں میں عرب تاجر بہت بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ ان عرب تاجروں کی آمد و رفت سے کئی ایک ساحلی شہر آباد ہو گئے ہیں جن میں عربوں کی کافی تعداد ہے۔ ان ریاستوں کے حکمران ان پر کسی قسم کی سختی نہیں کرتے۔ انہیں پوری پوری مذہبی آزادی حاصل ہے۔ مالابار کے راجاؤں کا عربوں اور مقامی مسلمانوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ ہے۔" ابن بطوطہ کہتا ہے۔ کہ "مالابار کا ساحلی سفر دو مہینوں میں کٹتا ہے۔ اس ملک میں بارہ راجے ہیں۔ ہندوؤں کی حکومتیں ہونے کے باوجود ان ریاستوں میں مسلمانوں کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ اس پورے سفر میں جگہ جگہ مسلمانوں کی بستیاں دکھائی دیتی ہیں۔" کالی کٹ کے بارے میں ابن بطوطہ لکھتا ہے۔ کہ "یہ مالابار کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے جہاں دنیا بھر کے ملکوں کے سوداگر جمع ہوتے ہیں۔ یہاں کا ہندو راجہ زیمورن کہلاتا ہے۔ ابراہیم شاہ بندر یہاں کے سوداگروں کا سردار ہے۔" یہی سیاح اپنے سفرنامہ میں کالی کٹ کے ایک ایسے عرب سوداگر کا ذکر کرتا ہے۔ "جس کے اپنے جہاز ہیں۔ جو ہندوستان، یمن، چین اور فارس (ایران) سے تجارت کرتے ہیں۔" ابن بطوطہ سے بھی صدیوں پہلے کئی ایک عرب جغرافیہ نگاروں نے اپنی کتابوں اور عرب سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں ہندوستان کے مغربی ساحلوں کی بندرگاہوں اور وہاں کے باشندوں کا تذکرہ کیا ہے۔ تجارت کی سب سے بڑی سمندری سڑک پر صدیوں عربوں نے قبضہ کئے رکھا۔ عرب سوداگر ایک طرف اسکندریہ کی بندرگاہ تک اپنا مال پہنچا دیتے تھے اور دوسری طرف شام کی بندرگاہوں تک، ان بندرگاہوں سے وینس کے سوداگر مال خرید کر یورپی منڈیوں میں فروخت کرتے۔ جب اسپینیوں نے عربوں کو سپین سے نکال دیا۔ تو اس وقت ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ بحیرہ روم میں عربوں کے تجارتی تسلط کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ سپین اور پرتگال اس کوشش میں تھے کہ ترکوں نے بحیرہ روم کو "ترکی جھیل" بنا لیا۔ اب سپین اور پرتگال نے اس راستے سے ہندوستان پہنچنا چاہا۔ جس سے اس زمانہ کے عرب جہاز ران واقف ہو چکے تھے۔ عرب جہاز ران طنجہ تک پہنچ کر افریقہ کے ..... مغربی ساحل سے ہوتے ہوئے جنوبی افریقہ چلے جاتے۔ اور یہاں سے مشرقی افریقہ کی بندرگاہوں سے ہندوستان کے مغربی ساحل پر پہنچ جاتے تھے۔ دسویں صدی کا ایک عرب تاجر سلیمان لکھتا ہے۔ کہ ہمارے زمانہ میں ایک ایسا حادثہ ہوا ہے۔ جس کا پہلوں کو علم نہیں تھا۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ بحر ہند اور بحر روم آپس میں ملے ہوتے ہیں۔ ایک عرب جغرافیہ نگار کے الفاظ میں "طنجہ اور اسپین کے ساحلوں پر جو بحر محیط ہے۔ اسے یونانی اقیانوس کہتے ہیں۔" گیارہویں صدی کا ایک عرب سیاح ابو حامد اقیانوس کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ "اس سمندر میں زمین ایسی ہے جیسے تالاب میں گیند۔" تقریباً دو سو سال بعد ایک دوسرا عرب جغرافیہ نگار ابوالفدا لکھتا ہے

کہ اوقیانوس، مراکش کے ساحلوں کو چھوتا ہوا جنوب میں چلا جاتا ہے۔ اور پھر مشرق کی طرف گھوم کر افریقہ کی سمت ویران علاقوں کو پیچھے چھوڑ کر پھیلتا ہوا بحر ہند سے جا ملتا ہے۔ پرتگالیوں نے بھی اسی راستے سے ہندوستان پہنچنے کی کوشش کی۔

واسکوڈے گاما ابھی ملندہ ہی میں تھا۔ کہ عرب جہازیوں نے مالابار کے موپلا (عرب نسل کے مالاباری مسلمان) تاجروں کو پرتگیزوں کے ارادوں سے باخبر کر دیا۔ چونکہ ان تاجروں کو یورپی ملکوں کے ساتھ تجارت کرنے میں بہت زیادہ فائدہ ہوتا تھا۔ اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ پرتگیزی مغربی افریقہ کے ساحل کا چکر کاٹ کر ہندوستان کے تجارتی مال کو پرتگال کی بندرگاہوں تک لے جائیں۔ چنانچہ موپلا تاجروں نے کالی کٹ کے راجے کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا۔ کہ وہ پرتگیزوں کو اپنے ملک سے تجارت کرنے کی اجازت نہ دے۔

جب کالی کٹ کے راجہ زیمورن (سمودری) کو پرتگیزوں کے آنے کا پتہ چلا۔ تو اس نے ان کے سردار کو اپنے ہاں بلا بھیجا۔ چنانچہ واسکوڈے گاما اپنے تیرہ ساتھیوں سمیت خشکی کے راستے سے کالی کٹ کی طرف چل پڑا۔ واسکو ڈے گاما نے نہ معلوم کس بنا پر یہ فرض کر لیا تھا۔ کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان میں سب لوگ عیسائی ہیں چنانچہ واسکوڈے گاما اور اس کے ساتھیوں نے ایک مندر کو گرجا خیال کرتے ہوئے وہاں عبادت کی۔ واسکوڈے گاما کے پاس زیمورن کو پیش کرنے کے لئے کوئی تحائف نہیں تھے۔ اس پر زیمورن نے حیران ہو کر واسکو سے پوچھا۔ کیا تم یہاں پتھر تلاش کرنے آئے ہو یا انسان؟" واسکو نے کالی کٹ سے تجارت کرنے کی اجازت مانگی۔ زیمورن نے مسکراتے ہوئے پرتگیزوں کو اپنے ملک کے ساتھ تجارت کرنے کی اجازت دیدی۔

اس زمانہ میں کالی کٹ ہندوستان کے مغربی ساحل کا ایک مشہور تجارتی مرکز تھا۔ واسکوڈے گاما سے تقریباً ساٹھ سال پہلے عبدالرزاق کالی کٹ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے "کہ اس شہر میں بہت سے مسلمان بھی بستے ہیں۔ شہر کی دو مسجدوں میں مسلمان نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ کالی کٹ کے امن اور انصاف کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ یہاں کے تاجر سمندر پار کے دور دراز ملکوں سے تجارتی مال لاتے ہیں۔ چونگی کے افسر تجارتی مال کی دن رات حفاظت کرتے ہیں۔ کالی کٹ پہنچ کر ہر ملک کے تجارتی جہاز کو پناہ مل جاتی ہے" سولھویں صدی کے شروع میں ایک فرانسیسی سیاح پیرے دی لاوال لکھتا ہے۔ کہ "ہندوستان بھر میں کالی کٹ سے بہتر کوئی دوسرا مقام نہیں۔ جہاں انسانوں کو اتنا اطمینان نصیب ہے۔۔۔۔۔ یہاں ہر مذہب اور قوم کے سوداگروں کو پوری پوری شہری اور مذہبی آزادی حاصل ہے۔" سمرقندی، اطالوی اور فرانسیسی سیاحوں کے ملتے جلتے بیانوں کی سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کالی کٹ بلاشبہ ہندوستان کے مغربی ساحل کا ایک بہت بڑا تجارتی شہر تھا جس میں دولت مند تاجروں کی کمی نہیں۔ لیکن اس میں چند ایسے بھوکے انسان بھی بستے تھے۔ جو پرتگیزی ملاحوں کو بسکٹ کھاتا دیکھ کر ان سے ایک آدھ بسکٹ کی بھیک بھی مانگ لیتے تھے۔

اسی اثنا میں کالی کٹ کے جہازی پرتگیزی جہازوں کو کالی کٹ کی بندرگاہ میں لے آئے تھے۔ واسکوڈے گاما

نے اپنے بیڑے پر پہنچ کر پانچ چھ دن تک موپلا سوداگروں کا انتظار کیا۔ تاکہ وہ اس مال کو خرید لیں۔ جسے وہ پرتگال سے لایا تھا۔ جب سوداگروں نے پرتگیزی مال خریدنے سے انکار کر دیا۔ تو واسکو دے گاما نے زیمورن سے شکایت کی۔ زیمورن نے اس مال کو خرید کر اسے کالی کٹ کی منڈی میں بھیجدیا۔ واسکو دے گاما پرتگال سے ایسا مال لے کر آیا تھا جس کی کالی کٹ میں مانگ نہیں تھی۔ اس نے ایک تونسی عرب کی مدد سے جو ہسپانوی زبان جانتا تھا کالی کٹ کی منڈی کی مانگ کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ کالی کٹ کی بندرگاہ سے ایسی اشیا کے نمونے لے گیا۔ جو وہاں کثرت سے بیچی جاتی تھیں۔ اس تونسی عرب کو پرتگیزوں نے "مون شیدی" نام دے رکھا ہے۔ واسکو دے گاما واپس جانا چاہتا تھا۔ کہ زیمورن کے ساتھ اس کا جھگڑا ہو گیا۔ واسکو دے گاما پانچ مالاباریوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔

دو سال کے بعد واسکو دے گاما پرتگال پہنچا۔ اس کے تین جہازوں میں سے ایک تباہ ہو چکا تھا۔ اس کے ایک سو ستر ساتھیوں میں سے صرف پچپن زندہ تھے۔ اگر شاعروں اور مورخوں کی ان مبالغہ سے بھری ہوئی کہانیوں کو جو واسکو کے اس سفر کے ساتھ چمٹی ہوئی ہیں۔ نکال دیا جائے۔ تب بھی واسکو دے گاما کے اس سفر کی دلچسپیوں میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ واسکو دے گاما کا یہ سفر دنیا کی تاریخ کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ ایک ایسا واقعہ جس سے نہ صرف ایک نیا سمندری راستہ دریافت ہوا۔ بلکہ جس نے آگے چل کر قوموں کی معاشی اور سیاسی تاریخ کو بدل دیا۔

واسکو دے گاما نے جس سمندری راستے کو تلاش کر لیا تھا۔ اسے جاری رکھنے کے لئے تیرہ جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کیا گیا۔ ۹ مارچ ۱۵۰۰ء کو الوریز کبرال کی کمان میں یہ بیڑہ ہندوستان کی طرف چل دیا۔ اسی اثنا میں جنوبی افریقہ کی سونے کی کانوں کی اطلاع پرتگال میں پہنچ چکی تھی۔ سونے کی ان کانوں کو دریافت کرنا بھی اس بیڑے کے ذمے تھا۔ راس وردے سے ہٹ کر ایک جہاز بیڑے سے الگ ہو گیا۔ ہوا کے رخ سے فائدہ اٹھانے کے لئے باقی جہاز اوقیانوس پر پھیل گئے۔ اس طرح پرتگیزوں نے برازیل دریافت کر لیا۔ ایک جہاز کو اس نئی دریافت کی اطلاع دینے کے لئے پرتگال جانا پڑا۔ باقی کے گیارہ جہاز برازیل کے ساحل سے راس امید کی طرف چل دیئے۔ راس امید کے قریب چار جہاز ڈوب گئے۔ سات جہاز راس امید کا چکر کاٹنے میں کامیاب ہو سکے۔ ان میں سے ایک جہاز مڈغاسکر کے ساحل کی طرف نکل گیا۔ اس جہاز کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی مشکل سے یہ جہاز پرتگال پہنچ سکا۔ ۷ اگست ۱۵۰۱ء کو الوریز کبرال افریقی ساحل سے ہندوستان کی طرف چل پڑا۔ اب اس کے بیڑے میں صرف چھ جہاز تھے۔ ۱۳ ستمبر کو پرتگیزی بیڑہ کالی کٹ پہنچ گیا۔ الوریز اور زیمورن میں کئی ہفتوں تک جھگڑا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ پرتگال اور مالابار میں سمجھوتہ ہو گیا۔ اس سمجھوتے کے سبب پرتگیزوں کو کالی کٹ میں ایک فیکٹری کھولنے اور اپنا پھریرا لہرانے کی اجازت مل گئی۔ تین مہینوں کی مدت میں پرتگیزی صرف دو جہازوں میں تجارتی مال لاد سکے۔ پرتگیزوں نے زیمورن سے کالی مرچ خریدنے

کا اجارہ لے لیا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا۔ کہ عرب سوداگر اس جنس کو خرید رہے ہیں۔ تو انہوں نے زیمورن سے شکایت کی۔ زیمورن کا جواب آنے سے پہلے ہی پرتگیزوں نے عربوں کے ایک جہاز کو جو لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ پکڑ لیا۔ پرتگیزوں کی اس حرکت کی خبر شہر میں پہنچ گئی۔ مالاباریوں کے ایک ہجوم نے پرتگیزی فیکٹری کو لوٹ لیا۔ ستر پرتگیزوں میں آدھے کے قریب مارے گئے۔ اور باقی بڑی مشکل سے جان بچا کر اپنے جہازوں تک پہنچے۔ کئی ایک زخمی پرتگیزوں کو کالی کٹ کے لوگوں نے اپنے ہاں پناہ دی۔ اس وقت تک الوریز کبرال اس ہنگامے کو فیکٹری کا معمولی جھگڑا سمجھ رہا تھا۔ لیکن اگلے دن اس نے غیر ملکی جہازوں کے چھ سو کے قریب کشتی چلانے والوں کو پکڑ کر قتل کروا دیا۔ کئی ایک ملاحوں کو ان کی کشتیوں میں زندہ جلا دیا گیا۔ الوریز کبرال دو دن تک کالی کٹ پر گولے برساتا رہا۔ اب پرتگیزوں کی پوزیشن بہت خراب ہو چکی تھی۔ مون سون شروع ہونے والی تھی۔ پرتگیزوں کو ہندوستان کی کسی دوسری بندرگاہ کا پتہ نہیں تھا۔ جب ان کو کوچین کی بندرگاہ کا علم ہوا تو وہ ۱۳ دسمبر کو کالی کٹ سے بھاگ نکلے۔ چند دنوں میں پرتگیزوں نے اپنے سارے جہاز تجارتی مال سے بھر لئے۔

پرتگیزی بیڑہ پرتگال کو روانہ ہونے والا تھا۔ کہ الوریز کبرال کو پتہ چلا۔ کہ کالی کٹ کا ایک بیڑہ اس پر حملہ کرنے کے لئے چلا آ رہا ہے۔ کوچین کی پرتگیزی فیکٹری میں تیس پرتگیزوں کو چھوڑ کر الوریز رات کے اندھیرے میں کوچین سے کھسک گیا۔ پیچھے رہنے والے پرتگیزوں میں سے "دوآرتے باربوسا" بھی تھا۔ جس نے آگے چل کر افریقہ اور مالابار کے ساحلوں پر ایک کتاب لکھی۔ کنانور سے ہوتے ہوئے پانچ جہازوں کو صحیح سلامت لے کر پرتگال تک جا پہنچا۔ اسی اثنا میں پرتگیزوں کا ایک تجارتی بیڑہ ہندوستان کی طرف چل پڑا تھا۔ جب یہ بیڑہ موزمبیق پہنچا۔ تو اسے الوریز کے حالات کا پتہ چلا۔ چنانچہ اس بیڑے نے کالی کٹ جانے سے گریز کیا۔ واپسی پر اس بیڑے نے سینٹ ہلینا کو دریافت کر لیا۔

الوریز کبرال کا یہ سمندری سفر اس لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کہ پرتگیزوں نے کوچین کی بندرگاہ کو دریافت کر لیا تھا۔ پرتگیزوں کے لئے یہ بندرگاہ کالی کٹ سے زیادہ مفید تھی۔

پرتگال کے بادشاہ نے مشرق میں پرتگیزی سلطنت قائم کرنے کے لئے بیس جہازوں کے ایک بیڑے کو واسکو ڈے گاما کی کمان میں فروری ۱۵۰۲ء کو ہندوستان روانہ کیا۔ جب یہ بیڑہ ہندوستان کے ساحل کے قریب پہنچا۔ تو واسکو ڈے گاما کو معلوم ہوا۔ کہ بحیرہ احمر سے ایک بہت بڑا تجارتی جہاز آ رہا ہے۔ واسکو ڈے گاما نے اس تجارتی جہاز پر حملہ بول دیا۔ جہاز کے کپتان جوہر آفندی نے پرتگیزوں کی بہت منت سماجت کی۔ لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ سات دن تک جوہر آفندی پرتگیزی بیڑے سے لڑتا رہا۔ پرتگیزوں نے اس جہاز کے تمام سواروں کو جن میں بچے اور عورتیں بھی تھیں قتل کر دیا۔

واسکو ڈے گاما نے کالی کٹ پہنچ کر (۲۹۔ اکتوبر ۱۵۰۲ء) زیمورن سے مطالبہ کیا۔ کہ وہ تمام موپلوں اور عربوں کو اپنی ریاست سے نکال دے۔ زیمورن نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ کالی کٹ ایک مدت سے

آزاد بندرگاہ چلی آرہی تھی۔ زیمورن نے واسکو دے گاما سے کہہ دیا۔ کہ اگر انہیں یہ شرط منظور نہیں۔ تو وہ کالی کٹ سے چلے جائیں۔ واسکو دے گاما نے چاول لے جانے والے جہازوں کے آٹھ سو ملاحوں کو پکڑ کر ان سب کو قتل کروا دیا۔ ملاحوں کو قتل کرنے کے بعد اس نے دو دن تک کالی کٹ پر گولے برسائے۔ مالاباری فوج کے پاس دو توپیں تھیں۔ لیکن وہ ٹھیک نشانہ نہیں باندھ سکتے تھے۔ تیسرے دن واسکو دے گاما کوچین کی طرف چل دیا۔ واسکو نے کوچین اور کنانور کی پرتگیزی فیکٹریوں کو مستحکم کرنے کے بعد یکم ستمبر ۱۵۰۳ء کو پرتگال کی راہ لی۔ مالابار کے ساحل میں پرتگیزوں کے تجارتی مفاد کی نگرانی کے لئے سودرے کی کمان میں ایک بیڑے کو پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ واسکو دے گاما کی واپسی کے بعد زیمورن نے کوچین کے راجے سے کہا۔ کہ وہ پرتگیزوں کو نکال دے۔ لیکن کوچین نے کالی کٹ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ زیمورن نے کوچین پر حملہ کر دیا۔ ایڈاپلی کی لڑائی میں زیمورن نے کوچین کی فوج کو شکست دی۔ اس لڑائی میں کوچین کا راجکمار نارائن مارا گیا۔ اسی اثنا میں البوکرک پرتگال سے کمک لے کر پہنچ گیا۔ اس نے کوچین کے راجے اور پرتگیزوں کو ایک جزیرے کے سندر میں پناہ گزین پایا۔ البوکرک نے زیمورن کو شکست دے، اسے کوچین کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیا البوکرک تجارتی جہازوں کو لاد کر پرتگال چلا گیا۔ لیکن بہت جلد کوچین اور کالی کٹ کے تعلقات خراب ہو گئے۔ زیمورن کے بیڑے کے کمانڈر علی خواجہ نے کوچین پر حملہ کیا۔ لیکن اس نے شکست کھائی۔ اب پرتگیزی بیڑہ کالی کٹ کی طرف بڑھا۔ پرتگیزوں نے کالی کٹ پر پھر گولے برسائے۔

مشرق میں پرتگال کا مفاد اس حد تک پہنچ گیا تھا۔ کہ اب ہر سال نئے بیڑے کی روانگی ناکافی محسوس کی جانے لگی۔ چنانچہ تین سال کے لئے ایک وائسرائے مقرر کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ فرانسسکو دا المیدہ ہندوستان میں پرتگالیوں کا پہلا وائسرائے تھا۔ المیدہ ایک بہت بڑے بیڑے اور پندرہ سو سپاہیوں کو لیکر ہندوستان کی طرف چل دیا۔ چونکہ وہ کلوا، انجادیو، کنانور اور کوچین میں پرتگالی قلعے بنانا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ بہت سے معماروں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ کلوا میں ایک قلعہ بنانے اور مشرقی افریقہ کے بہت سے ساحلی شہروں کو لوٹنے کے بعد وہ ۱۳ ستمبر ۱۵۰۵ء کو انجادیو پہنچا۔ یہاں بھی ایک قلعہ کھڑا کرنے کے بعد المیدہ نے کنانور میں بھی ایک قلعہ بنوایا۔ اسی قلعہ میں المیدہ کے بیٹے لورینشو کو ایک اطالوی نے بتایا۔ کہ پرتگالیوں کی سمندری سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لئے زیمورن ایک بہت بڑا جنگی بیڑہ تیار کر رہا ہے۔ مارچ ۱۵۰۶ء کو زیمورن کا یہ بیڑہ عبدالرحمٰن کی کمان میں مالابار کے ساحل سے روانہ ہوا۔ پرتگالیوں سے معمولی لڑائی کے بعد یہ بیڑہ کالی کٹ چلا گیا۔

پرتگالیوں کی ان سمندری سرگرمیوں اور پرتگال کے سمندری لیٹروں کی لوٹ مار نے مصری بندرگاہوں کی چنگی میں نمایاں کمی کر دی تھی۔ مصر کے مملوک سلطان قانصوہ نے پرتگالیوں سے لڑنے کے لئے ایک جنگی بیڑہ تیار کیا۔ یہ بیڑہ میر ہاشم کی کمان میں ۱۰ ستمبر ۱۵۰۸ء کو دیو پہنچا۔ دیو کے گورنر ملک ایاز نے میر ہاشم کی

پوری امداد کا وعدہ کیا۔ چنانچہ میر ہاشم اور ملک ایاز نے پرتگالیوں کے بیڑے کو شکست دی۔ اس سمندری لڑائی میں پرتگال کے وائسرائے کا بہادر بیٹا لورینشو مارا گیا۔ المیدو اپنے بیٹے کا انتقام لینے کے لئے کوچین سے چل دیا۔ اس اثنا میں البوکرک سقوطرہ اور ہرمز سے ہوتا ہوا بحر ہند میں داخل ہو چکا تھا۔ ساحلی شہروں کو لوٹتا ہوا المیدہ دیو (گجرات کے جنوب میں ایک چھوٹا سا جزیرہ) کی طرف بڑھا۔ دیو کے پانیوں میں پرتگالیوں اور اتحادیوں میں ۲ فروری ۱۵۰۹ء کو لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں اتحادیوں کو شکست ہوئی۔ پرتگالی بیڑہ جس طرح لوٹ مار کرتا ہوا آیا تھا۔ اسی طرح لوٹ مار کرتا ہوا کوچین پہنچ گیا۔ یکم دسمبر ۱۵۰۹ء کو المیدہ (۱۵۰۵ – ۱۵۰۹ء) کوچین سے پرتگال روانہ ہوا۔

البوکرک (۱۵۰۹ – ۱۵۱۵) کو پرتگال کے بادشاہ نے گجرات کے ساحل سے راس کماری کے ساحل تک کا گورنر مقرر کیا تھا۔ شاہِ پرتگال نے وائسرائے کا عہدہ اُڑا دیا تھا۔ البوکرک نے مشرق میں پرتگالی سلطنت قائم کرنے کے لئے سب سے پہلے کالی کٹ پر حملہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ اس لڑائی میں مالابایوں نے پرتگالیوں کے سامان جنگ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس شکست کے بعد البوکرک نے اپنی قوت کو منظم کرنے کے لئے پرتگال سے فوجی افسروں کو بُلا بھیجا۔ اس نے اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے موپلا جہازوں کو تجارت کی اجازت دے دی۔ اگلے سال البوکرک نے گوا پر قبضہ کر لیا۔ پرتگالی ابھی گوا کی دولت کو لوٹنے میں مصروف تھے کہ اسمٰعیل عادل شاہ نے گوا کو پرتگالیوں سے چھین لیا۔ جب پرتگال سے کمک پہنچ گئی۔ تو البوکرک گوا پر پھر حملہ کرنے کے لئے کنانور سے نکلا۔ کپتان رسول خان نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ پرتگالیوں نے گوا پر قابض ہوتے ہی ایک قلعہ، ایک ہسپتال اور ایک گرجا بنا ڈالا۔ اب اس نے ملاکا پر ہلہ بول کر اس پر قبضہ کر لیا۔ فروری ۱۵۱۲ء میں وہ کوچین میں تھا۔ اس سال البوکرک کو پرتگال سے جو کمک آئی تھی۔ اس میں پہلی مرتبہ بندوق بھی آئی تھی۔ اب البوکرک نے گوا کو اپنی راجدھانی بنا لیا۔ پرتگالیوں کو بہت جلد گوا کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا۔ البوکرک کے دربار میں ہرمز، سیام، پیگو، گجرات اور حبشہ کے سفیر دکھائی دینے لگے۔ ۱۵۱۵ء میں پرتگالیوں نے ہرمز پر بھی قبضہ کر لیا۔ ایک سال پہلے انہوں نے ملاکا پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ہرمز سے واپسی پر البوکرک ۱۶ دسمبر ۱۵۱۵ء کو اس جہاز ہی میں مر گیا۔ جو گوا کے سامنے لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ اگلے دن اسے گوا کے گرجا میں دفن کر دیا گیا۔ البوکرک اور شاہِ پرتگال کے اختلافات کی وجہ سے البوکرک اپنی سرگرمیوں کو تیز نہیں کر سکتا تھا۔ شاہِ پرتگال نے البوکرک کی پالیسی کا اس وقت اندازہ لگایا۔ جب وہ اس دنیا سے جا چکا تھا۔ جب شاہِ پرتگال کو البوکرک کی موت کی خبر سنائی گئی تو اس نے کہا۔ کہ جب تک اس کی ہڈیاں وہاں ہیں۔ ہندوستان محفوظ ہے۔" پچاس سال بعد البوکرک کی نعش لزبن پہنچائی گئی۔ البوکرک نے گوا کو پرتگالیوں کا صدر مقام بنا کر ہندوستان کے ایک قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے ہے المیدہ کا مقصد اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ کہ مشرق و مغرب کی تجارت پرتگالیوں کے ہاتھ

میں چلی جائے۔ لیکن البوکرک مشرق میں ایک پرتگالی سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ اس سلطنت سے پرتگالیوں کے ہاتھ میں ساری دنیا کی تجارت آجائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اس نے کئی ایک بندرگاہوں پر قبضہ کر کے وہاں پرتگالی قلعے کھڑے کئے۔ اور ان کی دیواروں پر پرتگالی پھریرے لہرائے۔ جب پرتگال کے بادشاہ نے البوکرک سے یہ کہا۔ کہ وہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ پالیسی اختیار کرے۔ تو اس نے اپنے بادشاہ کو یہ جواب دیا تھا کہ ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے لوگ ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہیں۔ کہ انہیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا" چھ سال کی مدت میں البوکرک نے ہندوستان کی سرزمین پر پرتگالیوں کے قدم مضبوط کر دیئے۔ بحر ہند میں ان کی قوت بہت مضبوط ہو گئی۔ البوکرک نے گوا کی دیسی آبادی کے لئے اسکول کھولے۔ اس نے ستی کو قانوناً بند کر دیا۔ البوکرک نے ہندوستان میں پرتگالیوں کی نوآبادیاں قائم کرنے کیلئے پرتگالیوں کو دیسی عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کی ترغیب دی۔

البوکرک کے بعد شاہ پرتگال نے لوپو سوریز (۱۵۱۵ - ۱۵۱۸) کو گورنر مقرر کیا۔ سوریز اپنے پیش رَو کی خوبیوں سے خالی تھا۔ وہ بہت کمزور، بے ہمت اور بیکار سا انسان تھا۔ جنوری ۱۵۱۶ء میں پرتگال سے یہ اطلاع آئی۔ کہ مصریوں کا ایک بہت بڑا جنگی بیڑا پچھلی لڑائی کا بدلہ لینے کے لئے تیار ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایک سال تک تیاری کرنے کے بعد سوریز اپنے بیڑے سمیت بحر احمر کی طرف چل دیا۔ یہ بیڑا گیارہ دن تک جدہ کی بندرگاہ کے قریب لنگر ڈالنے کے بعد واپس ہوا۔ کامران پہنچ کر پرتگالیوں کے پاس بہت کم خوراک رہ گئی کئی پرتگالی بھوک سے مرنے لگے۔ زندوں میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی۔ کہ وہ مردوں کو دفن کر سکتے۔ یہ تباہ حال بیڑا بڑی مشکل سے ہرمز پہنچا۔ ہرمز سے پرتگالی گورنر نے ہندوستان کی راہ لی ۱۵۱۸ء میں پرتگالیوں نے سیلون میں بھی ایک قلعہ بنایا۔

دیگو لوپیز (۱۵۱۸ سے ۱۵۲۱) نے ہرمز سے واپسی پر دیو کے گورنر ملک ایاز سے ملاقات کی۔ دیگو لوپیز دیو پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دیو کی حفاظتی تیاریوں نے اسے اپنے ارادوں سے باز رکھا۔ دیگو لوپیز کے عہد میں گوا میونسپلٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ میونسپل دستور وہی تھا۔ جو لزبن میں رائج تھا۔ میونسپلٹی کے ممبروں کا ہر سال چناؤ ہوتا تھا۔ خاص خاص پیشوں کی نمائندگی کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ لوپیز کے جانشین دوریت (۱۵۲۱ - ۱۵۲۴) کے عہد میں پرتگالیوں کی حالت ابتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ پہلے پرتگالی وائسرائے واسکو دے گاما کو حالات پر قابو پانے کے لئے ہندوستان بھیجا گیا۔ وہ ستمبر ۱۵۲۴ء میں ہندوستان پہنچا لیکن تین مہینوں کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ واسکو دے گاما نے ہلکے جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کرانا شروع کر دیا تھا۔ ۱۵۳۸ء میں اس کی ہڈیوں کو کوچین سے پرتگال پہنچا دیا گیا۔

اب گوی بیڑے کا کپتان ہنریک : ۱۵۲۴ سے ۱۵۲۶) پرتگیزی مقبوضات کا گورنر مقرر ہوا۔ اس کے عہد میں مالابار کے ساحلوں پر لڑائیاں ہوتی رہیں اور کالی کٹ کے پرتگالی قلعہ کو زیمورن کے سپاہیوں نے

مسمار کر دیا تھا۔ لوپو واز نے بھی گجرات کی بندرگاہ دیو پر قبضہ کرنا چاہا۔ لیکن ناکام رہا۔ بہرحال لوپو واز نے اپنے جانشین نونو (۱۵۲۹ - ۱۵۳۸) کے لئے ایک مضبوط بیڑا چھوڑا۔

نونو کے عہد میں دیو پرتگالیوں کی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ چنانچہ اس مرکز سے قریب ہونے کے لئے کوچین کی جگہ گوا کو ہیڈ کوارٹر بنایا گیا۔ اب گوا پرتگالی ہندوستان کی راجدھانی تھا۔

جب پرتگالی پہلی مرتبہ ہندوستان پہنچے تھے۔ تو اس وقت سلطان محمود گجرات کا حکمران تھا۔ اب اس کا پوتا سلطان بہادر شاہ گجرات کا حکمران تھا۔ دیو اس کی مملکت کا ایک حصہ تھا۔ بہادر شاہ کی طرف سے ملک توغان دیو کا حاکم تھا جب نونو کا بیڑہ دیو کی طرف بڑھا۔ بحر روم کا مشہور جہازی مصطفیٰ اپنے بیڑے سمیت دیو میں لنگر انداز ہو چکا تھا۔ مصطفیٰ کے جنگی جہازوں نے پرتگالیوں پر گولے برسائے۔ پرتگالی بیڑہ شکست کھا کر دیو سے بھاگ نکلا۔ سلطان بہادر شاہ نے مصطفیٰ کو رومی خان کا خطاب دے کر اپنے بیڑے کا کپتان مقرر کر لیا۔ نونو نے لڑائی میں شکست کھانے کے بعد ٹھٹھہ میں سے دیو پر قبضہ کرنا چاہا۔ شمال سے ہمایوں بڑھ رہا تھا۔ اور جنوب میں پرتگالیوں نے دباؤ ڈال رکھا تھا۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے بہادر شاہ نے پرتگالیوں سے پرامن رہنے کا وعدہ لے لیا۔ سلطان نے بسین کو پرتگالیوں کے سپرد کر دیا۔ ہمایوں سے شکست کھانے کے بعد بہادر شاہ نے دیو میں نونو سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں بہادر شاہ نے پرتگالیوں کو دیو میں قلعہ بنانے کی اجازت دے دی۔ جب شمالی ہندوستان کے حالات نے ہمایوں کو واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ تب پرتگالیوں اور بہادر شاہ میں ایک لڑائی ہوئی جس میں بہادر شاہ مارا گیا۔ اس لڑائی کے بعد پرتگالیوں نے دیو پر قبضہ کر لیا۔ سلطان بہادر شاہ نے عثمانی سلطان سے امداد لینے کے لئے جو ایلچی بھیجا تھا۔ اس کے قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے سلطان بہادر شاہ کی موت کی خبر وہاں پہنچ چکی تھی ترکی بیڑہ ۲۲ جون ۱۵۳۸ء کو سویز سے روانہ ہوا۔ اس بیڑے میں ۷۲ جہاز اور ساڑھے چھ ہزار سپاہی تھے۔ سلیمان پاشا اس بیڑے کا کمانڈر تھا۔ عدن پر قبضہ کرنے کے بعد ۴ ستمبر کو یہ بیڑہ دیو پہنچا۔ پرتگالیوں کو اس بیڑے کے آنے کی خبر مل چکی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بھی اپنی ساری سمندری طاقت کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ سلیمان پاشا نے دیو کا محاصرہ کر لیا

اسی اثنا میں نونو کی جگہ گارشیا ہندوستان کے پرتگالی مقبوضات کا وائسرائے مقرر ہو چکا تھا۔ جب وہ گوا پہنچا۔ تو پرتگالی بیڑہ دیو جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ ترکی اور پرتگالی بیڑوں میں لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں دونوں طرف سے بہادری کے جوہر دکھائے گئے۔ پرتگالیوں کے حفاظتی دستے نے کئی ہفتوں تک محاصرین کا مقابلہ کیا۔ جس سے گجراتیوں اور ترکوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ۶ نومبر کی صبح کو سلیمان پاشا نے بحر روم کی راہ لی۔ ترکوں کے چلے جانے کے بعد گجراتی فوجیں دیو کے گرد و نواح سے ہٹ گئیں۔ ۲۰ نومبر کو گارشیا نورے جہازوں کا بیڑہ لے کر دیو کی طرف چل دیا۔ آخر یہ بیڑہ طوفان کی نذر کرنے کے بعد جنوری ۱۵۳۹ء میں گارشیا دیو پہنچا۔ ترکی توپوں کی گولہ باری سے دیو کا قلعہ تباہ ہو چکا تھا۔ پرتگالی وائسرائے نے سب سے پہلے قلعہ کی مرمت کروا کر اسے پہلے سے زیادہ مضبوط بنا دیا گارشیا نے گجرات کے سلطان کے ساتھ صلح کی بات چیت شروع کی۔ چنانچہ ۱۱ مارچ ۱۵۳۹ء کو گجراتیوں اور پرتگالیوں میں معاہدہ ہو گیا۔ پرتگالیوں کا پلہ بھاری دیکھ کر کالی کٹ کے راجہ نے بھی پرتگالیوں کی تمام شرطیں مان لیں۔

کر ان سے صلح کرلی۔

گارشیا کی موت کے بعد واسکو دے گاما کا بیٹا استاداوٗ دے گاما (۱۵۴۰ - ۱۵۴۲) پرتگالی مقبوضات کا گورنر مقرر کیا گیا۔ استاداوٗ نے آتے ہی سویز پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پہلی جنوری ۱۵۴۱ء کو پرتگالی بیڑہ بحر احمر کی طرف چل دیا۔ ۲۲- اپریل کو پرتگالی جہاز سویز کے سامنے تھے۔ ہندوستان میں پرتگالیوں کے پہنچ جانے کے بعد سویز کی تجارتی حیثیت گھٹتی چلی جا رہی تھی۔ سویز تیس یا چالیس جھونپڑیوں کی ایک بستی رہ گئی تھی۔ سویز میں چونکہ ترکوں کا ایک جنگی بیڑہ موجود تھا۔ پرتگالیوں نے ترکوں سے لڑے بغیر اپنا رخ بدل لیا۔ پرتگالی بیڑہ ۸۔ اگست کو گوا پہنچ گیا۔ استاداوٗ کے جانشین مارتیم افانسو (۱۵۴۲ - ۱۵۴۵) نے جیا نگر کے ایک شہر کو لوٹ کر اپنے دوست کو دشمن بنا لیا۔ مارتیم نے پرتگالیوں کو لوٹ مار کی عام اجازت دے رکھی تھی یہی وجہ ہے۔ کہ اس کے جانشینوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

مارتیم افانسو کے بعد ژاوٗ دے کاسترو (۱۵۴۵-۱۵۴۸) کا عہد حکومت قابل ذکر ہے۔ ژاوٗ نے اپنے آپ کو دو مشکلوں میں گھرا ہوا پایا۔ بیجاپور کا سلطان ابراہیم عادل شاہ گوا پر چڑھائی کرنے کی تیاری کر رہا تھا اور گجرات کا سلطان دیو کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا۔ کہ مغربی ہندوستان کے تمام حکمران پرتگالیوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے متحدہ محاذ بنا رہے تھے۔ ان حالات کے باوجود ژاوٗ نے میر علی خاں کو سلطان بیجاپور کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بیجاپور کی فوج سالسٹ پر قبضہ کرنے کے لئے آگے بڑھی۔ لیکن پرتگالیوں نے اسے شکست دی۔

خواجہ خضر (پرتگالیوں کا کوجی مسافر) نے دیو کے پرتگالی قلعہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ پرتگالی سپاہیوں نے اپنے قلعہ کی حفاظت میں ایک مرتبہ پھر غیر معمولی بہادری کا ثبوت دیا۔ خواجہ خضر لڑائی ہی میں مارا گیا۔ اس کے مرنے پر رومی خاں نے پرتگالی قلعہ کے محاصرے کو جاری رکھا۔ ژاوٗ دے کاسترو نے گجراتیوں کو شکست دی۔ اب پرتگالیوں نے بکھے اور سورت کو لوٹا۔ ژاوٗ نے بیجاپور کو بھی شکست دی۔

اس زمانہ میں حکومت کے پرتگالی ملازموں نے ذاتی کاروبار سے روپیہ پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ ژاوٗ نے افسروں کی تنخواہیں مقرر کر کے انہیں ذاتی کاروبار کرنے سے روک دیا۔ مشہور ہے۔ کہ جب دیو کے قلعہ کی حفاظت کے لئے اسے روپے کی ضرورت پڑی۔ تو اس نے اپنی داڑھی کے بال گرو رکھ کر گوا میونسپلٹی سے قرض لیا تھا۔

ژاوٗ دے کاسترو کی موت کے تقریباً ۳۵ برس بعد پرتگال کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا۔ ہسپانیہ کے فلپ دوم نے پرتگال پر قبضہ کر لیا تھا۔ پرتگال کی سیاسی آزادی کے ختم ہو جانے پر بھی پرتگالی اپنی تجارتی فتوحات سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ ۱۵۹۵ء تک مشرق کی تجارت پر پرتگالیوں ہی کا قبضہ رہا۔ یورپ کی مختلف قومیں مشرقی اجناس کو اپنی اپنی ضرورت کے مطابق لزبن ہی سے خریدتی تھیں۔ لیکن بہت جلد ولندیزی سوداگر یہ مشرق

کی تجارت سے مالا مال ہونے کے لئے میدان میں نکل آئے۔

ژاؤ دے کاسترو کے بعد پرتگالی صرف دمن پر قبضہ کر سکے۔ سترہویں صدی کے شروع ہی میں ولندیزیوں اور انگریزوں نے پرتگالیوں کو ہندوستان کی کئی بندرگاہوں سے نکال دیا تھا۔ سترہویں صدی کے وسط تک ایشیائی تجارت پرتگالیوں کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

پرتگالی جتنی جلدی ابھرے تھے، اتنی جلدی گرے۔ پرتگالیوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب ہسپانیہ کے فلپ دوم کے عہد میں پرتگال اور ہسپانیہ کا الحاق ہے۔ جب ہسپانیہ ولندیزیوں اور انگریزوں سے لڑ رہا تھا تو اس وقت پرتگال کو بھی ان لڑائیوں میں حصہ لینا پڑا۔ پرتگال ایسے چھوٹے ملک کے لئے اپنے بیڑوں کے لئے سپاہی مہیا کرنا دشوار ہو گیا۔ چنانچہ جب ولندیزی اور انگریزی بیڑوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ تو پرتگالی ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ولندیزوں اور انگریزوں کے علاوہ مغل اعظم نے ۱۶۲۹ء میں ہگلی پر قبضہ کر کے ہندوستان میں پرتگالیوں کی بحری قوت پر بہت بڑی ضرب لگائی۔ سترہویں صدی کے شروع میں پرتگالیوں کا بحری اور تجارتی اقتدار مٹنا شروع ہوا۔ آج گوا، دمن اور دیو پرتگالیوں کی ان سرگرمیوں کی یاد ہیں جنہیں واسکوڈے گاما البوکرک اور ژاؤ دے کاسترو نے جاری کیا تھا۔

ہندوستان کی سمندری تجارت پر پرتگالیوں کا ایک سو سال تک قبضہ رہا۔ لیکن یہ کہنا کہ اس مدت میں پرتگالیوں نے ہندوستان میں کوئی سلطنت قائم کر لی تھی۔ سراسر غلط ہے۔ ہندوستان میں نہ تو ان کی کوئی سلطنت تھی۔ اور نہ انہیں ہندوستان کے مغربی ساحلوں کی حکومتوں کی سیاست میں زیادہ دخل ہو سکا۔ انہوں نے چند ایک ساحلی بستیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن ان کا اقتدار ان کے ساحلی بیڑوں سے چند میل آگے نہ بڑھ سکا۔ ان کے قبضے میں صرف گوا کا اہم علاقہ تھا۔ پرتگالی بڑی مشکل سے سو سال میں زمورن کی سمندری طاقت کو کمزور کر سکے۔ لیکن ٹھیک اس وقت ولندیزیوں نے انہیں بحرہ ہند کے پانیوں سے نکال دیا۔ ادھر ادھر واقع چند پرتگالی قلعوں کو پرتگال کی سلطنت نہیں کہا جا سکتا۔

پرتگالیوں نے اتنی مدت تک بحر ہند کی تجارت پر اس لئے قبضہ جمائے رکھا کہ عثمانی ترکوں نے مصر کو فتح کرنے کے بعد اپنی سمندری سرگرمیوں کو بحر ہند کی جگہ مغربی بحر روم میں جاری رکھا۔ اس اقدام کا یہ نتیجہ نکلا کہ ٹھیک اس وقت جب عثمانیوں کا امیر البحر بحرہ روم کو ترکی جھیل بنائے ہوئے تھا۔ پرتگالیوں نے بحرہ ہند میں اپنی قوت کو مضبوط کر لیا تھا۔ ایک دو مرتبہ عثمانی سلاطین نے بحرہ ہند کی طرف توجہ کی۔ لیکن وہ یورپ کو فتح کرنے میں اتنے مصروف تھے۔ کہ پرتگالیوں سے کئی گنا زیادہ اور طاقت ور بیڑہ رکھنے کے باوجود انہوں نے بحر ہند کی طرف توجہ نہ کی۔ عثمانی ترکوں کی اس غفلت نے پرتگالیوں کو سمندری اقتدار کا موقع دے دیا۔ ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ساحلی ریاستوں کے مقابلے پر تو یہ پورے اترتے تھے۔ لیکن جب انہیں ولندیزیوں اور انگریزوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ تو ان کی سمندری قوت کا طلسم ٹوٹ گیا۔

پرتگالیوں کو مشرق کی تجارت سے نکال دیا گیا۔ اور یہی وہ واقعہ ہے۔ جسے پرتگال کے بعض مورخ "ہندوستان میں پرتگالی سلطنت کا خاتمہ" قرار دیتے ہیں۔ ہندوستان میں پرتگال کی نہ کوئی سلطنت تھی۔ اور نہ کبھی کسی نے اس سلطنت کو مٹایا۔ پرتگالیوں اور مالابار میں ایک سو پچاس سال تک تعلقات رہے۔ پرتگالیوں کے ان تعلقات نے مالابار کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی پر "یقیناً" اثر کیا۔

جب پرتگالی مالابار کے ساحل پر پہنچے تھے۔ تو اس وقت مالابار کئی ایک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ مالابار کے حکمرانوں میں جو کنانور سے راس کماری تک پھیلے ہوئے تھے۔ کالی کٹ، کنانور اور ونادر کے راجے بہت زیادہ سیاسی اہمیت رکھتے تھے۔ ان تینوں میں سے کالی کٹ کے زیمورن (راجہ) کی ریاست سب سے بڑی تھی۔ زیمورن کی یہ کوشش تھی۔ کہ وہ سارے مالابار کو متحد کر کے ایک مرکزی بادشاہت قائم کرے۔ لیکن پرتگالیوں کے آنے سے زیمورن اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پرتگالیوں نے مالابار کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی مدد کر کے زیمورن کے سیاسی اقتدار کو بڑھنے سے روک دیا۔ پرتگالیوں نے چھوٹے چھوٹے ساحلی سرداروں کے اقتدار کو اس لئے بڑھایا کہ اس سے بڑے بڑے حکمرانوں کو نقصان پہنچایا جائے۔ ان چھوٹے چھوٹے سرداروں نے پرتگالیوں کی مدد سے بڑے بڑے حکمرانوں سے لڑائیاں مول لیں۔ چنانچہ پرتگالیوں نے ڈیڑھ سو سال کی مدت میں ساحلی سرداروں کو ساحلی راجاؤں میں بدل دیا۔ پرتگالیوں کے بنائے ہوئے یہ نئے حکمران پرتگالیوں کے تجارتی مفاد کے رکھوالے تھے راجاؤں کے اس نئے طبقے نے زیمورن کی شاہی قوت کو کمزور کر دیا۔ اور مالابار ایک مرتبہ پھر چھوٹے چھوٹے راجاؤں میں بٹ گیا۔

پرتگالیوں نے جہاں زیمورن کے سیاسی اقتدار کو بڑھنے سے روک دیا۔ وہاں ان کی تجارتی سرگرمیوں نے مالابار کی اکانومی پر خوشگوار اثر ڈالا۔ ہندوستان میں پرتگالیوں کے آنے سے پہلے عربوں اور موپلوں کے ذریعہ مالابار کی خام پیداوار یورپی ملکوں تک پہنچائی جاتی تھی۔ تاجروں کو چونکہ بہت لمبا سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے یہ اجناس یورپ کی منڈیوں میں سستے داموں فروخت نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن جب پرتگالیوں نے ان اجناس کو براہ راست یورپ کی منڈیوں تک پہنچانا شروع کر دیا۔ تو ان اجناس کی قیمتوں میں کمی آنے سے ان کی مانگ زیادہ ہوتی چلی گئی جہاں عربوں کو ان اجناس کی کاشت میں رسائی نہیں ہوتی تھی۔ وہاں پرتگالیوں نے اپنے قلعوں کی بدولت مقامی لوگوں کو ان اجناس کی زیادہ سے زیادہ کاشت پر زور دیا۔ زمین کے ہر اس ٹکڑے میں جہاں کھیتی باڑی ہو سکتی تھی۔ کالی مرچ اور ادرک کی کاشت ہونے لگی۔ ان دو اجناس کی بڑھتی ہوئی تجارت سے کاشتکاروں کو بھی فائدہ ہونے لگا۔

پرتگالیوں نے مالابار میں جس نئے درخت کی کاشت کی تھی۔ وہ آج بھی وہاں "فرنگی درخت" کہلاتا ہے۔ وہ مالابار میں تمباکو لائے۔ اور وہاں اس کی کاشت کروائی۔ انہوں نے ناریل کی کاشت میں بہت سی مفید تبدیلیاں کیں۔ پرتگالیوں کی کوششوں سے مالابار میں ناریل کی کاشت بہت بڑھ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ جب موپلوں

صدی کے شروع ہی میں انہیں پتہ چلا۔ کہ جہاز کے رسّوں کے لئے نارا بہت مفید ہے۔ تو اس سے مالابار میں ناریل کی کاشت وسادر کے لئے ہونے لگی۔ پرتگالیوں کے علاوہ دوسری یورپی قوموں کے جہازی بھی نارا کے رسّے استعمال کرنے لگے۔ آج بھی مالابار سے نارا کی بہت بڑی مقدار دساور کو جاتی ہے۔ مالابار میں ناریل کی کاشت کو بہتر بنانے کے لئے پرتگالیوں نے افریقی ناریل کے بیجوں کو مالابار کی زمین میں بویا۔ نارا کی بڑھتی ہوئی مانگ نے مالابار کے ساحلی علاقوں میں ناریل کے درختوں کو قطار اندر قطار کھڑا کر دیا۔

پرتگالیوں کی تجارتی سرگرمیوں نے جہاں مالابار کی سیاست اور اکانومی کو متاثر کیا۔ وہاں انہوں نے مالاباریوں کی مجلسی زندگی پر بھی اثر کیا۔ کوچین۔ کالی کٹ اور دوسرے شہروں میں یورپی طرز کے مکان بننے لگے مالابار کے راجاؤں نے یورپی طرز کے توپ خانے قائم کئے۔ کئی ایک نئے شہر آباد ہو گئے۔ کوچین کی ساری رونق پرتگالیوں کے دم سے قائم ہوئی۔ انہوں نے وہاں سکول اور کالج قائم کئے۔ ان کالجوں میں لاطینی اور پرتگالی پڑھائی جاتی تھی کوچین کے راجے پرتگالی میں نہ صرف بات چیت کر سکتے تھے۔ بلکہ وہ اس زبان میں مراسلت بھی کرتے تھے کالی کٹ میں جب انگریزوں نے تجارتی کوٹھی بنائی۔ تو اس وقت زمورن اور انگریزی فیکٹری کے افسر میں پرتگالی ہی میں مراسلت ہوتی۔ پرتگالیوں نے بھی اپنی سیاسی اور تجارتی ضرورتوں کے لئے ملیالم سیکھی۔ ملیالم اور پرتگالی دونوں میں ایک دوسرے کے بہت سے لفظ گھل مل گئے۔ کالی کٹ اور کوچین سے بہت دور دلّی اور لاہور کے بازاروں میں آج بھی پرتگالی کے چند الفاظ بولے جاتے ہیں۔ الماری، کمرہ، بالٹی، بوتل، پیپا، چابی، گرجا اور گودام کے الفاظ منہ سے نکالتے وقت کس کے ذہن میں آسکتا ہے۔ کہ یہ لفظ پرتگال سے آئے ہوں گے۔ جس زمانہ میں بحر ہند کی تجارت پر پرتگالیوں کا قبضہ تھا۔ اسی زمانہ میں شمالی ہندوستان میں ایک نئی سلطنت قائم ہو رہی تھی۔ پرتگالیوں مالاباریوں اور گجراتیوں سے رخصت ہو کہ اب ہم مغلوں کی سلطنت میں داخل ہوتے ہیں۔

جس دن ایک زبردست سیاسی لیڈر اور ایک سفاک انقلابی لیڈر

دونوں کو جلاوطن کرنے کے لئے جہاز پہ بٹھلایا گیا۔ تو اُس دن باہمی گفتگو

سے انہیں پتہ چلا۔ کہ ان دونوں کے اصول دراصل ایک ہی ہیں۔

(ایک فرانسیسی خطیب)

پال رچرڈ

وطن پرست

سب سے افضل "ماں" اپنا وطن ہے۔ لیکن کون چاہتا ہے کہ اس کی ماں وحشی، ظالم اور چور ہو؟

اس کے باوجود ہر ملک میں ایسے وطن پرست موجود ہیں جو کبھی اس قدر مغرور نہیں ہوتے جب تک اُن کی ماں دوسروں کے وطن و دولت پر قبضہ نہ جما لے اور بعض کمزور اور کم مسلح قوموں کو مارے پیٹے یا قتل نہ کرے اور بستی آبادیوں کو غلام نہ بنا دے۔ اُس وقت وطن پرستوں کی گردن تنی ہوئی دکھائی دیتی ہے جب ان کی ماں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے کہ اگر ان کے بیٹے اس کے مرتکب ہوتے تو شرم سے ڈوب مرتے ——

یہ وطن پرستی کی شان نہیں ہے۔ وطن پرستی ملک کو شکاری کتے کی طرح مسلسل شکار کرنے اور مارنے پر اکساتے رہنا ہی نہیں ہے۔ اور نہ ہی اُس وقت تھپکے لگاتا ہے جبکہ اُن کی ماں جبڑوں میں کوئی نیا شکار لیکر تعاقب سے واپس لوٹے۔

سچے وطن پرست وہ ہیں جو ان حرکتوں پر پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں جن پر دوسرے ناز کرتے ہیں۔ جو مادر وطن کے رویے کا اُس وقت تک ماتم کرتے ہیں جب وہ بُرے طریقے سے حاصل کئے گئے فائدوں سے اپنے آپ کو مالا مال کرتی ہے۔ کیونکہ ان کی نگاہوں میں وہ اس وقت بلند نہیں بلکہ حقیر تر، حقیقی حسن و دولت سے محروم اور اپنی اخلاقی بیسوائی کے چیتھڑے پہنے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔

تمام ملکوں میں وہ سچے وطن پرست کہاں ہیں جو اپنی مادر وطن سے محبت کرتے ہیں اور اسے دیانت دار اور بے عیب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسے کسی گرا دینے والی حرکت کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اور نہ اس کا چہرہ خون اور کیچڑ سے لتھڑا ہوا دیکھنا گوارا کر سکتے ہیں۔

مترجمہ۔ شریف کنجاہی

ظہیر کاشمیری

ادب کا مادّی نظریہ

وہ احکام' اور 'پہاڑی کے وعظ' سے لیکر سینٹ اوگسٹائن کی کتاب 'شہرِ الٰہی' تک معاشرہ پر جو کچھ بھی لکھا گیا۔ وہ مابعد الطبیعاتی، اخلاقی، اور الہیاتی نکتۂ نظر سے تھا۔ اُن ادوار میں یہ اندازِ فکر اتنا ناگزیر تھا کہ افلاطون اور ارسطو ایسے مفکرین بھی معاشرہ کی شافی تشریح میں اُلجھ کر رہ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ اپنے اوائل میں معاشرہ کے اُن مادی یا نظری اصولوں کو نہ سمجھ سکی جو معاشرہ کے لئے بنیاد کا حکم رکھتے تھے۔ انسان کی یہ فکری مجبوری ادب پر بھی اثر انداز ہوئی۔ چنانچہ بعض اذہان نے اسے معاشرہ کی ضمنی پیداوار سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیا۔ اور جو مفکرین اس پہ سنجیدگی سے غور کر سکے انہوں نے بھی اسے قائم بالوجود سمجھ لیا۔ اُن کی نظر میں ادبی تحریکوں کا معاشرہ کے مادی یا خارجی رجحانات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سوچ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ادب کو زندگی سے علیحدہ کر کے دیکھا جانے لگا۔ ایک ایسے شعبے کی حیثیت سے جو عالمِ علوی سے تعلق رکھتا ہو اور جس کا انسانی زندگی سے تعلق ہی نہ ہو۔

آخر جب عہدِ وسطیٰ ختم ہونے لگا۔ اور انسانی معاشرہ میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں تو مفکرین کا زاویۂ نظر بھی بدلا، اب معاشرہ کوئی ناقابلِ تشریح عمل نہ تھا بلکہ ایک منضبط نظامِ کار تھا۔ جو صدہا کائناتی اصولوں سے بندھا ہوا ہو۔ اور علیٰ ہذا القیاس ادب ایک ایسا شعبہ تھا۔ جو انسانی زندگی سے براہِ راست متعلق ہو۔ اور اس کی گوناگوں تبدیلیوں کے ساتھ خود بھی بدلتا رہتا ہو۔ چنانچہ معاشرہ کے سب سے پہلے جدید مفکر گیباٹسٹا نے (Scienza Nuova) میں اعلان کیا کہ ہومر کی نظمیں جہاں یونان کی قدیم رسموں اور معاشرتی تحریکوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ وہاں وہ اُن فطری تمایلات کی بھی ترجمان ہیں جو اس وقت کے یونانی باشندوں پر اثر پذیر رہے تھے —

نکتۂ نظر کی یہ تبدیلی اُس فلسفیانہ مسئلہ کے حل سے وجود میں آئی۔ جسے خارجیت اور داخلیت کا مسئلہ کہتے ہیں۔ قدیم مفکرین ضمیر کل اور فوق الشعور ایسی اصطلاحیں رواج دے کر یہ ثابت کر رہے تھے کہ انسانی ذہن خارجیت کا ہی مرہون نہیں۔ بلکہ اُس کے کچھ عنصر جو کلیتہً داخلی ہیں۔ مادی تجربات سے پہلے ہی موجود ہوتے ہیں۔ اُدھر عہد وسطیٰ نے دم توڑا اور ادھر دماغ کا یہ تصور دھیرے دھیرے مفقود ہونے لگا۔ اب مفکرین اس نتیجہ کے قائل ہونے لگے کہ دماغ کوئی مافوق الحس شے نہیں۔ یہ آلۂ خیال ہے اور اس کی ہر داخلی حالت خارجی ماحول کا ہی عکس ہوتی ہے۔ لاک نے یہاں تک کہہ دیا کہ ”نومولود بچے کا دماغ خالی تختی کی مانند ہوتا ہے جس پر تجربے تحریر ہوتے ہیں“۔ —— دماغ کا یہ شیئت پسندانہ تصور انگلستان سے ہوتا ہوا فرانس پہنچا اور آخر انیسویں صدی میں جرمن مفکروں نے اسے اتنا مستند بنا دیا کہ ہزارہا سال کے ترقی یافتہ مثالی نظریے جنہیں ہیگل نے انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ ہمیشہ کے لئے شکست کھا گئے۔

انسان، جسمِ نامی ہے۔ جس پر خارجی مہیجات، حسی آلات کے ذریعے اپنا عمل کرتے رہتے ہیں۔ انسانی جسم اس کا ردِ عمل کی صورت میں جواب دیتا ہے۔ اور اس طرح عمل اور ردِ عمل کا یہ باہمی سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا —— اس مسلسل تحریک کے کارن تصورات، خیالات اور نظریے وجود میں آتے ہیں۔ جو دوسرے لفظوں میں خارجی حالات کے داخلی نقوش ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ذہن کا وہ حصہ، جسے نفسیات کی اصطلاح میں ”وراثت“ کہا جاتا ہے۔ انسان کے ”قبل ولادت حالات“ کے تاثر کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ——

—— اس اعتبار سے ادب کوئی مافوق الادراک شے نہیں رہتا۔ ذہین ناقد جو ادب کے ذہنی عمل پر عبور رکھتا ہو، کسی مصنف کی تصنیف سے اُس کی ذہنی کشمکش، اُس کے خارجی حالات اور اُس کی اکتسابی صلاحیتوں کا پوری طرح اندازہ لگا سکتا ہے۔ کسی زمانے میں شعر آسمان سے نازل ہوتے تھے اور شاعر ملہم کہلاتا تھا۔ لیکن آج ایسا نہیں۔ ادب دیگر فنون کی طرح ایک فن ہے۔ ہر موزوں طبیعت اُس کا اکتساب کر سکتی ہے۔ اور ہر ادبی تخلیق اتنی ہی اچھی ہوتی ہے جتنی اُس پر محنت کی جائے۔ اسی مسلم حقیقت کی بنا پر ٹین نے ادب پر بحث کرتے ہوئے نظریۂ عکس کو رواج دیا تھا۔

اگر دماغ خارجی ماحول کا پابند ہے۔ تو اُس کی گوناگوں تبدیلیاں بھی گرد و پیش کے تغیرات سے بندھی ہوں گی۔ اور واقعی بات بھی یہی ہے۔ ذہنی ارتقا در اصل ...

کائناتی تحریک کے تأثر کا نام ہے جو ہر نئے عہد میں نئی قدروں کو پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے —— ابنِ آدم نے تہذیب کے اوائل میں کائنات کو ساکن تصور کیا اور ہر شے میں ابدیت تلاش کرنا شروع کر دی۔

ہیرکلیٹس نے سب سے پہلے کائنات کے اس سکونی تصور کے خلاف نظریۂ تغیر پر روشنی ڈالی۔ اُس نے کہا کہ موجودات کی ہر شے لحظہ بہ لحظہ بدل رہی ہے۔ تغیر اصلِ کائنات ہے اور کائنات کی کوئی حالت بھی مستقل نہیں۔

ہر شے اتحادِ اضداد سے وجود میں آتی ہے۔ اور اضداد اپنے اتحاد کے باوجود ایک دوسرے پر اپنا عمل کرتی رہتی ہیں۔ اس بنیادی نزاع کے کارن ہر شے ہمیشہ ایک تحلیلی اور ترکیبی عمل سے گذرتی رہتی ہے۔ دماغ بیرونیات کا پابند ہے۔ چنانچہ اُس کا بھی اس کلیے کے کارن بدلتے رہنا ایک قدرتی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ادبی تاریخ ہر زمانے میں نئے بھیس بدلتی رہی ہے۔ جو ادب کل تھا وہ آج نہیں۔ جو آج ہے وہ کل نہیں ہو گا۔ چنانچہ موجودہ ادب کو پرانے معیارِ تنقید سے پرکھنا یا پرانے ادب کو موجودہ معیارِ تنقید سے جانچنا غلط ہے۔ ادب ٹھہراؤ کا نہیں رفتار کا نام ہے۔ اور اسی اعتبار سے اس کی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔

ہر شے اتحادِ اضداد سے وجود میں آتی ہے۔ بعض ضدیں شے متعلقہ کا اثبات چاہتی ہیں۔ اور مثبت ضدیں کہلاتی ہیں۔ لیکن بعض ضدیں شے متعلقہ پر تخریبی عمل کرنے کے باعث منفی قدروں کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔ مُثبت اور منفی قدروں کی مسلسل چپقلش ہر شے میں مقداری تبدیلی پیدا کرتی رہتی ہے۔ لیکن جب منفی قدریں پوری طرح غالب آ جائیں۔ تو شے متعلقہ کی ماہیت بدل جاتی ہے۔ اور یہ ہوتا ہے ماہیتی تبدیلی کا مرحلہ ——

انسانی دماغ بھی اسی انداز سے شعور حاصل کرتا ہے۔ پہلے وہ مقداری تبدیلیوں کے دَور سے گزرتا ہے اور پھر ماہیتی تبدیلیوں کے دور سے —— ایک ہی نظامِ کار کا ادب روایتی اعتبار سے بظاہر ایک اکائی معلوم ہو گا۔ لیکن بغور دیکھنے سے اس میں مقداری کمی بیشی ضرور نظر آئے گی —— مقداری تبدیلی کے بعد ماہیتی تبدیلی کا عہد ادب میں اُس وقت آتا ہے۔ جب معاشرہ اصلاح اور ریفارم کے عہد سے گزر کر انقلاب کی طرف جا رہا ہو۔ اور جب نئے اداروں کے [illegible] نئے ماحول [illegible] وجود میں آ رہے ہوں۔ ادب کی ماہیتی تبدیلی نئی روایتوں کو [illegible] کرتی ہے ——

فارم میں نئے تجربے کئے جاتے ہیں۔ اور مصنفین کا اندازِ فکر بالکل بدل جاتا ہے —— اسی طرح کسی ملک کے ادب میں اگر دفعتاً انقلابی تبدیلیاں رُونما ہو جائیں تو قاری کو بخوبی اندازہ لگا لینا چاہیئے کہ متعلقہ ملک معاشرتی طور پر ماہیتی تبدیلی کے مرحلے سے گزرا ہے۔

ہر شے اَن گنت ماہیتی تبدیلیوں سے گذر رہی ہے اور گزرتی رہے گی۔ جو منفی نفیں ایک ماہیت پیدا کرتی ہیں۔ وہ اضدادی جنگ کے عمومی کلیے کے کارن آخر خود فنا ہو جاتی ہیں۔ اور نئی ماہیت جنم لیتی ہے۔ اسی طرح دماغ بھی کسی ایک ماہیتی تبدیلی کے مقام پر نہیں ٹھہر سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ادب نے کسی ایک ماہیت کو ہمیشہ کے لئے کبھی نہیں اپنایا۔ معاشرہ کی ہر ماہیتی تبدیلی ادب کو اپنے ساتھ بدلتی رہی اور بدلتی رہے گی۔ سرمایہ دارانہ عہد ہومر کی شاعری کے مانیہ کے لئے گوارا نہیں۔ اور غلامی دَور میں رڈیارڈ کپلنگ کی پیدائش غیر منطقی بن رہی ہے۔

مادے کا مشینی تصوّر پیش کرنے والے مفکروں نے ارسطو کے علت و معلول کے کلیے کی تشریح کرتے ہوئے انسان کو ایک بے جان کل سمجھ لیا۔ اُن کے نزدیک انسان خارجی تغیرات کے ساتھ اس طرح بندھا ہوا تھا کہ اُس کا گردو پیش کے متعلق ہر فعل ایک مشینی فعل تھا۔ دراصل انسان کو اس قدر مجبور ثابت کرنے والوں نے دماغ کی چند اہم صلاحیتوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ حسّی آلات کے ذریعے حاصل کردہ خام مواد کو ترتیب دینے کے علاوہ اور خارجی تغیرات سے تاثر حاصل کرنے کے علاوہ انسانی دماغ میں خارجی حالات کو (بذریعہ ردِ عمل) تبدیل کرنے کی زبردست صلاحیت موجود ہے۔ دماغ کا یہ فعل کوئی ارتجالی فعل نہیں بلکہ یہ ہمیشہ کسی عقلی یا غیر عقلی سکیم کے ماتحت ہوتا ہے۔ انسان کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ موجودہ حالات سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ بلکہ اُسے مثالی نظر سے دیکھ کر اس میں تبدیلیاں کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

حیاتیاتی ارتقاء پسندوں کے امام ہربرٹ سپنسر نے مسئلہ اخلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ؎ —— وہ فعل اخلاقی ہے۔ جو انسان کے داخلی حالات کو خارجی حالات پر منطبق کرنے میں مدد دے؛ معترضوں نے اخلاقی فعل کی اس تعریف پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ہربرٹ سپنسر نے گھوڑے کو تانگے کے آگے جوتنے کے بجائے تانگے کو گھوڑے کے آگے جوت دیا ہے۔ انسان کی برتری اس بات میں نہیں کہ وہ اپنے آپ کو خارجی حالات کے مطابق بناتا پھرے۔ بلکہ اُس کی عظمت اس میں ہے کہ وہ خارجی حالات کو اپنے نصب العین کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔

ادب بھی محض خشک شیئت پسندی کا نام نہیں۔ جب تک اس میں مثالی عنصر شامل نہ ہو، اسے ادب عالیہ نہیں کہا جا سکتا۔ مثالی عنصر کے بغیر ادب گرد و پیش کی چند تصویریں تو مرتب کر دے گا۔ لیکن اُس فکری ارتقاء کو پیدا نہ کر سکے گا۔ جو ہر عہد کے ادب کی جان ہے۔ فرسودہ اداروں کو توڑنے کے ذہنی نقشے، نئی سماج کو تعمیر کرنے کے خاکے، یہ سب چیزیں ادبی مثالیت ہی کی پیدا کردہ ہیں۔ مثالیت کے بغیر ادب تخریب کی یا تہذیبی ٹھہراؤ کی باتیں تو کر سکتا ہے۔ لیکن معاشرہ کے لئے مثبت طاقت نہیں بن سکتا۔ افلاطون نے شاید ادب کے اس حصے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ورنہ اس کی ریاست سے ادیب کبھی خارج نہ ہونے پاتے۔

ایک مادہ پرست ادیب بھی ادب کے مثالی عنصر سے گریز نہیں کر سکتا۔ لیکن اُس کی مثالیت عمل سے بہت قریب ہوگی۔ وہ جاگیری عہد کی ادبی بجھارتوں سے نہیں اُلجھے گا۔ بلکہ اُس دَور کی باتیں کریگا۔ جو ممکن الحصول ہو۔ پہلی عالمگیر جنگ سے پہلے اشتراکی عہد کے متعلق جتنا ادب بھی پیدا ہوا۔ اُسے مثالی ہی کہا جائیگا۔ لیکن اُس مثالیت کی بنیاد وجدان یا الہام نہیں تھا۔ بلکہ وہ مادی اصول تھے۔ جو ہمیشہ سے کائناتی ارتقاء کا باعث بنے رہے۔ ولیم بلیک یا شیلی بائرن کی صوفیت اور عوامی عہد کے ادیبوں کی مثالیت میں بین فرق نظر آتا ہے۔ مقدم الذکر عقل کے مقام سے گذر کر شعر کہتے ہیں اور موخر الذکر ایسے مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں جو فکری اعتبار سے قابلِ تشریح ہو —— مادہ پرست ادیب کی مثالیت میں تجزیاتی عنصر زیادہ ہوتا ہے اور غیر مادہ پرست ادیب کی مثالیت تکمیلی عنصر سے بھرپور ہوتی ہے۔

دماغ اگر خارجیت کا عکس ہے۔ اور اس کی ہر تبدیلی کے ساتھ بدل جاتا ہے تو ایک عہد کے ادیبوں کو ایک ہی طریق پر فکر کرنا چاہیئے۔ اور ان کے ادب کا قافیہ بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ دماغ اور گرد و پیش کی رفتار متوازی نہیں ہوتی۔ خارجی ماحول تبدیل ہوتے ہی بہت تیزی سے بڑھ پھیل جاتا ہے اور انسانی دماغ جو اس تبدیلی کا باعث ہوتا ہے اپنی سست رفتاری کے سبب پیچھے رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج جہاں عوامی ادب کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے۔ وہاں سامنتی اور سامراجی عہد کے ادیب بھی بکثرت مل جاتے ہیں اور —— دوسرا جواب یہ ہے کہ ہر شخص کا ذاتی کردار (تعلیم مزاج اور اقتصادی دائرہ) اُس کے ذہن کو منفرد حیثیت کا حامل بنا دیتا ہے۔ اس اصول کی وجہ سے ایک ہی ماحول اور ایک ہی زمانے میں رہتے ہوئے مختلف

کنھیا لعل کپور

فکر کی شاعری

شیکسپیئر کے ڈرامے MIDSUMMER NIGHT DREAM میں ایک ملکوتی کردار "پک" ہے۔ جو فضا میں پرواز کرتے ہوئے بنی آدم پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتا ہے۔ اور شرارت اور طنز کے ملے جلے جذبات سے چیخ کر کہتا ہے۔

"یا خدا! انسان کتنا بیوقوف ہے!"

مجھے فکر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ "جھولے" کا شاعر "پک" سے بڑی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ تخیل کی بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے بار بار چلا اٹھتا ہے۔

"اے آدم وحوا کے فرزندو! تم کتنے عجیب ہو!!"

طامس ہارڈی اپنی ایک خیال انگیز نظم "چاند سے خطاب" میں کہتا ہے۔ "اے چاند! تو روزِ ازل سے یہ "بے معنی تماشا" دیکھ رہا ہے۔ جسے کئی لوگ دنیا بھی کہتے ہیں۔ لیکن کیا تو خدا کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ اس عالمِ ہست و بود کو جلد تر غرقِ آب کر دے!"

فکر اپنی نظم "مشورہ" میں اسی خیال کو نہایت گستاخی اور بیباکی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے ..... رب العالمین سے خطاب کرتا ہے۔ کہ

بڑی گستاخی ہے کہہ دوں گا میں رب عالم
تری بیکار تمنا کا نشانہ ہیں ہم!

اسی نظم میں وہ خدا سے ایک اور سوال بھی کرتا ہے۔ کہ اس زندگی کا جو بقول غالب دیوانے کا خواب ہے۔ مفہوم کیا ہے۔

تجھ سے الجھوں گا کہ اس رقص کا مفہوم ہے کیا
تجھ سے پوچھوں گا کہ یہ نغمۂ موہوم ہے کیا

طامس ہارڈی نے اپنے ایک ناول میں یہ پیشین گوئی کی تھی۔ کہ زمانۂ مستقبل کا پختہ فکر انسان جب اپنے

گردوپیش پر نظر ڈالے گا۔ تو مسکرانا بھول جائیگا .... فکرِ زمانۂ مستقبل کا ہی شاعر ہے۔ اور جب انسان کی حقیقتوں سے دیوتاؤں کی بوالعجبیوں کا جائزہ لیتا ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ کافور ہو جاتی ہے اور کلیجہ سے ہوک اٹھتی ہے وہ مسکرانا بھول جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک قہقہۂ استہزا بلند کر سکے۔ اس کی شاعری ایک مسلسل صدائے احتجاج ہے۔ ایک دردناک آواز جس کی درماندگی پر رحیل کا رہرو ان کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ وہ انسانوں اور دیوتاؤں کے مظالم کا شکوہ سنج ہے۔ اس کی نگاہ میں ان دونوں عناصر نے مل کر زمین کے تاریک سیارے کو ظلم و استبداد کی آماجگاہ بنادیا ہے۔

وہ خدا کو، اس قوتِ اعلیٰ کو "بازیگرِ کونین" کے عجیب و غریب لقب سے یاد کرتا ہے۔ وہ بازیگرِ کونین، جو ضعیف الاعتقاد اور فریب خوردہ مخلوق کا مذاق اڑا کر لطف اندوز ہوتا ہے "جاؤ، کہہ دو" میں وہ اس قوتِ اعلیٰ پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اور وہ بازیگرِ کونین جسے تاب نہیں
کسی مضراب کی طوفان کی تخلیق کرے
اک نئے ساز سے بہلائیگا پھر محفل کو!
ساز کی اوٹ میں دبکے ہوئے نغموں سے کہو ــــــ جاؤ، کہہ دو!

وہ صرف خدا ہی کو نہیں۔ بلکہ اپنے گردوپیش کے انسانوں کو بھی معاف نہیں کرتا۔ کیونکہ انسان بھی جو مذہب اور انصاف کی آڑ میں گناہ اور جرائم کا کھیل کھیلتا ہے۔ ناقابلِ عفو الزام کا ذمہ دار ہے۔ اپنی ایک نظم "ایک کہانی" میں وہ مشہور ہندو قانون ساز "منو" کی شعبدہ بازی کو بے نقاب کرتا ہے۔ جس نے انسانی چاند کے چار ٹکڑے کر کے سماج کی اشتراکی قدروں کو صدیوں تک کے لئے مفلوج کر دیا۔ تیز، تلخ اور طنزیہ انداز میں "منو" کو سلام کرنے کے بعد وہ نئی سماج اور نئے نظریوں کی جھلکیاں دکھلاتا ہے۔ اور "منو" کے پردے میں "منوازم" کے موجودہ نمائندوں کو چیلنج کرتا ہے۔ کہ

منو مہاراج! تری روحِ معظم کو سلام
شعبدہ باز! ترے سحرِ منظم کو سلام
تیرے ادراک کے ہر پیچ کو، ہر خم کو سلام
تیری اس تفرقہ پردازیٔ آدم کو سلام
لیکن اب دیکھ رہا ہے اک نیا نقشہ منو
اب تو ہم تیرے اصول، تیرے عملوں کے صنم
ڈھا دیا چاند کی اس وحدتِ فردیں کی قسم
توڑ ہی ڈالیں گے اب اور نہیں رہ سکتے

فکر کی نئی عظمت اس وقت مقام ارتقا پر دکھائی دیتی ہے جب وہ موجودہ مادی تہذیب کے اس پہلو پر تازیانے لگاتا ہے جس پر دورِ حاضر کی گردن فرطِ غرور سے تن جاتی ہے ...... فکر موجودہ تمدن کی پستی کا جنون آمیز اور خونی رقص دیکھ دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہے۔ اور پھر نہایت یاسیت کے عالم میں یہ چاہتا ہے۔ کہ موجودہ تہذیب اس ماضی کی طرف لوٹ جائے۔ جبکہ تہذیب جدید کی منزل تک نہ پہنچنے کے باوجود، تہذیبی عناصر پائے جاتے تھے۔ "مراجعت" میں وہ رات کے وقت چلانے والے شیر خوار بچے کی طرح کہہ اٹھتا ہے

اے سائنسدانو! اے آتش و آہن کے خداؤ

کچھ بھی ہو، لاؤ، کوئی شعلہ، کوئی دیپک

اس کہرے کی میلی ہوئی آنکھوں میں جلاؤ

ورنہ مجھے لے جاؤ اپنی خوابگاہوں میں

تھیں دل سے ہم آہنگ جہاں وقت کی سانسیں

فکر کی شاعری خیالات کی قوت اور انفرادیت سے معمور ہے۔ بغیر کسی الجھاؤ کے ہم اسے دماغ کی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ دل کی نہیں۔ یہ ایسی شاعری نہیں جو پڑھتے ہی دل میں اتر جاتی ہے۔ اس لئے یقیناً ان حلقوں کو مایوس کرے گی۔ جو فن اور دماغ کے رشتے سے محروم ہیں۔ فکر کی شاعری ایک مخصوص طبقے کے ذہن کو مانوس دکھائی دے گی۔ وہ عامہ ذہانت اور سطحی ادراک کا مالک نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ذہن چند مخصوص عناصر کا مرکب ہے۔ وہ عوامی اور جماعتی جذباتیت کو متاثر نہیں کرتا۔ اور مجھے ذرہ بھر تعجب نہیں ہوگا۔ کہ وہ اپنی موت کے بعد اس وقت شہرت کے معراج پر پہنچے۔ جب کہ دنیا اسے آدھا بھلا چکی ہو۔ وہ روایات سے ہٹ کر باتیں کرتا ہے۔ اس کے خیالات اس قدر دقیق ہیں۔ اور وہ مسائل حیات کے اس قدر غیر معمولی اور تحیر خیز حل پیش کرتا ہے۔ جو عوام کی پسندیدگی کی ذیل میں نہیں آتے۔ اور جنہیں عوام کے دل و دماغ قبول نے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس کی تشبیہیں استعارے اور تراکیب اچھوتی انفرادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ ایسے محاورے، جملے اور الفاظ تخلیق کرتا ہے۔ جو خاص اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ اور اس قدر طبعزاد ہوتے ہیں۔ کہ قارئین انہیں تعجب کے ساتھ پسند کرنے لگتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک عام قاری کے فہم سے بالا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ اس کا ہر مصرع انفرادی معانی سے معمور ہوتا ہے۔ نظریوں کی یہ انفرادیت ایک سطحی ذہن کی سمجھ سے تو باہر ہوتی ہے۔ ایسا سطحی ذہن گہرائیوں سے دور بھاگتا ہے۔ لیکن جب ذہین قاری اسے پڑھتا ہے تو اس کی شاعری میں چند نرم و نازک احساسات کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ وہ احساسات جو زندگی کی حدوں میں کبھی کبھار میسر آتے ہیں۔ اور ایک گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

جو قاری مطالعہ نے فکر کی پہلو کے خوگر ہیں۔ ان کو فکر کی شاعری میں ایک خوفناک یاسیت ہویدا ہے۔

کسی قنوطیت کا احساس ہوگا۔ کیونکہ وہ بسا اوقات اتنا قنوطی ہو جاتا ہے۔ کہ مشہور فلاسفر دیجانس شوپن ہار اور ٹامس ہارڈی سے دوسرے درجے پر دکھائی دیتا ہے۔۔۔۔ لیکن وہ قاری جو مفکرانہ آسٹک کے دلدادہ ہیں۔ اس مجموعے میں کئی صالح، صحت مند اور رجائی نظمیں بھی انتخاب کر لیں گے۔ اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ وہ اکثر عالم نا امیدی میں پکار اٹھتا ہے۔

اور میں — مانوس غمگینی میں بل کھاتا ہوا
اور میں — ناکام سپاہ دل سے شرماتا ہوا
وقت کے جادو بھرے جھولے میں لہراتا ہوا
آزمودہ کشمکش کے گیت دہراتا ہوا
دیکھتا ہوں خود کو غم خانے میں پھر آتا ہوا
اپنا غم خانہ — جو رنگ اپنا بدلتا ہی نہیں
اس گہن کے پیچ سے سورج نکلتا ہی نہیں

لیکن یہ اس کے ذہن کی ایک عبوری فضا ہے۔ اور وہ اس فضا میں سے جلدی گزر جاتا ہے۔ بلکہ اس کی کئی ایک نظمیں ایسی بھی ہیں۔ جو نشاطیہ اور طربیہ کیفیت کی حامل ہیں۔ ان نظموں کا وجود میں آنا اس امر کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔ کہ "اگر انسان صدق دل سے چاہے۔ تو اپنے گرد جکڑی ہوئی سالہا سال کی زنجیروں سے رہائی حاصل کر سکتا ہے۔" بلادے این دہ انسان کو اسی نوعیت کا زندگی بخش اذن دیتا ہے۔ کہ وہ ایک مشترکہ محاذ بنا کر اس کائنات کو اپنی آرزؤں کے قالب میں ڈھال سکتے ہیں۔

آؤ کہ ہم ہیں نجم و مہ و مہر سے بلند
ٹھہری ہوئی حیات کو زیر و زبر کریں
اس برف زار پر بھی کوئی آتشیں کمند
کوندا بنا ہوا ہے دماغوں کا پھول پھل
شعلوں پہ کھلتا جاتا ہے ذہنوں کا بند بند

نثر کی شاعری کا ایک اور اہم پہلو بھی قابل ذکر ہے۔ کہ وہ واحد شاعر ہے۔ جس نے ہندو دیومالا کو جدید حیران کن اور منفرد زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہندو دیومالا سے اس کا یہ سلوک بیت کر انفرادی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ "شکنتلا"۔ "برہمچاری" اور "ایک کہانی" میرا جی اس دھرتی کے بہترین نمونے ہیں۔ "شکنتلا" میں وہ شکنتلا کے حق میں مرد سماج کی جابرانہ اور بدنہاد نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ "برہمچاری" میں وہ جنسی ہیجانات کو دبا کر [illegible] نفس کشی کرنے والے مذہبی اختیار مندوں کو چیلنج کرتا ہے۔ اور "ایک کہانی" میں وہ اپنے مذہبی اعتبارات کے حربوں سے قانون سازوں اور محتسبوں کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے

ہر عظیم فن کار کی طرح فکر بھی ایک صاحب اسلوب شاعر ہے۔ اس کا طرز اظہار منفرد ہے۔ اور ایک خاص قسم کا جذب لئے ہوتا ہے۔ اس کے انتخاب لفظی اور مصرعوں کی ساخت میں ایک یگانگت ہے۔ مثلاً اس کا یہ مصرع

جیسے کسی چھیڑی ہوئی ناگن کا تناؤ

وہ اپنے اسلوب بیان میں، الفاظ کی جدت اور تازگی میں، نئی تراکیب میں، تشبیہوں کی ندرت میں، بے مثال چابکدستی رکھتا ہے اور جس کی مثالیں اس کی نظموں میں عام ملتی ہیں۔ مثلاً

"آتش و آہن کے نداؤ"۔ "سیلی ہوئی آنکھیں"۔ "کہرا جو اجالا نہیں جاتا"۔ "دھول میں کفنایا ہوا"۔ "رنگ غم خانہ"۔ "الجھی حیات"۔ "بازیگر کونین"۔ "پاکیازان عرش"۔ "ممنوعہ مسرت"۔ "دوشیزہ تمنائیں"۔ "مرمریں سائے"۔ "زرپوش عبادت گاہیں"۔ "نغمہ گر شعر و شراب"۔ وغیرہم۔

اسے الفاظ کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ جہاں بھی لغوی الفاظ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہاں وہ اپنے الفاظ ڈھال لیتا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ روایتی الفاظ اور فرسودہ تراکیب اس کے انوکھے خیالات کو ادا کرنے میں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ اور جب اس کے انوکھے خیالات کے راستے میں روایاتی اور گھسے پٹے محاورات اور تشبیہات مزاحم ہوتے ہیں۔ تو وہ اپنے نظریوں کی دیانت اور خیالات کی سچائی ثابت کرنے کے لئے ان الفاظ سے بے نیازی اختیار کر لیتا ہے۔ اور ایک منفرد اور صاحب طرز فن کار کی طرح اپنے الفاظ کی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے۔

میرے خیال میں فکر اس قسم کا شاعر ہے۔ جو ایک نئی اور اچھوتی بات کہنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس نے ایک نیا اور اچھوتا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اور یہ اس کی فنی دیانت کی دلیل ہے۔ اگرچہ اس نے اپنی بات کے اظہار کے لئے "صنعت شعر" کو منتخب کیا ہے۔ جو ایک پرانی چیز ہے۔ لیکن وہ اس میں بھی رسمیات کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے۔ اور اس طرح ایک نیا جادو، ایک نئی موسیقی، ایک نیا راگ اور ایک نئی شوکت سے دنیائے شاعری کو مالا مال کر دیتا ہے

جابرانہ قوانین

قدرت نے کسی کو چھوٹا یا بڑا نہیں بنایا۔ کمتری اور برتری کے قوانین انسان کی اپنی بنائی ہوئی سدا تعلل کے پیدا کردہ ہیں ۔

(روسو)

طفیل احمد

سوویت تمدن — ایک نیا تمدن

تہذیب اور تمدن کا تعلق انسانی سماج سے ہے۔ انسانی سماج ایک نامیاتی شے ہے۔ وہ ایک ایسے مجموعی کُل کی حیثیت رکھتا ہے جس کا ہر پہلو دوسرے پہلوؤں سے متعلق اور وابستہ ہے۔ اور جس کا ہر پہلو نہ صرف دوسرے پہلوؤں سے متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ خود بھی ان پر اثر ڈالتا ہے۔ انسانی سماج کوئی جامد اور ساکن شے نہیں۔ بلکہ ہمیشہ بدلتا اور نئی شکل اختیار کرتا رہتا ہے۔ وُہ ایک مسلسل حرکت اور غیر مختتم تبدیلیوں کے سحر میں گرفتار ہے۔ تہذیب اور تمدن بھی ہمیشہ بدلتی ہوئی اشیا ہیں۔ تہذیب و تمدن بھی سماج کے دو پہلو ہونے کی حیثیت سے نہ صرف ایک دوسرے سے منسلک اور وابستہ ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو متعین بھی کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اس متعین کرنے کا تعلق ہے۔ تمدن کی حیثیت بنیادی ہے۔ تمدن ہی تہذیب کی شکل و صُورت اور اس کی اندرونی رُوح کو متعین کرتا ہے۔ اس کو اعلیٰ بناتا ہے یا اس کے معیار کو گھٹا دیتا ہے تمدن ہی کی اچھائی یا خرابی پر تہذیب کے اچھے یا بُرے ہونے کا انحصار ہے۔ تمدن سماج کے خارجی مظاہر سے مترتب ہوتا ہے۔ تہذیب اس کا داخلی پہلو ہے۔ خارجی حالات سماج کی اندرونی رُوح اور اس کے داخلی پہلو —— یعنی تہذیب کو —— متعین و متاثر کرتے ہیں۔ تہذیب کوئی مُردہ اور بے حس شے نہیں۔ وُہ بھی تمدن پر اپنا ردِعمل ثبت کرتی ہے۔ تہذیب، تمدن کی پیداوار ہوتے ہوئے بھی اس پر اپنا اثر ڈالتی۔ اور اس کی خصوصیات کا تعین کرتی ہے۔ تمدن زیادہ بنیادی ہونے ہوئے بھی تہذیب سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ تہذیب تمدن کا داخلی پہلو ہے۔ اور تمدن، تہذیب کا خارجی پہلو۔ دونوں مل کر انسانی سماج کی تشکیل کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن تہذیب اس وقت تک اپنی شکل اور نوعیت نہیں بدل سکتی جب تک تمدن میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہو۔ جب تمدن کا ڈھانچہ بدلتا ہے۔ تب نئی تہذیبی قدریں پیدا ہوتی ہیں اور پرانی قدریں بدلتی ہیں اس طرح تہذیب و تمدن ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔

یہ سوچنا غلط ہے کہ تہذیب ہی تمدن کو پیدا کرتی ہے۔ اور اس کے پورے ڈھانچے کو متعین کرتی ہے

یہ تو گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنے کے مترادف ہے۔ یہ نظریہ انیسویں صدی کا عینیت پرستانہ نظریہ ہے۔ جو مادی دنیا کی ہر چیز کو خیال کی پیداوار سمجھتا ہے۔ صحیح اور سائنسی نظریہ یہ ہے۔ کہ مادی دنیا ہی ہمارے ذہن میں خیال کی تخلیق کرتی ہے۔ یہ ضرور ہے۔ کہ خیال ایک بار پیدا ہو جانے کے بعد پھر مادی دنیا پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اور اس کی شکل و صورت کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ مادی دنیا محض ہمارے خیال کی پیداوار ہے۔ خیال مادی دنیا کی شکل ضرور بدلتا ہے۔ اور اس کو نئے رنگ ڈھنگ میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لیکن وہ مادی دنیا کو پیدا نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ ایک غیر ممکن عمل ہے۔ اسی طرح تہذیب جو انسانی سماج کا گویا ذہنی پہلو ہے۔ سماج کے مادی مظاہر یعنی تمدن سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ خود تمدن کو پیدا نہیں کرتی۔ تمدن ہی تہذیب کو پیدا کرتا ہے۔ اور اس کی صفت اور کردار کا تعین کرتا ہے۔ تہذیب محض تمدن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس پر رنگ آمیزی کرتی ہے۔ اس کو آگے بڑھا سکتی ہے یا اس کی ترقی کو روک سکتی ہے۔ لیکن اس کو پیدا نہیں کر سکتی۔ اور نہ یکسر اسے بدل سکتی ہے۔ تہذیب تمدن کے ارتقا کے رُخ کو بھی نہیں موڑ سکتی۔ وہ صرف اس کے ساتھ ساتھ چل سکتی ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ تمدن کے ارتقا کی رفتار کو دھیما یا تیز کر سکتی ہے۔

تہذیب کوئی بنی بنائی مکمل مقفل سی چیز نہیں ہے۔ کہ اسے ایک ہی دفعہ تمام آنے والے زمانوں کیلئے بنا کر رکھ دیا گیا ہو۔ ہر تہذیب کچھ خاص تمدنی حالات میں پیدا ہوتی ہے۔ پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ اور جب ان تمدنی حالات کا زوال ہوتا ہے تو وہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ صرف اس کی چند اعلیٰ ترین قدریں نئی تہذیب میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ تہذیب میں ایک تسلسل بھی ہوتا ہے۔ تہذیب ہمیشہ انقلاب پذیر رہتی ہے۔ اس لئے ہم کسی بھی تہذیب کے اصولوں اور قدروں کو دائمی اور ابدی نہیں قرار دے سکتے نہ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کسی خاص قوم یا کسی خاص مذہب کے پیروکاروں کی تہذیب سب سے مکمل ہے۔ اور اسے تمام آیندہ نسلوں کے لئے ایک ہی بار بنا کر تیار کر لیا گیا ہے۔ تاکہ ہر قوم کو ہر حالات میں معجون کے طور پر کھلایا جا سکے۔ پھر چونکہ ہر تہذیب خاص خاص تمدنی حالات کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس لئے کسی تہذیب کو ہر تمدن پر چپکایا نہیں جا سکتا۔ یہ بالکل بچوں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ موجودہ یورپی تمدن کو صالح بنانے کے لئے اس کے اندر کسی مشرقی تہذیب کا انجکشن دینے کی کوشش کی جائے۔ یورپی تمدن کا اپنا ایک داخلی پہلو ہے۔ جسے آپ اسکی تہذیب کہہ لیجئے۔ اگر یورپ کی تہذیب بدلی جا سکتی ہے تو صرف یورپ کے تمدن کو بدل کر۔ ہر تمدن اپنی داخلی رُوح ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس کو اپنی معاشی خصوصیات سے زبردستی دستبردار نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اگر ہم اس کی تہذیبی روح کو بدلنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اس کے ڈھانچے کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ اس کے تمدنی حالات اور ان کے پیدا کردہ تہذیبی رجحانات میں بے آہنگی اور نامطابقت پیدا نہ ہو۔ انسانی سماج کی نامیاتی فطرت کا یہی تقاضا ہے۔ کسی تمدن میں زبردستی کسی مشرقی تہذیب کے رجحانات پیدا کرنا

غیر فطری عمل جراحی ہے۔

تمدن سے مراد ہے کسی سماج کا معاشی سیاسی اور معاشرتی نظام۔ اور تہذیب سے مراد ہے اس کا تعلیمی اخلاقی اور مذہبی و روحانی نظام۔ تہذیب کے دائرے میں ادب اور آرٹ بھی شامل ہیں۔

اسے ہم محض تاریخی اتفاق نہیں قرار دے سکتے۔ کہ انسان اسی زمانے سے متمدن ہونا شروع ہوا۔ جس زمانے میں ذاتی ملکیت کا رواج قائم ہوا۔ تہذیب و تمدن اور ذاتی ملکیت دونوں کا سماجی ارتقا کے ایک ہی عہد میں پیدا ہونا محض اتفاق نہیں۔ دونوں میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ تمدن کی پیدائش ذاتی ملکیت پر مبنی معاشی نظام سے ہوئی ہے۔ آج کے تاریخی حالات میں یا پیدائش انسیا کے ارتقا کے موجودہ دور میں ذاتی ملکیت کا وجود تہذیبی و تمدنی ترقی کے منافی ہے۔ لیکن جس زمانے میں وہ پہلی بار وجود میں آئی۔ اس کے تاریخی حالات کے تحت وہ یقیناً سماج کی ایک ترقی پسند طاقت رہی ہوگی کوئی چیز بجائے خود اچھی یا بُری نہیں ہوتی۔ بلکہ مخصوص خارجی حالات اُسے اچھا یا بُرا بنا دیتے ہیں۔ ذاتی ملکیت کے بغیر ابتدائی سماج غالباً ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتا تھا۔ اور نہ تہذیب و تمدن ہی وجود میں آسکتا تھا۔ اسی وجہ سے کسی بنے بنائے اخلاقی اصول کو ابدی قرار دے کر اس کی کسوٹی پر تمام قدیم و جدید تہذیبوں اور تمدنوں کو جانچنا سراسر غیر سائنسی طریقہ ہے۔ عہد قدیم میں انسانی سماج کی مادی قوت میں اضافہ کرنے کے لئے اور قدرت کے ذرائع پر اس کے اختیارات و اقتدار کا دائرہ وسیع اور مضبوط کرنے کے لئے جس کے بغیر تہذیب و تمدن کی ترقی ناممکن تھی۔ ذاتی ملکیت اور اس پر مبنی معاشی نظام کی ضرورت تھی۔ ذاتی ملکیت نے سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقا تک یہ اہم تاریخی فرض انجام دیا۔ لیکن اب قدرت پر انسانی حیطۂ اقتدار کو وسیع تر کرنے سے اور تہذیبی و تمدنی ارتقا کے تسلسل کو برقرار رکھنے سے ذاتی ملکیت قاصر اور معذور ہے۔ اب تک ذاتی ملکیت نے جس تہذیبی و تمدنی ترقی کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ اس کو برقرار رکھنے کے لئے اب ہمیں اجتماعی ملکیت کی ضرورت ہے۔ ورنہ خود تہذیب و تمدن ہی فنا کے گھاٹ اُتر جائیگا۔

گویا اب تک دنیا میں جتنی تہذیبیں پیدا ہوئیں۔ اور جتنے تمدنوں نے جنم لیا۔ اُن سب پر ذاتی ملکیت کی چھاپ رہی ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں ان میں کوئی نہ کوئی نقص اور تکمیل کا فقدان نظر آتا ہے۔ لیکن یہ کوئی قابل الزام بات نہیں ہے۔ بلکہ تاریخی طور پر ایسا ہونا لابدی تھا۔ ہم یونانی تمدن کو محض اس لئے بُرا نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس کی بنیاد غلامی کے نظام پر قائم تھی۔ کیونکہ اس زمانے کے تاریخی حالات کے تحت اتنی تہذیب اور اتنا تمدن بھی نظام غلامی ہی کا رہین منت تھا۔ قدیم روم اور کارتھیج، ہندوستان و چین مصر و بغداد و ایران و تاتار اور یورپ کا موجودہ تمدن سب ذاتی ملکیت کے نظام کے سہارے ہی پیدا ہوئے اور آگے بڑھے۔ اسی لئے آج کے اخلاقی آئیڈیل کی عینک سے دیکھئے۔ تو ان کے اندر اچھائیوں کے ساتھ برائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ قدیم یونان کے علمی و تہذیبی کمالات میں ہمیں غلاموں کے خون کی سرخی نظر آتی ہے۔ روم کی

شاہانہ عظمت و جبروت کا عالیشان قصر بھی غلاموں کے کندھوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ قدیم ہندو تہذیب اچھوتوں کو کچل کر اور پیس کر آگے بڑھی۔ مسلم تمدن کی نشوونما بھی جاگیرداری نظام کے سہارے ہوئی جس میں تہذیب کی دولت صرف امراء و رؤسا کے طبقے کو حاصل تھی۔ اور بقیہ انسانیت کو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا تھا۔ جدید یورپی تمدن میں فاقہ کش مزدور کے چہرے کی زردی اور کمزور اور محکوم قوموں کے خون ناحق کی سرخی جھلک رہی ہے ان تمام تمدنوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔ کہ اگر ایک طرف تہذیب و تمدن کا مسلسل ارتقا ہوتا رہا۔ تو دوسری طرف انسان کی عظیم اکثریت ظلم و تعدی، بھوک اور مفلسی، جہالت اور کثافت کا شکار ہوتی رہی۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بغیر انسانی تمدن کی ترقی ناممکن تھی۔

اسی تضاد نے دنیا کے اعلیٰ ترین اخلاقی اور انسانی اصولوں کو کبھی عملی صورت اختیار نہیں کرنے دی تمدن کی پوری تاریخ میں ہمیں نظریہ اور عمل کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل نظر آتی ہے۔ افلاطون کی اشتمالیت گوتم بدھ کے اشتمالیت اور مساوات کے نظریئے، عیسیٰ کا محبت اور نیکی کا پیغام، اسلام کا مساوات کا اصول ان میں سے کسی بھی اخلاقی نظام کو آج تک عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ موجودہ یورپی تمدن بھی ایک اخلاقی تضاد کا شکار ہے معلمین اخلاق کو یہ بھی شکایت ہے۔ کہ سائنس جتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اسی لحاظ سے انسان کی اخلاقی ترقی نہیں ہو رہی ہے۔ سائنس کی طاقتیں شیطانی ارادوں کے ہاتھ میں آ رہی ہیں

یہ ہے ان تمام تہذیبوں اور تمدنوں کی وہ مشترکہ خصوصیت جو ذاتی ملکیت پر قائم ہیں۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے نومبر میں روس کے سرخ انقلاب کے بعد انسانی تاریخ میں پہلی بار ایک ایسے تمدن اور ایک ایسی تہذیب کی تعمیر شروع ہوئی جس کی بنیاد ذاتی ملکیت پر نہیں۔ بلکہ ذاتی ملکیت کی تباہی و بربادی پر قائم ہے۔ سوویٹ تمدن پہلا تمدن ہے۔ جو ذاتی ملکیت کا مرہونِ منت نہیں ہے۔ سوویٹ تمدن نے اس تصور کو پاش پاش کر دیا۔ کہ آج کے حالات میں بھی تمدن اور تہذیب اگر ترقی کر سکتی ہے۔ تو صرف ذاتی ملکیت کی بنا پر، اس شرط پر کہ کچھ انسان تمدنی ترقی سے فائدہ اٹھائیں۔ اور عظیم اکثریت تمدن کو برقرار رکھنے کے لئے مصائب و آلام کا شکار بنی رہے۔ یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے۔ جو سوویٹ تمدن کو تاریخ انسانی کے تمام تمدنوں سے ممتاز اور علیحدہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اشتراکی انقلاب ہمیں انسانی سماج میں ایک ایسی تبدیلی کا پتہ دیتا ہے۔ جس کے مقابلے میں کوئی بھی تبدیلی اتنی بنیادی نہیں ہے۔ غلامی سے جاگیرداری اور جاگیرداری سے سرمایہ داری کی طرف جو تبدیلیاں ہوئیں۔ وہ ہرگز اتنی بنیادی نہیں تھیں۔ اس لئے کہ وہ ذاتی ملکیت کے حدود کے اندر ہی واقع ہوئیں۔ اور وہ ذاتی ملکیت کو ختم نہ کر سکیں۔ لیکن اشتراکی انقلاب جس سماجی تبدیلی کو وجود میں لاتا ہے۔ وہ سب سے زیادہ بنیادی ہے۔ ایک بنیادی تبدیلی تو اس وقت ہوئی۔ جب ذاتی ملکیت وجود میں آئی اور دوسری بنیادی تبدیلی اب ہو رہی ہے جب کہ ذاتی ملکیت ختم ہو رہی ہے۔ گویا چار پانچ ہزار سال کے بعد انسانی سماج میں اتنا گہرا اور بنیادی انقلاب آج تک نہیں ہوا۔ جب چرچل چیخ کر کہتا ہے۔ کہ سوویٹ نظام انسانی تمدن

کو ختم کئے ڈالتا ہے۔ تو دراصل اس کے پیش نظر یہ حقیقت ہوتی ہے۔ کہ دنیا کے تمام قدیم و جدید تمدن ذاتی ملکیت پر ہی مبنی تھے۔ اور ذاتی ملکیت کے وجود میں آنے سے پہلے دنیا میں تمدن کا وجود ہی نہیں تھا۔ وہ یہ سوچنے سے قاصر ہے۔ کہ اب سماجی ارتقا کی وہ منزل آ پہنچی ہے۔ جب تمدن کی بقا کے لئے ذاتی ملکیت کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ اسے تباہ و برباد کر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اب اگر تمدن کی ترقی کی رفتار کو برقرار رکھنا ہے۔ تو ذاتی ملکیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ اب انسان نے قدرت پر اتنا قابو حاصل کر لیا ہے۔ اور اس نے ایسے آلات پیدا کر لئے ہیں۔ کہ کچھ لوگوں کو تمدن کی تعمیر میں مصروف رکھنے کے لئے عظیم اکثریت کو کم تر زندگی گزارنے پر مجبور کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

غرض سوویت تمدن کی عظیم الشان تاریخی اہمیت یہی ہے۔ کہ وہ انسانی تاریخ کا پہلا تمدن ہے جس کی بنیاد ذاتی ملکیت پر قائم نہیں بلکہ اجتماعی ملکیت پر۔ یہ تمدن ابھی تک تکمیلی شکل اختیار نہیں کر سکا ہے لیکن نہایت تیز رفتاری کے ساتھ تکمیل کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ اور مزدوروں کی حکومت میں اس کا تکمیل تک پہنچنا ایک لازمی اور یقینی امر ہے۔

یہ ہے سوویٹ تمدن کی بنیادی خصوصیت۔ اب ہم اس کے خارجی ڈھانچے اور اس کی داخلی خصوصیات یعنی اس کی تہذیب کا مطالعہ کریں گے۔

معاشی نظام

ہر تمدن کسی مخصوص معاشی نظام کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس لئے ہم سب سے پہلے سوویٹ معاشی نظام کی خصوصیات سے بحث کریں گے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے سوویٹ معاشی نظام کی بنیاد اجتماعی ملکیت پر قائم ہے۔ دولت پیدا کرنے کے تمام ذرائع، زمینیں، کارخانے ملیں اور آلات وغیرہ پوری جماعت کی ملک ہیں۔ یہ معاشی نظام کسی خاص طبقے کے فائدے کے اصول پر قائم نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ہر فرد کے فائدے کے اصول پر۔ یہ نظام چند لوگوں کی نفع اندوزی کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ پوری جماعت کی خدمت کے لئے۔ آج تک دنیا کے کسی بھی متمدن نظام میں سماج کے تمام افراد کے ساتھ اس طرح بالکل یکساں اور مساوی سلوک روا نہیں رکھا گیا ہے۔ سوویت معاشی نظام کے ماتحت پہلے سماج کے تمام افراد کی ضرورتوں کا تخمینہ کیا جاتا ہے۔ پھر اسی کے لحاظ سے چیزیں پیدا کی جاتی ہیں۔ اس اصول کی پابندی کی جاتی ہے کہ سماج میں جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہی پیدا کی جائے۔ اس میں سماج کی فوجی اور صنعتی ضروریات بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں بچوں، عورتوں، بڈھوں اور جوانوں کی عام اور مشترکہ ضروریات کے علاوہ، ان کی الگ الگ مخصوص خاص ضروریات کا بھی پورا پورا خیال کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں چیزیں صرف سرمایہ داروں کے نفع کے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔ چاہے سماج کی ضرورتیں پوری ہوں یا نہ ہوں۔ سرمایہ دار جو ذرائع پیداوار کا مالک ہوتا ہے۔ وہی چیزیں پیدا کرتا ہے جن سے اسے منافع حاصل ہونے کی امید ہوتی ہے اس کے پیش نظر چونکہ سماج کی ضروریات کا خیال نہیں رہتا۔ سوویت معاشی نظام میں جب سماج کے تمام افراد

کی ضرورتوں کو اندازہ لگایا جاتا ہے۔ تو نہ صرف مادی اور جسمانی ضروریات کا خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ ذہنی اور تخلیقی ضروریات کا بھی۔ یعنی سوویت معاشی نظام ہر فرد کے لئے کھانے کپڑے کے ساتھ ساتھ علم، آرٹ، ادب اور موسیقی وغیرہ بھی مہیا کرتا ہے۔ دولت کی پیدائش اور تقسیم کی پوری تنظیم اسی مقصد سے کی جاتی ہے۔ سوویت معاشی نظام چیزیں پیدا کرنے والوں کے لئے وجود میں نہیں لایا گیا۔ بلکہ چیزیں استعمال کرنے والوں کے لئے سوویت نظام میں طبقوں کا وجود نہیں ہے۔ اس میں نہ کوئی ایسا طبقہ ہے۔ جو دوسرے طبقوں کا استحصال کرتا ہو اور نہ ایسے طبقے جن کا استحصال کیا جاتا ہو۔ وہ تو اس بنیادی اصول پر قائم ہے۔ کہ ہر شخص سے اس کی جسمانی اور ذہنی طاقت کے مطابق کام لیا جائے۔ اور ہر شخص کی ضروریات پوری کی جائیں۔ ایسے معاشی نظام میں ہر فرد کو لازمی طور پر روزگار مہیا کیا جاتا ہے۔ اور اسے کام کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات اور مالی تحفظ حاصل رہتا ہے۔ وہاں بیکاری کبھی نہیں آسکتی۔ اور نہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح یہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ کہ ایک طرف چیزوں کی افراط ہے۔ اور دوسری طرف لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ اور اشیائے ضرورت کے لئے ترس رہے ہیں۔

سوویت معاشی نظام میں انسان مشین کا غلام نہیں ہے۔ بلکہ مشین ہی انسان کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام کے برخلاف وہاں مشین سے اور نئی نئی مشینی ایجادوں سے لوگ خوف نہیں کھاتے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ہر ایجاد کے معنی ہیں۔ کچھ مزدوروں کا بیکار ہو جانا۔ لیکن سوویٹ معاشی نظام میں مشینی ایجادوں سے یہ ہوتا ہے۔ کہ مزدوروں کی فرصت کے اوقات میں اضافہ ہو جاتا ہے اس لئے وہ مشینی ایجادوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ چنانچہ بائیس سال کے قلیل عرصے میں سوویت یونین میں نہ صرف چیزیں پیدا کرنے والی تمام مشینیں آگئی ہیں۔ بلکہ مشینیں بنانے والی تمام مشینیں بھی اب وہیں پیدا کی جانے لگی ہیں۔ مشینی ایجادیں بھی تیزی سے ہو رہی ہیں۔ انقلاب سے پہلے کے غیر صنعتی نظام کے مقابلے میں یہ ترقی حیرت انگیز ہے۔ سوویت یونین کی صنعتی ترقی کی رفتار کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ بہت جلد اکیلا باقی دنیا کے مقابلے میں صنعتی طاقت کے لحاظ سے زیادہ ترقی کر جائیگا۔

سوویت معاشی نظام میں صنعت اپنا مقصد آپ نہیں۔ بلکہ وہ محض انسانی اور سماجی ضروریات کے پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ سوویت معاشی نظام میں روز بروز چیزوں کی قیمتیں گھٹتی جا رہی ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں لوگوں کی آمدنی اور تنخواہوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح معیارِ زندگی بلند ہو رہا ہے اور چیزوں کی کھپت بھی تیزی کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ وہاں کی پیدائش اشیا کا نظام اس رجحان کا ساتھ دے رہا ہے۔ معاشی خوشحالی کے نتیجے کے طور پر تہذیبی ترقی بھی اعلیٰ پیمانے پر ہو رہی ہے۔

سوویت کارخانوں کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہاں سرمایہ دار ملکوں کے کارخانوں کی طرح منیجر یا ڈائریکٹر اور مزدور میں تصادم اور مناقشے کی صورت نہیں رہتی۔ اور دونوں میں مقصد کا تضاد نہیں پایا جاتا۔ انگلستان یا امریکہ کے کارخانوں میں کارخانے کے مالک، ڈائریکٹر اور منیجر کے مقصد میں اور مزدور کے

مقصد میں بنیادی اختلاف موجود ہوتا ہے۔ مالک پیدائش اور اشیا کے اخراجات کو گھٹانے کے لئے مزدور کو کم سے کم تنخواہ دینا چاہتا ہے۔ اور مزدور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے زیادہ تنخواہ کا مطالبہ کرتا ہے مقصد کا یہ اختلاف پیدائش اشیا کے نظام پر خراب اثر ڈالتا ہے۔ سوویت نظام میں مینجر یا ڈائرکٹر اور مزدور کے مقصد میں مکمل ہم آہنگی اور مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مقصد ہے پورے سماج کے فائدے کے لئے چیزیں پیدا کرنا سوویت کارخانوں کی اندرونی تنظیم بھی ایسی ہوتی ہے۔ جس کے تحت مزدور کو جمہوریت اور باہمی تعاون اور سماجی خدمت کی تربیت اور تعلیم ملتی ہے۔ اس ماحول میں اس کی شخصیت ترقی کر کے بلند ترین اخلاقی منزل پر پہنچ جاتی ہے چنانچہ سوویت کارخانوں میں مزدور کو کام بوجھ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ مسرت اور خدمت کا ایک ذریعہ۔ یہ احساس کہ وہ کارخانے میں کام کر کے خود کو فائدہ پہنچانے کے علاوہ عظیم الشان انسانی اور سماجی خدمت انجام دے رہا ہے کام کو مسرت اور طمانیت کا ایک ذریعہ بنا دیتا ہے۔

سیاسی نظام

سوویت ریاست کی اساس دو اصولوں پر قائم ہے۔ (۱) بلا لحاظ نسل، رنگ، قوم جنس تمام اشخاص کے حقوق برابر ہیں۔ (۲) سوویت وفاق کی تمام قوموں اقلیتوں اور اکثریتوں کے حقوق برابر ہیں۔ سوویت ریاست کو مزدور حکومت چلا رہی ہے۔

۱۹۳۶ء کے دستور کے مطابق ہر فرد کو مندرجہ ذیل حقوق دیئے گئے ہیں:۔

۱۔ روزگار حاصل کرنے کا حق۔

۲۔ آرام کرنے کا حق

۳۔ تعلیم حاصل کرنے کا حق

۴۔ بڑھاپے اور دوران علالت میں سرکاری تحفظ کا حق

یہ حقوق محض الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں ہیں۔ بلکہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ سوویٹ ریاست میں آج کوئی بیکار نہیں ہے۔ ہر شخص کو سال میں طویل عرصے تک تنخواہ کے ساتھ چھٹی ملتی ہے۔ عام حالتوں میں سات گھنٹے اور خاص حالتوں میں آٹھ گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ کوئی ایسا شخص نہیں ہے۔ جو تعلیم حاصل کرنے کی عمر میں ہے۔ اور سرکاری امداد سے تعلیم حاصل نہیں کر رہا ہے۔ بڑھاپے اور دوران علالت میں ہر فرد کو سرکاری مالی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ سوویت نظام میں اگر کسی فرد کو روزگار نہ ملے۔ تو وہ ریاست کے خلاف مقدمہ دائر کر سکتا ہے اور عدالت میں چارہ جوئی کر سکتا ہے۔

سوویت نظام میں بلا امتیاز نسل و رنگ، زبان اور عقیدہ ہر مرد و عورت کو ۱۸ برس کی عمر سے ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ دنیا میں کسی بھی ملک میں ووٹ دینے کے حق کو اتنا وسیع نہیں کیا گیا ہے۔

سوویت ریاست کے ہر فرد کو مکمل سیاسی مساوات حاصل ہے۔ سیاسی مساوات کا انحصار دراصل معاشی مساوات پر ہے۔ انگلستان میں اصولی طور پر ایک بڑے سرمایہ دار اور ایک معمولی آدمی دونوں کو پارلیمنٹ

کی نشست کے لئے کھڑا ہونے کا حق حاصل ہے۔ لیکن حقیقت کیا ہے؟ معمولی آدمی سرمایہ دار کے مقابلے میں کبھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اس کا شکست کھا جانا یقینی ہے۔ لیکن سوویت نظام میں چونکہ معاشی لحاظ سے لوگوں کو مساوات حاصل ہے۔ اس لئے انہیں حقیقی معنوں میں مساوات بھی حاصل ہے۔ سوویت ریاست کا کوئی بھی فرد محض اپنی خدمات، صلاحیت اور قابلیت کی بنا پر کسی بھی نشست کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے اور کامیاب ہو سکتا ہے۔

سوویت وفاق میں تمام قوموں کے محنت کش عوام خود اپنی رضامندی اور خواہش سے شامل ہیں۔ قومیں جس وقت بھی چاہیں۔ وفاق سے ایک گھنٹے کے نوٹس پر علیحدگی اختیار کر سکتی ہیں۔ لیکن وہ ایسا اس لئے نہیں کرتیں۔ کہ اشتراکی سماج قائم کرنے کی کوشش میں کامیاب ہونے کے لئے اور دنیا کی سرمایہ دار سامراجی طاقتوں کی دستبرد سے محفوظ رہنے کے لئے وہ ساتھ رہنا پسند کرتی ہیں۔ چنانچہ آجکل سوویت وفاق کی ہر قومی ریاست نے اپنے تحفظ کے اختیارات اور خارجی پالیسی ایک مرکزی اقتدار کے حوالے کر رکھی ہے۔ لیکن ۱۹۴۴ء کی دستوری تبدیلی کی رُو سے یوکرین اور بیلو روس کی قومی ریاستوں کو خارجی پالیسی کی بھی خود مختاری حاصل ہے۔ ہر قومی ریاست کے نمائندے مرکزی مجلس قانون ساز میں موجود ہیں۔ اور انہیں مساوی حقوق اور اختیارات حاصل ہیں۔ ہر قومی ریاست کو معاشی، لسانی، تعلیمی، تہذیبی اور خود مختاری اور انتظامی امور کی آزادی حاصل ہے ہر قومی ریاست کے تمام سرکاری لوگ خود وہیں کے باشندوں میں سے چنے جاتے ہیں۔ اور ہر قومی ریاست کی زبان خود وہیں کی مقامی زبان ہے۔ ہر قومی ریاست میں تعلیم بھی مقامی زبان میں دی جاتی ہے۔ ہر قومی ریاست اپنے دستورِ اساسی کی تشکیل بھی خود ہی کرتی ہے۔ ہر ریاست کے اندر پائی جانے والی اقلیت کو اکثریت کے برابر اور مساوی حقوق حاصل ہیں۔ اور دونوں میں صرف کاغذی طور پر نہیں۔ بلکہ عملی طور پر قطعی کسی قسم کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ چنانچہ سوویت ریاست ہی دنیا کا وہ واحد نظام ہے۔ جہاں یہودیوں کا مسئلہ بالکل حل کر دیا گیا ہے۔

معاشرتی نظام

سوویت نظام میں انسانی تمدن کی تاریخ میں پہلی بار عورت کو مکمل طور پر مرد کے مساوی درجہ دیا گیا ہے۔ عورت نے یہ آزادی کئی ہزار سال کے بعد حاصل کی ہے۔ تمدن کی ابتدا ہی ذاتی ملکیت کے قیام اور اس کے نتیجے یعنی عورت کی غلامی سے ہوئی تھی۔ سوویت تمدن دنیا کا پہلا تمدن ہے۔ جس نے دونوں چیزوں کو ختم کر دیا ہے۔ انسانی سماج میں حاکم و محکوم کے اولین طبقے مرد اور عورت کے درمیان پیدا ہوتے تھے۔ سوویت کے غیر طبقاتی تمدن میں لازمی طور پر اس اولین طبقاتی اختلاف کو مٹا دیا گیا ہے۔ عورت اب مرد کے ساتھ ساتھ تمام معاشی، سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی امور میں حصہ لے سکتی ہے۔ وہ استانی سے لے کر فوج کی کمانڈر اور ریاست کی وزیرِ اعظم تک بن سکتی ہے۔ چنانچہ آج سوویت ریاست میں ایک لاکھ سے زیادہ عورتیں، انجینئر اور تکنیکی ماہرین کی حیثیت سے مختلف صنعتوں میں کام کر رہی ہیں۔ حتیٰ

کو مرد کے برابر تنخواہ ملتی ہے۔ اور زچگی کی حالت میں پوری تنخواہ کے ساتھ طویل عرصے کی فرصت ملتی ہے۔ مفت طبّی امداد مہیا کرنے کے علاوہ بچے کی پرورش اور دیکھ بھال میں ریاست ہر عورت کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اس طرح عورت کو تھکا دینے والے اور جان لیوا گھریلو کاموں کا بوجھ برداشت نہیں کرنا پڑتا۔ جو تھوڑے بہت گھریلو امور اُسے انجام دینے پڑتے ہیں۔ وہ اُسے کوفت کی بجائے مسرت اور آرام کی دولت عطا کرتے ہیں۔ عورت کی گھریلو زندگی کوفت کی بجائے راحت اور سکون سے لبریز ہے۔ اور وہ تہذیبی امور میں دلچسپی لینے کے لئے کافی وقت بچا سکتی ہے۔ گھر کی دُنیا اسے باہر کی دنیا سے لطف اندوز ہونے سے نہیں روکتی۔

وہ اب دولت دیکھ کر شادی نہیں کرتی۔ بلکہ اپنی خواہش کے مطابق اور خالص محبّت کی بنا پر۔ اس لئے کہ وہ اب معاشی لحاظ سے آزاد ہے۔ اور معاشی لحاظ سے اپنے شوہر کی دستِ نگر نہیں ہے۔ اولاد کی پیدائش اس کے لئے فکر و آلام اور مصائب کی دنیا نہیں بلکہ حقیقی مسرت کا پیغام لاتی ہے۔ وہ معاشی لحاظ سے آزاد ہونے کی بنا پر شوہر کو جنسی بے راہ روی سے روک سکتی ہے۔ اور بدچلن شوہر کے ظلم و ستم سے بغاوت کر کے بآسانی طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ وہاں کثرت طلاق ہے۔ بحیثیت مجموعی سوویت سماج میں کثرت طلاق کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اور صرف خاص خاص حالات میں طلاق کو پسند کیا جاتا ہے۔ پھر بھی طلاق کی مکمل آزادی ہے۔

اس طرح سوویت سماج میں یک ازدواجی کا اطلاق نہ صرف عورتوں پر ہوتا ہے۔ بلکہ مردوں پر بھی۔ اب مرد اپنے معاشی اقتدار سے فائدہ اٹھا کر بیوی کو اپنی جنسی بے راہ روی کی روحانی تکلیف برداشت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اب تک تمدّن کی پوری تاریخ میں یک ازدواجی کی پابندی صرف عورتوں سے کرائی گئی تھی۔ مرد اس کی پابندیوں سے آزاد تھا۔ وہ یک طرفہ یک ازدواجی تھی۔ سوویت سماج کی یک ازدواجی مکمل یک ازدواجی ہے۔ اس لئے کہ اس کی پابندی عورت اور مرد دونوں پر لازم ہے۔

سوویت تمدّن پہلا تمدّن ہے۔ جہاں طوائفوں کے وجود کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ جب سے تمدّن پیدا ہوا انسانی سماج طوائفوں کے وجود سے نجات نہ پا سکا تھا۔ سوویت سماج پہلا سماج ہے جس نے اس سے نجات حاصل کی ہے۔ تمام معقول محنتوں اور باعزت پیشوں کا دروازہ عورت پر وا کر کے اُسے خوددار اور آزاد بنا دیا گیا ہے۔ اب وہ پیٹ کی خاطر اپنی عفت و عصمت فروخت نہیں کرتی۔

سوویت سماج میں جنسی الجھنیں، غیر صحت مند قوم کی جنسی بھوک اور بے راہ روی بہت کم پائی جاتی ہے اور جو کچھ ہے وہ تیزی کے ساتھ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ وہ نیا انسان جو سوویت سماج میں پیدا ہو رہا ہے ان تمام جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں سے پاک ہے۔ جنسی مسائل کی طرف اس کا رویہ صحت مند ہوتا ہے۔ وہاں انسان کی جنسی خواہش اپنی فطری حالت پر آ رہی ہے۔ وہ ایک مرض بن کر انسان کی اخلاقی، جسمانی اور ذہنی زندگی کو پامال نہیں کرتی۔

سوویٹ سماج میں خاندان ایک معاشی وحدت نہیں رہا۔ لیکن وہ ایک اخلاقی اور معاشرتی وحدت ضرور ہے۔ وہاں خاندانی اور گھریلو زندگی ختم نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ پہلے سے زیادہ خوشگوار، آرام دہ اور صاف ستھری ہوگئی ہے۔ اب معاشی کوفت گھریلو اور خاندانی زندگی کی مسرتوں کو تباہ نہیں کرتی۔ بیوی شوہر، ماں اور بچے کے تعلقات میں زیادہ خوشگواری پیدا ہوگئی ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر کسی کو معاشی افکار و آلام سے نجات حاصل ہوتی ہے۔

تعلیمی نظام

۸ سے ۱۵ سال تک کی عمر کے ہر بچے اور بچی کے لئے تعلیم مفت اور لازمی ہے۔ سوویٹ نظامِ تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہے۔ کہ فرد کو سماج اور انسانیت کا خدمت گذار بنائے۔ سوویت نظامِ تعلیم میں سب سے پہلے یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ جسمانی محنت کرنا کوئی ذلیل بات نہیں ہے بلکہ وہ اتنی ہی قابلِ عزت اور اہم ہے جتنی دماغی محنت۔ سوویت نظامِ تعلیم میں طالب علموں کے اندر وسیع النظری اور جامعیت پیدا کرنے کے لئے انہیں پہلے پورے سماجی اور معاشی نظام سے آگاہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ ہر جزو کو کل کے ساتھ دیکھ سکیں۔ وہ جزو کو علیحدہ کرکے نہیں دیکھتے۔ بلکہ کل سے ہر جزو کے تعلق پر نظر رکھتے ہیں۔ اور کل کے ساتھ ساتھ جزو کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ جامعیت اور وسیع النظری ان کے تدریسی ٹکنیک کی تربیت دی جاتی ہے۔ اور پورے پیدائش اشیا کے نظام سے اور سماج سے اس کا جو گہرا تعلق ہے۔ اس سے انہیں آگاہ کیا جاتا ہے۔ سوویت طالب علموں کو بچپن ہی سے دوسروں کے ساتھ تعاون اور اشتراکِ عمل کا سبق دیا جاتا ہے۔ اور ان کے اندر غلط قسم کی انفرادیت پسندی اور خود غرضی کو ختم کرکے اجتماعیت پسندی پیدا کی جاتی ہے۔ ان کے اندر گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے اور ان میں دلچسپی لینے کی اہلیت پیدا کی جاتی ہے۔ ان کو صرف اپنے ذاتی اور خود غرضانہ معاملات میں دلچسپی لینا نہیں سکھایا جاتا۔ سوویت نظامِ تعلیم میں غلط قسم کی مقابلے بازی اور حاسدانہ جذبات کو روکنے کے لئے طلباء کو فرداً فرداً نمبر نہیں دیئے جاتے۔ بلکہ اجتماعی سعی و عمل اور اجتماعی تعاون کی تربیت دینے کے لئے پورے پورے کلاس کو الگ الگ نمبر دیئے جاتے ہیں۔ یعنی مقابلہ افراد کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ جماعتوں کے درمیان۔ سوویت طالب علم کے لئے تعلیم گاہوں سے باہر بھی ہزاروں تعلیمی کلب اور مطالعہ گاہیں قائم ہیں۔ جن میں داخل ہوکر وہ اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو ترقی دے سکتے ہیں۔ سوویت بچوں کے ذہن سے بالکل ابتدا ہی سے رنگ و نسل اور قومیت کے تعصبات کو مٹانے کی ارادی کوشش کی جاتی ہے سوویت طالب علموں کو پوری توجہ اور سکونِ دماغ کے ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس لئے کہ حکومت ان کی مالی امداد کرتی ہے۔ اور ان کی تمام علمی و تعلیمی ضروریات کی چیزیں مہیا کرتی ہے سوویت طالب علم کے سامنے ترقی کے بیشمار اور لاتعداد مواقع اور امکانات کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اسے تعلیمی زندگی ختم کرنے کے بعد بیکاری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ سوویت ریاست عنقریب مکمل طور پر تعلیم یافتہ لوگوں کی ریاست ہوجائیگی۔ جس میں ایک بھی جاہل یا ان پڑھ نظر نہیں آئیگا۔ سوویت نظام میں جتنی کتابیں شایع ہوتی ہیں۔ اتنی دنیا میں

کہیں نہیں شائع ہوتیں۔

سوویت ریاست کے افراد کو مالی تحفظ اور فرصت کے اوقات حاصل ہیں۔ چنانچہ انہیں علم و ادب اور آرٹ سے دلچسپی لینے کے بے شمار مواقع ملتے ہیں۔ سوویت نظام میں تہذیب کا معیار دن بدن زیادہ سے زیادہ بلند ہوتا جا رہا ہے۔ ہر قوم کو اپنی تہذیب، اپنے آرٹ، اپنے ادب اور اپنے فنونِ لطیفہ کو نشو و نما دینے کے پورے پورے مواقع حاصل ہیں۔ اور کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ دوسری قوموں کی ادبیات اور فنونِ لطیفہ میں بھی سوویت قومیں گہری دلچسپی لیتی ہیں۔ سوویت سرزمین کے طول و عرض میں بےشمار ناٹک گھر، مطالعہ گاہیں، موسیقی کلب، رقص گاہیں اور فنونِ لطیفہ کے ادارے پھیلے ہوئے ہیں۔ جو ہر ہر فرد کو تہذیب و تمدن اور علم و ادب کی برکتوں سے مالا مال کر رہے ہیں۔ سوویت تمدن پہلا تمدن ہے جس میں تہذیب کی دولت صرف چند افراد کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ ہر ہر فرد کو۔ سوویت نظامِ تعلیم میں سائنس کی زبردست اہمیت ہے۔ وہاں سائنس کو شک و شبہ کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ برخلاف اس کے امریکہ اور انگلستان کے بہت سے مفکرین سائنس ہی پر موجودہ سماجی خرابیوں اور برائیوں کا الزام دھرتے ہیں۔ سوویت نظام سے زیادہ سائنس کی ترقی کے لئے موافق فضا اور کہیں نہیں مل سکتی۔ وجہ ظاہر ہے۔ سوویت نظام میں سائنس کی ترقی کے معنی ہیں مزدور کے آرام اور فرصت کے اوقات میں مزید اضافہ۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے موجودہ دور میں سائنس کی ترقی سے بیکاری اور بیروزگاری کے بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ دُنیا کے کسی ملک میں سائنس سوویت نظام کی طرح سماجی تنظیم و ترقی کا ایک لازمی حصّہ اور اس کی بنیاد نہیں ہے۔

سوویت نظام کی اخلاقی بلندی

سوویت نظام اس اصول پر مبنی ہے۔ کہ انسانی سماج ایک خاندان ہے۔ ہر فرد کو اس خاندان سے تحفظ اور آرام و ترقی کا مطالبہ کرنے کا حق ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہر فرد پہ خاندان کی طرف سے کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ جن کو ادا کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ سوویت نظام اس اصول پر مبنی نہیں ہے۔ کہ انسانی سماج میں طبقات اور مدارج قائم ہیں۔ جن کے تحت کچھ لوگوں کو حکمرانی اور آرام و آسائش کا حق حاصل ہے۔ اور باقی تمام لوگوں کے لئے فرماں برداری اور مصائب و آلام کا برداشت کرنا ضروری ہے۔ اس سے سوویت تمدن کی عظیم الشان اخلاقی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر سوویت تمدن کی اساس خودغرضی اور نفع خوری پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی خدمت پر۔ مغرب میں عام شکایت پائی جاتی ہے۔ کہ مادی ترقی کے مقابلے میں اخلاقی ترقی کی رفتار سست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مغربی ملکوں میں مادی ترقی کی بنیاد خودغرضانہ نفع خوری پر قائم ہے۔ برخلاف اس کے سوویت تمدن میں مادی ترقی چونکہ انسانی خدمت کے لئے ہو رہی ہے۔ اس لئے اخلاقی ترقی اور مادی ترقی کی رفتار یکساں ہے۔ اور دونوں میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں پایا جاتا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی ممد و معاون

اخلاقیات اور سائنس ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ اور دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ سوویٹ نظام نے ہر فرد کو مادی افکار و آلام سے نجات دلا کر اسے اعلیٰ تہذیبی اور روحانی ترقی حاصل کرنے کا زبردست موقع عطا کیا ہے۔ سوویٹ افراد کے دل سے مادی تحفظ نے ہر قسم کا خوف دہراس مٹا دیا ہے اس لئے ہر مصیبت کے موقع پر پورا انسانی سماج اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔ سوویٹ نظام میں انفرادی اور ذاتی کاروبار و تجارت کو ختم کر کے پبلک جھوٹ اور پبلک دھوکے بازی کے مواقع بھی ختم کر دیئے گئے ہیں۔ اور اس طرح افراد کی اخلاقی سطح کو پہلے سے زیادہ بلند کر دیا ہے۔ سوویٹ نظام نے غربت اور مفلسی کو ختم کر کے جرائم کی اصل بنیاد کا قلع قمع کر دیا ہے۔ سوویٹ نظام کے تحت ذاتی فائدہ اور اجتماعی فائدے کا فرق اور تضاد بالکل مٹ گیا ہے۔ اب وہاں ذاتی فائدے کا کام کرتے ہوئے انسان اجتماعی فائدے کا کام بھی کر رہا ہوتا ہے۔ اور اجتماعی فائدے کے کام میں مصروف رہ کر اپنی ذات کو بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

سوویت تمدن میں اب پہلی بار تمام بڑے بڑے مفکروں، فلسفیوں، پیغمبروں اور تمام مذاہب کے اعلیٰ اصولوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ ایسے تمدن کا اخلاقی اور روحانی معیار کتنا بلند اور ارفع ہو گا۔

سعادت حسن منٹو

افسانہ نگار اور جنسی مسائل

کوئی حقیر سے حقیر چیز بھی کیوں نہ ہو، مسائل پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہے ــــ مسہری کے اندر ایک مچھر گھس آئے تو اس کو باہر نکالنے، مارنے اور آئندہ کے لئے دوسرے مچھروں کی روک تھام کرنے کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ــــ لیکن دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یعنی تمام مسئلوں کا باپ اس وقت پیدا ہوا تھا۔ جب آدم نے بھوک محسوس کی تھی اور اس سے چھوٹا مگر دلچسپ مسئلہ اُس وقت بروئے ظہور میں آیا تھا جب دنیا کے اس سب سے پہلے مرد کی دنیا کی سب سے پہلی عورت سے ملاقات ہوئی تھی۔

یہ دونوں مسئلے جیسا کہ آپ جانتے ہیں، دو مختلف قسم کی بھوکیں ہیں جن کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے ــــ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اِس وقت جتنے معاشرتی، مجلسی، سیاسی اور جنگی مسائل نظر آتے ہیں اُن کے عقب میں یہی دو بھوکیں جلوہ گر ہیں۔

موجودہ جنگ کا خونیں پردہ اگر اٹھا دیا جائے تو لاشوں کے انبار کے پیچھے آپ کو ملک گیری کی بھوک کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔

بھوک کسی قسم کی بھی ہو بہت خطرناک ہے ــــ آزادی کے بھوکوں کو اگر غلامی کی زنجیریں ہی پیش کی جاتی رہیں تو انقلاب ضرور برپا ہو گا ــــ روٹی کے بھوکے اگر فاقے ہی کھینچتے رہے تو وہ تنگ آ کر دوسرے کا نوالہ ضرور چھینیں گے ــــ مرد کی نظروں کو اگر عورت کے دیدار کا بھوکا رکھا گیا تو شاید وہ اپنے ہم جنسوں اور حیوانوں ہی میں اُس کا عکس دیکھنے کی کوشش کریں۔

دنیا میں جتنی لعنتیں ہیں، بھوک ان کی ماں ہے ــــ بھوک گداگری سکھاتی ہے، بھوک جرائم کی ترغیب دیتی ہے، بھوک عصمت فروشی پر مجبور کرتی ہے، بھوک انتہا پسندی کا سبق دیتی ہے ــــ اس کا حملہ بہت شدید، اس کا وار بہت اوچھا اور اس کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے ــــ بھوک دیوانے پیدا کرتی ہے دیوانگی بھوک پیدا نہیں کرتی۔

دنیا کے کسی کونے کا مصنف ہو، ترقی پسند ہو یا تنزل پسند، بوڑھا ہو یا جوان، اُس کے پیشِ نظر دنیا کے تمام بکھرے ہوئے مسائل رہتے ہیں۔ چن چن کر وہ ان پر لکھتا ہے لیکن کسی کے حق میں یا کسی

کے خلاف!

آج کا ادیب بنیادی طور پر آج سے پانچ سو سال پہلے کے ادیب سے کوئی زیادہ مختلف نہیں — ہر چیز پر نئے پرانے کا لیبل وقت لگاتا ہے، انسان نہیں لگاتا — ہم آج نئے ادیب کہلاتے ہیں، آنے والی کل ہمیں پرانا کر کے الماریوں میں بند کر دے گی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بیکار رہے، ہم نے مدت میں معزز وردی کی — گھڑی کی سوئی جب ایک سے گذر کر دو کی طرف رینگتی ہے تو ایک کا ہندسہ بے مصرف نہیں ہو جاتا — پورا سفر طے کر کے سوئی پھر اُسی ہندسے کی طرف لوٹتی ہے — یہ گھڑی کا اصول بھی ہے اور دُنیا کا بھی۔

آج کے نئے مسائل بھی گذری ہوئی کل کے پرانے مسائل سے بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ جو آج کی برائیاں ہیں، گذری ہوئی کل ہی نے اُن کے بیج بوئے تھے۔

جنسی مسائل جس طرح آج کے نئے ادیبوں کے پیش نظر ہیں، اسی طرح پرانے ادیبوں کے پیش نظر بھی تھے، — انھوں نے ان پر اپنے رنگ میں لکھا، ہم آج اپنے رنگ میں لکھ رہے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں، مجھ سے جنسی مسائل کے متعلق بار بار کیوں پوچھا جاتا ہے؟ — شاید اس لئے کہ لوگ مجھے ترقی پسند کہتے ہیں، یا شاید اس لئے کہ میرے چند افسانے جنسی مسائل سے متعلق ہیں، یا پھر اس لئے کہ آج کے نئے ادیبوں کو بعض حضرات "جنس زدہ" قرار دے کر انہیں ادب، مذہب اور سماج سے یک قلم خارج کر دینا چاہتے ہیں — وجہ کچھ بھی ہو، میں اپنا نقطۂ نظر بیان کئے دیتا ہوں۔

روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد — یہ دو بہت پرانے رشتے ہیں، ازلی اور ابدی — روٹی زیادہ اہم ہے یا پیٹ؟ — عورت زیادہ ضروری ہے کہ مرد؟ — میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لئے کہ میرا پیٹ روٹی مانگتا ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ گیہوں بھی میرے پیٹ کے لئے اتنا ہی ترستا ہے جتنا کہ میرا پیٹ؟

پھر بھی جب میں سوچتا ہوں کہ زمین نے گیہوں کے خوشوں کو بیکار جنم نہیں دیا ہوگا تو مجھے خوش فہمی ہوتی ہے کہ میرے پیٹ ہی کے لئے وسیع و عریض کھیتوں میں سنہری بالیاں جھومتی ہیں اور پھر ہو سکتا ہے کہ میرا پیٹ پہلے پیدا ہوا ہو اور گیہوں کی یہ بچیاں کچھ دیر کے بعد۔

کچھ بھی ہو لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ دُنیا کا ادب صرف ان دو رشتوں ہی سے متعلق ہے — الہامی کتابیں بھی جن کو آسمانی ادب کہنا چاہئے، روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد کے تذکروں سے خالی نہیں۔

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مسائل اتنے پرانے ہیں کہ ان کا ذکر الہامی کتابوں میں بھی آچکا ہے، تو پھر کیوں آج کے ادیب ان پر خامہ فرسائی کرتے ہیں — کیوں عورت اور مرد کے تعلقات

کو بار بار کُہرایا جاتا ہے اور بقول شخصے عریانی پھیلائی جاتی ہے ــــ جواب اِس سوال کا یہ ہے کہ اگر ایک ہی بار جھوٹ نہ بولنے اور چوری نہ کرنے کی تلقین کرنے پر ساری دنیا جھوٹ اور چوری سے پرہیز کرتی تو شاید ایک ہی پیغمبر کافی ہوتا ــــ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں پیغمبروں کی فہرست خاصی لمبی ہے۔

ہم لکھنے والے پیغمبر نہیں، ہم ایک ہی چیز کو، ایک ہی مسئلے کو مختلف حالات میں مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے دُنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور کبھی مجبور نہیں کرتے کہ وہ اسے قبول ہی کرے۔

ہم قانون ساز نہیں، محتسب بھی نہیں احتساب اور قانون سازی دوسروں کا کام ہے ــــ ہم حکومتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن خود حاکم نہیں بنتے، ہم عمارتوں کے نقشے بناتے ہیں لیکن معمار نہیں۔ ہم مرض بتاتے ہیں لیکن دواخانوں کے مہتمم نہیں۔

ہم جنسیات پر نہیں لکھتے، جو سمجھتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔ ہم اپنے افسانوں میں خاص عورتوں اور خاص مردوں کے جنسی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہمارے کسی افسانے کی ہیروئن سے اگر اس کا مرد صرف اس لئے متنفر ہو جاتا ہے کہ وہ سفید کپڑے پسند کرتی ہے اور سادگی پسند ہے تو دوسری عورتوں کو اسے اصول نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ نفرت کیوں پیدا ہوئی اور کن حالات میں پیدا ہوئی؟ ــــ اس استفہام کا جواب آپ کو ہمارے افسانے میں ضرور مل جائے گا۔

جو لوگ ہمارے افسانوں میں لذت حاصل کرنے کے طریقے دیکھنا چاہتے ہیں، انہیں یقیناً نا امیدی ہوگی ــــ ہم داؤ پیچ بتانے والے خلیفے نہیں۔ ہم جب اکھاڑے میں کسی گرتا دیکھتے ہیں تو اپنی سمجھ کے مطابق آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیوں گرا تھا؟

ہم رجائی ہیں ــــ دنیا کی سیاہیوں میں بھی ہم اجالے کی لکیریں دیکھ لیتے ہیں۔ ہم کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے ــــ چکلوں میں جب کوئی ٹکھیائی اپنے کوٹھے پر سے کسی راہ گذر پر پان کی پیک تھوکتی ہے تو ہم دوسرے تماشائیوں کی طرح نہ تو کبھی اُس رہ گذر پر ہنستے ہیں اور نہ کبھی اُس ٹکھیائی کو گالیاں دیتے ہیں۔ ہم یہ واقعہ دیکھ کر رُک جائیں گے۔ ہماری نگاہیں اُس غلیظ پیشہ ور عورت کے نیم عریاں لباس کو چیرتی ہوئی، اُس کے سیاہ عصیاں بھرے جسم کے اندر داخل ہو کر اُس کے دل تک پہنچ جائیں گی۔ اُس کو ٹٹولیں گی اور ٹٹولتے ٹٹولتے ہم خود کچھ عرصے کے لئے تصور میں وہی کریہہ اور متعفن رنڈی بن جائیں گے صرف اس لئے کہ ہم اس واقعے کی تصویر ہی نہیں بلکہ اُس کے اصل محرک کی وجہ بھی پیش کر سکیں۔

ہم جب کسی ویشیا کو دیکھتے ہیں تو اُس کی ہستی سے عورت کو نوچ کر علیحدہ نہیں کر دیتے ہم بادلوں کے اندر دیکھنے کے عادی ہیں۔

[illegible]

بھاگ جاتی ہے تو ہم اُسے ملعون قرار نہیں دینگے۔ دوسرے اُس لڑکی کا ماضی، حال اور مستقبل اخلاق کی پھانسی میں لٹکا دیں گے لیکن ہم وہ بھونڈی سی گرہ کھولنے کی کوشش کریں گے جس نے اُس لڑکی کے ادراک کو بے حس کیا۔

انسان ایک دوسرے سے کوئی زیادہ مختلف نہیں جو غلطی ایک مرد کرتا ہے، دوسرا بھی کر سکتا ہے جب ایک عورت بازار میں دکان لگا کر اپنا جسم بیچ سکتی ہے تو دنیا کی سب عورتیں ایسا کر سکتی ہیں لیکن غلط کار انسان نہیں وہ حالات ہیں جن کی کھیتیوں میں انسان اپنی غلطیاں پیدا کرتا ہے اور اُن کی فصلیں کاٹتا ہے۔

زیادہ تر جنسی مسائل ہی آج کے نئے ادیبوں کی توجہ کا مرکز کیوں بنے ہیں، اس کا جواب معلوم کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ یہ زمانہ عجیب و غریب قسم کے اضداد کا زمانہ ہے۔ عورت قریب بھی ہے، دور بھی۔ کہیں مادر زاد برہنگی نظر آتی ہے کہیں سر سے لیکر پیر تک ستر۔ کہیں عورت مرد کے بھیس میں دکھائی دیتی ہے کہیں مرد عورت کے بھیس میں

دنیا ایک بہت بڑی کروٹ لے رہی ہے۔ ہندوستان بھی جہاں آزادی کا ننھا منا بچہ غلامی کے دامن سے اپنے آنسو پونچھ رہا ہے، مٹی کا نیا گھروندا بنانے کے لئے ضد کر رہا ہے۔ مشرقی تہذیب کی چولی کے بند کبھی کھولے جاتے ہیں، کبھی بند کئے جاتے ہیں، مغربی تہذیب کے چہرے کا غازہ کبھی ہٹایا جاتا ہے، کبھی لگایا جاتا ہے۔ ایک افراتفری سی مچی ہے۔ نئے کھٹ مٹنے پرانی کھاٹوں کی مونج ادھیڑ رہے ہیں، پرانے کھٹ مٹنے چلا رہے ہیں۔ ملی ہوئی چولوں سے کہیں کھٹمل نکل رہے ہیں، کہیں پسو ــــ کوئی کہتا ہے انہیں زندہ رہنے دو، کوئی کہتا ہے نہیں فنا کر دو ــ اس دھاندلی میں، اس شورش میں ہم نئے لکھنے والے اپنے قلم سنبھالے کبھی اس مسئلے سے ٹکراتے ہیں، کبھی اُس مسئلے سے۔

اگر ہماری تحریروں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا ذکر آپ کو زیادہ نظر آئے تو یہ ایک فطری بات ہے ملک، ملک سے سیاسی طور پر جُدا کئے جا سکتے ہیں۔ ایک مذہب دوسرے مذہب سے عقیدوں کی بنا پر علیحدہ کیا جا سکتا ہے، دو زمینوں کو ایک قانون ایک دوسرے سے بیگانہ کر سکتا ہے، لیکن کوئی سیاست، کوئی عقیدہ، کوئی قانون، عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکتا۔

عورت اور مرد میں جو فاصلہ ہے اُس کو عبور کرنے کی کوشش ہر زمانے میں ہوتی رہے گی۔ عورت اور مرد میں جو ایک لرزتی ہوئی دیوار حائل ہے اُسے سنبھالنے اور گرانے کی سعی ہر صدی، ہر قرن میں ہوتی رہے گی ــــ جو اسے عریانی سمجھتے ہیں۔ اُنہیں اپنے احساس کے ننگ پر افسوس ہونا چاہیئے۔ جو اسے اخلاق کی کسوٹی پہ پرکھتے ہیں، اُنہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اخلاق، زنگ ہے جو سماج کے اُسترے پر بے احتیاطی سے جم گیا ہے۔

جو سمجھتے ہیں کہ نئے ادب نے جنسی مسائل پیدا کئے ہیں، غلطی پر ہیں، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی مسائل نے اس نئے ادب کو پیدا کیا ہے۔ اس نئے ادب کو جس میں آپ کبھی کبھی اپنا ہی عکس دیکھتے ہیں اور جھنجھلا اٹھتے ہیں ــــ

حقیقت خواہ، کتنی ہی بدہیئت کیوں پیش کی جائے اس کی کڑواہٹ دور نہیں ہوگی۔ ہماری تحریریں آنکھ کڑوی اور کسیلی لگتی ہیں مگر اب تک جو مٹھاسیں آمیزش کی جاتی رہی ہیں۔ ان سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟ نمک سے کڑوے ہیں ان کا خود منہ صاف کر سکتے ہیں [illegible]

عندلیب شادانی

اصلی اور بناوٹی ہندی

ہمارے ایک دوست ہیں پنڈت ہرنام داس - ہیں تو بہت اچھے انسان۔ مگر آج کل کی نفاق انگیز ہواؤں کے اثر سے وہ بھی نہ بچ سکے - کبھی اردو کے شیدائی تھے - آج کل ہندی پر جان دیتے ہیں - ایک دن مجھ سے ملنے آئے - مڑی ہوئی ایک کتاب اُن کے ہاتھ میں تھی - میں نے پوچھا "یہ کیا ہے پنڈت جی؟" کہا "آپ کے کام کی چیز نہیں - ہندی کا ایک رسالہ ہے - میں نے کہا "دیکھوں تو - انہوں نے رسالہ میری طرف بڑھا دیا - رسالے کے سرورق کی عبارت کو میں نے ذرا بلند آواز سے پڑھا - پنڈت جی حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگے - اور مسکرا کر بولے "اچھا! آپ کو ہندی آتی ہے؟" - میں نے کہا ہاں تیس برس ہوئے جب ہندی پڑھی تھی اور امتحان بھی پاس کیا تھا - مگر پھر کبھی اس کے مطالعے کا اتفاق نہیں ہوا - قدرتی طور پر بہت کچھ بھول گیا - جی چاہتا ہے - پھر ایک بار اُسے تازہ کر لوں ہندی کا کوئی ایسا رسالہ بتا دیجئے جس کی زبان آسان ہو - انہوں نے کہا "تو پھر یہی "مایا" پڑھ لیجئے یہ کوئی اونچے درجے کا رسالہ نہیں - معمولی لکھے پڑھے لوگوں کے لئے ہے - مگر اس کے مطالعے سے آپ کی ہندی تازہ ہو جائے گی۔

میں نے رسالہ اُٹھا کر رکھ لیا - پنڈت جی چلے گئے - جب کبھی وقت ملتا میں اس رسالے (مایا، الہ آباد بابت ماہ [illegible]) کے چند صفحے پڑھ لیا کرتا - جوں جوں پڑھتا گیا، میری حیرانی بڑھتی گئی اور رسالہ ختم کرنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک پردہ میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گیا۔

ایک دن پنڈت جی پھر آئے - مئی کا مہینہ تھا - رسمی احوال پرسی کے بعد میں نے کہا "پنڈت جی! "مایا" کے لئے میں نے ایک افسانہ لکھا ہے جو درحقیقت میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے - آپ ذرا اُسے سُن لیں اور جو الفاظ آپ کے نزدیک ایسے ہوں کہ ہندی میں اُن کی کھپت نہ ہو سکے انہیں ایک ایک کر کے نوٹ کرتے جائیں تاکہ میں اُنہیں بدل دوں - پنڈت جی نے کہا سنائیے-

میں نے کاغذ اور فاؤنٹین پن ان کے سامنے رکھ دیا اور افسانہ پڑھنا شروع کیا۔

شاہی انعام

وطن اور قوم کی بھلائی چاہنے والوں کی کوششوں سے ہندوستانیوں میں ہندو مسلم فساد کا تماشا یوں تو ہمیشہ اور ہر جگہ ہی ہوتا رہتا ہے لیکن خدا نہ کرے کہ مارچ سنہ ۴۱ء کی سترھویں تاریخ کو پیر کے دن ڈھاکا میں، ہندو مسلم فساد کی بدولت اِن آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ زندگی میں کبھی کسی کو دیکھنا نصیب ہو۔

یوں تو پریشان کرنے والی بازاری خبریں کئی روز سے اڑ رہی تھیں لیکن ایسا بھی خیال نہ تھا۔ کہ جوالا مکھی پہاڑ اس طرح اچانک پھٹ پڑے گا۔ اور آگ، خون اور موت کا طوفان سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ہنگامہ تو دوپہر سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن دن کے چار بجتے بجتے یہ حالت ہو گئی جیسے برٹش راج ختم ہو گیا اور امن و امان کا نشان تک باقی نہیں رہا۔ زمین سے آسمان تک جدھر دیکھئے آگ ہی آگ دکھائی دیتی تھی۔ دھوئیں کے بادل سارے شہر پر چھا گئے تھے گھر جل رہے تھے۔ دکانیں جل رہی تھیں۔ تالوں پر ہتوڑے بج رہے تھے۔ دروازے توڑے جا رہے تھے۔ بازار لُٹ رہے تھے۔ پوری حیوانیت کے ساتھ ہر چیز برباد کی جا رہی تھی۔ معصوم انسان قتل ہو رہے تھے۔

کسی نے پیچھے سے چھری بھونک دی۔ کسی نے لوہے کے ڈنڈے سے سر پھاڑ دیا۔ کوئی خون میں نہایا ہوا آہ کر کے یہاں گرا۔ کوئی وہاں گرا۔ کسی کی آنتیں پیٹ سے نکل پڑیں۔ کہیں کوئی زخمی پڑا سسک رہا ہے۔ کہیں کوئی لاش پڑی ہے۔ کتنے بدنصیبوں کو کفن تک میسر نہ ہوا۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اللہ اکبر اور بندے ماترم کے نعرے سنائی دیتے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ ہنگامہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے کانپ رہے تھے۔ کسی کی جان، مال، عزت کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ گورنمنٹ کی تمام ذمہ داریاں ختم ہو چکی تھیں۔ ہر شخص کو پوری پوری آزادی تھی کہ جو اس کا جی چاہے سو کرے۔ انسان جنگلی جانوروں سے بدتر ہو گئے تھے۔ دوست دشمن میں کوئی فرق باقی نہیں رہا تھا۔ اِکّا دُکّا مسلمان یا ہندو، بھولا بھٹکا، دشمنوں کے محلے میں پہنچا۔ اور موت کا شکار ہوا۔

اور پھر یہ مرنے والے تھے کون؟ اکثر بے خطا، بے قصور لوگ۔ پردیسی۔ مسافر، غریب۔ کوئی گھاس بیچنے والا کوئی گاڑی ہانکنے والا۔ کوئی بھیک مانگنے والا۔ کوئی پاگل۔ کوئی اپاہج۔ ایک بدقسمت غریب۔ دیہاتی سرکاری ہسپتال سے مفت کی دوا لینے آیا تھا۔ نسخہ اور دوا کی ٹوٹی

ہوئی شیشی اس کی لاش کے پاس پڑی ہوئی ملی۔ دین داروں نے مذہب کی خاطر حیوانیت کے وہ کارنامے پیش کئے کہ رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ انہوں نے فقط بوڑھے مردوں ہی پر ہاتھ صاف نہیں کیا۔ بلکہ بوڑھی عورتوں اور کم سن معصوم بچوں کا خون بہانا اپنا دینی فرض سمجھا اور سب سے زیادہ قیمتی یعنی انسانی قربانی پیش کرکرکے اپنے دیوتاؤں کو خوش اور اپنے خدا کو راضی کیا۔

ہندو مسلم بلوائیوں کے گروہ دشمن کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے مگر اب تک انہوں نے جم کر ایک دوسرے کا مقابلہ کہیں نہیں کیا تھا۔ غنڈوں اور بدمعاشوں کی بن آئی تھی۔ اِن شیطانوں کے زیر اثر بہت سے آوارہ، نالائق اور بیکار لوگ لوٹ مار میں شامل ہو گئے تھے علاوہ مردوں کا تو ذکر ہی کیا، عورتیں تک لٹی ہوئی دکانوں سے چھوٹی موٹی چیزیں اُٹھائے جا رہی تھیں۔ طرفہ لطف یہ کہ پولیس اور فوج کے سپاہی ہر خطرناک جگہ پر تعینات تھے اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ یہ کھڑے دیکھتے ہی رہے اور دکانوں میں سے مال غائب ہو گیا۔ دن دہاڑے ان کی آنکھوں کے سامنے خون ہو رہے تھے وہ نہایت بے پروائی بلکہ بے دردی کے ساتھ یہ تماشا دیکھتے تھے اور کسی سے کچھ نہ کہتے تھے۔ یہ ہنگامہ ان کے لئے ایک اچھا خاصا تفریح کا شغل تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ سے اس کے عادی ہیں۔ اور ان کا فرض اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ لوٹ مار کرکے جب کوئی چوری کا مال لے کر ان کے سامنے سے گذرے تو اُسے روک لیں اور جو چیز انہیں اچھی لگے وہ بے تکلف اس سے رکھوا لیں۔ اس سے انہیں کچھ بحث نہ تھی کہ لانے والا کہاں سے لایا اور کس طرح لایا۔

میں اس وقت ملکہ بیگم بازار روڈ پر رہتا تھا۔ بیگم بازار مسلمانوں کا محلہ ہے۔ اس لئے میرا گھر ہر قسم کے خطرے سے بچا ہوا تھا۔ میرے مکان کی بغل ہی میں بنئے کی ایک دکان تھی۔ چودہ پندرہ آدمی اس دکان پر کام کرتے تھے۔ اسی سے سمجھ لیجئے کہ کاروبار کتنا بڑا تھا۔ گھر میں اس وقت ہم صرف دو آدمی تھے۔ ایک میں اور دوسرا میرا نوکر "سلارو"۔ مکان کی دوسری منزل میں ہم لوگ رہتے تھے۔ رات ہو گئی۔ اندھیرے میں آسمان تک پہنچنے والی آگ اور بھی زیادہ بھیانک معلوم ہوتی تھی۔ رات کے دس بج گئے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھے پہرا دے رہے تھے۔ میں بھی برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ سلارو لالٹین ہاتھ میں لئے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ادھر کی چھتوں پر نظر ڈال لیتا تھا۔ یکایک برابر کی چھت پر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے کان کھڑے کئے۔ سلارو فوراً ادھر جھپٹا اور منڈیر پر سے جھک کر نیچے کی طرف دیکھا۔ کسی سے کچھ کھسر پھسر کی۔ پھر میرے پاس آیا اور کہا۔ "میاں! دکان والے لالہ اصان کے آدمی کہتے ہیں کہ ہماری جان خطرے میں ہے۔ اپنے صاحب سے کہو کہ رات ہمیں اپنے گھر میں چھپا لیں"

عمر بھر احسان نہ بھولیں گے۔"

اس وقت یہ لوگ واقعی میری مدد کے محتاج تھے اور انسانی ہمدردی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ کہ ہم اُنہیں اپنے گھر میں پناہ دیں۔ لیکن یہ کام خطرے سے خالی نہ تھا میں نے کہا۔ "سلارو! اگر کسی نے ان لوگوں کو ہمارے گھر میں آتے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ یہ تو مارے جائیں گے لیکن ہم پر بھی آفت آئے گی۔ سارے محلے سے دشمنی ہو جائے گی۔ اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوگا۔ وہ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ہمارے گھر میں آئیں گے کس طرح۔ دروازے کی طرف سے تو آ نہیں سکتے۔ سڑک پر نکلے اور مارے گئے۔ ہمارا مکان دو منزلہ، اُن کا ایک منزلہ۔ کوئی سیڑھی بھی نہیں جو چڑھ کر آ جائیں"۔ سلارو نے چپکے چپکے یہ باتیں اُن سے کہہ دیں۔ انہوں نے کہا۔ "ہماری چھت پر بہت سے خالی صندوق پڑے ہیں۔ انہیں کو نیچے اوپر رکھ کر اوپر چڑھ آئیں گے۔" میں اجازت دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ان لوگوں کو میرے گھر میں دیوار پر سے اُترتے ہوئے کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ سلارو نے کہا "میاں! خدا پر نظر رکھئے۔ ان لوگوں پر وقت پڑا ہے۔ ان کی ضرور مدد کیجئے۔ خدا آپ کی مدد کرے گا۔ آخر میں نے ہمت کی اور کہہ دیا کہ اچھا آنے دو۔

ان لوگوں نے نیچے اوپر صندوق رکھ کر ایک سیڑھی سی بنائی اور ایک ایک کر کے سات آدمی برآمدے کی چھت پر چڑھ کر آنگن میں اُتر آئے۔ آخری آدمی اترتے وقت گھبراہٹ میں گر پڑا۔ فوراً ایک محلے والے نے آواز دی "سلارو بھیا! یہ دھم سے کیا گرا؟" اس سوال سے میں تو سٹ پٹا گیا۔ لیکن سلارو کا دماغ حاضر تھا۔ اُس نے فوری جواب دیا۔ "بھیا! میں خود ہی گر پڑا۔ چھت پر چڑھ رہا تھا" بات ختم ہوئی۔ مجھے بھی اطمینان ہوا۔

یہ سب لوگ بھوکے تھے۔ میں نے کہا۔ میں جانتا ہوں آپ لوگوں کی غذا چاول ہے۔ مگر چاول اس وقت گھر میں موجود نہیں اور کہیں سے مہیا بھی نہیں ہو سکتا، البتہ دال آٹا، نمک مرچ، گھی تیل وغیرہ سب سامان موجود ہے۔ پکائیے اور کھائیے۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ میں نے دالان میں دری کا فرش کرا دیا۔ اس پر وہ لوگ لیٹ گئے۔ سویا تو کوئی نہیں لیکن مُردوں کی طرح چپ چاپ پڑے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ سلارو نے کہا۔ "میاں! اب آپ بھی لیٹ جائیے میں جاگ رہا ہوں" نیند کے مارے میری بُری حالت تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ شاید ایک گھنٹہ سویا ہوں گا کہ اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ وہ لوگ آپس میں کچھ کانا پھوسی کر رہے ہیں اور سلارو دیوار کے پاس بیٹھا لالٹین ہاتھ میں لئے اونگھ رہا ہے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ ہمارے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر رہے ہیں۔ ہم دو ہیں اور یہ سات۔ اگر ان کی نیت بگڑ جائے تو ہم دونوں کو بڑی سہولت اور صفائی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیں۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

میری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے پلنگ کے قریب ہی کوئی شخص کھڑا ہے۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ مگر میرا خیال غلط تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ ہوا یہ کہ میرے کمرے میں قدِ آدم آئینہ رکھا ہوا تھا۔ ایک آدمی کسی ضرورت سے اُٹھا تھا۔ آئینے میں اس کا عکس پڑا۔ اسی نے مجھے ڈرا دیا۔ توبہ! اس رات کو میں کتنا ڈرپوک ہو گیا تھا۔ اپنی بدگمانی پر مجھے خود ہی شرم آئی۔ میں نے اپنے جی میں کہا۔ "کچھ بھی ہو۔ انسان آخر انسان ہے۔ اتنا ذلیل کبھی نہیں ہو سکتا کہ اپنی جان بچانے والے کے ساتھ دھوکا کرے۔ میں پھر لیٹ گیا۔ اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔ باقی رات ...... آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔

ابھی اندھیرا ہی تھا اور پورے طور پر صبح نہ ہونے پائی تھی۔ کہ پھر وہی شور و غل، وہی ہنگامہ شہر بھر میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ رات ہی رات میں کئی خوبصورت اور شاندار عمارتیں راکھ کا ڈھیر بن چکی تھیں۔ شام کو محل، صبح کو کھنڈر۔ سچ مچ کتنے لاکھ کے گھر خاک ہو گئے۔ اسی وقت دیوار کے پیچھے پھر کچھ کھٹکا ہوا۔ سلارو نے جھانک کر دیکھا سلالا کے باقی چھ آدمی ہاتھ جوڑ کر زمین پر ناک رگڑنے لگے۔ کہ خدا کے واسطے ہمیں بھی بچاؤ۔ اس وقت ان لوگوں کا چھت پر چڑھ کر ہمارے گھر میں آنا رات سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ مگر خیریت یہ ہوئی کہ کچھ لوگ تو صبح کی نماز کے لئے مسجدوں میں گئے ہوئے تھے۔ اور کچھ اپنی دوسری مزدوریوں سے ابھی فارغ نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے ان آدمیوں کو دیوار پر چڑھتے اور ہمارے گھر میں اُترتے کسی نے نہیں دیکھا۔

اس وقت ان لوگوں کی حالت رحم کے قابل تھی۔ صورت دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آدھی جان نکل چکی ہے۔ چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ قدم ڈگمگاتے تھے۔ زبان ڈگمگاتی تھی۔ صاف لفظ منہ سے نہیں نکلتے تھے۔ رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ ذرا سا کھٹکا ہوا اور کانپنے لگے۔ ہوش ٹھکانے نہ تھے۔ ایک آدمی نے بہت سے نوٹ دھوتی میں لپیٹ کر اپنی کمر سے باندھ رکھے تھے۔ گانٹھ شاید کچھ ڈھیلی تھی۔ دیوار سے اُترنے میں کھل گئی اور نوٹوں کا مٹھا نکل پڑا۔ بس یہ معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کی جان نکال لی۔ اُسے غش سا آ گیا۔ وہ خود بھی نوٹوں کے اس مٹھے پر گر پڑا۔ سلارو نے جھپٹ کر اُسے سہارا دیا۔ اور کھڑا کیا۔ پھر جھک کر نوٹوں کا مٹھا اُٹھانے لگا۔ نوٹوں کے مالک کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ اُف! کس قدر بھیانک ہو گئی تھی اُس کی صورت۔ شاید اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ لٹ گیا۔ میں نے وہیں سے پکارا۔ خبردار سلارو! تم ہاتھ نہ لگانا۔ اس نے کہا میاں جی میں تو اُٹھا کر دے رہا تھا۔ میں نے کہا تمہیں اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لالا خود اٹھا لیں گے۔ لالا نے نوٹوں کا بنڈل اٹھا لیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان نوٹوں کے گر پڑنے سے وہ سب لوگ بہت پریشان ہو گئے۔ میرا

خیال ہے کہ اور بھی چند لوگوں کے پاس نوٹ تھے۔ ایک شخص کے ہاتھ میں ریشمی رومال کی ایک پوٹلی اور چیک بک تھی۔ دوسرے کی قمیص کی جیب بہت پھولی ہوئی تھی۔ تیسرے نے کرتے کے دامن میں کچھ لپیٹ رکھا تھا۔ ما گھبرا کر اوروں کے پیچھے جا چھپا۔ شاید انہیں یہ اندیشہ تھا کہ میں اور سلامت ان سب کا بھانڈا پھوڑ دوں گے اور ان کی ساری دولت ان سے چھین لیں گے۔ اور لوٹنے کے بعد انہیں قتل بھی کر دیں گے۔ تاکہ لوٹ کا بھید کھلنے نہ پائے۔ ایک آدمی گردن جھکائے بیٹھا رو رہا تھا۔ میں نے کہا بھائی خدا کو یاد کرو۔ گھبراؤ نہیں۔ اس نے کہا ابھی حضور ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔ نوکری کرنے کانپور گئے تھے وہاں بھی رائٹ (RIOT) ہو گیا تھا۔

دن کی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا "اب آپ لوگ برابر والے کمرے میں چلے جائیے ممکن ہے برآمدے میں کوئی آپ کو دیکھ لے۔" وہ سب کمرے میں چلے گئے۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے وقت ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ میں نے کہا کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں سب بند کر لیجئے اور آرام و اطمینان سے بیٹھئے۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ رات تو جوں توں کٹ گئی اور کسی کو کچھ پتا نہ چلا مگر دن کیونکر گزرے گا۔ اور کس طرح یہ لوگ صحیح سلامت یہاں سے کسی دوسری جگہ پہنچائے جا سکیں گے۔ میں نے بہت غور کیا۔ مگر اس مشکل کا کوئی حل سمجھ میں نہ آیا۔ یوں عجیب و غریب باتیں تو بہت سی دماغ میں آئیں لیکن معقول تدبیر کوئی نہ سوجھی۔ ان لوگوں نے کہا کہ کسی صورت سے آپ ہمیں اسٹیشن پہنچا دیجئے۔ ہم مین سنگھ چلے جائیں گے۔ ان میں سے اکثر مین سنگھ کے رہنے والے تھے۔ مگر اسٹیشن تک پہنچیں تو کیونکر۔

سلامت نے کہا "میاں! دو گھوڑا گاڑیاں لے آتا ہوں۔ اُن کے پٹ چڑھا دیں گے۔ کوچبان کے برابر میں بیٹھ جاؤں گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ صاحب کے گھر کی سواریاں جا رہی ہیں۔" میں نے کہا "ارے اُلو لوگ کیا اتنے بیوقوف ہیں کہ اس طرح فریب کھا جائیں گے؟ انہیں یہ خیال نہ آئے گا کہ صاحب تو اکیلے رہتے ہیں۔ رات ہی رات میں یہ اتنی پردہ نشین عورتیں گھر میں کہاں سے آ گئیں؟ یہ سب تو بیکار باتیں ہیں۔ تو ایک کام کر۔ سائیکل لے اور وائس چانسلر صاحب کے یہاں چلا جا۔ میں خط میں بھی لکھے دیتا ہوں اور تو زبانی بھی کہہ دینا کہ تیرہ ہندو ہمارے گھر میں پوشیدہ ہیں۔ انہیں کسی طرح اسٹیشن پہنچائیے۔ اور اگر آپ کچھ نہ کر سکیں تو اپنی کار بھیج دیجئے تاکہ میں خود جا کر کمشنر اور کلکٹر سے ملوں۔ اور ان لوگوں کو کہیں بھیجنے کا انتظام کروں۔ اور ہاں آپ سے یہ بھی پوچھنا کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ جلدی میں کاغذ اور لفافہ بھی نہ ملا۔ اشتہار کا ایک پرچہ میز پر پڑا ہوا تھا۔ اسے اٹھا کر اسی کی پیٹھ پر خط لکھ دیا۔

سلامت نے بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لیا۔ اس وقت اپنے محلے سے باہر جانے میں جان کا

خطرہ تھا۔ مگر اُس نے پروا نہ کی۔ دن کے آٹھ بجے تھے۔ سلارو کو اس طرف روانہ کرنے کے بعد میں لالہ لوگوں کے پاس گیا۔ وہ بہت گھبرا رہے تھے۔ میں نے ان کی ڈھارس بندھائی اور پھر دالان میں آکر ٹہلنے لگا۔ تنہائی کی وجہ سے میرا جی بھی گھبرا رہا تھا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر مرحوم والی کوٹھی کچھ ایسی دُور نہ تھی۔ سائیکل پر جانے آنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ خرچ نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر نو بج گئے اور سلارو کا کہیں پتا نہیں۔ ساڑھے نو بجے۔ دس بجے مگر سلارو نہ آج آتا ہے نہ کل طرح طرح کے خیالات میرے دماغ میں آ رہے تھے۔ میں حیران و پریشان بیٹھا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں گیا۔ محلے کے چند بے فکرے سلارو سے ملنے آئے تھے کیا خوب ملاقات کا اچھا وقت نکالا۔ ساڑھے دس بج گئے۔ سلارو پر مجھے غصہ آ رہا تھا کہ کم بخت کہاں جا کر بیٹھ رہا۔ پھر خود ہی جی میں کہتا، میں ناحق اس پر ناراض ہو رہا ہوں۔ خدا جانے کیا بات ہے اس کی جان کی خیر ہو۔ دل ہی دل میں اس کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔

ٹھیک گیارہ بجے سلارو واپس آیا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اور پسینے پسینے ہو رہا تھا اس نے کہا، جاتے وقت تو میں خیریت سے چلا گیا لیکن لوٹتے ہوئے راستے میں کئی بار ہندوؤں نے میرے اوپر حملہ کیا۔ حملہ کرنے والوں کی تعداد پندرہ بیس سے کم نہ تھی۔ میں بڑی تیزی سے بھاگا تب کہیں جان بچی۔ آخری بار تین ہندوؤں نے مجھے گھیرا۔ خدا کی شان! اسی دم نتھو لال (ہمارا وصیلی) اور اُس کے دونوں بیٹے وہاں آ پہنچے۔ انہوں نے میری حمایت کی۔ پہلے تو ان لوگوں کو منع کیا۔ کہ میرے اوپر ہاتھ نہ چھوڑیں۔ مگر جب دیکھا کہ ان کا ارادہ کچھ اور ہے تو ہم سب نے قریب کی ٹال سے لکڑیاں اٹھالیں۔ اس پر وہ لوگ چلے گئے اور نتھو لال اور اس کے بیٹے مجھے ہندو محلے کے ختم تک پہنچا گئے۔

ڈاکٹر مرحوم والے وائس چانسلر کو جس وقت میرا خط ملا وہ ناشتا کر رہے تھے۔ کچھ دیر تو اس میں لگی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر باغ کے بارے میں اپنے مالی کو کچھ سمجھانے لگے۔ اور اس کے بعد اسی قسم کے کسی دوسرے "ضروری" کام میں لگ گئے۔ ان کاموں سے جب فرصت ہوئی تو اطمینان سے کلکٹر کو ٹیلیفون کیا۔ آخر ایسی جلدی بھی کیا تھی۔ کلکٹر صاحب بہادر، اس خاص اور نازک موقع کے لحاظ سے وائس چانسلر صاحب سے بھی زیادہ مستعد ثابت ہوئے یعنی نو بجے اُنہیں اطلاع ملی اور پورے بارہ بجے انہوں نے ایک اعلیٰ افسر کو ہتھیار بند گارڈ کے ساتھ میرے یہاں بھیج دیا۔

کار جس وقت میرے مکان کے قریب آکر رکی تو محلے کے بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ محلے والے آج تک میرا بہت خیال کرتے تھے۔ افسر نے ایک سپاہی کو تو کار کی چوکسی کے لئے تعینات کیا اور باقی تین سپاہیوں کو لے کر میرے دروازے پر آئے۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ سلارو نیچے گیا اور آکر مجھے اطلاع دی کہ جنٹ صاحب ہیں۔ محلے والوں کی بھیڑ

بڑھتی جارہی تھی۔ وہ تعجب اور بدگمانی کی نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید میری بابت کسی نے مخبری کی ہے۔ مجھ پر کوئی تہمت لگائی ہے اور جنٹ صاحب مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔ اسلامی ہمدردی کے جذبات ان کے سینے میں مچلنے لگے۔ اور انہوں نے قطعی طور پر طے کرلیا کہ اگر جنٹ صاحب مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہیں تو وہ اُن پر اور اُن کے ساتھیوں پر حملہ کردیں۔ میں نیچے آیا۔ لوگ اب سمٹ کر بالکل دروازے کے قریب آگئے۔ جنٹ صاحب نے مجھے دیکھتے ہی انگریزی میں کہا۔ "ہلو ڈاکٹر شاھانی! یہ سب کیا ہنگامہ ہے۔ یہ اتنے ہندو تمہارے گھر میں کیسے آچھپے۔ اور یہ ہیں کون لوگ؟" میں سٹ پٹا گیا۔ میں نے کہا۔ خدا کے لئے چپ رہیے۔ اندر آکر باتیں کیجئے۔ وہ اور اُن کے دو ساتھی اندر آگئے۔ میں نے دروازہ بند کرلیا۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ جنٹ مسٹر رائے، آئی سی ایس تھے۔ میری ان کی ولایت کی ملاقات تھی۔ میں نے مسٹر رائے کو سارا قصہ سُنایا۔ انہوں نے کہا "آپ نے تو کمال کردیا"۔ پھر کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ آخر یہ طے پایا کہ ان لالا لوگوں کو موٹر میں بٹھا کر اسٹیشن پہنچا دیا جائے۔ ایک لالا جو دکان کے مالکوں میں سے تھے چلتے وقت میرے کمرے میں آئے۔ ہاتھ جوڑ کے سو روپے کا ایک نوٹ میرے سامنے رکھا اور کہنے لگے:۔ "عرض یہ ہے کہ حضور نے ہماری جان بچائی ہے۔ ہم آپ کے بہت احسان مند ہیں۔ ہم سب کی طرف سے یہ نذرانہ قبول فرمالیجے"۔ میں نے کہا لالا! میں نے سو روپے کے لالچ سے آپ کی جان نہیں بچائی۔ نوٹ اپنے پاس رکھیے۔ آپ کے کام آئے گا۔" کتنے کم حوصلہ اور پست خیال تھے یہ لوگ! سات روپے گیارہ آنے ایک پائی کو ایک جان کا معاوضہ یا قیمت سمجھتے تھے! خوب! اور بہت خوب! میرے مکان سے نکل کر یہ لوگ موٹر کی طرف اس طرح جھپٹے جیسے کوئی قیدی جیل سے رہا ہو کر اپنے گھر کی راہ لے موٹر میں چار آدمیوں سے زیادہ بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ مگر مسٹر رائے نے زبردستی سات آدمیوں کو اس میں ٹھونس دیا۔ اس طرح دو پھیروں میں وہ لوگ اسٹیشن پہنچائے گئے۔

محلہ والوں کو اب معلوم ہوگیا کہ بات کیا تھی۔ مسٹر رائے کے جانے کے بعد وہ لوگ اکٹھے ہو کر میرے پاس آئے۔ وہ بہت غصے میں بھرے ہوئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ لڑنے کے ارادے سے آئے ہیں۔ میں نے کہا اندر تشریف لے آئیے۔ مگر وہ دروازے ہی پر کھڑے رہے۔ ایک شخص بولا۔ کیوں جناب یہ آپ نے کیا کیا؟ ابھی میں کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ دوسرا برابر سے بولا بڑے مسلمان ہیں آپ۔ مسلمان تو کافروں کے ہاتھ سے کتے بلی کی طرح مارے جا رہے ہیں اور آپ نے ان حرامزادوں کو اپنے گھر میں چھپایا۔ تیسرے نے آگے بڑھ کر کہا: کاش ہمیں پہلے سے خبر ہوتی۔ ہمیں تو اب معلوم ہوا ہے کہ یہی مردود "رائے" تھا۔ کل اسی کے حکم سے فائرنگ ہوا۔ اور خود اس نے چار بے گناہ مسلمانوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ اگر ذرا دیر پہلے بھی ہمیں پتہ چل جاتا تو قسم قرآن کی اس کافر بچے

کو ہیں ٹھنڈا کر دیتے ۔

میں نے کہا: اگر آپ ایسا کرتے تو غلطی کرتے ۔ طاقت کا استعمال ہر موقع پر صحیح نہیں ہوتا۔ آپ لوگ نہتے تھے ۔ اُن کے پاس بندوقیں اور تمنچے تھے ۔ خدا جانے کتنوں کی جانیں جاتیں اور کتنے آباد گھر برباد ہو جاتے ۔ اس نے کہا: خوب ۔ جیسے ہم تو مٹی یا گھاس پھونس کے بنے ہوئے ہیں ۔ مگر اب کچھ کہنا فضول ہے ۔ موقع ہاتھ سے نکل گیا ۔ ورنہ دکھا دیتے ۔ اس کو بھی دیکھ لیتے اور اُس کے حمایتی کو بھی دیکھ لیتے ۔" ایک اور شخص سب کے پیچھے سے بولا: "ہائے! وہ رنڈا یوسف کیسا مارا گیا کمبخت پہ ابھی پوری جوانی بھی تو نہیں آئی تھی ۔ ماں نے کیسے ارمان سے شادی کی تھی ۔ دوسرے نے کہا: ہاں، مگر عقد ہی ہوا تھا ۔ رخصت نہیں ہوئی تھی ۔ دلہن بے چاری تو بیاہ ہونے سے پہلے ہی بیوہ ہو لی ۔ ان باتوں سے لوگوں کے جذبات اور بھی بھڑک اُٹھے ۔ میں چپ کھڑا سن رہا تھا ۔

ایک بزرگ میری طرف گھور کر فرمانے لگے ۔ یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا مگر آپ نے بڑا دین کا کام کیا۔ ی اسلام کی خدمت فرمائی ۔ اللہ رسول آپ سے بہت خوش ہوں گے ۔ آپ نے تو دنیا ہی پر جنت لی ۔ دوسرا بولا ۔ اچھا یہ تو فرمائیے آپ کو اس سے فائدہ کیا ہوا؟ کوئی تخت ملے گا؟ تاج ملیگا؟ معاوضہ آخر کیا ملے گا؟ تیسرے نے کہا: فائدہ کیوں نہیں ہوا ۔ اخباروں میں نام چھپے گا ملکوں وں مشہور ہو جائیں گے ۔" ایک بدتمیز لڑکے نے کچھ اور بھی جہالت کی باتیں کیں ۔ غصہ تو مجھے بہت ۔ جی چاہا کہ ایک طمانچہ اس کے منہ پر ماروں مگر موجودہ حالات کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے صبر و برداشت سے کام لیا ۔ ان کے کسی اعتراض کا جواب دینا محض بے سود تھا ۔ ایسی بے معنی باتوں کا جواب دینے سے چپ رہنا ہی بہتر تھا ۔ میں نے انہیں دعا کرنے کے لئے کہا ۔ مجھے بہت افسوس بلکہ رنج ہے کہ نے ایسا کیوں کیا ۔ آپ سچ کہتے ہیں ۔ بیشک مجھ سے زبردست غلطی ہوئی ۔ میں نے اس وقت نہیں کیا تھا ۔ اور خدا گواہ ہے یہ تو مجھے ابھی معلوم ہوا کہ اس کم بخت راکھے نے کل چار مسلمان شہید کیا ۔ مجھے اپنی اس حرکت پر خود شرم آ رہی ہے ۔ خدا میرے گناہ کو معاف کرے ۔ ر آپ لوگ بھی معاف کر دیجئے ۔ سچ کہتا ہوں اگر مجھے یہ خبر ہوتی کہ مسلمان اس طرح مارے گئے ارے جا رہے ہیں تو میں ان کافروں میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا ۔ اور اب آپ سے رش ہے کہ اگر کہیں سے کوئی ہندو ہاتھ آجائے تو اُسے یہاں لے آئیے ۔ میری دلی تمنا ہے یں اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کروں ۔ اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب زندگی بھر کسی [illegible]

ایک شخص نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا: اب آپ ہمیں بہلائیے مت ۔ ہم بچے نہیں ہیں ۔ مگر نے اچھا نہیں کیا ۔" وہ لوگ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے ۔ اور میں بھی دروازہ بند کر کے واپس آگیا دن کے بعد ایک [illegible] شہر میں امن و امان [illegible] لوگ اپنے معمول کاروبار میں لگ گئے بلکہ

بھی میں نے محسوس کیا کہ محلے والوں کے دلوں میں میری جو عزت تھی وہ اس دن کے بعد سے کافور ہو چکی تھی۔ میں نے جس چیز کو انسانی فرض سمجھا تھا وہ میرے لئے بلائے جان ہوگئی۔ اور مجھے اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ جب میں باہر نکلتا تو ایک دکان دار دوسرے کو آواز دے کر کہتا: "سنا ہے کافروں کو اپنے گھر میں چھپانے والوں کو جاگیر ملے گی۔" دوسرا جواب دیتا: "ہاں، اور خان بہادری کا خطاب بھی۔ اور پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ۔" تیسرا کہتا: "اسے تنخواہ نہیں پنشن (Pension) کہتے ہیں۔" چوتھا کہتا: "اور خدا کے یہاں جنت بھی۔" پھر سب مل کر قہقہہ لگاتے۔ میں چپ چاپ اس کوچے سے گزر جاتا۔

روزمرہ محلے والے کوئی نہ کوئی حرکت میرے خلاف ضرور کرتے تھے مگر میں نے گوارا نہ کیا کہ بزدلوں کی طرح گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ ان لوگوں نے جب دیکھا کہ یہ شخص بڑا ہی ڈھیٹ اور ضدی ہے تو میرے بائیکاٹ کی ٹھہرائی، اور اس بارے میں دو چار مسئلے جاننے والے ایک ٹٹ پونجیے مولوی سے جس کے بزرگ کسی زمانے میں شہر کے قاضی رہ چکے تھے۔ فتویٰ بھی منگوا لائے مسجد کے مُلّا نے اس پر مُہر کر دی۔ چلئے بائیکاٹ کا انتظام مکمل ہوگیا۔ اب ایک منٹ کے لئے بھی اس محلے میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا اس لئے اس سے پہلے کہ وہ لوگ اس قسم کی کوئی کارروائی کریں میں وہاں سے اُٹھ گیا اور اچھا مکان نہ ملنے کی وجہ سے کئی سال تک بہت تکلیف اُٹھائی۔

فساد کی آگ جب ذرا دھیمی ہوئی تو گورنمنٹ کی طرف سے اعلان ہوا کہ سارے شہر پر تعزیری ٹیکس (Punitive Tax) لگایا جائے گا۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں نے کمشنر کے یہاں عرضی دی کہ ہم لوگوں کو فساد سے کیا واسطہ۔ ہم نے تو فساد کو دبانے اور ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس لئے ہم لوگوں سے یہ ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔ جواب ملا کہ ہر شخص الگ الگ ٹیکس کی معافی کے لئے عرضی دے۔ اس پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا جائے گا۔ سرکار کے اس وعدے سے یہ امید کچھ بیجا نہ تھی کہ کم سے کم یونیورسٹی والے اس جرمانے سے بچ جائیں گے۔ میں نے بھی عرضی دی اور اس میں یہ لکھا کہ: "میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر تیرہ ہندوؤں کی جان بچائی۔ سارے محلے کو اپنا دشمن بنایا۔ اور اسی کی بدولت مجھے محلہ چھوڑ کر بھاگنا اور بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ گواہی اور ثبوت کی ضرورت ہو تو ڈاکٹر سر حیم دارا وائس چانسلر ڈھاکا یونیورسٹی اور مسٹر ... ڈسٹرکٹ کلکٹر موجود ہیں۔" عرضی پر پوری ہمدردی کے ساتھ غور کرنے کے بعد سرکار نے جو فیصلہ کیا اس کی اطلاع میرے پاس بھیج دی۔ لکھا تھا: "تمہیں آدھا ٹیکس معاف کیا گیا۔"

میں اس شاہی انعام کی اطلاع پاکر دنگ رہ گیا۔ بلکہ مزہ آگیا۔ واقعی گورنمنٹ نے مجھ پر بڑی عنایت کی کہ آدھا ٹیکس یعنی جرمانہ معاف کر دیا۔ ورنہ جو قصور میں نے کیا تھا اس کی سزا اس

سے زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔ آخر میں نے تیرہ ہندوؤں کو ساری رات اور آدھے دن اپنے گھر میں بند رکھا تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ میرے اوپر حبس بیجا کا الزام قائم کر کے مجھ پر مقدمہ چلایا جاتا اور مجھے قید یا بھاری جرمانے کی سزا دی جاتی۔ آخر گورنمنٹ کا قانون کس دن کے لئے اور کس مرض کا علاج ہے اگر بے قصور لوگوں سے جرمانے وصول نہ کئے جائیں تو گورنمنٹ کے خزانے کس طرح بھریں۔ میں نے اپنے دل میں سرکار کی قدردانی کا شکریہ اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں بہت سستا چھوٹا۔ ورنہ خدا جانے مجھ پر کیا مصیبت آتی اور میں کہاں کہاں کھنچا کھنچا پھرتا۔

جن لوگوں کو زندگی کا کوئی تجربہ نہیں انہیں اس معاملے سے سبق لینا چاہیئے۔ میں تو اپنی اولاد کو وصیت کر جاؤں گا۔ کہ انسانی ہمدردی کے جذبے سے مجبور ہو کر اگر کبھی ان کے دل میں کسی کی جان بچانے کی خواہش پیدا ہو تو انہیں کم سے کم جرمانے کی سزا بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ کیونکہ ہماری مہربان گورنمنٹ اپنے قانون کے مطابق سوشل سروس کا اتنا ہی معاوضہ دیتی ہے اور حق یہ ہے کہ اس سے بہتر انعام اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

افسانہ ختم کرنے کے بعد میں نے پنڈت جی کا کاغذ دیکھا تو دونوں طرف سے سیاہ۔ شمار کیا تو دو کم چار سو الفاظ نکلے۔ میں نے کہا، پنڈت جی اس طرح تو یہ افسانہ بالکل بیکار ہے۔ انہوں نے کہا ہاں "مایا" کے لئے تو بیکار ہی ہے۔ نہ کوئی پڑھ سکے گا۔ نہ سمجھ سکے گا۔ آپ نے بھی تو غضب ہی کیا کہ چن چن کے عربی فارسی کے بھاری بھاری پتھر ہندی کی نازک پھلواری میں لڑھکا دیئے۔ لفظ تو لفظ فارسی اضافتیں اور ترکیبیں تک ٹھونس دیں۔ بھلا، بلائے جان اور زیر اثر اور قید آدم اور احسان مند وغیرہ کی ہندی میں کہاں گنجائش ہے۔ میں نے کہا آپ فرما چکیں تو میں کچھ عرض کروں۔ کہا میں کہہ چکا۔ اب آپ فرمائیے۔ میں نے کہا یہ تمام الفاظ اور ترکیبیں جن پر آپ کو اعتراض ہے میں نے "مایا" کے اسی پرچے سے لی ہیں جو اس دن آپ میرے پاس چھوڑ گئے تھے۔ میں نے عربی فارسی کے ان تمام الفاظ کی ایک فہرست بنالی ہے جو "مایا" میں تھے۔ یہ کہہ کر میں نے یہ ذیل فہرست پنڈت جی کے سامنے رکھ دی۔

عربی اور فارسی کے ان لفظوں کی فہرست جو ہندی کے رسالے "مایا"، الہ آباد، بابت مئی [illegible] سے انتخاب کئے گئے۔ اس فہرست میں جو الفاظ جلی قلم سے لکھے گئے ہیں وہ افسانے میں استعمال نہیں کئے گئے ورنہ "شدھ" یا نقلی ہندی والوں کے نزدیک افسانہ کی عبارت اور بھی ناقابل برداشت ہو جاتی [illegible] تعداد

ل [illegible]

اُ ت۔ استعمال۔ ارمان۔ افسر۔ ادا۔ اندیشہ۔ اشارہ۔ امانتہ۔ امانت۔ احسان مند ۴۸
امان۔ آزادی۔ آہ۔ آزاد۔ الزام۔ اگر۔ اللہ۔ اسلام۔ اجابت۔ اعلیٰ۔ انسان آکم تنہ
آواز۔ البتہ۔ افسوس۔ آوارہ۔ ایمان دار۔ اکثر۔ امتحان۔ امیرانہ۔ ابتر۔ اشتہار۔
ارادہ۔ آسمان۔ اعلان۔ اطلاع۔ اجازت۔ امید۔ آئندہ۔ آسانی۔ اسلامی۔ ۵۲ | ۱

ب۔ بعد۔ بدمعاش۔ بہادری۔ بحث۔ بے وقوف۔ برآمدہ۔ بازار۔ بالشت۔ بیرحم۔
بے حد۔ بغل۔ بتول۔ بے شک۔ بدتر۔ بیکار۔ بازی۔ بابت۔ بے خبر۔ بخدا۔
برباد۔ بیوہ۔ بے کس۔ بالائے طاق۔ بے سود۔ بدنصیب۔ بدہضمی۔ بجائے
بازاری۔ بغل گیر۔ بے ایمان۔ باقی۔ بہار۔ بلائے جان۔ باریکی۔ بسر کرنا۔ بدولت ۱
بستر۔ بارے میں۔ بے دردی۔ بنیاد۔ بزرگ۔ بخار۔ بددعا۔ بے فکرا۔ بے پرواہی۔
بے تکلف۔ بہانہ۔ بلندیاں۔ بازی (شطرنج کی)۔ بدگمانی۔ بے ہوشی۔ بندگاہ۔
بھلائی۔ بقیہ۔ بے کار۔ بدتمیز۔ بے معنی۔ بہتر۔ برداشت۔ ۵۹ | ۲۳

پ۔ پریشان۔ پیروکار۔ پرما۔ پوشیدہ۔ پاک۔ پردہ نشین۔ پیش۔ پیدا۔ پردہ۔ پشتون۔ پست۔
ت۔ تکلیف۔ تشریف۔ تاریخ۔ تازہ۔ تعجب۔ تجربہ۔ تیز۔ تمنا۔ تیزی۔ تنہائی۔ تاج۔ تفرقہ۔
تعداد۔ تہمت۔ تربوز۔ تعلیم۔ تلاش۔ تفریح۔ تماشا۔ تمام۔ تصویر۔ تمانچہ۔ تقاضے۔
تازگی۔ تدبیریں۔ تاکہ۔ تعینات۔ تھکا۔ تنخواہ۔ تعلق۔ تندرست۔ ۲

ث۔ ثابت۔ ثبوت۔

ج۔ جمع۔ جلدی۔ جواب۔ جعلی۔ جہالت۔ جوانی۔ جذبہ۔ جہیز۔ جدا کرنا۔ جناب۔ جادو۔
جیب۔ جنگ۔ جذبات۔ جواب طلبی۔

چ۔ چیز۔ چمک۔ چراگاہ۔ چند۔ چراغ۔ چہرہ۔ چشمے۔ ۱

ح۔ حیران۔ حملہ۔ حالت۔ حد۔ حمایتی۔ حاضر۔ حال آنکہ۔ حرکت۔ حل۔ حائل۔ حکم۔
حرام زادی۔ حیثیت۔ حسن۔ حرج۔ حوصلہ۔ حق۔ حیوانیت۔ حمایت۔ ۴۳ | ۱۵

خ۔ خوب۔ خاک۔ خیال۔ خواہش۔ خوب صورت۔ خدمت۔ خوش نصیب۔ خیانت۔
خلاف۔ خداداد۔ خبط۔ خاطر۔ خوش۔ ختم۔ خط۔ خیریت۔ خطرہ۔ خون۔ خبر۔ خطا
خلوت۔ خود۔ خدا فاقراں۔ خرچ۔ خراب۔ خرابی۔ خطرناک۔ خاص۔ خاصہ۔ خریدار۔
خدا۔ خبردار۔ خیالی۔

د۔ داخل۔ دین۔ دنیا۔ دلچسپی۔ دوری۔ دولت خانہ۔ دسترخوان۔ دل۔ دماغ۔
دشمن۔ دل دادہ۔ درست۔ دعائیں۔ دعا۔ دیدار۔ دنگ۔ دوست۔ دیکھ بھال

دامن ۔ دل کش ۔ دخل کرنا ۔ دشمنی ۔
ذ ۔ ذلیل ۔ ذمہ دار ۔ ذکر ۔ ذمہ داری ۔ ذرا ۔
ر ۔ رواج ۔ رائے ۔ روز ۔ راضی ۔ رہائی ۔ رخصت ۔ راستہ ۔ ریگستان ۔ رسال ۔ ریشم ۔
روشنی ۔ رشتہ ۔ ریاست ۔ رنج ۔ روزمرہ ۔ رحم ۔
ز ۔ زیادہ ۔ زبردست ۔ زبان ۔ زنانہ ۔ زیر اثر ۔ زبردستی ۔ زمین ۔ زیادتی ۔ زکام ۔
زندگی ۔ زخمی ۔ ۵۵
س ۔ سینہ ۔ سوار ۔ سال ۔ سوا ۔ سنجیدہ ۔ سلام ۔ سرخ ۔ سپرد ۔ سند ۔ سرتاج ۔
سرکار پرستی ۔ سبق ۔ سامان ۔ سائے ۔ سبز پری ۔ سبز ۔ سفید پوش ۔ سوال ۔ سادگی ۔
سایہ دار ۔ سیاہی (دوات کی) ۔ سرگرمی ۔ سہولت ۔ سرِ عام ۔ ساز و سامان ۔
سرمایہ دار ۔ سلسلہ ۔ سطح ۔
ش ۔ شامیانہ ۔ شاہ ۔ شہنشاہ ۔ شان ۔ شوکت ۔ شیشہ ۔ شوخ ۔ شاید ۔ شخص ۔
شیطانی ۔ شکل ۔ شام ۔ شروع ۔ شاندار ۔ شادی ۔ شکریہ ۔ شیر ہندوستان ۔
شہر ۔ شرم ۔ شکار ۔ شرط ۔ شغل ۔ شکایت ۔ شرق ۔ شکن ۔ شہری ۔ ۵۴
ص ۔ صبح ۔ صاحب زادے ۔ صحیح ۔ صورت ۔ صرف ۔ صراحی ۔ صبر ۔ صاف ۔ صدرِ اعظم ۔
ض ۔ ضدی ۔ ضرور ۔ ضرورت ۔ ضلع ۔
ط ۔ طرح ۔ طیار ۔ طرف ۔ طوائفیں ۔ طشت ۔ طشتری ۔ طاق ۔ طاقت ۔ طے ۔ طوطا ۔
طوفان ۔
ظ ۔ ظلم ۔
ع ۔ عجب ۔ عادی ۔ عزت ۔ عادتیں ۔ عرض ۔ عذاب ۔ عجیب و غریب ۔ عقد ۔
علامت ۔ عمر ۔ علاوہ ۔ علاج ۔ علت ۔ عرصہ ۔ عنایت ۔ عہدہ ۔
غ ۔ غلطی ۔ غصہ ۔ غریب خانہ ۔ غضب ۔ غذا ۔ غریب ۔ غدر ۔ غائب ۔ غلط ۔ غش ۔ ۵۱
ف ۔ فرمایا ۔ فقط ۔ فرق ۔ فوراً ۔ فضول ۔ فائدہ ۔ فوج ۔ فنی ۔ فیشن پرست ۔ فضل ۔
فیصلہ ۔ فاتح ۔ فرض ۔ فتویٰ ۔ فولاد ۔
ق ۔ قہوہ ۔ قریب ۔ قربانی ۔ قصبہ ۔ قیمتی ۔ قسمت ۔ قرضہ ۔ قرض ۔ قلم ۔ قبضہ ۔ قطار ۔
قید ۔ قوم ۔ قیدی ۔ قصور ۔ قدرت ۔ قاضی ۔ قدم ۔ قرآن مجید ۔ قیمہ ۔ قمیص ۔ قبول ۔ قسم ۔
قلفی ۔ قیام ۔ قہقہہ ۔ قدردانی ۔ قیمت ۔ قائم ۔ قصائی ۔ قتل ۔ ۴۶
ک ۔ کافی ۔ کم بختی ۔ کاغذ ۔ کسر ۔ کافر ۔ کشش ۔ کاش ۔ کاشتکار ۔ کرچھا ۔ کافور ۔ کفن ۔

کم بخت۔ کمی۔ کمال۔ کاروبار۔ کتاب۔ کمزوری۔ کامیابی۔ کم سن۔
گ۔ گذارش۔ گروہ۔ گرم۔ گناہ۔ گواہ۔ گذرنا۔ گوارا۔ گواہی۔ گردن۔ گمان۔ گنبد نما۔
ل۔ لیکن۔ لاجواب۔ لاش۔ لفافہ۔ لحاظ۔ لفظ۔ لائق۔ لاپروائی۔ لطف۔ ۳۹ | ۰
م۔ معلوم۔ مذاق۔ میز۔ معمولی بحث۔ مسافر۔ مستعد۔ مہربان۔ معاملہ۔ معاف۔ مکار
معقول۔ مشہور۔ موقع۔ محرم۔ مرثیہ۔ مدد۔ مردانہ۔ مودچہ۔ مذہب۔ ممکن۔ موت۔
مہیا۔ ملک۔ مسئلے۔ مہر۔ معصوم۔ مجبور۔ مطابق۔ مطلب۔ مکمل۔ معنی۔ مزہ مار۔
مشغل۔ مفت۔ ماہ۔ مست۔ محسوس۔ ملائم۔ محنت۔ منع۔ مدہوشی۔ مرضی۔
موجود۔ مضمون۔ ملاقات۔ میدان۔ مکان۔ مقابلہ۔ مہربانی۔ مصیبت۔ موجودہ
محتاج۔ مشقت۔ منیر۔ محل۔ معاوضہ۔ مردہ۔ ماہوار۔ مستی۔ مہلت۔ مدت۔
مرہم۔ موجودگی۔ ۱۴۳ | ۱۰
ن۔ نوکر۔ ناحق۔ ناراض۔ نقلی۔ نایاب۔ نظریں۔ نسبت۔ نازنین۔ نظر مہر۔ نصیب
نورانی۔ نکاح۔ نکاح شدہ۔ نعرہ۔ نسخہ۔ نتیجہ۔ نثار کرنا۔ نالائق۔ نشان۔ نفاست
پسند۔ نگاہیں۔ نونہال۔ نازک۔ ناکامیاب۔ نیت۔ نامزد۔
و۔ وقت۔ واقعی۔ والدین۔ واپس۔ والدہ۔ وطن۔ وصیت۔ وارث۔ وعدے۔
ورنہ۔ وصول۔ وعدے۔ وغیرہ۔ واسطہ۔
ہ۔ ہرش۔ ہنگامہ۔ ہمیشہ۔ ہمت۔ ہمدردی۔
ی۔ یقین۔ یادگار۔ یعنی۔ ۴۸ | –

۵۸۶ | ۲

پنڈت جی نے بغور اس فہرست کا مطالعہ کیا۔ چند لفظوں کے سوا اُن کی فہرست کا کوئی لفظ ایسا نہ تھا۔ جو اس میں موجود نہ ہو۔ جب وہ شروع سے آخر تک اچھی طرح اسے دیکھ چکے تو میں نے کہا آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اس فہرست میں پانچ سو چھیاسی الفاظ ہیں۔ جن میں سے فقط تین سو چھیانوے میں نے افسانے میں استعمال کئے ہیں۔ باقی ایک سو نوے چھوڑ دیئے۔ اگر ان سب کو میں شامل کر لیتا تو غالباً افسانہ کی زبان آپ کے خیال کے مطابق ہندی والوں کے لئے عبرانی اور یونانی تحریروں کی طرح ناقابلِ فہم ہو جاتی۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے "مایا" کے جو الفاظ میں نے افسانے میں استعمال کئے ہیں۔ انہیں جلی قلم سے لکھا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے کو اندازہ ہو جائے۔ کہ میں نے کس طرح عربی اور فارسی کے کتنے الفاظ برتے ہیں۔

پنڈت جی نے کہا: میں نے مانا کہ "مایا" کے اس پرچے میں جو سب الفاظ موجود ہیں۔ اور بہت سے ہندو انہیں بولتے اور سمجھتے بھی ہیں مگر یہ اصلی ہندی نہیں۔ میں نے کہا اب مجھے عرض کر لینے دیجئے۔ پنڈت جی نے کہا۔ اچھا فرمایئے۔ میں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا: "مایا" الٰہ آباد سے نکلتا ہے۔ اشاعت کے لحاظ سے ہندی کا ایک کامیاب پرچہ ہے معرف، صرف افسانے اس میں شائع ہوتے ہیں۔ غرض اس کی تجارت ہے۔ شُدھ ہندی کا پروپیگنڈا اس کا مقصود نہیں۔ آپ ہی کے بقول معمولی لکھے پڑھے ہندی جاننے والے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں لازمی طور پر اس کی زبان ایسی ہونی چاہیئے کہ اس کے پڑھنے والے سمجھ سکیں اور انہیں پسند بھی ہو ورنہ تجارت میں نفع کے بجائے ٹوٹا ہوگا۔ "مایا" کا مارچ ۱۹۴۶ء نمبر چھاپ مجھے دے گئے تھے میں نے خود سے پڑھا۔ اس میں بارہ افسانے ہیں۔ لکھنے والے سب ہندو ہیں۔ نو مرد، تین عورتیں، لیکن اس کے باوجود عربی اور فارسی کے تقریباً چھ سو ایسے الفاظ اس میں استعمال کئے گئے ہیں۔ جن سے ہندی کا پروپیگنڈا کرنے والوں کو بیر ہے۔ یہ حال صرف ایک نمبر کا ہے۔ اگر "مایا" کے سال بھر کے بارہ پرچوں کا مطالعہ کیا جائے تو غالباً اس قسم کے کئی ہزار الفاظ ان میں سے نکل آئیں اور نہ بھی نکلیں تو یہ چھ سو ہی کیا کم ہیں۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ الفاظ عام طور پر ہندی میں رائج ہیں اور رائج ہونے کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ہندی کے ایک عام پسند پرچے میں ہندو پڑھنے والوں کے لئے، ہندو لکھنے والوں نے استعمال کئے ہیں۔ تو پھر کیا سبب ہے کہ ہندی والے ان الفاظ کو اچھوتوں سے زیادہ ناپاک سمجھ کر ان سے بھاگتے ہیں اور دوسروں کو بھی ان سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ اصلی مروّجہ ہندی تو یہی ہے جو "مایا" اور اسی قسم کے دوسرے ہندی رسالوں میں لکھی جاتی ہے اور جس میں عربی فارسی کے مانوس اور مروّجہ الفاظ نہایت آزادی کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن شُدھ (اور درحقیقت بناوٹی) ہندی کا پروپیگنڈا کرنے والے جو ان الفاظ کا [illegible] پڑتے ہوئے ہیں وہ ایک طرف تو مذہبی تعصب کا شکار ہیں اور دوسری طرف [illegible] ان کے پیش نظر یہی ہے [illegible] نہیں کہ [illegible] ہر طرح کا شدید شر مچائیں۔ ادھر ہندی کے عام پسند رسالے ایسی زبان لکھیں جس میں عربی فارسی کے ہزاروں مروجہ الفاظ بلاتکلف استعمال کئے جائیں۔ پنڈت جی [illegible] کہ آپ کی قوم کے لوگ سیاست اور تجارت دونوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ چلا جانتے ہیں" — پنڈت جی لاجواب ہوگئے اور [illegible] بات کو ختم کرتے ہوئے بولے [illegible] میاں چھوڑو ان جھگڑوں کو کوئی کام کی [illegible] [illegible]

فراق گورکھپوری

رُوپ

زلفِ پرخم عنانِ شب موڑتی ہے آواز طلسمِ تیرگی توڑتی ہے
دنیا نئی ہو جاتی ہے جلووں سے ترے ناگن جس طرح کینچلی چھوڑتی ہے

کیا کہیے جبینِ نور کی تابانی ایک ایک جھلک رشکِ مہِ کنعانی
آنکھیں ہیں کہ پڑتے ہی جھپک جاتی ہیں ہے صاعقہ یا ہنستی ہوئی پیشانی

جو روحِ نشاط ذرہ ذرہ میں بھرے پرتو سے جس کے روئے فطرت نکھرے
تری وہ نظر ہے اے حیاتوں کی حیات شائستہ زندگی جو عالم کو کرے

نورس کلی مسکراتے ہونٹوں کی مہک منڈلائی ہوئی گھٹائیں زلفوں کی لٹک
ہے جوبن مدھ کلس بھی چھلکا چھلکا ماتھے کے چندر لوک کی نرم دمک!!

پلکوں کی اوٹ میں ہیں اسرارِ حیات سانسوں کی نرم لَے میں روحِ نغمات
اے جانِ بہار حسنِ کافر کی ترے مستی ہے کہ بال کھولے برسات کی رات!

احمد ندیم قاسمی

تفاوت

سنہ ۱۹۱۸ء

آسماں پر ہیں رقصاں ستارے وہی — نقرئی چاندنی کے ہیں دھارے وہی
پربتوں پر ندی کے طرارے وہی — ریگزاروں میں رخشاں شرارے وہی
ساری دنیا وہی، سب نظارے وہی

آدمیت بدستور مجبور ہے — اور مشیت بدستور مغرور ہے
جینا مرنا ہی دیرینہ دستور ہے — زندگی اُن سوالات سے چور ہے
تشنگی ہی ابھی جن کا مقدور ہے

رائی کی کوہ پر برتری بھی وہی — بادہ سازوں کی تشنہ لبی بھی وہی
خانقاہوں کی یزداں گری بھی وہی — خواجگی بھی وہی، بندگی بھی وہی
آدمی کو "غمِ آدمی" بھی وہی

زندگی کے پرانے تقاضے وہی — سارے چہرے وہی، سارے خانے وہی

۱۹۴۶ء

آسماں پہنایاں نئے رنگ ہیں   تارے گلنگ ہیں (آدمی دنگ ہیں)
ان کی پروازیں کتنی ہم آہنگ ہیں   ایک آواز ہے ان گنت چنگ ہیں
ایک تقدیر ہے لاکھ ارژنگ ہیں

ایک ذرہ، جہنم بدوش! الاماں   ایک بندہ خدائی فروش! الاماں
زندگی کا یہ جوش و خروش! الاماں   آسماں پر مشیت خموش! الاماں
اور قدرت پراگندہ ہوش! الاماں

برتری کا تصور ہوا ہو گیا،   آدمیت کا مقصد ادا ہو گیا
آدمی، آدمی آشنا ہو گیا   آدمی، آدمی پر فدا ہو گیا
آدمی کبریا آزما ہو گیا

نوع انساں نے اب روپ دھارے نئے   ساری دنیا نئی، سب نظارے نئے

منیب الرحمٰن

مراجعت

حسین خوابوں کے تانے بانے شکستہ ہو ہو کے گر رہے ہیں
حسین خوابوں کی جلوہ سامانیاں حقیقت کی تلخیوں میں بدل گئی ہیں
میں دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں تجلیاتِ سحر نے پھیلا دیا ہے اک جال سا فضا میں
میں سوچتا ہوں
میں سوچتا ہوں کہ دستِ ہستی اجل کی شیرازہ بندیوں کو بکھیرنے پر تلے ہوئے ہیں۔
میں سُن رہا ہوں
میں سُن رہا ہوں صدائے ماتم بلند ہوتے ہوئے ہر اک کوچہ و مکاں سے!
مری نگاہوں کو تابِ نظارگی نہیں ہے
مرا تخیل لُٹا چکا ہے متاعِ احساس، دولتِ غم
مری سماعت پہ بار ہوتا ہے بزمِ ہستی کا شور و غوغا
مگر میں موت و حیات کی کشمکش میں اب تک پھنسا ہوا ہوں
میں سمجھ رہا ہوں کہ میرے جینے میں کوئی سود و زیاں نہیں ہے

میں مر نہیں سکتا کیونکہ ڈر ہے مجھے ہزاروں قیامتوں کا!

مجھے نہ چھیڑو!
شریر کرنوں مجھے نہ چھیڑو!
میں رات بھر کا جگا ہوا ہوں، شریر کرنوں مجھے نہ چھیڑو!
کبھی وہ دن تھے کہ میں تمہاری جدائی میں بےقرار رہتا
مجھے اگر کوئی آرزو تھی تو یہ کہ تم میرے پاس آؤ
میں تم سے باتیں کروں، تمہاری برہنہ رعنائیوں سے کھیلوں۔
اور ایک وارفتگی کے عالم میں پھر تمہیں ہمکنار کر لوں
مگر وہ دن داستانِ ماضی کے حرفِ آغاز بن چکے ہیں!
مجھے اب ایسی طویل راتوں کی جستجو ہے
جو میری بیتابیوں کو وقفِ سکوت کر دیں!

بہار آتی ہے صحنِ گلزار میں خزاں کی نقیب بن کر
یہ پھول کھلتے ہیں تاکہ مرجھا کے شاخِ نازک سے ٹوٹ جائیں۔
مرا تبسم بھی اشک ریزی کا ہے بہانہ
ملی ہوئی ہے مری مسرت میں کشمکشِ ہستی کی تلخ کامی!!
وہ پوچھتے ہیں کہ تمہارے نغموں میں اس قدر حزن و یاس کیوں ہے؟

بتاؤ کیا تم ہمیشہ آہ و فغاں کے یوں خوشہ چیں رہوگے ؟
ذرا نگاہیں اٹھا کے دیکھو
سحر کے انوار نقشِ فردا کا اک ہیولیٰ بنا رہے ہیں
چمن میں مرغانِ خوشنوا چہچہا رہے ہیں
وہ اپنے کندھوں پہ ہل اٹھائے کسان کھیتوں کو جا رہے ہیں
وہ انقلابی جواں بغاوت کے تند نغموں سے ایک طوفاں اٹھا رہے ہیں
وہ مرد و زن فصلِ گل کی آمد سے شاد ہو ہو کے گا رہے ہیں ——
تمہاری ہستی کو اس کا احساس کیوں نہیں ہے ؟"

میں کیا بتاؤں !
میں اُن سے کیسے کہوں کہ یہ بازگشت ہے میرے دورِ ماضی کے ہاؤ ہو کی
یہی ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، یونہی ہوتا رہیگا پیہم !
یہ نوجواں گاتے گاتے تھک جائیں گے تو اُن کے شرر فشاں، برق پاش نغمے
انہیں حقیقت سے دور خوابوں کی ظلمتوں میں دھکیل دیں گے
اسی کو سمجھیں گے وہ کمالِ وجود و معراجِ آدمیّت
اسی پہ رکھیں گے چاہے رکھنا چاہیں وہ بنیادِ قصرِ ہستی !!

یہ صفحۂ ہستی کے چند سکّے

یہ گندم و جو کے چند دانے
مرے لئے مشتِ خاک سے بیشتر نہیں ہیں!!
مگر کسی کی نگاہِ الفت
وہ اشک جن کو کسی نے میرے غموں کا ہمراز کر دیا تھا
وہ اک تبسم، لطیف و شیریں
مرے خیالوں میں تا ابد جاگزیں رہیں گے،
میں جب بھی چاہوں انہیں اٹھا لاؤں منظرِ عام پر تصور کی خلوتوں سے
میں جیسا چاہوں اُنہیں بنا دوں —— !

نرسوں کی محافظ

جوانی اپنی گنواری ہے کس طرح تو نے
کہ اب ہر اٹھتی جوانی سے بدگماں ہے تو
یہ فردِ جرم کسی اور کی زباں پہ نہیں
خود اپنے عہدِ گزشتہ کی ترجماں ہے تو

مٹا دیا ترے چہرے کی جھریوں نے جسے
تو اس نکھار کی اب تاب لا نہیں سکتی
ہنسی کو جرم سمجھنے لگا یہ سبب تو نہیں
کہ اب ہنسی ترے ہونٹوں پہ آ نہیں سکتی

وہ چہرے جن میں فروزاں ہے عصمتِ مریم
تو ان پہ اپنے گناہوں کے عکس ڈالتی ہے
ترا ضمیر ہے تیرہ، مہ و نجوم نہیں،
مہ و نجوم پہ تو تیرگی اچھالتی ہے

بٹھا دیئے تو نے پہرے قدم قدم پہ مگر
جھجک کے چلنے میں لغزش ضرور ہوتی ہے
گناہ ہوتے ہیں داخل میں سے فطرت میں
جوانی اپنا جہاں اعتبار کھوتی ہے۔

یہ تتلیاں جنھیں مٹھی میں بھینچ رکھا ہے
جو اُڑنے پائیں تو الجھیں کبھی نہ شمعوں سے
تری طرح کہیں یہ بھی جھلس کے رہ جائیں
تپش بڑھاؤ نہ ان ناچتے شراروں سے

کیفی اعظمی

مجید امجد

امروز

ابد کے سمندر کی اک موج جس پر مری زندگی کا کنول تیرتا ہے!
کسی ان سُنی، دائمی راگنی کی کوئی تان — آزردہ، آوارہ، برباد
جو دم بھر کو آ کر مری الجھی الجھی سی سانسوں کے سنگیت میں ڈھل گئی ہے!
زمانے کی پھیلی ہوئی بے کراں وسعتوں میں یہ دو چار لمحوں کی میعاد!
طلوع و غروبِ مہ و مہر کے جاودانی تسلسل کی دو چار کڑیاں!
یہ کچھ تھرتھراتے اجالوں کا رُوماں، یہ کچھ سنسناتے اندھیروں کا قصّہ!
یہ جو کچھ کہ میرے زمانے میں ہے اور یہ جو کچھ کہ اس کے زمانے میں ہیں!
یہی میرا حصّہ — ازل اور ابد کے خزانوں سے ہے بس یہی میرا حصّہ!

مجھے کیا خبر، وقت کے دیوتا کی حسیں رتھ کے پہیوں تلے پس چکے ہیں،
مقدر کے کتنے کھلونے، زمانوں کے ہنگامے، صدیوں کے صدہا ہیولے!
مجھے کیا تعلق، مری آخری سانس کے بعد بھی دوشِ گیتی پہ مچلے،
مہ و سال کے لازوال آبشارِ رواں کا وہ آنچل جو تاروں کو چھو لے!

مگر آہ یہ لمحۂ مختصر جو مری زندگی، میرا زادِ سفر ہے!
مرے ساتھ ہے! میرے بس میں ہے! میری ہتھیلی پہ ہے یہ لبالب پیالہ!
یہی کچھ ہے لے دے کے میرے لئے اس خراباتِ شام و سحر میں، یہی کچھ،
یہ اک فرصتِ کاوشِ دردِ ہستی! یہ اک مہلتِ کوششِ آہ و نالہ!

یہ صہبائے امروز، جو صبح کی شاہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر
بہ دورِ حیات آگئی ہے! یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں!
ہوا کا یہ جھونکا جو میرے دریچے میں تلسی کی ٹہنی کو لرزا گیا ہے!
پڑوسن کے آنگن میں پانی کے نلکے پہ یہ چڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں، !!
یہ دنیائے امروز میری ہے میرے دلِ زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے!
یہ اشکوں سے شاداب دو چار صبحیں، یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں،
انہی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے!

فکر تونسوی

جینئس
(GENIUS)

میں صدیوں سے تنہا چلا آ رہا ہوں
میں صدیوں سے غول بیاباں کے زنداں میں گھبرا رہا ہوں،
میں خاموش ہوں، جیسے معبد کے گوشے میں کوئی بُتِ ایستادہ
مرے ذہن پر میری اپنی ہی عظمت کی مہریں لگی ہیں

—یہ کونین پر کیوں مسلط ہے اک ہُو کا عالم؟
یہ سیمیں ستارے ہیں یا چاند نے اپنی تنہائیوں پر بہائے ہیں آنسو؟
ہوا کی پری سانس روکے، پروں کو سمیٹے ہوئے تھم گئی ہے۔
مرے گرد لاکھوں صدائیں بگولا صفت گھومتی ہیں۔
ابھارے چلی جا رہی ہیں مرے گرد زنداں کی سنگیں فصیلیں
بڑھائے چلی جا رہی ہیں مرے دل کی سنسانیوں کو
میں تنہا ہوا جا رہا ہوں۔

مرا غم — تمہارے تحیّر کے بس کا نہیں ہے۔
نکلنے دو مجھکو — بگولوں کے زنداں میں دم گھٹ رہا ہے
یہ اک چپکا چپکا تبسّم جو میرے لبوں پر اُبھرتا رہا ہے — تبسّم نہیں ہے
کہ یوں بھی مری چشمِ غفلت نے آنسو بہائے
یہ آنسو — یہ طنزِ مسلسل کہاں تک مرا ساتھ دیں گے؟
کہاں تک میں یوں اپنے اوپر ستم ڈھا سکوں گا؟
کہاں تک تمہارے لیے خود کو بہلا سکوں گا؟
کہ میری صدا، جو بُتِ خامشی بن گئی ہے،
اسے چاند، تاروں، بہاروں سے نسبت رہی ہے۔
نکلنے دو مجھکو — ستاروں بہاروں سے ملنے دو مجھکو۔
تمہارے تحیّر کو میں چھوڑ جاؤں گا زنداں کے در پہ
میں گھبرا رہا ہوں — میں تنہا ہوا جا رہا ہوں۔
میں تنہا نہیں رہ سکوں گا —!

ظہیر کاشمیری

عورت

گلہ بانوں کی خداوندی میں — خط و رخسار پہ تعزیریں تھیں
کُند تھا جذبۂ تحسینِ جمال — حُسن کے پاؤں میں زنجیریں تھیں

ہر زمیندار، شہنشاہ کے پاس — کئی ناسفتہ گہر ہوتے تھے
محفلِ شب میں اُجالا بن کر — وقفِ اندوہ سحر ہوتے تھے

آگ اور بھاپ کے دولابے پر — زیست لوہے کی طرح ڈھلنے لگی
جب ہوس کار نے سکّے دکھلائے — ایک انجن کی طرح چلنے لگی

کسی ان دیکھے ہوئے بازو پر
ریشمی جسم ڈھلک جاتا ہے
بادۂ شرم سے لبریز شباب
ایک ٹھوکر میں چھلک جاتا ہے

اختر الایمان

سرِ رہگذارے

شبِ ماہ تُو ہے سحر بھی تو
کہ فغاں بھی تو ہے اثر بھی تو
یہ تری بہار کے دن سہی
یہ ترے نکھار کے دن سہی
نہ مٹا کسی کو سنبھل سنبھل
سرِ راہ یوں نہ بہک کے چل
کہ زمیں پہ رہتے ہیں اور بھی
جنہیں حسن سے بھی لگاؤ ہے
جنہیں زندگی بھی عزیز ہے!

شاد عارفی

فلمی محبّت

خود گرا دی جائے گی کوئی کتاب! آپ اُٹھا دیں گے۔ تو شکریہ جناب!
مل گیا رستہ محبّت ٹھن گئی!

آپ؟ واللہ۔ کیا ہوا؟ کیوں گر پڑے بچ گئے لاری سے! کھمبے سے لڑے
اے! ادھر تانگہ! محبّت ٹھن گئی!

کس لئے لیٹے ہوئے ہو خاک پر؟ مکھیاں لپٹی ہوئی ہیں ناک پر!
کس کے اک بلّا۔ محبّت ٹھن گئی

مال پر زن سے گئی موٹر نکل نصف ماتھے تک "کٹی چوٹی کے بل"
بس نہیں چلتا۔ محبّت ٹھن گئی!

سائیکل ٹکرا کے۔ "ساری" دھول پر گفتگو نرمی سے بڑھ کر فُل پر
پھر جو رُخ بدلا محبت ٹھن گئی!

سیب سے رخسار پر مچھر۔ ارے! تِل! مگر سرمے کا ہے بہنے پرے
کھُل گیا دھوکا۔ محبّت ٹھن گئی!

بہ رہا ہے مے فشاں ہونٹوں سے خوں
پان! اِلپ اسٹک! تو چھو کر دیکھ لوں
گال پر چانٹا۔ محبت ہٹ گئی!

ریل کی پٹڑی پہ یا دریا کے پاس
پھر رہی تیا پھر رہے ہیں کیوں اُداس
خودکشی۔ توبہ! محبت ہٹ گئی

بھوک سے تیری بہن ہے نیم جاں!
جو بھی مل جائے ابھی لاتا ہوں ماں!
کار سے دبنا۔ محبت ہٹ گئی!

جمیل الدین عالی

دوہے

کدھر ہیں وہ متوالے نینا کدھر ہیں وہ رتنار
نس نس کھینچے ہے تن کی جیسے مدرا کرے اُتار

ایک تو یہ گھنگھور بدریا پھر برہا کی مار
بوند پڑے ہے بدن پہ ایسے جیسے لگے کٹار

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

بیتے دنوں کی یاد ہے کیسی ناگن کی پھنکار
پہلا وار ہے زہر بھرا اور دوجا امرت دھار

ساحر لدھیانوی

جاگیر

پھر اسی وادیٔ شاداب میں لوٹ آیا ہوں
جس میں پنہاں مرے خوابوں کی طرب گاہیں ہیں
میرے احباب کے سامانِ تعیش کے لیے
شوخ سینے ہیں جواں جسم حسیں باہیں ہیں

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

ہائے وہ گرم دلآویز ابلتے سینے
جن سے ہم سطوتِ آبا کا صلہ لیتے ہیں
جانے ان مرمریں جسموں کو یہ مریل دہقاں
کیسے ان تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں

یہ لہکتے ہوئے پودے، یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے، اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

ان کی محنت بھی مری حاصلِ محنت بھی مرا	ان کے بازو بھی مرے قوتِ بازو بھی مری
میں خداوند ہوں اس وسعتِ بے پایاں کا	موجِ عارض بھی مری نکہتِ گیسو بھی مری

میں اُن اجداد کا بیٹا ہوں جنھوں نے پیہم	اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعتِ ناپاک سے لیکر اب تک	ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

خاک پر رینگنے والے یہ فسردہ ڈھانچے	ان کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں، نہ بنیں
ان کی غیرت پہ ہر اک ہاتھ جھپٹ سکتا ہے	اِن کے ابرو کی کمانیں نہ تنی ہیں نہ تنیں

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی	میں ان آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں؟
وہ دبے پاؤں اُدھر کون چلی جاتی ہے!	بڑھ کے اس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں؟

مخمور جالندھری

تسلسل

کتنا خوش بخت ہے انساں — یہ اندھا انساں
کہ ستاروں کے جہاں میں ہے سکونت اس کی
پھول کو چھوڑ کے کانٹے سے اُلجھ جاتا ہے
اسے ناشاد ہی رکھے گی عفونت اس کی
جانتا ہے کہ بیاباں سے ہے گلزار حسیں
مگر انساں — بہاروں کے جہاں کا باسی
دیوِ تخریب ہے صورت گرِ تعمیر نہیں

کھیل کر جان پہ اپنی کئی انسانوں نے
نسلِ آدم کا بھبکتا ہوا باطن دھویا
اس کے سینے میں محبت کا کنول بھی بویا
تپتی جلتی ہوئی دلدل تھی سرشتِ آدم
جس میں اک بھی نہ مہکتی ہوئی کونپل پھوٹی
موجزن جس میں رہا سیلِ تعفن پیہم
جتنا اپنے سے ہے اُتنا ہی پڑوسی سے ہو عشق
خوف تھا — جیسے دو انسانوں کو بھی آسانی سے
اپنے زخموں پہ نہ مرہم یہ کسی نے رکھا،
اور انساں نہ باز آیا ستم رانی سے

آج بھی ٹھوکریں کھایا ہوا انساں کا دل
ظلم و بیداد کے اشغال کا گرویدہ ہے
"جنگ، شمشیر و سناں، تیغ ہے تقدیرِ امم"
یہ اور ایسے ہی کچھ اقوال کا گرویدہ ہے
وہی املاک کا خبط اور وہی منصب کا جنوں
یہ تسلسل ابھی ٹوٹا نہیں انسانوں سے
جب کبھی اس کے تفوق کا سنگھاسن ڈولا
اس نے خوں چوس لیا غیظ میں شریانوں سے
ہونے دیتا ہے کوئی ادنیٰ کو اعلیٰ؟ لیکن
حد سے بڑھتی ہے فلاکت تو غضب ڈھاتی ہے
باندھ کر سر سے کفن گھر سے نکل آتی ہے —
فرش پر زور سے بچوں کو پٹک دیتی ہے
ریشمی زلفوں کو نفرت سے جھٹک دیتی ہے
غیظ میں ہار پہن لیتی ہے پستانوں کا —
آگ لگتی ہے نشاں مٹتا ہے ایوانوں کا
نئے گھر بنتے ہیں بنیاد وہی رہتی ہے
لے بدل جاتی ہے فریاد وہی رہتی ہے
شاہ بنتا ہے گدا، بنتا ہے نادار ملک
بے کسی حد سے پھر اک بار گزر جاتی ہے
پھر وہی پہلی سی بیداد نظر آتی ہے
یہ تسلسل ابھی ٹوٹا نہیں انسانوں سے

آدمی چاند ستاروں کے جہاں کا باسی
کیا بہاروں میں بھی ناشاد رہے گا یونہی
ایک مجموعۂ اضداد رہے گا یونہی —؟
کبھی طبقات کی لعنت سے رہا بھی ہوگا —؟

علی سردار جعفری

خیالات

میری دنیا میں محبت نہیں کہتے ہیں اسے ۔۔۔ یوں تو ہر سنگ کے سینے میں شرر ملتا ہے
سیکڑوں اشک جب آنکھوں سے برس جاتے ہیں ۔۔۔ تب کہیں ایک محبت کا گہر ملتا ہے

شمع کی طرح پگھلتے ہوئے دل دیکھے ہیں ۔۔۔ اشک بن بن کے نکلتے ہوئے دل دیکھے ہیں
تو نے دیکھی ہی نہیں گرمیٔ رخسارِ حیات ۔۔۔ میں نے اس آگ میں جلتے ہوئے دل دیکھے ہیں

ماں کی آغوش میں ہنستا ہوا اک طفلِ جمیل ۔۔۔ جس طرح ذہنِ ازل میں ہو ابد کی تخئیل
دیکھ لیں وہ جو سمجھتے ہیں کہ فانی ہے حیات ۔۔۔ زندگانی کے طربناک تسلسل کی دلیل

آدمی لاکھ ہو مایوس، مگر مثلِ نسیم
رقص کرتا ہے تمناؤں کے گلزاروں میں
راستے وادی و صحرا میں بنا لیتے ہیں
چشمے رُک کر نہیں رہ جاتے ہیں کہساروں میں

قتیل شفائی

تجدید

وہی جھنکار ــــ وہی ناچتی گاتی تلوار،
وہی للکار ــــ وہی پھیلتا بڑھتا سا غبار

وہی سیلاب ــــ وہی سینۂ دریا کی امنگ
وہی گرداب ــــ وہی فطرتِ امواج کی جنگ
وہی طوفان، ــــ وہی عزمِ بغاوت کی دلیل
وہی ہیجان، ــــ وہی خوف کا احساسِ قلیل
وہی تدبیر ــــ وہی زہر کا چھلکتا ہوا جام
وہی تعبیر ــــ وہی خواب کا پھیلا ہوا دام

وہی پیغام ــــ وہی صلح کا مبہم اقرار
وہی انجام ــــ وہی ریت کی گرتی دیوار

وہی تمہید — وہی کہنہ رسومات کی رٹ
وہی تجدید — وہی پھر سے مراعات کی رٹ

وہی دمسانہ — وہی روح پہ چلتے نشتر
وہی اعزاز — وہی کھوٹ کے پیلے زیور
وہی قانون — وہی موم کی مڑتی ہوئی ناک
(وہی معجون — وہی شہد میں لپٹی ہوئی خاک
وہی سوغات — وہی نکتۂ ناقابلِ غور
وہی دن رات — وہی وقت کے بدلے ہوئے طور

پھر وہی ذکر — کہ یہ چوٹ بھی کھائیں کیوں کر
پھر وہی فکر — کہ تلوار اٹھائیں کیونکر

دو شعر

چاہوں کسے کہ تجھ سا جہاں میں کوئی نہیں
دیکھوں کسے کہ دور تلک روشنی نہیں

او محوِ ناز! پرسشِ خاطر کو حیلہ آ!
بیمارِ غم میں جاں ابھی ہے ابھی نہیں

ناصر کاظمی

مقبول حسین احمد پوری

چکور اور چاند

چاند کو دیکھ کے اِک دن بیکل ہو کے چکور لگا یہ کہنے
تیرے اس سُندر مکھڑے ہِتُ سیکھ لئے میں نے دکھ سَہنے
کھُل جاتی ہیں دونوں انکھیاں، دیکھ کے گورا چہرہ تیرا
اس شیتل پرکاش کو پا کے لہریں لیتا ہے دل میرا
کیا میں اور کیا میری چاہت، مٹھی بھر پہ میری کایا،
جبھی تو میں نے اِس جیون میں کبھی ترا سَنجوگ نہ پایا،
بڑے چاؤ سے میں نے ہِتُ نے اس تیری چاہت کو پالا
دیپ جلا کر جوت سے تیری دل کو بنایا ایک شوالا
پھر بھی نین چھپا کے، لجا کے، ہو جاتا تو آنکھ سے اوجھل
یوں اے پیارے چندرما کر دیتا کیوں میرا جیون بوجھل؟

۱؎ باعث
۲؎ دا،

چاند یہ سن کے، دبی مسکان سے کہنے لگا "سن سکھی پیارے
تیرے ننھے نین بنے ہیں پریت اگن کے دو انگارے
کر کے بھسم اس آگ میں اپنے سروپ کو مجھ سے آگے ہو جا
میں تو ہوں اک سپنے کی مایا، پریم امر ہے اُسی میں سمو جا
میری کھوج میں پاگل بن کے، ملن کی مدیرا کبھی نہ چکھنا
پریت کا دم جو تو نے بھرا ہے سدا برہ کی کلپن رکھنا!!"

تمثیلِ حیات

دیکھ ان برق صفت لہروں کے ٹکراؤ سے
سینکڑوں کانپتے افسردہ سے اُٹھتے ہیں حباب
اور سُن ان کے چٹکنے کی غم اندوز صدا
جس طرح دُور کہیں ٹوٹتے ہوں تارِ رباب!

اس الم خیز سے منظر میں نہاں ہے اے دوست
زندگانی کی مہیب اور بھیانک تمثیل
تضادِ اجسام — برانگیخت — تصادم تخلیق
اور پھر — ایک شکست — اور نتیجہ — تحلیل

عبدالمتین عارف

گوپال متل

شیطان کی موت

دیر ویراں ہے، حرم ہے بے خروش — برہمن چپ ہے، مؤذن ہے خموش
سوز ہے اشلوک میں باقی نہ ساز — اب نہ خطبے میں وہ حدت ہے نہ جوش

ہو گئی بے سود تلقینِ ثواب — اب دلائیں بھی تو کیوں خوفِ عذاب
اب حریفِ شیخ کوئی بھی نہیں — ختم ہے ہر ایک موضوعِ خطاب

آج مدھم سی ہے آوازِ درود — آج جلتا ہی نہیں مندر میں عود
کیا قیامت ہے یکایک ہو گیا — محفلِ زہاد پر طاری جمود

ربِ برحق، خالقِ عالی جناب — ہو گئے اپنے مشن میں کامیاب
سلسلۂ رشد و ہدایت کا ہے ختم — آسماں سے اب نہ اترے گی کتاب

مر گیا، اے وائے شیطاں مر گیا

ظہیر کاشمیری

غزل

ندھیاں اُٹھیں، فضائیں دور تک کجلا گئیں
اتفاقاً دو چراغوں کی لَویں ٹکرا گئیں

ہ یہ مہکی ہوئی شامیں، یہ لوگوں کے ہجوم
دل کو کچھ بیتی ہوئی تنہائیاں یاد آگئیں

س فضا میں سرسراتی ہیں ہزاروں بجلیاں
اِس فضا میں کیسی کیسی صورتیں سنولا گئیں

ے خزاں والو! خزاں والو!! کوئی سوچو علاج
یہ بہاریں پاؤں میں زنجیر سی پہنا گئیں

پھر کسی نے چھیڑ دی عذرِ جفا کی داستاں
دل پہ جیسے بھیگی بھیگی بدلیاں سی چھا گئیں

اثر لکھنوی

غزل

ہر چند کلیجا پھنکتا ہے ساقی سے تقاضا کون کرے
اے حد سے گزرتی تشنہ لبی یہ ننگ گوارا کون کرے

جس راز سے واقف ہو نہ کوئی اُس راز کو افشا کون کرے
خود حسن اگر غماز نہ ہو تو عشق کا چرچا کون کرے

اس رنگ رنگیلی دنیا کا ہر لمحہ سنہری سپنا ہے
ہر سپنا پگھلتا سونا ہے، انجام کی پروا کون کرے

اب شوق بھڑکتا شعلہ ہے دیتی ہے جسے ہر سانس ہوا
بیتابی سی بیتابی ہے، اظہارِ تمنا کون کرے

جلتی ہے پلک تپتی ہے نظر، اک آگ لگی ہے سینے میں

مشتاق سے اپنے تیرے سوا اس حال میں پروا کون کرے

ں پروں کے کچھ طائر یا خواب یہاں پرواز میں ہیں

تعبیر میں الجھا کون رہے تفسیر کا دعویٰ کون کرے

جلوہ و صد حیراں نظری، شوریدہ سری پھر بے خبری

اس عشقِ تماشا دشمن کو مانوسِ تماشا کون کرے

ب حال یہ ہے بے مہری کا ہم ڈوبتے ہیں وہ ہنستے ہیں

ساحل کی تمنا ایک طرف، ساحل کا نظارا کون کرے

جو کچھ بھی گزرنی ہے گزرے انجام وہ ہو جو ہونا ہے

جو آپ خریدا جائے اثرؔ اُس غم کا مداوا کون کرے

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

کب اُن کی نظر میں نہ پرسش تھی اور لب پر اُنکے سوال نہ تھا
ہم عرضِ حال جو کر نہ سکے کچھ حاصلِ عرضِ حال نہ تھا

گر اہلِ وفا کا بس چلتا کچھ اور ابھی وہ جی لیتے
اُس جانِ تمنا کا ملنا مشکل تھا ضرور محال نہ تھا

جو صبح تھی صبحِ گریاں تھی جو شام تھی شامِ ہجراں تھی
کیا اس کے سوا دامن میں لے گردشِ ماہ و سال نہ تھا

احساس مرے غم کا تھا اُنہیں آخر یہ حقیقت کھل کے رہی
خود وہ بھی پریشاں خاطر تھے اک میں ہی پریشاں حال نہ تھا

دیکھا جو پریشاں حال مجھے اُس جانِ محبت نے یہ کہا
ہم نے بھی کیا ہے عشق مگر ایسا تو ہمارا حال نہ تھا

عبدالحمید عدم

سنگ ریزے

چاکِ دامن مرا رفو نہ کرو یہ کسی دوست کی نشانی ہے

یہ کس رنگ کی گردشیں کھا رہا ہے ارے او زمانے! ارے او زمانے!!

ابھی سطحِ دریا بہت پُرسکوں ہے سفینہ لئے چل کنارے کنارے

اک حسیں آنکھ کے اشارے پر قافلے راہ بھول جاتے ہیں

زندگی کے اداس لمحوں میں بے وفا دوست یاد آتے ہیں

ہم کو فرصت نہیں ہے سننے کی اے غمِ روزگار! بات نہ کر

کشتیاں یوں بھی ڈوب جاتی ہیں ناخدا کس لئے ڈراتے ہیں؟

ارے او کارپردازانِ محشر! کیا تمسخر ہے؟

ابھی سوئے تھے ہم، جاؤ، نہیں بیدار ہوتے ہیں!

کسی کی آنکھ میں ہیں سُرخ ڈورے اس طرح جیسے
گلوں میں ریشہ ہائے انگبیں بیدار ہوتے ہیں

غرورِ میکشی کی کونسی منزل ہے یہ ساقی!
کھنک ساغر کی آوازِ خدا معلوم ہوتی ہے

غزل

آفتاب احمد

یہ کیا کہ تابِ لذتِ پرسش نہ لا سکوں
یوں دیکھئے کہ بارِ کرم بھی اٹھا سکوں
یاد آئیں ہر نگاہ پہ سو سو کہانیاں
ایسی کہانیاں جو تمہیں کو سُنا سکوں
یہ شوخیٔ شکستِ تمنا بھی دیکھئے!
ہے اب بھی اس قدر کہ گھروندے بنا سکوں
اس اجنبی حیات کے بدلے میں اے خُدا
وہ ایک لمحہ دے جسے اپنا بنا سکوں
ہاں اے نگاہِ ناز تری ساحری کی خیر   یہ اور بات ہے کہ مں مطلب نہ پا سکوں

جاں نثار اختر

نیرنگیاں

کبھی چمن کی لطافت بھی بار گذری ہے
نظر پہ پھول کی نکہت بھی بار گذری ہے

ہُوا ہے دل میں وہ شعلہ کبھی کبھی روشن
کہ چاندنی کی صباحت بھی بار گذری ہے

کبھی کسی کی متانت سے دم بھی اُلجھا ہے
کبھی کسی کی شرارت بھی بار گذری ہے

وہ انہماک رہا کاروبارِ دل میں کبھی
کہ سانس لینے کی فرصت بھی بار گذری ہے

کبھی خود اپنی وفا سے ہوا ہے دل بیزار
کبھی خود اُن کی محبت بھی بار گذری ہے

کبھی رہا ہوں میں اس درجہ بے سروساماں
کسی کی چشمِ عنایت بھی بار گذری ہے

غمِ جہاں کو کبھی ہمتوں نے اپنایا
کبھی خود اپنی مسرت بھی بار گذری ہے

کبھی نظر جو اٹھائی ہے آدمیت نے
جبیں پہ مہرِ شرافت بھی بار گذری ہے

کبھی طلسمِ فریبِ خیال یوں ٹوٹا،
کہ زندگی کی صداقت بھی بار گذری ہے

کبھی لطافتِ احساس نے ستایا ہے
خود اپنے دل کی نزاکت بھی بار گذری ہے

کبھی کبھی مرا ادراک یوں بھی جاگا ہے
کہ مجھ پہ خود مری فطرت بھی بار گذری ہے

کسی کی یاد قیامت سہی مگر اختر
کبھی کبھی یہ قیامت بھی بار گذری ہے

اُپندر ناتھ اشک

قیدِ حیات

افراد

احسان ریاض

سلطان سرور

عقیل نعیم

ذکیہ نجمہ رحیمن بیگاں نستو مجی

مقام

جموں سے اٹھارہ میل دور اکھنور کے قصبہ میں ذکیہ کا گھر

وقت

صبح سے شام تک

(ذکیہ کا گھر اکھنور کے قدیم قصبہ میں دریائے چناب کے کنارے ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ چونکہ اکھنور کا قصبہ جموں (کشمیر) سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر ہمالیہ کی ابتدائی میں واقع ہے اور ذکیہ کا گھر اس قصبہ میں سب سے اونچی جگہ بنا ہوا ہے۔ اسلئے اس کی کھڑکیوں سے دریا اور پہاڑوں کے نہایت دلچسپ اور دلفریب مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

پردہ اسی گھر کے سونے کے کمرے میں اٹھتا ہے۔ اور پہلی نظر میں کمرے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کیونکہ باہر سے گھر کی شان کو دیکھ کر کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ اندر سے اتنا مہذب ہوگا۔ لیکن قصور شاید مکان بنانے والے کا نہیں، کیونکہ یہ کمرہ بھی کافی کشادہ ہے اور پرانی وضع کا ہونے کے باوجود کافی ہوادار اور روشن ہے۔ سامنے کی دیوار میں تین دروازے ہیں جو آنگن کی بالکنی پر کھلتے ہیں

ان دروازوں میں سے بالکونی کا جنگلہ، اس سے پرے نیلا آسمان، دشنو دیوی کی تینوں چوٹیاں اور ہمالیہ کے برفانی پہاڑ نظر آتے ہیں۔ اس بالکونی سے ایک طرف باورچی خانے اور سیڑھیوں کو اور دوسری طرف غسلخانے اور دوسرے کمروں کو راستہ جاتا ہے۔ اُدھر سے آنے جانے والے ان تینوں دروازوں سے نظر آجاتے ہیں۔ بائیں دیوار میں دو کھڑکیاں اور ان کے درمیان ایک الماری بنی ہوئی ہے۔ یہ کھڑکیاں دریا کی طرف کھلتی ہیں۔ ان سے نہ صرف دریا کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ ہر وقت ٹھنڈی ہوا کا لطف بھی اُٹھایا جا سکتا ہے۔ دائیں دیوار کے پرلے کونے میں ایک دروازہ ہے جو دوسرے کمرے کو جاتا ہے اس کے دائیں کو دیوار میں ذرا اونچے دو بڑے بڑے طاق بنے ہوئے ہیں۔ انہیں طاقوں کے نیچے ذکیہ کا پلنگ لگا ہوا ہے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے درمیان دیواروں میں کھونٹیاں بھی لگی ہوئی ہیں لیکن ان دروازوں، کھڑکیوں، الماریوں اور کھونٹیوں کے باوجود کمرہ تنگ اور تاریک نظر آتا ہے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس وقت کھڑکیاں اور سامنے کی بالکونی پر کھلنے والے دو دروازے بند ہیں۔ درمیان کا بھی آدھا کھلا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کھونٹیوں، طاقوں اور الماری کے باوجود اتنی چیزیں ایک ساتھ کمرے میں گڈمڈ پڑی ہیں کہ کمرے کی وسعت اس بے ترتیبی میں گم ہو کر رہ گئی ہے — معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کمرہ سونے کا ہے کھانا کھانے یا نہانے کا — بالکونی پر کھلنے والے بائیں طرف کے دروازے کے نزدیک موری اور چھوٹا سا کھرا بنا ہوا ہے۔ اس کھرے کے برابر لوٹے اور بالٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اُدھر کو بائیں دیوار کے ساتھ الماری کے برابر چرخہ اور کاتنے اٹیرنے کا دوسرا سامان پڑا ہے۔ الماری کے پٹ کسی بے شرم کی بیباک آنکھوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں اور اس کے خانے تا ثلث سے لیکر سینے پرونے کے سامان تک بیشمار چیزوں سے اٹے پڑے ہیں۔ ان سب پر مٹی کی ایک ہلکی تہ جمی ہوئی ہے۔ کونے میں موری کے اُوپر چھت کے ساتھ ٹنگنا ہے جس پر رضائیاں اور دلائیاں بے ترتیبی سے ایک دوسری کے اُوپر ٹنگی ہوئی ہیں۔ کھونٹیاں اور طاق بھی اسی طرح مختلف چیزوں سے اٹے پڑے ہیں۔ ذکیہ کے پلنگ کی بائیں طرف کو کمرے کے درمیان ایک اور چارپائی بچھی ہوئی ہے جس کا بستر آدھا الٹ دیا گیا ہے۔ ذکیہ کے اپنے پلنگ پر بستر تکیہ اور چادریں ریشمی ہونے کے باوجود گندی اور میلی کچیلی ہیں۔ چارپائیوں کے علاوہ جو فرش خالی ہے اس میں تپائی اور چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی ہیں۔ فرش پر بچوں کے کھلونے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس سب بے ترتیبی نے کمرے کو اور بھی تنگ بنا دیا ہے اگرچہ دن کے دس بج چکے ہیں اور کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باوجود کمرا خاصہ روشن ہے لیکن ذکیہ ابھی تک اپنے پلنگ پر پڑی کروٹیں بدل رہی ہے۔

پردہ اٹھنے کے کچھ لمحے بعد بائیں طرف کے بند دروازے کو دھڑام سے کھولتے ہوئے نستر اور ممی ہانپتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔

دروازہ کھلنے کی آواز سے ذکیہ چونکتی ہے لیکن اٹھتی نہیں کروٹ بدل کر لیٹی رہتی ہے۔

ننھو اور مجی میں ایک ڈیڑھ سال کا فرق ہے۔ مجی سات برس کا ہے اور ننھو چھ کی، لیکن دونوں ہم عمر دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں کے کپڑے میلے اور چہرے ناصاف ہیں۔ ننھو کے ہاتھ میں ایک گیند ہے جسے سینے سے لگائے وہ مجی کے آگے آگے بھاگی آتی ہے)

مجی۔ میرا گیند۔۔۔۔۔ میرا گیند۔

ننھو۔ کیوں ہم نہ کھیلیں گے۔

مجی۔ تم کیوں کھیلو گی۔ میں تمہاری گڑیوں سے کھیلتا ہوں۔

(زبردستی گیند چھین لیتا ہے)

ننھو۔ میرا گیند۔۔۔۔۔ دے میرا گیند۔۔۔۔۔

(مجید کو پیٹتی ہے)

مجی۔ (برابر پیٹتا ہوا) لے یہ لے۔۔۔ یہ لے۔۔۔ پھر پیٹے گی۔

(ننھو روتی ہے)

ذکیہ۔ (صرف کروٹ بدل کر) ارے کوئی ہے! ان کمبختوں کو نکالے میرے کمرے سے، پل بھر کا چین حرام ہو گیا ان بدذاتوں کے مارے۔ خدا ایسی اولاد دشمن کو بھی نہ دے۔

(احسان صاحب داخل ہوتے ہیں۔ دوہرے جسم کے بھاری بھرکم آدمی ہیں، لیکن انہیں مضبوط اور توانا نہیں کہا جا سکتا، معلوم ہوتا ہے جیسے جسم نے بے دل ہو کر گوشت چھوڑ دیا ہے۔ ان کی چال میں ایک عجیب طرح کا اضمحلال ہے۔ کپڑے بھی صاف نہیں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا وجود بھی اسی کمرے کا ایک حصہ ہے۔ اُس پر بھی وہی بے دلی اور بے حسی طاری ہے جو کمرے پر)

احسان۔ (بچوں کو دبے لہجے میں سرزنش کرتے ہوئے) جاؤ بیٹا، بھاگو، ادھر جا کر کھیلو! (نزدیک آ کر) ارے بھئی، ابھی تک لیٹی ہوئی ہو، پھر طبیعت کچھ خراب ہے آج؟

ذکیہ۔ (اسی تھکی تھکی آواز میں) یونہی سر میں ہلکا ہلکا درد تھا، جسم ٹوٹ سا رہا تھا۔

(احسان آ کر اس کے قریب بیٹھ جاتے ہیں، اس کے بکھرے ہوئے بالوں پہ آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہیں)

احسان۔ (لمبے سانس کو دباتے ہوئے) وہ دن کتنی خوشی کا ہو گا ذکیہ، جب میں تمہیں تندرست دیکھوں گا پیٹ درد، کمر درد، کوئی نہ کوئی درد لگا ہی رہتا ہے تمہیں۔

ذکیہ۔ اب بیماری پر انسان کا کیا زور ہے۔

احسان۔ لیکن جہاں بیماری ہے وہاں علاج بھی تو ہے۔ تمہاری بیماری کا تو کوئی علاج ہی نہیں، کاش درد کی دوا میرے بس میں ہوتی!

ذکیہ۔ آپ..... بھلا..... آپ.....

(اُٹھنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن لیٹی رہتی ہے۔)

احسان۔ (لمبا سانس بھرتے ہیں) کاش میں تمہیں خوش رکھ سکتا!

ذکیہ۔ بھلا مجھے کیا غم ہے، میں ہر طرح خوش ہوں۔

احسان۔ خوش ہو (درد سے ہنستا ہے) خوشی کی کوئی علامت تو تمہارے چہرے پہ دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے ساون کی وہ شام یاد ہے، جب میں رضیہ کی موت کے بعد دلی گیا تھا۔ تم ہی نے قطب چلنے کی تجویز کی تھی۔ میں نکہت، تم اور ریاض۔ چاروں قطب دیکھنے گئے تھے۔ کتنی خوش تھیں تم ان دنوں کتنی شوخ اور چنچل؟ کتنا ہنسا کرتی تھیں۔ تمہارے گالوں کے گلاب ہر وقت کھلے رہتے تھے (لمبا سانس بھر کے) یہاں آ کر نہ جانے وہ کیوں مرجھا گئے؟

ذکیہ۔ (چپ رہتی ہے)

احسان۔ اور میں سوچتا تھا یہاں آ کر ان کی سرخی میں اضافہ ہوگا، یہ خوبصورت فضا، یہ ہوا، یہ پہاڑ، یہ دریا—— صبح و شام ہم سیر کو جایا کریں گے۔

ذکیہ۔ آپ جاتے ہی نہیں، میں کتنی بار کہہ چکی ہوں۔

احسان۔ میں نہیں جاتا (طنز سے ہنستے ہوئے کمرے میں گھومتے ہیں) میں سیر کو جایا کرتا تھا جب تمہاری بہن زندہ تھی۔

ذکیہ۔ (کروٹ بدل کر) آپ اب بھی جا سکتے ہیں، آپ کو فرصت بھی ملے۔

احسان۔ فرصت (اسی طنز سے ہنستے ہیں) تمہارے آنے کے بعد (تمہیں شاید یاد بھی نہیں) میں نے تمہارے ساتھ صبح صبح سیر کو جانے کی کوشش کی تھی۔ سورج نکلنے سے کہیں پہلے دریا کے نیلگوں پانی میں سونا گھلا ہوتا، کنول کے پیلے پیلے پتوں سے دائرے دریا کی لہروں میں بنتے مٹتے چلے جاتے، ادھر سورج کی پہلی کرن جھانکتی ادھر اس زردی میں سرخی تحلیل ہونے لگتی (کھڑکی میں جا کھڑے ہوتے ہیں) صبح کی اس پاکیزہ کنواری فضا میں میرا دل ایک عجیب مسرت سے معمور ہو جاتا، یوں محسوس ہوتا، جیسے دنیا نے پہلی بار، نہ جانے کتنی لمبی نیند کے بعد آنکھیں کھولی ہیں اور صرف ہمیں دو اس بیدار حسن کو دیکھنے کے لئے پہنچ گئے ہیں (ذکیہ کی طرف مڑ کر) لیکن میں غلطی پر تھا، دو نہیں، اس خوبصورتی کا نظارہ کرنے والا تو صرف میں اکیلا ہوتا، تم تو نہ جانے کہاں ہوتی تھیں۔ گم سم سی بیٹھی نہ جانے ماضی کا کونسا خواب دیکھا کرتی تھیں۔ پھر میں سیر چھوڑ کر مصروف رہنے کی کوشش کیوں نہ کرتا۔

ذکیہ۔ [illegible] خیال پر چھوڑیئے، آپ جائیے، ابھی اور نتو کو لے جایا کیجئے۔

احسان۔ مجی اور نستو (درد سے ہنستے ہیں) اب تو کبھی سیر کو جانے کی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ ایک عجیب طرح کی بے حسی طاری رہتی ہے۔ زندگی سردیوں کے اسی چناب کی طرح اپنی جوانی کھو چکی ہے، کیا سوکھا سمٹا کھویا کھویا سا بے آواز بہہ رہا ہے۔ نہ جانے اس کو اپنی جوانی کی یاد آتی ہے یا نہیں؟

(واپس ذکیہ کی چارپائی کی طرف آتے ہوئے) میں تو قریب قریب بھول ہی گیا ہوں۔ یہ تو ریاض کے آنے کی خبر سن کر کچھ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔

(لمبا سانس لیکر برابر کی چارپائی پہ بیٹھ جاتے ہیں۔ رضیہ اچانک چونک کر اٹھتی ہے)

ذکیہ۔ ریاض! کون ریاض؟ ریاض بھائی کیا یہاں آتے ہیں؟

احسان۔ سنا ہے جموں آئے ہیں۔

ذکیہ۔ (چارپائی چھوڑ کر ان کے قریب آجاتی ہے) جموں، کیوں، آپ کو کیسے پتہ چلا۔

احسان۔ (اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنے جذبات کی رو میں) میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں ذکیہ — پچھلے آٹھ برس میں، میں برابر سوچتا چلا آیا ہوں — اگر میں تمہاری بہن کی موت کے بعد دلی نہ گیا ہوتا تو تمہاری ہنسی خوشی کا سوتا بھی یوں نہ سوکھ جاتا اور میری زندگی کی پہاڑی بھی ایسے تند لاٹھوں کی گود میں نہ جا سوتی۔

ذکیہ۔ رضیہ آپا اتنی اچھی تھیں، ان کی جدائی کسے محسوس نہیں ہوتی، میں پوچھتی تھی کہ ریا.....

احسان۔ امد خالہ نے کہا تھا۔ ذکیہ رضیہ کے غم کو تمہارے دل سے بھلا دے گی۔ اگر خالہ میرا حوصلہ نہ بڑھاتیں تو میں شاید کبھی تمہیں مانگنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا۔

ذکیہ۔ (دوسری چارپائی کا بستر اکٹھا کرنے لگتی ہے) یہ آج آپ کیا گڑے مردے اکھیڑنے لگے ہیں — آٹھ برس ہو گئے ہماری شادی کو۔ اچھی بھلی بسر ہو رہی ہے۔ میں اگر بیمار نہ ہو جاتی.....

(بستر اپنی چارپائی پر رکھ کر چارپائی اٹھانا چاہتی ہے۔
احسان صاحب اس کی چارپائی پر جا بیٹھتے ہیں۔)

احسان۔ تم کبھی بیمار نہ رہتیں۔ اگر تم یہاں نہ آتیں۔ آج ریاض کے جموں آنے کی خبر سن کر میرے سامنے قطب کی وہی شام اور اس شام کی وہی ذکیہ گھوم گئی ہے۔

ذکیہ۔ (چارپائی اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے) یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ چھوڑیئے بھی اس قصے کو دیکھے میں اٹھ تو بیٹھی ہوں طبیعت خراب تھی، نہیں تو مجھے کیا لطف آتا ہے دن دن بھر لیٹے رہنے میں، ریاض کی بابت پوچھ رہی تھی اور آپ.....

(ٹہلتی ہوئی الماری ٹھیک کرنے چلی جاتی ہے)

احسان۔ اے تم تو ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہوتی ہو، میں نے کبھی کچھ کہا ہے، میری طرف سے آنکھوں پھیر رہی ہو۔

کے آنے کی خبر سن کر یونہی خیال آ گیا کہ جموں آیا ہے تو ہو سکتا ہے یہاں بھی چلا آئے۔

ذکیہ۔ (الماری صاف کرنا چھوڑ کر واپس آتے ہوئے) یہی تو پوچھ رہی ہوں پہر بھر سے اور آپ ہیں کہ بات کا جواب ہی نہیں دیتے۔

(پھر واپس الماری کی طرف جاتی ہے)

احسان۔ (اس کے پیچھے جاتے ہوئے) یہی تو بتانے آیا تھا لیکن نہ جانے کیوں تمہیں بیمار اور پژمردہ دیکھ کر مجھے افسوس سا ہونے لگتا ہے۔

ذکیہ۔ اب تو میں اٹھ بیٹھی ہوں، کام بھی کرنے لگی ہوں، طبیعت جب ٹھیک نہ ہو تو ..... کیا کرنے آئے ہیں ریاض بھائی جموں؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا ان کے آنے کا۔

احسان۔ رات قسیم آیا ہے وہاں سے کہہ رہا تھا کہ ریاض میاں جموں آئے ہوئے ہیں۔ ان کے تو خوب چرچے ہیں وہاں۔ پرسوں ان کے اعزاز میں پارٹی ہوئی، مشاعرہ بھی ہوا اور وہ تو کہتا ہے جموں کے تینوں مقامی اخباروں میں ان کا تذکرہ ہے۔

(ذیل کے مکالمے میں ذکیہ نادانستہ طور پر کمرے کی بکھری ہوئی چیزوں کو ترتیب سے رکھنے لگتی ہے۔ جوں جوں وہ ریاض کا ذکر کرتی ہے اس کی بےحسی دور ہوتی جاتی ہے اور ترتیب کے کام کی رفتار بڑھتی جاتی ہے)

ذکیہ۔ کتنی عزت حاصل کی ہے ریاض نے اور خالو ہمیشہ کوسا کرتے تھے کہ خاندان کے نام کو داغ لگائیگا۔

احسان۔ آوارہ جو رہے تھے بچپن میں

ذکیہ۔ نہیں آوارہ تو کیا تھے، الٹے آٹھوں پہر گھر میں پڑے رہتے تھے۔ لیکن درسی کتابوں سے انہیں چڑ تھی۔

احسان۔ تو پھر پڑھتے کیا تھے؟

ذکیہ۔ پریوں اور دیوں کے قصے کہانیاں اور کیا، ــــ نہ جانے کہاں کہاں سے خرید لاتے۔ خالو کو چڑ تھی ان سب کتابوں سے۔ وہ انہیں مخرب الاخلاق سمجھتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے۔ بھائی ریاض کے دشمنوں کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ خالو انہیں دیکھنے گئے تو الف لیلیٰ پڑھ رہے تھے۔ خون ہی تو اتر آیا ان کی آنکھوں میں۔ باہر سے تو آئے ہی تھے، چھڑی ہاتھ میں تھی، دھڑا دھڑ پیٹنے لگے۔

احسان۔ بڑے جابر تھے تمہارے خالو۔

ذکیہ۔ اگر یہ معافی مانگ لیتے تو ان کا غصہ فرو ہو جاتا۔ دو دھ کا ابال ہی تو ہوتا تھا ان کا غصہ، آیا اور اتر گیا۔ لیکن ریاض میاں تو گویا پتھر کے تھے۔ ٹس سے مس نہ ہوتے، آنکھوں میں آنسو تک نہ آئے جھلا کر خالو جان نے کان سے پکڑ کر باہر کر دیا۔

احسان۔ خالہ نے نہیں روکا۔

ذکیہ۔ خالو جان غصے میں ہوں تو کس کا حوصلہ تھا کہ ان کے سامنے دم بھی مارے۔ لیکن ریاض بھائی بھی نہ جانے کس مٹی کے بنے تھے، نہ روئے نہ چلائے، جا کر نیم کے تلے بیٹھ گئے، جب رات کے بارہ بجے خالو جان باہر سے لوٹے تو انہیں کان سے پکڑے ساتھ لیتے آئے، لا کر بستر پہ پٹک دیا اور بولے۔ یہ کمبخت خاندان کے نام کو داغ لگائے گا۔ خدا کی شان دیکھو، وہی خاندان کے نام کو روشن کر رہے ہیں۔

احسان۔ بڑا نام حاصل کیا ہے ریاض میاں نے۔

ذکیہ۔ لیکن چھوڑ تھوڑی دیا تھا ان حضرت نے ان قصوں کا پڑھنا، پڑھتے رہے اور بیچ کھیت پڑھتے رہے۔ ایک بار خالہ نے امی جان سے ریاض کو اپنی غلامی میں لینے کے لئے کہا۔

احسان۔ (ہنس کر) خالہ کی نظر تھی تم پر!

ذکیہ۔ امی تو شاید تیار بھی ہو جاتیں۔ لیکن خالو یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے، مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے بولے — کیوں اس غریب لڑکی کا گلا کاٹنے کے درپے ہو۔ جو آدمی چار پیسے نہیں کما سکتا وہ بیوی کی ناز برداری کیا کر سکتا ہے اور ابا جان خالو سے متفق تھے۔

احسان۔ (ذرا ہنس کر) تمہارا کیا خیال تھا؟

ذکیہ۔ میرا..... لو بھلا میں..... بڑی اچھی ہوں جیسی ہوں۔

احسان۔ لیکن شادی تو پھر شاید ریاض نے نہیں کی۔

ذکیہ۔ خالہ تو کئی جگہ بات پکی کر آئیں، لیکن پہلے خالو جان کی رائے میں ان کے طور نہ بدلے اور پھر جب طور بدلے تو سنتی ہوں ریاض بھائی نے شادی ہی سے انکار کر دیا اور پھر (لمبا سانس بھر کر) خالہ اور خالو دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

احسان۔ لیکن وہ کسی نجمہ کے متعلق..... کچھ بھنک..... کان میں پڑی تھی۔

ذکیہ۔ ایک نجمہ کیا بیسیوں نجمہ ان کے قدموں پہ نثار ہونے کے لئے تیار ہیں، وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں بھی۔ نکہت آئی تھی تو شکایت کرتی تھی کہ وہی رنگ ڈھنگ ہیں بھائی جان کے۔ عام لوگوں کی طرح رہتے ہی نہیں۔ بس شعر و نغمہ کی خیالی دنیا میں بستے ہیں..... اب جمعل کیا کرنے آتے ہیں۔

احسان۔ ہو سکتا ہے کسی مشاعرے اُشاعرے میں آئے ہو

ذکیہ۔ جموں تو گئے، لیکن یہاں نہیں آئے۔

احسان۔ وہ مصروف آدمی ہیں، ان کا پل پل بندھا ہو گا۔

ذکیہ۔ ہاں مصروف آدمی ہیں!

احسان۔ سو بھی تو میں کہنے آیا تھا کہ آنہ جائیں یہاں! جب جموں آئے ہیں تو یہاں بھی آسکتے ہیں اور گھر میں اتنی بے ترتیبی پھیلی ہوئی ہے

ذکیہ (امید و بیم کے ملے جلے جذبات سے) ہاں آگئے..... اس آٹھ برس کے عرصے میں کتنی بار لکھا۔ نزہت، نکہت، ارشد سب کے ہاتھ کہلا بھیجا۔ خطوں کی تو کبھی رسید نہیں دی۔ اب آئیں گے

(رحیمن دروازہ سے جھانکتی ہے)

رحیمن۔ سرکار ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں، سلطان انہیں دفتر میں بٹھا آیا ہے۔

احسان۔ میں جاتا ہوں۔ تم ذرا یہ جگہ صاف کر دو رحیمن۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی یہاں بھوت ناچ کر گئے ہیں۔ تم لوگ کرتے کیا رہتے ہو سارا دن؟ جانتی ہو کہ بیگم کی طبیعت خراب رہتی ہے (جاتے جاتے زمین پر پڑی ہوئی ایک دو چیزوں کو ٹھوکر مارتے ہیں) اٹھاؤ یہ سب کوڑا کرکٹ اور صاف کرو اس کمرے کو۔

(چلے جاتے ہیں لیکن استہزا آمیز ہنسی کے ساتھ کہے ہوئے ان کے الفاظ برابر کان میں پڑتے ہیں۔)

میں یہاں کا انجینئر ہوں، میرے تین تین ملازم ہیں اور میرے گھر کی یہ حالت ہے۔

(رحیمن ذکیہ کے ساتھ کمرہ صاف کرنے میں مدد دیتی ہے کچھ لمحے بعد مجی ہنستا ہنستا بھاگتا آتا ہے، نستو چیختی چلاتی اس کے پیچھے بھاگتی داخل ہوتی ہے)

نستو۔ دے میری گڑیا، دے میری گڑیا (اسے پکڑ کر کھینچتے ہوئے) دے میری گڑیا۔ دے... دے... دے

مجی (برابر اسے پیٹتا ہوا) پھر مارے گی مجھے، لے..... یہ لے..... یہ لے.....

ذکیہ۔ (کام چھوڑ کر) ایں ہیں، نستو، مجی، یہ کیا ہو رہا ہے

نستو۔ (سسکتے ہوئے) گڑیا چھین لی میری۔

مجی۔ پھر مجھے چڑاتی کیوں تھی۔

ذکیہ۔ چڑاتی تھی تو پھر کیا ہوا، تیری چھوٹی بہن ہے۔ اچھے لڑکے اپنی چھوٹی بہنوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہونگے۔ تیرے ماموں جان ہمیشہ مجھے پیار کرتے تھے۔ کبھی نہ پیٹتے تھے۔

نستو۔ (سسکنا کچھ کم کرکے) نسیم ماموں جان امی

ذکیہ۔ وہ تو اسی مجی کی طرح تھے، میں تمہارے ریاض ماموں جان کا ذکر کر رہی ہوں۔

نستو۔ (سسکنا اور بھی کم کرکے) بڑے امیر آدمی ہیں۔

ذکیہ۔ نہیں بیٹی، ان کا نام مجاز ہے۔ وہ شاعر ہیں، ملک بھر میں ان کی عزت ہے۔ جہاں وہ جاتے ہیں۔ لوگ ان کے راستے میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ ابھی تمہارے آبا کہہ رہے تھے کہ وہ یہیں آنے والے ہیں (مجید سے) اگر وہ تمہیں دیکھ لیں بھی تو کیا کہیں؟ شکل تو دیکھو کیسی بھنگیوں سی بنا رکھی ہے۔

(رحیمن سے) رحیمن یہ کمرہ پھر صاف کرنا پہلے اسے لیجا کر نہلا اور اس کے کپڑے بدل دے یہ پالتیاں اور لوٹے اٹھا لیجا یہاں سے

مجی۔ (ماں کے اس اچانک جاگ اٹھنے والے پیار سے فائدہ اٹھا کر منمناتا ہوا) امی ـــ ی ـــ ی۔

ذکیہ۔ (ڈانٹ کر) جاتا بھی ہے کمبخت! (پھر سنبھل کر) جا، جا بیٹا، تیرے ماموں جان آئیں گے تو تجھے اس طرح میلے کپڑے پہنے دیکھ کر ناراض ہونگے اور مٹھائی نہ دیں گے، جا ..... جا .. میرا راجہ بیٹا

مجی۔ پھر میں دو پیسے کی برفی لوں گا۔

ذکیہ۔ (دانت پیستے ہوئے لیکن پیار سے) ہاں ہاں لینا برفی۔

رحیمن۔ چلو۔ چلو۔

(رحیمن مجید کو لیجاتی ہے اور ذکیہ نسیمہ کو گود میں لے کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے ....)

ذکیہ۔ (بڑے پیار سے) اور کیوں نستو بیٹا، اس طرح بڑے بھائیوں سے پیش آتے ہیں۔

(ماں کے اس غیر متوقع سلوک سے چونک کر نسیمہ چپ رہتی ہے)

ـــ کہو بیٹا!

نستو۔ چھینی کیوں اس نے میری گڑیا؟

ذکیہ۔ گڑیا چھین لی تھی تو تو مجھ سے کہتی۔ یہ کیا کہ دھول دھپا شروع کر دیا۔ یہ تو چنی کے لچھن ہیں۔ منی کبھی ایسا نہ کرتی۔

نستو۔ (فطری تجسس سے) منی کون تھی امی؟

ذکیہ۔ منی چنی کی چھوٹی بہن تھی۔ کہنے کو وہ ننھی منی تھی۔ لیکن بڑی بہن کے مقابلے میں اتنی ہوشیار، سمجھدار اور نیک کہ سب اس سے پیار کرتے تھے، چنی دن چڑھے تک سوئی رہتی اور جب اٹھتی تو بہن بھائیوں سے لڑتی، لیکن منی بہن بھائیوں سے پیار کرتی اور اماں آپا کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی گھر تو گھر محلہ بھر اس سے پیار کرتا تھا ـــ اب میری نستو بیٹی چنی بنے گی یا منی؟

نستو۔ (ماں کی گود میں اچھل کر) میں تو منی بنوں گی۔

ذکیہ۔ لے پھر اپنی گڑیا کے جوڑے اور کھلونے سنبھال کر رکھ دے، تیری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں اور دیکھ تو کمرے کو کس طرح گندہ کر دیتی ہے۔

(نستو کو پیار سے چوم لیتی ہے)

نستو۔ (محجوب ہو کر) ابھی اٹھا لیتی ہوں۔

ذکیہ۔ (نستو کو ایک بار پھر پیار سے چوم کر) بڑی اچھی ہے میری منی بیٹی!

سلطان۔ (باہر سے) دلہن بیگم سرکار نے کہلا بھیجا ہے کہ ریاض میاں جموں سے آ گئے ہیں۔

ذکیہ۔ (بیٹی کو پیار کرنا بھول کر اسے فوراً گود سے اتارتے ہوئے) ریاض بھائی آ گئے۔۔۔۔ رحیمن!

(اور بھی زور سے) رحیمن!

رحیمن۔ (غسلخانے سے) جی بیگم آئی (گیلے ہاتھ لئے بھاگی آتی ہے) جی۔

ذکیہ۔ (مسرت بھرے جوش سے) دیکھو منی کو چھوڑ دو! اسے میں نہلاتی ہوں، ریاض بھائی آ رہے ہیں۔
تم اس کمرے کو فوراً صاف کر ڈالو، یہ چارپائی ہٹاؤ، جتنی فالتو چیزیں یہاں پڑی ہیں، تم اس کمرے کو فوراً صاف کر ڈالو، یہ چارپائی ہٹاؤ، جتنی فالتو چیزیں یہاں پڑی ہیں، سب اٹھا کر ادھر کمرے میں رکھ دو، میں نئی دری اور چادر نکال دیتی ہوں۔ کمرہ جھاڑ کر پلنگ پر نیا بستر بچھا دو۔۔۔۔ سونے کے لئے نہ جانے وہ کونسی جگہ پسند کریں گے؟

(سوچتی ہے)

رحیمن۔ بارہ دری اچھی رہے گی۔

ذکیہ۔ ہاں بارہ دری اچھی رہے گی۔ تم ذرا جلدی جلدی اس کمرے کو صاف کر کے اوپر جا کر بارہ دری کا فرش دھو ڈالو۔ نیچے فرش پر دری ولائی اور جاجم بچھا دینا اور کھڑکی کے برابر میز کرسی لگا دینا۔ میز کے لئے میز پوش اور کرسی کے لئے گدی میں ابھی دیتی ہوں۔

رحیمن۔ (اتنا کام سن کر ٹالنے کی غرض سے) لیکن رات برف پڑی ہے پہاڑوں پر، بارہ دری میں سردی ہو گی۔

ذکیہ۔ تم بارہ دری صاف کرو، میں سلطان سے نچلی بیٹھک صاف کرنے کو کہتی ہوں۔۔۔۔ معلوم نہیں وہ کونسی جگہ پسند کریں گے۔۔۔۔۔ ذرا سلطان کو آواز تو دو۔

رحیمن۔ (بالکونی کے دروازے پر جا کر سلطان کو آواز دیتی ہے) سلطان۔۔۔ سلطان۔

سلطان۔ (نیچے آنگن سے) کیا بات ہے، چلائے جاتی ہو۔

رحیمن۔ بیگم بلا رہی ہیں۔

سلطان۔ آیا۔

ذکیہ۔ (رحیمن کے اترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھے بغیر بالکونی پر جاتے ہوئے) اور دیکھو بارہ دری کو صاف کر کے ذرا انگنائی کو بھی ٹھیک کر دو، یہ جھلنگے جو کمبخت پڑے ہیں انہیں کوٹھڑی میں بند کر دو، مرغیوں کو ڈربوں میں ٹھونسو، بدبختوں نے جگہ جگہ گڑھے کھود رکھے ہیں (ذرا دھیمی آواز میں)

اور دیکھ ریاض بھائی کو پھول بے حد پسند ہیں۔ سلطان کے چھوکرے کو بیگاں کے باغ میں بھیج کر دو گلدستے منگا لو۔ شیشے کے گلاس میں دیدو تھی، ایک اوپر بارہ دری میں اور دوسرا نیچے بیٹھک کی میز پر لگا دینا۔۔۔۔ ذرا سی بھی سستی سے کام لیا تو دیکھنا۔۔۔۔

رحیمن۔ جی ابھی بھیجتی ہوں۔

ذکیہ۔ اور اس کہار سے کہنا دو گھڑے کنویں کا پانی لائے، دریا کا پانی شاید پسند نہ آئے ریاض بھائی کو

سلطان۔ (بائیں دروازے کی اوٹ میں) جی بیگم فرمایئے۔

ذکیہ۔ (درمیان کے دروازے میں ذرا پیچھے ہٹ کر) بھائی ریاض آئے ہیں سلطان اور میں پریشان ہوں کہ ان کے لئے کونسی جگہ اچھی رہے گی، بارہ دری یا بیٹھک!

سلطان۔ جی۔۔۔۔ جی

ذکیہ۔ میں نے رحیمن سے بارہ دری صاف کرنے کے لئے کہا ہے تو ذرا نیچے بیٹھک میں جاکر فرش دھو دے۔ تخت جھاڑ پونچھ کر صاف کر دے اور میز پوش بدل ڈال، بس اب بھاگ جا۔ تخت کی چادر اور میز پوش بھیجدونگی۔

(سلطان جانے لگتا ہے)

— اور سن! ذرا ان سے جاکر کہنا کہ ریاض بھائی کو کچھ دیر کے لئے دفتر ہی میں بٹھائیں۔ اتنے میں ذرا یہ صفائی وغیرہ ہو جائے۔ باہر بلا کر کان میں کہنا ان کے یہ بات!

سلطان۔ جی بہتر!

ذکیہ۔ اور دیکھ وہیں نہ بیٹھے رہنا۔ آکر جلدی سے بیٹھک صاف کر۔ میں اتنے میں بچوں کو نہلاتی دھلاتی ہوں (نسیمہ سے) چل نستو، تو بھی نہا کر کپڑے بدل (رحیمن سے) تو اب تم جاؤ اور جلدی سے یہ کام نمٹاؤ اور، ماما کو ساتھ لے لو اور ریاض بھائی کے آنے تک اس جگہ کو بیٹھنے لائق بنادو (جاتے جاتے کنویں سے پانی اور بیگاں کے باغ سے پھول منگانا مت بھولنا۔

(نسیمہ کو ساتھ لے کر چلی جاتی ہے۔ رحیمن چپ چاپ کمرے کی صفائی کرنے لگتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(ایک گھنٹہ بعد اسی کمرے میں)

(اس ایک گھنٹے میں اگرچہ اس بے ترتیب کمرے میں کوئی زبردست انقلاب پیدا نہیں ہوسکا، لیکن اس کی ظاہرہ صورت میں خاصی تبدیلی رونما ہوگئی ہے۔ چیزوں کی افراط میں کمی نہیں آئی (شاید ان سب کو دوسرے کمرے میں رکھنے کا وقت نہیں ملا) لیکن ان میں ایک ترتیب ضرور آگئی ہے۔ — بستر پر دودھ جیسی سفید چادر بچھی ہے، تکیئے کا غلاف بھی بدل دیا گیا ہے، کھلونے طاق میں چن دیئے گئے ہیں، کپڑوں کی گٹھڑیاں باندھ کر کھونٹی سے لٹکا دی گئی ہیں، بالٹیاں اور لوٹے شاید باورچی خانے یا غسلخانے میں چلے گئے ہیں، چرخہ ایک کونے میں دھر دیا گیا ہے، تپائی اور چار کرسیاں ایک طرف سجا دی گئی ہیں، کرسیوں کی گدیاں اور تپائی کا کور سب کچھ بدل دیا گیا ہے الماری کی چیزیں جھاڑ پونچھ کر سجا دی گئی ہیں۔ غرضیکہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ قرینے سے چن دی گئی ہے پردہ اٹھنے پر نستو اور مجی کتابیں لئے دو کرسیوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ برابر ہی تیسری کرسی پر بیٹھی ہوئی ذکیہ لیس بن رہی ہے — لیس بن رہی ہے لیکن اس کا دھیان لیس بننے میں نہیں رہ رہ کر اس کی آنکھیں بالکونی کی طرف اٹھ جاتی ہیں، لیس بنتے بنتے اٹھ کر کبھی کمرے کا ایک چکر لگاتی ہے اور پھر بیٹھ جاتی ہے۔

اس ایک گھنٹے کے عرصے میں خواہ کمرے میں کوئی خاطرخواہ انقلاب نہ پیدا ہوا ہو۔ لیکن ذکیہ اور دونوں بچوں کی صورت شکل میں زبردست تبدیلی آگئی ہے — وہ ایک گھنٹہ پہلے کی مغموم، اداس اور جوانی کے باوجود ادھیڑ عمر کی نظر آنے والی ذکیہ، جیسے بجلی کی سی شوخی اور چمک پاگئی ہے — آٹھ برس پہلے جس جاں سوز حسن کے ایک شعلے نے احسان صاحب کی مردہ خواہشوں میں آگ بھر دی تھی، اس کی ایک جھلک اس وقت ذکیہ کے چہرے پر لرزاں اور خنداں ہے۔

پردہ اٹھنے کے کچھ لمحے بعد ریشمی جمپر اور فرش کو چھوتا ہوا غرارہ پہنے، کھسکتے ہوئے دوپٹے کو گردن کے گرد بل دیتی ہوئی وہ بالکونی کے بائیں دروازے کے پاس جاکر رحیمن کو آواز دیتی ہے)

ذکیہ۔ رحیمن ابھی آئے نہیں ریاض بھائی؟

(اور پھر جواب سنے بغیر واپس آکر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے، لیکن پھر اٹھتی ہے اور کمرے میں گھومنے لگتی ہے۔ نستو اور مجی کتابوں کی طرف نہ دیکھ کر کھڑکیوں میں دیکھتے ہیں۔)

ذکیہ۔ (انتظار سے جھنجھلا کر) اب اچھے بچوں کی طرح پڑھو بیٹھ کر!

(نستو اور ممی پھر نگاہیں کتابوں پہ جما لیتے ہیں)

— (ان کے قریب جا کر ملائمت سے) دیکھو ابھی تمہارے ماموں جان آئیں گے، آتے ہی انہیں سلام کرنا اور بہت شور نہ مچانا (ممی سے جو پھر کھڑکی میں دیکھنے لگا ہے) سنا رے ممی!

ممی۔ پھر میں برف لوں گا ملائی کی۔

ذکیہ۔ (دانت پیستے ہوئے) پاجی!

(ممی رونے کے لئے ہونٹ لٹکاتا ہے)

— (جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال کر پیار سے) ہاں ہاں لینا برف، لینا برف!

(احسان اور ریاض باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

(ریاض تیس تینتیس برس کا نوجوان شاعر ہے۔ جذباتی، بےچین اور بے پروا، اس کے چلنے میں باتیں کرنے میں پارے کا سا اضطرار ہے۔ اس کی آنکھوں میں، چہرے میں اور بالوں میں ایسی کشش ہے جو بے طرح دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے، اس نے سوٹ پہن رکھا ہے لیکن اس کا لاابالی پن اور اس کی بے پروائی اس میں سے پھوٹی پڑتی ہے)

احسان بھلا دہلی اور لاہور کے محلوں کے مقابلے میں آپ کو لکھنؤ کا یہ مکان کیا پسند آئے گا۔

ریاض۔ مجھے تو یہ چھوٹا سا قصبہ بے حد پسند آیا، پھر جو پاکیزہ ہوا اسے میسر ہے وہ لاہور اور دلی کے نصیب میں کہاں؟ (ذکیہ کو دیکھ کر) کہو ذکیہ اچھی تو ہو۔

ذکیہ۔ سلام بھائی جان، آپ کی دعا ہے۔

احسان۔ یہ تو جب سے آئی ہیں، بیمار رہتی ہیں۔

ریاض تم تو کافی کمزور ہو گئی ہو ذکی۔

ذکیہ۔ اپنے ماموں جان کو سلام کرو بیٹا۔

نستو۔ ماموں جان سلام

ممی۔ ماموں جان سلام

ریاض۔ (انہیں پیار کرتے ہوئے) سلام بھئی، سلام بھئی (نسیمہ کو گود میں اٹھا کر) کیا نام ہے تمہارا۔

نستو۔ نستو۔

ریاض۔ بیٹی تو آپ کی بڑی پیاری ہے (ممی سے) اور تمہارا کیا نام ہے

ممی۔ ممی۔

ریاض۔ پڑھتے ہو۔

مجی۔ دوسری جماعت میں پڑھتا ہوں۔

ریاض۔ (دنتو کو گود سے اتارتے اور مجی کو پیار کرتے ہوئے) شاباش! بڑا اچھا بیٹا ہے۔

(سلطان بالکونی کے بائیں دروازے سے سنگتروں
کی ٹوکری اندر رکھتا ہے۔)

سلطان۔ سرکار یہ سنگترے رکھے ہیں۔

ریاض۔ اور کچھ ملا ہی نہیں راستے سے ......

ذکیہ۔ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔

ریاض۔ میں اور تکلف! راستے میں بس کھڑی ہوئی تو ایک سنگترے والا سر پر سوار ہو گیا، سو بچوں کے لئے لیتا آیا۔

(دنتو اور مجی اپنی جگہ سے اُٹھ کر ایک ایک سنگترہ اُٹھا لیتے ہیں
ذکیہ قہر کی نگاہوں سے بچوں کی طرف دیکھتی ہے اور پھر ضبط سے کہتی ہے)

ذکیہ۔ دیکھو بیٹا، یہاں نہ بکھیرنا چھلکے!

(نیچے آنگن سے رحیمن کی گھبرائی ہوئی آواز آتی ہے)

رحیمن۔ لے گیا.... سلطان..... سلطان..... وہ جا بیٹھا مؤا منڈیر پر!

(احسان، ریاض، ذکیہ اور بچے بھاگ کر بالکونی پر جاتے ہیں۔)

احسان۔ کیا بات ہے، کیا بات ہے؟

مجی۔ (جو سب سے پہلے بالکونی پر پہنچا ہے) امی بندر چادر لے گیا ہے۔

ذکیہ۔ اُف یہ بندر! ناک میں دم آ گیا ان کے مارے (بالکونی کے جنگلے پر جا کر رحیمن کو پکارتے ہوئے) کیسے چھین کرلے گیا رحیمن!

رحیمن۔ (جو گھبرائی ہوئی اوپر بھاگی آئی ہے) میں اسے تخت پر رکھ کر سلطان کو دری بچھانے میں مدد دے رہی تھی کہ اُٹھا کر لے گیا۔

ذکیہ۔ ٹھہر مجی، اسے ڈرانا مت، تار تار کر کے رکھ دے گا چادر، جا دنتو بھاگ باورچی خانے سے روٹی کا ایک ٹکڑا اُٹھا لا۔

(دنتو بھاگ جاتی ہے)

احسان۔ (ٹوکری سے ایک سنگترا اُٹھا کر ذکیہ کو دیتے ہوئے) ارے بھئی یہ سنگترہ لے لو، اس وقت تک کہیں برابر ہی نہ کر دے چادر!

ذکیہ۔ (سنگترہ لے کر بندر کو دکھاتے ہوئے) لے..... لے..... بیچ ذرا..... بندر کیا

کنگ کانگ ہے۔

احسان۔ کنگ کانگ!

ذکیہ۔ (بدستور بندر کو شگترہ دکھاتے ہوئے) میں جب بھی اس کو دیکھتی ہوں مجھے کنگ کانگ کی یاد آجاتی ہے۔

احسان۔ کنگ کانگ!

ریاض۔ ایک بھیانک فلم کا نام ہے جس میں ایک بن مانس ایک خوبصورت لڑکی کو اٹھا کر لے جاتا ہے اسی جیسا بھیانک اور نڈر ہے یہ بھی۔ (بندر سے) لے...... لے...... پچ...... پچ!

رحیمن۔ ایسا دلیر ہے موا کہ سامنے سے اُٹھا کر لے گیا۔

ذکیہ۔ جانتی ہو کہ یہ وقت ہے ان کی چڑھائی کا، پھر بھی بے پروا ہو جاتی ہو۔

احسان۔ ارے بھئی ہاتھ میں دکھانے سے کیا ہوگا، کچھ چپاتیں ادھر پھینکو تو چھوڑ کر جائے۔

(نستو روٹی کا ٹکڑا لیکر بھاگی آتی ہے)

نستو۔ امی یہ لو روٹی۔

ذکیہ۔ (روٹی نستو سے لیکر بندر کو دکھاتی ہے) لے...... لے...... (روٹی کا ٹکڑا توڑ کر پھینکتی ہے) یہ لے...... (لمبا سانس لیتی ہے) چلا گیا، کتنا چالاک ہے۔

احسان۔ کنگ کانگ، کیا نام دیا ہے تم نے اسے۔

ذکی۔ مجی بیٹا، جا تو ذرا جاگ کر چادر اٹھا لا۔

مجی۔ پھر میں چلغوزے لوں گا دو پیسے کے۔

ذکیہ۔ (بیزاری سے) ہاں ہاں لینا چلغوزے (جنگلے پر سے نیچے آنگن میں سلطان کو ڈانٹتے ہوئے) ارے سلطان اس طرح تو گرد نہ اڑا کہ سانس لینا مشکل ہو جائے۔

(سب کمرے میں واپس آجاتے ہیں نستو اپنی کرسی پر جا کر کتاب لیکر بیٹھ جاتی ہے لیکن وہ میاں اس کا سگترے میں ہے۔)

احسان۔ (واپس کمرے میں آتے آتے) اچھا بیگم تم ان کے نہانے دھونے کا انتظام کر دو میں ذرا دفتر ہو آؤں۔ دیکھو گرم پانی......

ذکیہ۔ پانی تو بھئی یہاں دریا ہی کا آتا ہے، تمہیں شاید کچھ جھجک محسوس ہو، ہم تو پیتے بھی وہی ہیں۔ لیکن تمہارے لئے میں نے کنوئیں کا پانی منگایا ہے۔ دو میل دور ہے کنواں، وہیں سے کہار لاتے ہیں۔

احسان۔ کہئے تو نہانے کے لئے بھی پانی وہیں سے منگا لیا جائے۔ ہم تو پھٹکری ڈال لیا کرتے ہیں۔

ریاض۔ جی آپ فکر نہ کیجئے میں نہا کر چلا ہوں۔

حسان۔ اچھا چائے پانی پلاؤ ریاض میاں کو، میں ہو آؤں دفتر تک۔

(چلے جاتے ہیں)

ریاض۔ چارپائی پر لیٹتے ہوئے) چائے میں صبح ہی پیتا ہوں، سچ، پی کر چلا تھا۔ اب تو بارہ بجنے والے ہیں۔

ذکیہ۔ کرسی کو چارپائی کے نزدیک کھسکا کر اس پر بیٹھتے ہوئے) تم تو اس طرح تکلف کر رہے ہو۔ جیسے یہ کسی دوسرے کا گھر ہو۔

ریاض۔ سچ میں پی کر چلا تھا، ورنہ کبھی آج تک تکلف کیا جو اب کرونگا۔

ذکیہ۔ آج تک، جیسے بیسیوں دفعہ آچکے ہو یہاں ؟

ریاض۔ بھئی میں چائے پی کر چلا تھا ذکی، اب تو کھانا کھانے کا وقت ہے۔

ذکیہ۔ کھانا بھی تیار ہوا چاہتا ہے۔ گھر میں کچھ بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی، میں نے نوکروں کو ادھر لگادیا۔ (نوکرانی کو آواز دیتی ہے) رحیمن ...... رحیمن ...... (بالکونی پر جاکر نیچے جھانکتے ہوئے) رحیمن!

رحیمن۔ (نیچے آنگن سے) جی بیگم!

ذکیہ۔ صفائی وغیرہ سلطان پر چھوڑ دو، تم جاکر کھانا پکانے کا انتظام کرو، وہ کہار پانی لایا کنوئیں کا یا نہیں

رحیمن۔ ابھی دو گھڑے دے گیا ہے بیگم!

ذکیہ۔ تو بس اب جھٹ سے باورچی خانے میں آگ واگ ٹھیک کرو، آٹا گوندھ کر رکھو۔ روٹیاں میں خود پکاؤں گی۔

ریاض۔ (اٹھ کر اس کے پاس جاتا ہوا) کوئی ایسی جلدی نہیں ذکی، میں تو یوں بھی ڈیڑھ دو بجے کھانے کا عادی ہوں، لیکن یہ لاری کمبخت جس راستے سے آتی ہے، اس میں اتنے ہچکولے لگتے ہیں کہ خدا کی پناہ ہفتوں کے لئے آنتوں کی ورزش ہو جاتی ہے۔ بھوک لگ ہی آئی ہے۔

ذکیہ۔ (ایک سنگترہ اٹھا کر چھیلتے ہوئے) تم اتنے میں ایک دو سنگترے کھاؤ، سالن تیار ہے، رحیمن ذرا آٹا گوندھ دے، میں روٹیاں خود پکاؤں گی۔

(ریاض پھر چارپائی پر جاکر لیٹ جاتا ہے۔ مجی آتا ہے۔ اور چپ چاپ نستو کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنا سنگترہ وہ ختم کر آیا ہے، لیکن اس کی نگاہیں برابر نستو کے سنگترے پر لگی ہوئی ہیں۔ ذکیہ قہر بھری نظر سے دیکھتی ہے، مجی نگاہیں کتاب میں جما دیتا ہے)

ذکیہ۔ (کرسی پر بیٹھ کر سنگترہ چھیلتے ہوئے) تم ڈاک لاری سے نہیں آئے۔ وہ تو نہر کے کنارے کنارے آتی ہے۔

ریاض۔ سواریوں نے تو کہا تھا نہر پر سے چلنے کے لئے، لیکن ڈرائیور بولا۔ پل ٹوٹ گیا ہے وہاں

سے لاری نہیں جاسکتی۔

ذکیہ۔ کوئی ڈرپوک ہوگا، برکت تو پینتالیس منٹ میں لے آیا کرتا ہے۔

ریاض۔ پینتالیس — یہ تو پونے دو گھنٹے میں لایا ہے، اور پھر ایسے راستے سے کہ ہڈیاں چٹخ گئیں۔

ذکیہ۔ سڑک سے آئی ہوگی لاری۔

ریاض۔ اس اوبڑ کھابڑ راستے کو آپ سڑک کہتے ہیں، اتنے پتھریلے نالے راستے میں پڑتے ہیں لیکن کسی پر بھی تو پل نہیں۔ میں سوچتا ہوں، برسات کے دنوں میں لوگ کیسے آتے جاتے ہونگے۔ مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں کشتی میں آتا۔

ذکیہ۔ (الماری سے ایک پلیٹ اٹھا کر سنگترے کو اس میں رکھتے ہوئے) اور شام کو کمسنور پہنچے۔ آیتیں قل ہو اللہ پڑھتیں، لیکن جناب شاعر ہونے کے زعم میں اس طرف سے بے پرواہ ہریں گنتے، پلوں کے اوپر نیچے سے گذرتے ہوئے چلے آتے۔

(آنکھوں ہی آنکھوں میں نستو اور مجی اشارے کرتے ہیں۔ اور نستو اُٹھ کر امی کے پاس آتی ہے)

نستو۔ امی، میں ذرا ہو آؤں صادقہ کے ہاں، اس کی گڑیا کی شادی ہے۔

ذکیہ۔ آجانا اپنے آپ رجنی کی طرح تنگ نہ کرنا اپنی امی کو۔

نستو۔ ہاں ہاں میں آجاؤنگی۔

(نستو جاتی ہے اور جاتے جاتے مجی کو چھیڑتی ہے۔)

مجی۔ میں بھی گلی ڈنڈا کھیلنے جاؤں گا امی۔

ذکیہ۔ ہاں ہاں کھیل آؤ، لیکن آجائیو جلدی۔

مجید۔ (جاتے ہوئے) ہاں ہاں بس جلدی آجاؤں گا۔

(نستو کے پیچھے بھاگ جاتا ہے)

ذکیہ دیکھو۔

(مجید بالکونی پر رُکتا ہے)

— تمہارے ماموں جان کے ساتھ ہم سب مل کر اکٹھے کھانا کھائیں گے۔

(مجید بہت اچھا کہتا ہوا بھاگ جاتا ہے۔

اور ذکیہ ایک سکھ کی سانس دبا لیتی ہے)

ریاض۔ کتنے پیارے بچے ہیں، ذکیہ تم نے تو جنت بسا رکھی ہے۔

ذکیہ۔ (زہر خند کے ساتھ) جنت!

ریاض۔ (اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ارمان بھرے لہجے میں) آٹھ برس گزر گئے جب ہم نے بھی یکبار ایسی ہی جنت بسانے کا عہد کیا تھا۔

ذکیہ۔ (ویسے ہی ارمان بھرے لہجے میں) صدیوں سے آٹھ برس!

ریاض۔ تم نے اپنی جنت بسالی۔۔۔ لیکن میں۔۔۔ میں نہ جانے کن کشاکشوں میں سے نکل گیا۔۔۔۔۔ تمہارا ایک گھر ہے، شوہر ہے، بچے ہیں اور میں۔۔۔ میں۔۔۔۔۔

ذکیہ۔ آزادی کی آگ میں جل کر کندن بن گئے تم اور نہ ٹوٹنے والی بیڑیاں میرے پاؤں میں بندھتی چلی گئیں۔

ریاض۔ (حیرت سے) بیڑیاں۔۔۔۔ ذکی۔۔۔۔ تم خوش نہیں ہو۔

ذکیہ۔ میں شاکر ہوں۔

ریاض۔ بھائی صاحب کہتے تھے تم بیمار رہتی ہو۔

ذکیہ۔ مجھے تم بیمار نظر آتے ہو۔

ریاض۔ میں تو اچھا خاصا ہوں، سفر سے آرہا ہوں، اس لئے کچھ تھکن محسوس ہو رہی ہے۔

ذکیہ۔ (جیسے دوسری دنیا سے بول رہی ہے) مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں ایک لمبا سفر طے کرکے آئی ہوں اور تھک گئی ہوں (ہنس کر) لیکن چھوڑو اس قصے کو، تھکے ہوئے ہو آرام کرو۔

ریاض۔ لیکن جبھی میں کپڑے تو بدل لوں۔

ذکیہ۔ میں نے تمہارے ٹھہرنے کا انتظام اوپر بارہ دری میں بھی کیا ہے اور نیچے بیٹھک میں بھی۔ تمہیں جو جگہ پسند آئے، وہیں تمہارا سامان رکھوا دوں۔

ریاض۔ سامان ہی کونسا ہے، بس یہی کپڑے ہیں۔ کوئی تہمد یا چادر دو تو انہیں بدل ڈالوں۔

ذکیہ۔ تو چلو اوپر بارہ دری میں جگہ پسند کر لو، تہمد نکالے دیتی ہوں، میں تو تمہارے آنے کی امید ہی کھو بیٹھی تھی۔ صبح ہی سنا ـــ تم جموں آئے ہو، سوچا شاید ادھر بھی آنکلو، سو جلدی جلدی بارہ دری ٹھیک کرائی۔ بیٹھک ٹھیک ہو رہی ہے۔ چلو پہلے بارہ دری دیکھ لو۔

ریاض۔ بارہ دری ـــ واہ ـــ

(اُٹھ کر چلتا ہے)

ذکیہ۔ (اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے) لیکن دروازوں کی بجائے اس میں صرف بارہ کھڑکیاں ہیں خدا کیلئے کھول کر نہ بیٹھنا۔ یہ موئے بند اتنے دیر ہیں کہ ذرا آنکھ ادھر ہوئی اور یہ کچھ نہ کچھ لے اُڑے۔

ریاض۔ (قہقہہ لگاتا ہے) لیکن پھر کھڑکیوں کا فائدہ ہی کیا؟

ذکیہ۔ (ہنس کر) نچلے کواڑوں میں جالیاں لگی ہیں۔ آدھی کھڑکیاں ہر وقت کھل سکتی ہیں۔

(دونوں بالکونی کے دروازے میں کھڑے ہیں کہ پردہ گر جاتا ہے)

تیسرا منظر

(دو گھنٹے بعد اسی کمرے میں)

(کمرا اور بھی دیدہ زیب ہو گیا ہے۔ کپڑوں کی گٹھڑیاں، ٹنگنے کے کپڑے اور دوسری فالتو چیزیں اندر کمرے میں پہنچا دی گئی ہیں۔ سلطان چرخہ لئے دوسرے کمرے میں جا رہا ہے جب رحیمن داخل ہوتی ہے)

رحیمن۔ اب ختم بھی کرو اس کام کو سلطان، نیچے آنگن میں کمبخت مرغیوں نے قیامت کا اودھم مچا رکھا ہے۔ انہیں ڈربوں میں بند کرنا ہے۔

سلطان۔ بس یہ چرخہ رہ گیا ہے، باقی سب چیزیں تو میں نے اٹھا دی ہیں، دیکھو تو کمرے کی کیا صورت نکل آئی ہے۔

رحیمن۔ بیگم ادھر ہی آنے والی ہیں، اب چل آنگن . . . .

سلطان (چرخے کو وہیں زمین پر ٹکا کر) بس ابھی جاتا ہوں (سرگوشی میں) بیگم کا چہرہ روشن ہو گیا ہے۔ ان دو گھڑیوں میں، وہ ہمیشہ کی زردی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ یہ ریاض میاں اچھے آئے ہیں، ــــ گھر کی، بیگم کی، بچوں کی سب کی کایا پلٹ گئی ہے۔

رحیمن۔ (اسی طرح سرگوشی میں) یہاں آنے سے پہلے انہی کے ساتھ چل رہی تھی بیگم کی بات چیت ــــ لیکن رضیہ بیگم، خدا انہیں قدم قدم جنت نصیب کرے، بچی کو چھوڑ کر رحلت کر گئیں اور نواسی کے خیال سے نانی نے ان کو یہیں بیاہ دیا ہے۔

سلطان۔ دولت کا بھی تو خیال ہو گا۔

رحیمن۔ ہاں، اپنا آگ پر لئے کیوں سیکیں . . . . .

سلطان۔ لیکن نہ وہ دولت رہی اور نہ نواسی اور بیگم قید ہو گئیں اس سنسان جگہ میں، میں تو جب بھی ان کو دیکھتا ہوں، مجھے ان پر ہمیشہ رحم آ جاتا ہے۔ کہاں دلی اور کہاں یہ اکھنور ــــ قسمت ہی ہے نا کہاں سے کہاں لا پھینکا۔

رحیمن۔ کیوں انہیں کس بات کی کمی ہے، اب بھی خدا رکھے ہزاروں لاکھوں سے اچھے ہیں، بھائی مر گئے تو کیا ہوا، اللہ اپنا بچہ بھی سلامت رکھے۔

(باہر بالکونی پر ریاض اور زکیہ کے باتیں کرنے کی آواز آتی ہے)

ریاض۔ ارے بھئی کیوں کانٹوں میں گھسیٹتی ہو، اتنا لذیذ تھا کھانا . . . . مجھے تو مدت ہو گئی ایسا کھانا کھائے

رحیمن۔ (سرگوشی میں) اٹھاؤ چرخہ اور بھاگو، وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔

(سلطان پھر خفا اٹھا کر دائیں دروازے سے نکل جاتا ہے۔ اور رحیمن
اس کے پیچھے پیچھے چلی جاتی ہے۔ بائیں دروازے سے
ریاض اور ذکیہ باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔)

ذکیہ۔ کیا کروں، یہاں کوئی نئی چیز ملتی ہی نہیں، وہی نگوڑی مولی گاجریں اور وہی موا کرم کا ساگ (جاتی ہوئی رحیمن سے) رحیمن ذرا پاندان اُٹھا لا، میں پان بنا دوں ریاض بھائی کے لئے۔

رحیمن۔ جی ابھی لائی بیگم!

ریاض۔ (جا کر چارپائی پر لیٹتے ہوئے) یہ کرم کا ساگ کیا بلا ہے؟ ہم نے تو کبھی نہیں چکھا۔

ذکیہ۔ (اس کے پاس کرسی پہ بیٹھ کر پھر لیس بنتے ہوئے) کھا لینا، شام کو پکا لیں گے گوشت میں، کوئی ایسی سوغات کی چیز تو ہے نہیں، تمہیں کیا پسند آئیگا۔ تم پرتکلف دعوتیں کھانے کے عادی، میں تعجب سے سنا کہ تم آ رہے ہو بڑا یہی ترکاریوں کی بات سوچ رہی ہوں۔ موٹر ڈرائیور سے کہلا بھیجا ہے کہ جموں سے آتا آتا کچھ سبزیاں اور پھل لیتا آئے۔

ریاض۔ ارے بھئی تم خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو ذکی، تم تصور ہی نہیں کر سکتیں، مجھے باورچی خانے میں کھانا کھا کر کتنا لطف آیا۔ دسترخوانوں اور ڈائننگ ٹیبلوں پر کھا کھا کر تو جان ضیق میں آگئی ہے باورچی خانے میں چولھے کے آگے تمہارے سامنے بیٹھے ہوں تم روٹی پکاؤ، ہم کھائیں —— مجھے امید نہ تھی کہ زندگی میں دوبارہ یہ مسرت حاصل ہوگی۔

ذکیہ۔ مجھے تو بھول ہی گیا سب کچھ، اب تمہارے آنے پر برسوں بعد آج روٹیاں پکی ہیں۔

ریاض۔ (بیٹھ کر) لیکن تمہارے کھانے میں مٹھاس تو پہلے سے بھی زیادہ ہے ذکیہ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کھانا پکانے میں تم نے پہلے سے بھی زیادہ مہارت حاصل کر لی ہے تو جیسے بھی ہوتا چلا آتا۔

ذکیہ۔ تم آئے ہی نہیں، بیسیوں بار ہم نے بلا بھیجا۔

ریاض۔ (اس کی طرف ایک ٹک دیکھتا ہے گویا اس کی آنکھوں میں ڈوب کر ان کی تھاہ پانا چاہتا ہے پھر لمبا سانس بھرتا ہے) ارے بھئی تم آ بیٹھیں یہاں کالے کوسوں دور —— کہاں دلی، علیگڑھ اور کہاں ریاست جموں و کشمیر —— اور پھر اس میں بھی یہ دور افتادہ قصبہ، جسے ڈھب کی ایک سڑک بھی تو حاصل نہیں۔

ذکیہ۔ آ بیٹھی (درد سے مسکاتی ہے) جیسے خود اُٹھ کر آ بیٹھی یہاں —— ہم غریبوں کا کیا ہے، اماں ابا نے جہاں بٹھا دیا، جا بیٹھیں۔

(رحیمن پاندان لے کر آتی ہے)

رحیمن۔ لیجے بیگم پاندان۔

ذکیہ۔ لاؤ، اور جا کر دیکھو، وہ سلطان کا چھوکرا پھولوں کے گلدستے لایا ہے یا نہیں۔

(ریاض اٹھ کر بالکونی کے درمیانی دروازے میں جا کھڑا ہوتا ہے۔ ذکیہ چارپائی پر بیٹھ کر پان بنانے لگتی ہے۔)

ریاض۔ (کچھ لمحے دور پہاڑوں کو دیکھتا رہتا ہے، پھر سکھ کا لمبا سانس بھر کر مڑتا ہے) کچھ بھی ہو ذکیہ، اگر میں جانتا تم اتنی خوبصورت جگہ رہتی ہو تو سفر کی دقتوں کو بھول کر اڑا آتا (کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے) کتنا خوبصورت مقام ہے (بالکونی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) وہ تین طرف بیضوی دائرہ سا بناتے ہوئے پہاڑ اور یہ چوتھی طرف اپنی دھن میں مست سویا کھویا سا بہتا چناب۔

ذکیہ۔ (اس کے پاس جا کر اسے پان کی گلوری دیتے ہوئے) تم کہیں گرمیوں میں آتے تو چناب کی بہار دیکھتے سویا کھویا ایسی سا معلوم نہیں ہوتا ان دنوں ——— ہزار پھنوں والے افعی کی طرح پھنکارتا ہوا بہتا ہے ——— پل لرزنے لگتا ہے، کنارے کی پہاڑی پہ بنے ہوئے یہ گھر تک لرزنے لگتے ہیں۔ انہی دنوں یہاں رونق بھی ہوتی ہے، اردگرد کے بازاروں سے اتنے آم آتے ہیں اور لوگ اتنے آم چوستے ہیں کہ چھلکوں سے بازار بھر جاتے ہیں، جموں تو کیا سیالکوٹ اور گوجرانوالہ تک سے لوگ یہاں آتے ہیں، آدھی رات تک بازاروں میں شور ہوتا رہتا ہے۔

(ریاض جا کر چارپائی پر لیٹ جاتا ہے اور ذکیہ کرسی کھسکا کر پہلے کی طرح اس کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

ریاض۔ شور دلی میں کم نہیں ہوتا، کئی رات تک ٹرامیں گھڑگھڑاتی رہتی ہیں اور پھر موٹریں، بسیں، کاریں، تانگے، چھکڑے ——— اتنا ہنگامہ برپا رہتا ہے کہ جی چاہا کرتا ہے، آدمی کہیں بھاگ جائے ——— کہیں ایسی جگہ، جہاں اتنا شور نہ ہو، اتنی آوازیں نہ ہوں، سکون ہو، طمانیت ہو، کچھ اونگھتی ہوئی سی، سوئی سوئی سی خواب آلود فضا ہو، تمہیں میں نے ایک نظم سنائی تھی لوٹس ایٹرز (Lotus Eaters)

ذکیہ۔ (سکھ کا لمبا سانس بھر کر) میں یہاں آ کر سب نظمیں بھول گئی ہوں۔

ریاض۔ (اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) ارے وہی ٹینیسن کی، جہاں اوڈیسس کے ساتھی جہاز کی تباہی کے بعد ایک ایسے جزیرے میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں سکون ہی سکون ہے (اٹھ کر کمرے میں گھومنے لگتا ہے) اس جزیرے کی سوئی سوئی سی خوبصورت فضا کو دیکھ کر وہ چاہتے ہیں کہ وہ وہیں کے ہو رہیں۔ کنول کے پھول کھاتے رہیں اور سوتے رہیں (ذکیہ کے قریب آ کر) کبھی کبھی میرا جی بھی ایسی ہی دنیا میں پہنچ جانے کو چاہا کرتا ہے ——— یہاں آ کر معلوم ہوتا ہے کہ میں اس خطے میں پہنچ گیا ہوں، زندگی جیسے کسی ابدی نیند سوئی ہوئی ہے یہاں۔

(پھر لیٹ جاتا ہے ——— کہیں برابر کی گلی میں عورتوں کے جھگڑنے کی

آواز آتی ہے جس میں مردوں کی آوازیں بھی شامل ہیں۔)

ذکیہ۔ لیکن ہنگامے تو یہاں بھی ہوتے ہیں، دیکھو نیچے گلی میں شور ہو رہا ہے۔

ریاض۔ (کروٹ لیکر ذکیہ کے نزدیک ہوتے ہوئے کہنی کے بل لیٹے لیٹے) تم شاید دلی کی آوازوں کو بھول گئی ہو ذکی، اس پرسکون جگہ پہنچ کر تمہیں شاید یاد ہی نہیں رہا کہ شور ہوتا کیا ہے؟ میں تو جب سے آیا ہوں برابر یہ محسوس کر رہا ہوں کہ زندگی یہاں ایک ابدی نیند سو رہی ہے۔ یہ ہنگامے اور خرخشے تو محض اس کے خراٹے ہیں۔

ذکیہ۔ کیوں ریاض، کالے پانی میں بھی تو اتنا ہی سکون اور خاموشی ہوتی ہوگی۔

ریاض۔ (پھر اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) کالا پانی — کالے پانی کا کیا ذکر؟

ذکیہ۔ میں کبھی کبھی ایسے محسوس کرتی ہوں، جیسے یہ لکھنؤ میرا کالا پانی ہے اور میں یہاں عمر بھر کے لئے قید کر دی گئی ہوں۔

ریاض۔ (اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے) تم خوش نہیں ہو ذکیہ۔

ذکیہ۔ (درد بھری مسکراہٹ کے ساتھ) میں شاکر ہوں۔

ریاض۔ (اُٹھ کر کمرے میں گھومتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں) یہ ساری کی ساری زندگی ایک کالا پانی ہے ذکیہ۔ غالب نے ٹھیک ہی تو حیات کو قید کا نام دیا ہے (کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے) یہ اتنی خوبصورتی۔ یہ بھی تو شاید آزاد نہیں، وقت کی قید میں بند ہے (پھر واپس آتے ہوئے) اور یہ روح جسے لوگ آزاد کہتے ہیں، جسم کی قید میں بند رہتی ہے اور جسم زندگی کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہے — ان زنجیروں سے نجات نہیں، ایک حلقے سے نکل کر دوسرے میں اور دوسرے سے نکل کر تیسرے میں پھنسنا ناگزیر ہے — ہمیشہ ان جانی، ان دیکھی بیڑیاں جسم کو، روح کو، خوبصورتی کو، زندگی کو جکڑے رہتی ہیں۔

(پھر آکر چارپائی پہ بیٹھ جاتا ہے)

ذکیہ۔ (اداس مسکراہٹ کے ساتھ) تم ہمیشہ شاعری کی دنیا میں گھو ہو گئے، کبھی حقیقی دنیا کی بات نہ کرو گے۔

ریاض۔ میں سوچتا ہوں، کہ قید جب ہر حال میں برحق ہے تو کیوں اس کی فکر کی جائے، کاٹ سکیں تو ان زنجیروں کو کاٹا جائے، نہیں تو کیوں نہ ان میں جکڑے جکڑے انہیں فراموش کیا جائے۔

ذکیہ۔ تم شاعر ہو اور میں تم سے باتوں میں نہیں جیت سکتی۔

ریاض۔ لیکن تم بھی تو شاعر تھیں اور ہمیشہ مجھ سے باتوں میں جیت جایا کرتی تھیں۔

ذکیہ۔ میں جان گئی ہوں جیت کر بھی تم ہار جایا کرتے تھے۔ اور میری تک بندیوں پر بھی سر دھنا کرتے تھے۔

(دھاگا ختم ہو جاتا ہے۔ الماری سے جا کر دھاگا لاتی ہے)

ریاض۔ (اس کے پیچھے جاتا ہوا) کتنے اچھے تھے وہ دن!

ذکیہ۔ تمہیں تو کبھی یاد بھی نہ آتی ہوگی ان کی۔

ریاض۔ اگر ان دنوں کی یاد میرا پیچھا چھوڑ دیتی تو میری زندگی یوں اکھڑی نہ ہوتی۔

ذکیہ۔ (آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے) ریاض۔

ریاض۔ (جذبات کو چھپانے کی کوشش میں بالکونی کی طرف جاتے ہوئے) سچ کہتا ہوں اگر وہ یاد نہ دیتی تو آوارگی کی بیڑیاں یوں میرے پاؤں کو نہ جکڑے رکھتیں۔

ذکیہ۔ (اس کے پیچھے جاتے ہوئے، ہمدردی، درد اور محبت کے لہجے میں) ریاض۔

ریاض۔ (جذبات پر قابو پاتے ہوئے ذرا ہنس کر) وہ دیکھو تمہارا کنگ کانگ پھر تاک لگا رہا ہے۔

(ذکیہ ریاض کے بالکل قریب جا کر اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن ریاض بندر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ ایک لمبا سانس بھر کر وہ بھی ادھر دیکھنے لگتی ہے۔ اس کا لب و لہجہ ایک عجیب درد سے بھر جاتا ہے)

ذکیہ۔ کنگ کانگ..... (مسکراتی ہے) تمہیں یاد ہے نا، ہم ایک بار کنگ کانگ کی فلم دیکھنے گئے تھے میں اُس لڑکی کو کبھی نہیں بھول سکی۔ جسے کنگ کانگ اُٹھا کر لے گیا تھا۔ (لمبا سانس لیتی ہے) وہ رہائی پا گئی تھی لیکن.....

(باہر سے احسان صاحب کی آواز آتی ہے)

احسان۔ ارے بھئی کدھر ہو؟

(اندر داخل ہوتے ہیں، ہاتھ میں مٹھائی کا دونا ہے)

ریاض۔ آئیے بھائی جان یہ کیا لائے ہیں؟

احسان۔ (اندر آتے ہوئے) یہاں ملتا ہی کیا ہے، میں نے کہا، منہ میٹھا کرنے کے لئے مٹھائی ہی لیتا چلوں۔

ریاض۔ (ان کے پیچھے آتے ہوئے) ارے بھائی جان اس کی کچھ کسر رہ گئی تھی۔ گاجر کا حلوہ تو کھایا ہے۔

ذکیہ۔ (ان کے پیچھے آتے ہوئے ریاض کی بات کاٹ کر) کالی گاجر کا حلوہ بھلا کیا پسند آیا ہوگا۔

ریاض (ہنستے ہوئے) وہ کسی نے کہا ہے نا — حسن صورت پر نہ جاؤ (احسان دونے کو تپائی پہ رکھ کر جانے لگتے ہیں) ارے بھائی جان آپ کدھر جا رہے ہیں، بیٹھئے نا۔

احسان۔ نہیں بھئی دفتر میں کام ہے۔

ذکیہ۔ (چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے) ذرا جلدی آئیے گا، ذرا گھما لائیں گے ریاض بھائی کو، ہیں کے گاؤں تک

احسان۔ کوشش کروں گا، لیکن نہ آ سکا تو تم لوگ ہو آنا۔

(چلے جاتے ہیں)

ریاض۔ بھائی جان کی صحت تو پہلے سے کہیں بہتر ہے۔
ذکیہ۔ پھول گئے ہیں، نہیں روگ تو اندر لگا ہوا ہے۔
ریاض۔ یہ ان کے دانت کس طرح کے ہیں، اوپر کی قطار سفید ہے اور نچلی زرد۔
ذکیہ۔ دونوں زرد تھیں، پایوریا تھا۔ اوپر کی نقلی لگوائی ہے، نچلے بھی نکلوانے کے لئے زور دے رہی ہوں لیکن مانتے ہی نہیں، اپنی صحت کا کچھ خیال ہی نہیں رکھتے۔
ریاض۔ لیکن پایوریا تو بڑا موذی مرض ہے۔
ذکیہ۔ (اب ہٹاؤ بھی اس ذکر کو، رسے انداز میں) مانیں بھی۔

(ایک بندر تیزی سے آتا ہے اور مٹھائی کا دونا لے جاتا ہے)

ریاض۔ (بے طرح چونک کر) ارے...... لے...... لے...... وہ لے گیا مٹھائی کا دونا۔ شاید اسی وقت سے تاک لگائے بیٹھا تھا۔

(اٹھ کر آنگن کے دروازے میں جاتا ہے)

— وہی ہے کنگ کانگ —— کس مزے سے جا بیٹھا ہے منڈیر پر۔
ذکیہ۔ (وہیں چارپائی پر بیٹھے بیٹھے) کنگ کانگ سے میں نے کب کا سمجھوتہ کر لیا ہے۔
ریاض۔ (دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے کھڑے دور پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے) یہ سامنے کے گھومتے پہاڑوں پر بادلوں کے سائے کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے یہ پرسکون جگہ پاکر سو گئے ہیں اور یہ چتکبری پہاڑیاں، لیٹی، سوئی، نیم غنودہ سی۔ کیسی اچھی لگ رہی ہیں۔ میں اگر یہاں رہ جاؤں تو نہ جانے کن معرکۃ الآرا چیزوں کی تخلیق کروں۔
ذکیہ۔ (طعنے اور امید سے) رہ گئے تم!

(دزدیدہ نگاہوں سے اسکی طرف دیکھتی ہے —— نیچے گلی سے اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز آتی ہے)

ریاض۔ کتنا سکون ہے اس دوپہر میں، یہ نیچے گلی سے گذرنے والے اونٹوں کے گلے میں بندھے ہوئے گھنٹوں کی آواز کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے۔

(کبوتروں کی غٹرغوں کی آواز آتی ہے)

— یہ بازار سے آنے والا مدھم سا شور اور یہ جنگلی کبوتروں کی غٹرغوں!

(بندیا کے بچے کی کوں کوں کی آواز آتی ہے)

— لیکن یہ کوں کوں کی آواز نہ جانے کس پرندے کی ہے؟
ذکیہ۔ (اٹھ کر ہنستی ہوئی کھڑکی کے پاس جاتی ہے) پرندے کی نہیں، یہ بندیا کے بچوں کی آواز ہے

ریاض۔ (اس کے پاس آتا ہوا) کہاں ہیں یہ بندریا کے بچے۔
ذکیہ۔ وہ دیکھو ادھر چھت پہ ۔ کیسی کوٹ کوٹ کر شوخی بھری ہوئی ہے ان میں، وہ دیکھو وہ بندر کمبخت کس طرح لیٹا ہوا ہے اور وہ بندریا کس طرح اس کے جسم کو سہلا رہی ہے۔
ریاض۔ جی چاہتا ہے، اسی طرح دوپہر کی میٹھی میٹھی دھوپ میں لیٹ جاؤں اور کوئی میرے جسم کو سہلائے۔
ذکیہ۔ تم کب چاہتے ہو؟ تم نے کبھی نہیں چاہا۔

(لمبا سانس بھرتی ہے)

ریاض۔ کتنے شوخ اور چنچل ہیں یہ بندر اور ان کے بچے۔
ذکیہ۔ ہر طرح کی قید سے آزاد۔
ریاض۔ حیات کی قید میں تو یہ بھی بند ہیں۔ لیکن انہیں اس کا غم نہیں، شاید اُس کا احساس بھی ان کو نہیں۔
ذکیہ۔ یہ احساس کا کانٹا آدمی ہی کی قسمت میں کیوں ہے؟ یہ احساس کند کیوں نہیں ہو جاتا، مر کیوں نہیں جاتا۔
ریاض۔ (لمبے سانس کو سینے ہی میں دباتے ہوئے) مر بھی جاتا ہے آدمی کا احساس۔

(آ کر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے)

ذکیہ۔ (اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے) مر کر بھی جی اُٹھتا ہے۔ میں گھنٹوں ان بندروں کو آزادی سے کودتے، پھاندتے، قلابازیاں لگاتے، درختوں کی شاخوں سے لٹکتے، جھولتے دیکھتی ہوں یہاں تک کہ اپنی قید کا یہ احساس کئی گنا ہو کر میری رگ رگ میں جاگ اٹھتا ہے، کبھی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے جسم کی تمام رگوں میں کچھ سلگنے سا لگا ہے، اور کبھی ایسے کہ جسم کی ہر دھڑکن، ہر ایک رگ گویا بجھی ہوئی بھیگی لکڑی کی طرح مردہ ہو گئی ہے۔
ریاض۔ (اچانک اُٹھ کر ذکیہ کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر ذرا سا جھنجھوڑتے ہوئے) ذکیہ تم خوش نہیں ہو۔
ذکیہ۔ میں شاکر ہوں۔
ریاض۔ (اور بھی جھنجھوڑتے ہوئے) تم شاکر بھی نہیں ہو۔
ذکیہ۔ دنیا میں کون خوش ہے، کون شاکر ہے ..... تم خوش ہو۔

(ریاض کچھ کہنا چاہتا ہے، اس کے چہرے پر ایک ابال سا آتا ہے لیکن دوسرے لمحے میں وہ اپنے آپ پر قابو پا لیتا ہے)

ریاض۔ میں ..... (ہنستا ہے) ..... میں شاعر ہوں۔ (اس کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے) اور تم ... تم شاعر سے فلسفی بن گئی ہو۔

(خود بھی چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے)

ذکیہ۔ زندگی میں آدمی یا فلسفی بن جاتا ہے یا پتھر ہا

ریاض۔ دونوں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

ذکیہ۔ شاید تم سچ کہتے ہو۔ پھر شاعر شاید سب سے بڑا فلسفی ہے۔

ریاض۔ (اٹھ کر کمرے میں گھومتے ہوئے) لیکن ذکیہ اچھا تھا تم شاعر نہیں۔ اپنی تمام ناامیدی اور یاس کے باوجود شاعر کے دل میں، دل کے کسی نامعلوم گوشے میں امید چھپی رہتی ہے۔ تم سوچ ہی نہیں سکتیں ذکیہ! کل شام میں کتنا مایوس تھا، رات میں نے کس ذہنی اذیت سے گذاری، اپنے پرشور لیکن کھوکھلے ماحول کی اس دم گھونٹ دینے والی قید سے کس طرح بھاگ کر یہاں آیا ہوں۔ لیکن اس چھوٹے سے خوبصورت قصبے کو دیکھ کر، تم سے مل کر، ننتو اور منی کو پاکر۔ تمہاری اس ننھی سی جنّت کا نظارہ کر کے میں جیسے پھر اپنی امید اور مسرت پاگیا ہوں، لیکن اسی جنّت کی تخلیق کرنیوالی تم غمگین اور اداس ہو۔

ذکیہ۔ جنّت!

(دردبھری ہنسی ہنستی ہے)

ریاض۔ (ذکیہ کی اس زہریلی، دردبھری ہنسی کی طرف دھیان دیئے بغیر اپنے جذبات کی رو میں) اور میں سوچتا تھا، اگر میں یہاں کچھ دن بھی رہ جاتا تو نہ جانے کتنی خوبصورت چیزوں کی تخلیق کر دیتا۔ (پھر آکر چارپائی پر ذکیہ کے سامنے بیٹھ جاتا ہے) جس دن دنیا میں خوبصورتی پیدا ہوئی تھی ذکیہ شاید اس کے ساتھ ہی بدصورتی نے بھی جنم لیا تھا۔ فلسفی جب خوبصورتی کو دیکھتا ہے تو بدصورتی کو نہیں بھولتا، لیکن شاعر جب اس بدصورتی کو دیکھتا ہے تو خوبصورتی کو یاد رکھتا ہے۔ گئی بیتی خوبصورتی کو ماضی کے تاریک غاروں سے نکال کر اپنے ماحول کی بدصورتی پر طاری کر دیتا ہے، یہیں شاید فلسفی سے فایدے میں رہتا ہے۔

ذکیہ (لمبا سانس بھرتے ہوئے) شاید تم سچ کہتے ہو، شاید یہ شاعری ہی کا جذبہ ہے جس نے اب تک مجھے زندہ رکھا۔ شاید میں بیتے دنوں کی خوشیوں میں اپنے موجودہ غم کو، ماضی کی خوبصورتی میں، حال کی بدصورتی کو بھولے رہی ہوں۔

ریاض (مسرت سے) بخدا تم اب بھی شاعر ہو ذکی۔ اگرچہ تم نے پچھلے آٹھ برس میں ایک بھی شعر نہیں کہا۔

ذکیہ تمہارے ساتھ رہ کر شاید میں پھر شاعر بن جاؤں، تم یہاں رہو تو شاید میں اپنی پرانی خوشی پھر واپس پا جاؤں۔

ریاض۔ (اٹھ کر پھر کمرے میں چکر لگاتے ہوئے) میں رہوں گا، مجھے برفباری سے کوئی دلچسپی نہیں۔

ذکیہ۔ برفباری؟

ریاض۔ ہم لوگ برفباری دیکھنے آئے تھے، لیکن جہلم پہنچ کر میں یہاں چلا آیا۔

ذکیہ۔ (اُٹھ کر اس کی آنکھوں میں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) تم کبھی آؤ گے شاید میں اسی امید پر زندہ تھی۔

(لمحہ بھر کے لئے دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہیں، ریاض کی آنکھوں میں ایک ثانیے کے لئے ایک چمک سی کوند جاتی ہے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایک ہی بار ذکیہ کو اپنی آغوش میں بھر لیگا لیکن پھر وہ بے پناہ ضبط سے (جس کے اثرات اس کے چہرے پر نمایاں ہو جاتے ہیں) اپنے آپ پر قابو پا لیتا ہے اور اس کی آنکھوں کی وہ چمک جیسے پیدا ہوئی تھی اسی طرح عنقا ہو جاتی ہے' اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے، ذکیہ فوراً موضوع بدل دیتی ہے۔)

— تمہیں اپنا کمرہ پسند آیا۔

ریاض (خوش ہے کہ ذکیہ نے موضوع بدل دیا بڑے جوش و خروش سے) کمرہ ..... پسند ..... (ہنستا ہے اور کمرے میں گھومتا ہے) مجھے محسوس ہوتا ہے' جیسے مجھے اسی کمرے کی ضرورت تھی میں وہیں بیٹھا بیٹھا سورج کے طلوع و غروب کا نظارہ کر سکتا ہوں۔ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر کرنوں کی گلکاری کا لطف اٹھا سکتا ہوں، نیچے دریا کو کسی، کبھی نہ ختم ہونے والی تلاش میں سرگرداں دیکھ سکتا ہوں بیٹھا بیٹھا تھک جاؤں تو لیٹ سکتا ہوں، لیٹا لیٹا اکتا جاؤں تو گھوم سکتا ہوں۔

ذکیہ میں ڈرتی تھی۔ کہیں وہاں تمہیں رات کو سردی محسوس نہ ہو' بارش آئے تو بڑی ٹھنڈک ہو جاتی ہے بارہ دری میں۔

ریاض۔ میں بارش کو پسند کرتا ہوں۔ باہر رم جھم، رم جھم بارش ہو رہی ہو اور میں کمرے میں خاموش بیٹھا اس کا سنگیت سنوں' یا پھر باہر ہوائیں چل رہی ہوں' کیسے کمرے کی دیواروں سے ٹکریں مار رہی ہوں اور میں اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھا، کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے شعر کہوں ، اونگھوں' یا خواب دیکھوں۔ اس سے زیادہ مجھے کوئی چیز مرغوب نہیں۔

ذکیہ۔ مجھے سردی کا ڈر تھا، اس لئے میں نے نیچے کا کمرہ بھی ٹھیک کرا دیا تھا۔

ریاض۔ نہیں..... نہیں..... نہیں..... مجھے وہ کمرہ پسند نہیں' مجھے بارہ دری ہی پسند ہے — دور بھی اور نزدیک بھی، خاموش بھی اور پر شور بھی — ایک کھڑکی کھول لوں تو بازار کا شور سن سکوں گا، دوسری کھولوں تو تم سے باتیں کر سکوں گا، نستو اور مجی کو بلا سکوں گا۔

ذکیہ۔ میں خوش ہوں' تمہیں بارہ دری پسند آگئی۔ میں دو پٹو رکھ دونگی۔ شاید تمہیں سردی محسوس ہو

ریاض۔ تم فکر نہ کرو، میری بے تکلفی میں ابھی تک کسی طرح کی کمی نہیں آئی۔

(بالکونی میں بیگاں کی آواز آتی ہے)

بیگاں۔ مجید کی اماں۔۔۔۔۔ مجید کی اماں۔۔۔۔۔

ذکیہ۔ (جاکر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) آؤ بیگاں، آجاؤ،

(بیگاں آکر چوکھٹ میں بیٹھ جاتی ہے)

— سلام دادی بیگاں۔

بیگاں۔ وعلیکم السلام مجید کی اماں (ریاض سے) سلام حضور (پھر ذکیہ سے) بال بچے جئیں، سائیں جئے دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔

ذکیہ۔ کہو کیسے آئیں۔

بیگاں۔ سلطان کا چھوکرا گیا تھا گلدستے مانگنے، میں نے کہا۔۔۔۔۔۔۔ خود ہی لے جاؤں۔

ذکیہ۔ ہمارے بھائی جان آئے ہیں بیگاں، یہیں رہیں گے، ہوسکے تو ایک دو گلدستے روز دے جایا کرو!

بیگاں۔ سو بار حضور، جتنے کہو اتنے!

ذکیہ۔ آج ہم تمہارا باغ دیکھنے آئیں گے۔

بیگاں۔ دھن بھاگ ہمارے جو آپ آئیں۔

ذکیہ۔ سرسوں کا ساگ اور مکئی کا ڈھوڈا کھلاؤ تو آئیں۔

بیگاں۔ ڈھوڈوں کی کیا کمی ہے سرکار۔

ذکیہ۔ (جیب سے کچھ پیسے نکال کر اس کی طرف پھینکتی ہے) لو یہ دو آنے، بچوں کے لئے ریوڑیاں لے جانا۔

بیگاں۔ سرکار بخشو کے لئے کوئی کرتا مل جاتا، ننگا پھرتا ہے، سائیں جئے۔

ذکیہ۔ اب تو نہیں، لیکن دو ایک دن میں دیکھ کر بھیج دوں گی۔

بیگاں۔ (اٹھتے ہوئے) بچے جئیں سرکار، آپ ہی کا آسرا ہے۔۔۔۔۔ سلام!

(چلی جاتی ہے)

ریاض۔ یہ ڈھوڈا کیا بلا ہے۔

ذکیہ۔ مکئی کی روٹی کو ادھر ڈھوڈا کہتے ہیں۔

ریاض۔ (قہقہہ لگا کر) لاحول ولا قوۃ —— کیا نام رکھا ہے مکئی کی روٹی کا۔

(مجی بھاگا آتا ہے)

مجی۔ امی۔

(نستو اس کے پیچھے بھاگی آتی ہے)

نستو۔ امّی

(اس کے دامن سے لپٹتی ہے)

ذکیہ۔ اس کے میلے ہاتھوں سے دامن بچاتے ہوئے) ار... لے... ے کہو بھی۔

مجی۔ (نستو کے ساتھ امّی کو گھیرتے ہوئے) پیسے دو، ریوڑیاں لیں گے۔

ذکیہ۔ (اچانک سنبھل کر ہاتھ سے دیکر) سارا دن تمہیں چرنے کے سوا..... (پھر سنبھل کر).....اچھا

اچھا لو پیسے اور میرا پیچھا چھوڑو۔

(دونوں چلنے کو ہوتے ہیں)

— اور اپنے ابّی سے کہو نستو آجائیں، ذرا گھما لائیں تمہارے ماموں جان کو بیگاں کے باغ تک۔

مجید۔ (جاتے جاتے) دفتر میں آدمی بیٹھے ہیں۔

نستو۔ (جاتے جاتے) میں نے پوچھا تھا، وہ نہ آئیں گے۔

(بالکونی میں غائب ہو جاتے ہیں)

ذکیہ۔ چلو ریاض، بیگاں کے باغ تک گھوم آئیں، تمہیں ذرا یہاں کے گاؤں دکھا لاؤں۔

ریاض۔ چلو۔

ذکیہ۔ ٹھہرو میں ذرا برقعہ اوڑھ لوں۔

ریاض۔ برقعہ۔

ذکیہ۔ یہ کوئی ماڈرن شہر تو ہے نہیں، قصبہ ہے پرانے زمانے کا۔

(الماری سے نکال کر برقعہ پہنتی ہے، ریاض
حیران کھڑا دیکھتا ہے۔ پردہ گرتا ہے۔)

چوتھا منظر

(شام کے وقت اسی کمرے میں)

(سورج شاید ابھی ابھی غروب ہوا ہے، اگرچہ اندر کمرے میں خاصا اندھیرا چھا رہا ہے لیکن دائیں طرف کی کھڑکی میں ابھی تک جاتی ہوئی شام کی روشنی جھلک رہی ہے۔

کمرے میں سب کچھ قریب قریب وہی ہے جو تیسرے منظر میں صرف آنگن کے دروازے کے برابر دیوار کی کھونٹی میں ایک لالٹین لٹک رہی ہے جس کا شیشہ سیاہ ہو رہا ہے۔

پردہ اٹھنے کے کچھ لمحے بعد ذکیہ اور ریاض داخل ہوتے ہیں۔ ذکیہ برقعہ کو اتارتی ہوئی آتی ہے)

ذکیہ۔ (برقعے کو اتار کر چارپائی پر پھینکتے اور خود بھی اس میں دھنستے ہوئے) کتنا لطف آیا اس سیر میں۔

(سکھ کا لمبا سانس لیتی ہے)

ریاض۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) نہ جانے کتنے عرصے کے بعد یہ حسین شام میسر ہوئی ہے۔

ذکیہ۔ یہی میں کہنے والی تھی۔

ریاض۔ میں کہتا ہوں ذکیہ یہ دیہاتی کتنے سادہ لوح، کتنے مہمان نواز ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی قدیم اور پرانی بستی میں پہنچ گیا ہوں (کرسی پر پیچھے کو لیٹ جاتا ہے) جہاں انسان نے شیطان ہونا نہیں سیکھا اور جہاں زندگی کی پاکیزہ ندی چھل کپٹ کی آلائشوں سے پاک اپنے کناروں میں مست بہ رہی ہے۔

ذکیہ۔ اردگرد ایسے بیسیوں گاؤں ہیں۔ میں شروع شروع میں جایا کرتی تھی، لیکن اب تو جیسے خواہش ہی نہیں ہوتی، ایک عجیب طرح کی بے حسی چھائی رہتی ہے۔

ریاض۔ (اٹھ کر اپنے اضطرار اور اس خوبصورت فضا سے پیدا ہونے والے رومانی جذبے کے زیر اثر) تمہارے اردگرد کتنی خوبصورتی ہے۔

(کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا ہے)

ذکیہ۔ لیکن قفس کے اندر وہی کلھیا کا دانا پانی۔

ریاض۔ (مڑکر) پھر وہی مایوسی! ذکیہ تم فلسفی بن گئی ہو، خوبصورتی کو بھول گئی ہو۔ میں یہیں رہونگا تمہیں پھر سے اس خوبصورتی، اس لافانی حسن سے محظوظ ہونا سکھاؤنگا۔ کتنا حسن ہے تمہارے اردگرد۔ المطہر، پاکیزہ، غیر فانی حسن —— ابھی کچھ لمحے پہلے میں نے جو منظر دیکھا۔ وہ مدتوں میرے دماغ سے محو نہیں ہو سکتا۔

ذکیہ۔ (چارپائی پر لیٹتے ہوئے) کونسا منظر!

ریاض۔ شام کے سایوں اور دھندلکوں کے غلاف میں لپٹی ہوئی نیلاہٹ آہستہ آہستہ وشنو دیوی کے پہاڑ پر نیچے سے اوپر کو اٹھ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے سارے کے سارے پہاڑ پر نیلی نیلی دھند کا غلاف چڑھ گیا۔ صرف چوٹی پر نیلی سی روشنی رہ گئی۔ شاید وہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری مسکراہٹ تھی۔

ذکیہ۔ اگر تم صبح دریا پر جاؤ تو وشنو دیوی کی ان نیلاہٹوں کو نیچے اترتے دیکھو گے اور پہاڑ کی چوٹی پر تمہیں طلوع ہوتے ہوئے سورج کی پہلی مسکراہٹ دکھائی دے گی۔ لیکن میں ان کی عادی ہو گئی ہوں، میرے لئے ان میں کوئی نیا پن نہیں۔

ریاض۔ کوئی نیا پن نہیں، یہ تم کہتی ہو! اور پھر 'فلسفی' کے نام سے تمہیں چڑ ہوتی ہے —— میں اگر اس منظر کو اسی صورت میں قیامت تک دیکھتا رہوں تو نت نئے دن مجھے اس میں نیا لطف حاصل ہو۔ اس وقت جب میں اس نالے کے سفید و سیاہ پتھروں پر کھڑا تھا اور دھندیالی نیلاہٹوں نے نزدیک کے پہاڑ و

کو اپنے دامن میں لے لیا تھا اور دور برفانی پہاڑوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کیسری چمک اقلیدس کی عجیب و غریب شکلیں بناتی ہوئی چاروں طرف سے بڑھے آنے والے ان وسیع و بے کنار دھندلکوں میں گم ہو گئی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوا تھا، جیسے میں اس مادی دنیا سے اوپر ــــ بہت اوپر ــــ اٹھ گیا ہوں۔ میرے دل کی ساری غلاظت دھل گئی ہے، تکلیف، دکھ، اذیت، غم اب مجھے نہ چھو پائیں گے اور اس وقت میں سچ کہتا ہوں ذکیہ، اس وقت مجھے اس عظیم، لامحدود، لاشریک ہستی کے قرب کا احساس ہوا تھا۔ اس وسعت و رفعت کا تو ایک کونا بھی برسوں میں نہیں جانا جا سکتا۔ یہ کہیں پرانی ہو سکتی ہے۔

ذکیہ۔ (ہنس کر اٹھتے ہوئے) شاید نئے اور پرانے کی تمیز ہی مجھے نہیں رہی، کتنا اندھیرا ہو رہا ہے۔ یہاں ان کمبختوں نے ابھی تک دیا نہیں جلایا (بالکونی پر جا کر) رحیمن۔۔۔۔۔ رحیمن۔۔۔۔۔ (پھر جیسے اپنے آپ) وہ بھی نہ جانے کیوں ابھی تک نہیں آئے، سیر کو نہ چلے گئے ہوں، تمہاری اس شاعری میں، میں تو لیمپ جلانا ہی بھول گئی۔

(ہنستی ہوئی کھونٹی سے لیمپ اتار کر طاق
سے دیا سلائی اٹھا کر اسے روشن کرتی ہے۔)

ــــ چمنی تک نہیں صاف کی کمبختوں نے، اور بتی، معلوم ہوتا ہے جیسے برسوں سے نہیں کٹی (پھر بالکونی پر جا کر اور بھی زور سے رحیمن کو آواز دیتی ہے) رحیمن!۔۔۔۔۔ رحیمن!

رحیمن۔ (بھاگی آتی ہے) جی۔۔۔۔۔ جی بیگم!

ذکیہ۔ یہ لیمپ صاف نہیں کیا۔

رحیمن۔ سلطان سے پوچھ لو بیگم، میں نے تو بڑی اچھی طرح صاف کر کے جلایا تھا، شاید بجھ گیا۔

ذکیہ۔ بتی نہیں کاٹی۔

رحیمن۔ میں نے کوشش کی تھی، لیکن یہ مجھ سے ٹھیک نہیں ہوتی۔

ذکیہ۔ وہ قینچی اٹھا لا۔

(رحیمن طاق سے قینچی اٹھا لاتی ہے)

ــــ (قینچی لیتے ہوئے) نسو کے ابا کہاں ہیں؟

رحیمن۔ جی وہ آتے تھے، لیکن آپ تو گئے ہوئے تھے۔ اس لئے شاید وہ بھی سیر کو نکل گئے۔

ذکیہ (چمنی کو صاف کرتے اور بتی کاٹتے ہوئے) تم تو بجلی کی چکاچوند کے عادی ہو، یہاں تو لالٹینوں کی روشنی ہے، جو اس تاریکی کو اور بھی گہرا کر دیتی ہے۔

ریاض۔ دل کی تاریکی تو بجلی کے قمقمے بھی نہیں دور کر سکتے، لیکن میں تاریکی سے مانوس ہوں ذکیہ، کبھی کبھی مجھے

محسوس ہوا کرتا ہے، جیسے میں اس تاریکی کے پردوں کو کبھی نہ چیر سکوں گا، لیکن پھر کتنی ہی یادیں اپنی روشن مشعلیں لئے ہوئے آجاتی ہیں، یہ تاریکی آئینے کی طرح چمک اٹھتی ہے۔ اور میں اس میں اپنے سپنے دیکھنے لگتا ہوں۔

ذکیہ۔ (لیمپ کو کھونٹی سے لٹکاتے ہوئے) تم اب بھی سپنے دیکھتے ہو۔

ریاض۔ میں جس دن سپنے نہ دیکھوں گا مر جاؤں گا۔

ذکیہ۔ توبہ توبہ کیسی باتیں کرتے ہو۔

(اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہتی ہے، لیکن ہاتھ تیل والے ہیں۔ اس لئے رحیمن کو آواز دیتی ہے)

— رحیمن ذرا پانی اور صابن لانا۔

ریاض۔ ابھی کل رات مجھے ایسا محسوس ہوا تھا ذکیہ جیسے یہ تاریکی اپنی پوری جمعیت کے ساتھ محصور کرنے آئی ہے، جیسے یہ میرے سارے سپنوں کا گلا گھونٹ دے گی، لیکن میں بھاگ کر یہاں تمہارے پاس آگیا اور اس وقت میں محسوس کر رہا ہوں، جیسے اس لالٹین کی روشنی میں میرے دل کا تاریک سے تاریک گوشہ منور ہو اٹھا ہے۔

(رحیمن پانی لاتی ہے اور ذکیہ صابن سے ہاتھ دھوتی ہے)

— تم اس روشنی کو حقیر خیال کرتی ہو، ذکیہ تم نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا۔

(رحیمن چلی جاتی ہے)

ذکیہ۔ (تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے) پہچانا۔ میں خود کئی بار ایک اتھاہ تاریکی میں بھٹکتی رہتی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ تاریکی مجھے، میرے ارمانوں، آرزوؤں، سپنوں، یادوں سب کو نگل جائے گی اور میں اس نعش کی طرح پڑی رہ جاؤں گی جس کا تمام خون کسی آسودہ نہ ہونے والی جونک نے چوس لیا ہو (لمبا سانس بھرتی ہے) لیکن تم نے سچ کہا، آدمی تاریکی سے بھی مانوس ہو جاتا ہے اور جہاں پہلے تاریکی اس کا خون چوستی ہے، وہ تاریکی ہی سے خون حاصل کرتا ہے۔

ریاض۔ (اچانک اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر) خدا قسم ذکی تم شاعر ہو، تم زبردست شاعر ہو، نہ جانے کون سے خیالات تمہارے دل کے نہاں خانے میں مدفون، اظہار کا انتظار کر رہے ہیں۔

ذکیہ۔ (مسرت سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے) میں خود محسوس کرتی ہوں جیسے میں ایک دم گا اٹھوں گی۔ جذبات کا ایک طوفان سا میرے دل میں مچل اٹھا ہے، نہ جانے یہ تمہاری ہی آمد کا منتظر تھا، تم رہو تو شاید یہ طوفان لفظوں اور سطروں کی شکل اختیار کرے۔

ریاض۔ میں ضرور رہوں گا ذکیہ۔

ذکیہ۔ لیکن نجمہ۔

ریاض۔ نجمہ ــــ وہ مجھے فضول ہی اڑائے پھر رہی ہے۔ اور کبھی کبھی میں کسی ایسے ہلکے پھلکے سے خالی بادل سا محسوس کرتا ہوں جو فضائے آسمانی میں ہوا کے جھونکوں سے، بیسود و بے مطلب کبھی ادھر اڑتا ہے کبھی ادھر، لیکن اب میں زیادہ نہیں اڑونگا۔ ایک بھری بھری گھٹا کی طرح ٹک کر بیٹھ جاؤں گا۔ نجمہ اب مجھے اور نہیں اڑا سکتی، میں اس سے دامن چھڑا کر بھاگ آیا ہوں، میری روح آزادی چاہتی ہے، بالیدگی چاہتی ہے۔ پروانہ چاہتی ہے۔

(باہر آنگن میں کوئی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے)

ذکیہ۔ کون؟

(پھر دستک کی آواز آتی ہے)

— (بالکونی پر جا کر) رحیمن، دیکھو کون ہے۔

رحیمن۔ (جو ادھر ہی آرہی ہے بائیں دروازے سے) ایک لڑکی ہے بیگم جموں سے آئی ہے، ریاض میاں کو پوچھ رہی ہے!

ریاض۔ (گھبرا کر) نجمہ نہ ہو!

ذکیہ۔ گھبرا کیوں گئے، میں جا کر انہیں لے آتی ہوں۔

(بالکونی کے بائیں دروازے میں نجمہ آتی ہے)

ریاض۔ لانے کی ضرورت نہیں، وہ خود ہی آرہی ہے۔

ذکیہ۔ آجایئے آجایئے۔

(نجمہ اندر آتی ہے ــــ پڑھی لکھی فیشن ایبل لڑکی جس کے حسن کا شعلہ میک اپ کا مرہونِ منت ہے)

— (نجمہ کے لئے کرسی پیش کرتے ہوئے) تشریف رکھئے۔

نجمہ۔ (نہیں بیٹھتی اور ریاض کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکراتی ہے) آداب عرض!

ریاض۔ (کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ) تم دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرنے کی ضرورت تو نہیں؟

نجمہ۔ جی نہیں (ذکیہ سے) میں نجمہ ہوں اور آپ کو میں جانتی ہوں۔

ذکیہ۔ بڑی مہربانی کی آپ نے (کچھ گھبرا کر) نہ جانے وہ آج کہاں چلے گئے ہیں (نجمہ سے) آیئے ادھر تشریف رکھئے، دقت تو نہیں ہوئی آپ کو سفر میں۔

نجمہ۔ (ریاض کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے) نہیں آپ کی دعا سے پہنچ ہی گئے ہیں۔

ذکیہ۔ کہیئے چائے پئیں گی یا دودھ۔

نجمہ۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔
ذکیہ۔ (مصروف ہوتے ہوئے) اس میں تکلیف کی کونسی بات ہے۔ میں ابھی لائی، آپ ذرا تشریف رکھئے
نجمہ۔ آپ تردد نہ کیجئے، (ملائمت سے) دودھ میں پیتی نہیں اور چائے کا وقت نہیں اور پھر ہمیں ابھی جانا ہے۔
ذکیہ (جاتے جاتے رک کر) بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے جانے کا، اب تو کوئی لاری بھی نہ جائے گی۔
نجمہ۔ ہم کار پہ آئے ہیں۔
ذکیہ۔ تو بھئی چائے تو پیتے جائیے، ہمارے تو کھانا کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔
نجمہ۔ کھانا تو ہم ذرا دیر سے کھاتے ہیں۔
ذکیہ۔ میں جانتی ہوں، اسی لئے صرف چائے کے لئے کہہ رہی ہوں، بیٹھئے، میں ابھی آتی ہوں۔ رحیمن... رحیمن . .

(چلی جاتی ہے)

نجمہ۔ ریاض!
ریاض۔ (چپ رہتا ہے)
نجمہ۔ بڑے ظالم ہو، یہاں بھاگ کر آ بیٹھے ہو، اور تمہیں اس بات کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں کہ تمہاری وجہ سے اتنے آدمیوں کو پریشانی اٹھانا پڑے گی، تمہارا لاابالی پن کبھی نہ جائیگا، تم کبھی ذمہ داری نہ سیکھو گے۔
ریاض۔ (چپ رہتا ہے)
نجمہ۔ اگر تمہیں یہیں آکر بیٹھنا تھا تو وہاں سے چلے کیوں تھے (جواب کے لئے رکتی ہے، ریاض جواب نہیں دیتا) اب اٹھو، صبح ہمیں سرینگر کے لئے چل دینا ہے، رات پہلی بار برف پڑی ہے، یہی وقت ہے برفباری دیکھنے کا۔
ریاض۔ مجھے کہیں نہیں جانا نجمہ، میں یہیں دور سے برف گرتے دیکھ لونگا۔
نجمہ۔ پاگل ہو، یہاں سے تم (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) کیسے برف گرتے دیکھ سکتے ہو۔
ریاض۔ میں سامنے کے پہاڑوں پر برف کی تہوں کو گہرا ہوتے ہوئے دیکھونگا۔
نجمہ۔ (ہنستی ہے) تم بالکل بچے ہو، اب اٹھو، پریشان نہ کرو ہمیں رات بھر سو نہیں سکی۔
ریاض۔ میں ہی کب سو سکا ہوں۔
نجمہ۔ تم تو یہاں آکر ذکیہ کی گود......
ریاض۔ (کانپ کر) نجمہ!

نجمہ۔ ذکیہ اپنی بہن کی گود میں آ بیٹھے ہو اور میں تمہارے انتظار میں۔۔۔۔۔

ریاض۔ نجمہ جاؤ، اب مجھے کچھ لمحوں کے لئے آرام کا سانس لینے دو! تم نے مجھے بہتیرا ستایا۔

(پھر ضدی بچوں کی طرح بیٹھ جاتا ہے)

نجمہ۔ (گلے میں نمی ہے) ریاض!

ریاض۔ (چپ رہتا ہے)

نجمہ۔ تم مجھے ستا رہے ہو یا میں؟

ریاض۔ جاؤ! تم دیکھ آؤ آسمان سے برف گرتے، میں نے اولے گرتے دیکھے ہیں۔

نجمہ۔ ان باتوں سے حاصل! چلو یہاں سے تمہیں یہاں نہ آنا چاہیئے تھا تمہیں برابر اس دن کی یاد ستائے گی، جب تم نے پہلی بار اولے گرتے دیکھے، تم رہو گے تو اس گھر کی پرسکون فضا میں بھی اداسی ہونے لگے گی ــــ چلو میرے ساتھ، برف کے نرم و نازک روئی کے گالوں کو گرتے ہوئے دیکھو!

ریاض۔ میں جاؤنگا تو تمہارا لطف بھی کرکرا کر دونگا مجھ سے تمہاری باتیں نہ سہی جائیں گی۔ ہم پھر لڑنے لگیں گے۔

نجمہ۔ تم مذاق مذاق میں روٹھ جاتے ہو۔

ریاض۔ مذاق مذاق میں فرق ہوتا ہے، میں ذکیہ کی اتنی عزت کرتا ہوں ۔۔۔۔

نجمہ۔ تو تم نے میرے اور سراج کے متعلق اتنی سچی جھوٹی باتیں کہہ کر بدلہ تو لے لیا، تم نے وہ وہ باتیں کہیں کہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اسے زندگی بھر معاف نہ کرتی۔ (لمبا سانس بھرتی ہوئی ہنستی ہے) لیکن نہ جانے کیوں ریاض، تمہاری گالیوں کا بھی مجھ پر الٹا اثر ہوتا ہے۔

ریاض۔ میں نے تمہیں گالیاں دیں۔

نجمہ۔ گالیاں اور کیسی ہوتی ہیں۔

ریاض۔ اور تم نے جو مجھ سے کہا کہ ذکیہ۔۔۔۔۔

نجمہ۔ اب ہٹاؤ، اس تلخ بحث کو نئے سرے سے شروع نہ کرو، تم جیتے میں ہاری، میں تم سے ہمیشہ ہار جاتی ہوں۔

ریاض۔ اس میں ہار جیت کا سوال نہیں۔

نجمہ۔ میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں، میں خود ذکیہ بہن کی عزت کرتی ہوں ــــ میں نے صرف یہی کہا تھا کہ ان سب باتوں کے بعد، جو تم ہی نے مجھے سنائیں، تمہیں ادھر نہ آنا چاہیئے تھا۔

ریاض۔ میں جموں تک آکے اسے ملے بغیر چلا جاتا۔

نجمہ۔ خیر واپسی پر خواہ تم برس بھر کے لئے یہاں بیٹھے رہنا لیکن اب سارے کا سارا پروگرام خاک

میں نہ جاؤ، دیکھو مجھے مایوس نہ کرو، وہ ذکیہ آ رہی ہے، کہو تو میں اس سے بھی معافی مانگ لوں۔

(قدرے زور سے) ذکیہ بہن!

(ذکیہ آتی ہے)

ریاض۔ (سرگوشی میں) نجمہ——؟

ذکیہ۔ کہئے آپ نے مجھے آواز دی۔

(ذکیہ کے پیچھے پیچھے ہی احسان اور ان کے
پیچھے سرور، عقیل، نعیم وغیرہ بالکونی پر آتے ہیں۔)

حسان۔ تم ذرا پردے میں ہو جاؤ بیگم (اُن لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے) آجائیے صاحب۔ آجائیے۔

(ننھو اور مجی باہر سے بھاگے آتے ہیں۔ اور امی
امی، کہتے ہوئے ذکیہ کا دامن پکڑ لیتے ہیں۔)

ذکیہ۔ (دانت پیستے ہوئے سرگوشی میں) کہاں سے آئے ہو خاک چھانتے، کپڑے تو دیکھو کیسے میلے ہو رہے ہیں، ہٹو، دیکھو کون آئے ہیں؟

مجی۔ ہم ابا کے ساتھ سیر کرنے گئے تھے۔

(ذکیہ دامن چھڑا کر برابر کے کمرے میں چلی جاتی
ہے، سرور، نعیم، عقیل وغیرہ اندر آتے ہیں۔)

نعیم۔ (اندر داخل ہوتے ہی) ارے تم یہاں آ کر بیٹھ گئے، اور ہم صبح سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ عجیب چغد ہو تم!

سرور۔ صبح صبح ہمیں سرینگر کے لئے چل دینا ہے اور تم یہاں ایسے بیٹھے ہو گویا اب یہیں کٹیا بساؤ گے۔

عقیل۔ ہم لوگوں کو تو پھر کالج بھی جانا ہے، تم تو آزاد ہو، تمہارا کیا ہے، پھر آ کر یہاں دھونی رما لینا۔

ریاض۔ مجھے کہیں نہیں جانا، میں اب یہیں رہونگا۔

سرور۔ سمجھائیے ذرا انہیں عقیل صاحب۔

نعیم۔ (عقیل کو پیچھے ہٹاتے ہوئے) ارے ہٹاؤ، عقیل انہیں کیا سمجھائیں گے، ان حضرت کے کپڑے کہاں ہیں؟ (نسیمہ سے) کیوں بیٹیا، تمہارے ماموں جان کے کپڑے کہاں ہیں؟

نسیمہ۔ (جواب نہیں دیتی۔)

ریاض۔ نعیم تنگ نہ کرو۔

سرور۔ گویا ہم تنگ کر رہے ہیں۔

نعیم۔ (ننھو کو گود میں اٹھا کر) کیوں ننھی کیا نام ہے تمہارا؟

مجی۔ (آگے بڑھ کر) اس کا نام نستو ہے اور میرا مجی۔
نعیم۔ (نستو کو اتار کر اور مجی کو اٹھاتے ہوئے) کیوں مجی میاں، تمہارے ماموں جان کہاں ٹھہرے ہیں؟
مجی۔ اُوپر بارہ دری میں۔
نعیم۔ چلو ہمیں ذرا دکھاؤ تو بارہ دری، تمہیں مٹھائی دے دیں گے۔
نستو۔ (مٹھائی کے نام پر آگے بڑھ کر) میں چلوں گی۔
مجی۔ (گود میں مچل کر) نہیں میں چلوں گا۔
نعیم۔ (بالکنی کی طرف بڑھتے ہوئے) آؤ۔ ... آؤ۔ ... تم دونوں آؤ۔ (جاتے جاتے نجمہ سے) تم ذرا تو کیہ بہن سے معافی مانگ آؤ۔

(دونوں کو ساتھ لیکر چلا جاتا ہے، نجمہ
برابر کے کمرے میں چلی جاتی ہے۔)

سرور۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے، یہ فیاری کی خوبصورتی اور تازگی کا نقشہ کھینچ کھینچ کر اتنی دور سے ہمیں یہاں گھسیٹ لائے حضرت اور خود یہاں آ بیٹھے ہیں، بھلا کس کے پاؤں میں کھجلی ہوئی تھی جو اس سردی میں اس سفر کو نکلتا۔
احسان۔ لیکن صاحب، میں کہتا ہوں۔ آپ اس وقت کہاں جائیں گے؟ میرا خیال ہے، آج رات آپ یہیں قیام کریں۔
سرور۔ آپ کا بہت بہت شکریہ بھائی جان، لیکن ہمیں صبح چل دینا ہے، دو ایک دن سرینگر ٹھہر کر پھر واپس علیگڈھ پہنچنا ہے، ان دو ایک دنوں میں گلمرگ بھی دیکھنا ہے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔
ریاض۔ (کرسی سے چپکتے ہوئے) تو بھی آپ لوگ جائیں، میں اگر نہ جاؤں گا تو کیا برف گرنا چھوڑ دے گی میں ذرا سکون چاہتا ہوں اور یہ جگہ مجھے پسند ہے۔
سرور۔ تمہیں کچھ بھی پسند نہیں اور سب کچھ پسند ہے، دو دن میں اس سکون سے بھی اکتا جاؤ گے اور ران پھلوں کی یاد ستانے لگے گی۔
احسان۔ میں کہتا تھا آپ ریاض میاں کو تو .....
عقیل۔ آتے آتے چھوڑ جائیں گے۔
احسان۔ لیکن صاحب اس وقت تو اندھیرا ہو گیا ہے۔ اور میں نے سنا ہے کہ نہر کی پٹڑی ٹھیک نہیں
عقیل۔ ہم آرام سے چلے جائیں گے، آپ فکر نہ کریں۔

(نعیم ریاض کا سوٹ اور ٹائی اٹھائے ہوئے آتا ہے)

نعیم۔ یہ بھئی سوٹ تو اٹھا لایا ہوں، اب اٹھاؤ ان حضرت کو، دیر ہو رہی ہے، وہ سب لوگ انتظار کر رہے

(سرور ریاض کو ہاتھ پکڑ کر اٹھاتا ہے۔)

ریاض۔ (کرسی سے چپکتے ہوئے) میں کہتا ہوں......

عقیل۔ (ریاض کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر پیچھے سے دھکیلتے ہوئے) تمہیں جو کہنا ہے، راستے میں کہنا۔

ریاض۔ (پھر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) ارے بھئی....

سرور۔ (گھسیٹتے ہوئے) وہاں چل کر۔

ریاض۔ مجھے ذکیہ سے تو رخصت ہو لینے دو۔

نعیم۔ (زور سے) آپا انہیں معاف کر دیجئے گا ہم انہیں زبردستی لئے جا رہے ہیں لیکن اس میں ہمارا قصور نہیں، یہی حضرت ہمیں وہاں سے گھسیٹ کر لائے تھے۔

(ریاض کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں، مجی اور نستو ہنستے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں، احسان صاحب بھی مجبوراً ساتھ ساتھ چلتے ہیں نجمہ اندر کے کمرے سے آتی ہے)

نجمہ۔ چلو میں ذکیہ بہن سے معافی مانگ آتی ہوں۔

نعیم (سوٹ کندھوں پر رکھ کر چلتے ہوئے احسان سے) یہ بدتہذیبی معاف کیجئے گا بھائی جان لیکن دوسرا چارہ نہ تھا۔ ارے...... ارے...... آپ ٹھہریئے، آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔

احسان۔ (لیمپ لیکر ساتھ چلتے ہوئے) نہیں نہیں تکلیف کیسی، نیچے تک تو چھوڑ آؤں، سیڑھیوں میں ذرا اندھیرا ہے۔

ریاض۔ (پورے زور سے بالکونی کے بائیں دروازے میں رک کر) ارے بھئی مجھے کپڑے تو بدل لینے دو

سرور۔ کپڑے تم جہلم جا کر بدلنا، کل ہم یہاں بھجوا دیں گے۔

ریاض۔ (انتہائی مجبوری سے جاتے جاتے) ذکیہ بھئی میں پھر آؤں گا۔ یہ لوگ بڑے ظالم ہیں میری کوئی پیش نہیں چلنے دیتے۔

(سب کے سب چلے جاتے ہیں کمرے میں شام کی بہت ہلکی سی روشنی ہے۔ کچھ لمحے بعد اندر کے کمرے سے ذکیہ نکلتی ہے، جا کر کچھ دیر کھڑکی میں حسرت بھری نظر سے دیکھتی رہتی ہے، پھر آ کر گرتی ہوئی دیوار کی طرح چارپائی پر لیٹ جاتی ہے۔ کچھ لمحے بعد مجی اور نستو خوش خوش داخل ہوتے ہیں)

مجی۔ (نسیمہ کو دکھا کر) دیکھو جی ہمارے پاس کیا ہے؟ ــــ اٹھنی ــــ ہمیں ماموں جان نے دی ہے۔

نستو۔ (مجی کو دکھا کر) ہمارے پاس روپیہ ہے، ہمیں بھی ماموں جان نے دیا ہے۔

مجی۔ (اٹھنی کو ایک ہاتھ سے پیٹھ پیچھے کرتا ہوا) روپیہ؟ دکھاؤ تو!

نستو۔ نہیں دکھاتے۔
مجی۔ ذرا دور سے دکھا دو۔
نسیمہ۔ (ذرا دور سے) یہ دیکھو۔
(نستو روپیہ دکھاتی ہے اور مجی جھپٹ کر اس سے چھین لیتا ہے۔)
مجی۔ (ہاتھ کو گھما کر جھوٹ موٹ روپیہ خلا میں پھینکتے ہوئے) وہ گیا پھرررر
نسیمہ۔ (رونے لگتی ہے) میرا روپیہ، ہائے میرا روپیہ (وہیں زمین پر بیٹھ کر ایڑیاں رگڑتی ہے) ہائے میرا روپیہ — امی — (پھر اچانک اُٹھ کر دھڑا دھڑ مجی کو پیٹتے ہوئے) میرا روپیہ، دے میرا روپیہ — دے — دے۔
مجی۔ (جواب میں پیٹتا ہے) پھر پیٹے گی — لے — یہ لے — یہ لے۔
ذکیہ۔ (اٹھ کر چیختے ہوئے) نستو، مجی، کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو (زور سے دو طمانچے دونوں بچوں کے جڑ دیتی ہے) سارا دن لڑتے رہتے ہو تم!
(بچوں کو پیٹتے پیٹتے رونے لگتی ہے اور پھر سسکتی ہوئی اندر کمرے میں چلی جاتی ہے — ہاتھ میں لالٹین لئے احسان صاحب داخل ہوتے ہیں)
احسان۔ (بالکونی ہی سے) نستو کی اماں .... نستو کی اماں — (اندر آکر) نستو کی اماں۔ (بچوں کو سہمے ہوئے دیکھ کر) کہاں ہیں تمہاری اماں۔
مجی۔ (ابا کے گھٹنوں سے چمٹ کر زور زور سے رونے لگتا ہے) اندر کمرے میں ہیں۔
(احسان صاحب اندر کمرے میں جاتے ہیں، چوکھٹ ہی سے ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔)
احسان۔ ذکیہ ...... ارے بات کیا ہے ...... رو کیوں رہی ہو ...... ذکیہ ...... ذکیہ۔
(مجی کو اٹھا کر جلدی سے اندر جاتے ہیں)
(پردہ ایک دم گرتا ہے۔)

راجندر سنگھ بیدی

آگ

اسن سول ابھی بہت دور تھا۔ یہی کوئی سات ایک میل کے قریب۔

سات میل کا فاصلہ کوئی بڑا فاصلہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس دھان پاتی کے لئے جو پہلے ہی ٹوٹ چکا ہو یہ فاصلہ ایک خاصی منزل کے برابر ہے۔ اپنے من من کے پاؤں سمیٹ کر اڈتن اونٹ کے کجاوے کی طرح تاڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ تاڑ اس علاقے میں بےشمار تھے۔ جدھر دیکھو تاڑ ہی کے درخت نظر آتے تھے۔ اور ان کے پاس وں سے اپنے آپ جھاگ پھوٹ رہی تھی۔

کچھ دور سڑک کے پاس خاکستری زمین پر کوئلوں کے دھبے سے نظر آتے تھے۔ یہ کوئلوں کے گڑھے تھے جو اب بیکار ہو گئے تھے۔ ان گڑھوں کو ملاتی ہوئی سڑک اسن سول کی طرف جا رہی تھی۔ ہر آدھ پون گھنٹے کے بعد اس سڑک پر کوئی گاڑی آ کر رکتی۔ اور پھر آس پاس کے بھوکوں سے بےخبر چل دیتی۔ "ٹھہرو دادا! رک جاؤ دادا ......" اڈتن پورے زور سے چلاتا۔ اور پھر عاجز آ کر کجاوے پالان کی طرح دہرا تہرا ہو کر تاڑ کے نیچے جا پڑتا۔ اور زبان کی نوک سے پسینہ چاٹنے لگتا ...... دور ...... دور ...... جہاں زمین آسمان سے ملتی نظر آتی تھی۔ دو ایک باڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جن کے ساتھ اوس کی فصل چھدری چھدری بوڑھے کے دانتوں کی طرح میلی میلی اگ رہی تھی۔ فاقوں مارے لوگوں نے اوس کی پیلی پیلی کمزور بالیاں نوچ لی تھیں اب ان میں کچھ بھی نہ تھا۔ بلکہ اس مہاماری سے بہت پہلے، ہمالیہ پھاند کر منگری نور سے آنے والے جانوروں نے کھپریل تک سے دھان ڈھونگ لیا تھا۔

اب دھان پاتی مرتے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں اُبال رہے تھے۔ وہ اور کیا کرتے؟

تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک بھنبھناہٹ سی سنائی دی۔ اور ایک لاری آ کر رکی۔

"رک جاؤ ...... رک جاؤ ...... ٹھہرو ...... " اڈتن چلایا ...... "ٹھہرو!"

پھر اڈتن نے کالی کا واسطہ دے کر گاڑی کو روکنا چاہا۔ لیکن ایک دم اس کے دماغ نے فیصلہ کر لیا کہ اب کال کا ستیاناس ہے۔ دھرتی ماتا کے سامنے کالی اور بھگوان دونوں بےبس ہیں۔ کالی اور بھگوان ظالم اور

مظلوم دو نوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے ہیں۔ اودن نے اپنا واسطہ دینا چاہا۔ لیکن اسے کیا غرض تھی۔۔۔۔۔ وہ چپ رہا

ڈرائیور نے ذرا دیر سن لی تھی۔ اس نے کھڑکی میں سے سر نکال کر پوچھا۔۔۔۔ "کہاں جاؤ گے، اس سول، کیا دو گے اس سول کا؟"

اودن نے ایک ہی سانس میں کہا۔ "جو کچھ میرے پاس ہے دے دوں گا۔ تمہارا غلام رہوں گا۔ ساری عمر تمہارا غلام رہوں گا۔ ساری عمر۔۔۔۔۔" اور پھر وہ ہانپنے لگا۔

ڈرائیور تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ موبل آئل گاڑی سے نیچے ٹپک رہا تھا۔ نیچے اتر کر اس نے انجن کا ڈھکنا اٹھایا۔ موبل آئل کے گیج کو ٹینک میں داخل کیا۔ اور ریلا۔ "کافی ہے، کافی۔۔۔۔۔" پیچھے سے اس کے ساتھی نے آواز دی۔۔۔۔ "لعیسو کی جان کو رو رہے ہو دادا؟" ڈرائیور نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔" اور پھر اودن کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ "ساری جندگی کی مصیبت کون مول لے۔ نقد کیا دو گے؟ بولو دس روپے دو گے؟"

اودن نے جلدی سے ہاتھ جیب کے اندر ڈالا۔ اور جیب سمیت نقدی کو باہر لے آیا۔ ایک روپے کا بوسیدہ سانوٹ تھا۔ اور کچھ سکے۔ ڈرائیور بات کئے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اودن اپنی جگہ کھڑا کھڑا جھپٹا۔ پھر جیسے اسے ہاتھی پاؤں کی بیماری ہو۔ پاؤں زمین پر گڑتے کے گڑے رہ گئے۔ اور ہاتھ آگے بڑھ گئے۔ وہیں کھڑے کھڑے اودن گر پڑا۔ اور اس کے منہ سے جھاگ پھوٹنے لگی۔

لیکن اودن اکیلا نہ تھا۔ اس کے پاس ایک اور آدمی بھی کھڑا تھا۔

یہ سب کچھ اس خواب کی مانند تھا۔ جس میں ایک آدمی دہشت کے مارے بھاگنا چاہتا ہے۔ لیکن پاؤں زمین میں گڑ جاتے ہوں۔ اور بھاگ نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہوں۔ البتہ ایسی تفصیلات دی جاتی ہوں۔ جیسے تارے کے پتے جھوم رہے ہیں اور کوئی آدمی پاس کھڑا۔۔۔

لیکن وہ آدمی بولنے لگا۔ اس انداز میں جیسے اصل اور نقل، خواب اور بیداری ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہے ہوں۔ یہ خواب نہ تھا۔ کیونکہ بیگا نگر کے ریکارچونی جھکڑ کے ساتھ برابر چل رہی تھی۔۔۔۔ صاف چکر لگاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ آدمی جو اس بیداری اور خواب کی حدوں کو ملاتا ہوا آ رہا تھا۔ گنگنا رہا تھا۔۔۔۔۔ من بچکو جو گتو رہے، تر و گرد لگ رہے دیکھ۔۔۔۔

اس آخری کشمکش کے بعد اودن بلبلانے لگا۔ میں مر جاؤں گا رے دادا۔ گویا زندگی میں اسے پہلی بار گیان ہوا کہ وہ مر بھی سکتا ہے۔ مشکل سے مشکل گھڑیوں میں بھی اسے امید ہی رہی۔ کہ کچھ نہ کچھ ہو جائیگا۔ وہ نہیں مر سکتا آخر اس نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ اب دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل رہی تھیں۔ اور اسے یقین ہونے لگا۔ کہ مرنے کے لئے ضروری نہیں کہ کسی کا کچھ بگاڑا جائے۔۔۔ وہ آدمی کھڑا اودن کی آنکھوں میں دیکھے

لگا۔ اگرچہ اس کا من گرونگ روپ دیکھ کے پگلا ہو رہا تھا۔ تاہم وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ آدمی تھا پتھر نہیں تھا۔ یہ بول تو یونہی زبان پر چلے آتے تھے جیسے صبح اٹھتے ہی کوئی بول بے ساختہ زبان پر آجاتے۔ اچھا یا بُرا۔ آدمی دن بھر کاروبار کرتا ہے۔ اور بنا جانے بوجھے اس بول کو گنگناتا رہتا ہے۔ ... مثلاً دوسری بیاہ کے موقع پر بھی گاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک مرگ ناگہانی اور ہے : ۔ ۔ ۔ ۔

تمی کنتو باڑی چھے ؟ اس نے پوچھا

اوتن نے پاگل ہوتے ہوئے جواب دیا۔ میں مر جاؤں گا ۔ وادا ! اور وہ اور بھی متوحش نظر آنے لگا۔ تنز ماشٹے نے یہ سوال بھی اسی انداز میں کیا تھا جس میں گورنگ روپ گنگنایا تھا۔ اب ایک دم اس نے دلاسا دیتے ہوئے کہا ۔۔ ارے تم مر جاؤ گے۔ تو کیا بگڑ جائیگا ۔ ۔ ۔ ۔ بتاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

کیا دنیا کا کاروبار بند ہو جائیگا ؟

تمہارے مر جانے سے لوگ بھی مر جائیں گے ؟

اس مہاماری میں تئیس لاکھ مر گئے۔

تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چودھری ؟

اوتن کے ہونٹوں پر جانے مہر لگ گئی۔ کل اس کے سامنے انّم مرا تھا۔ لیکن اس بیکار گڑھے پر بیکار چوکی جگہ میں ویسے ہی گھومتی رہی تھی۔ گویا اسے بھی رک جانا چاہیئے تھا۔ تاڑ ہوا میں اسی طرح جھومتے رہے تھے۔ اور اپنے ہماسوں سے نشیلی تاڑی کی جھاگ بدستور اگلتے رہے تھے۔ اور بیٹ بھرے آدمیوں کو متوالا کرتے رہے تھے۔ مکھیاں ویسے ہی حاصلوں کی طرح نوالے نگلتا رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بچوں کو تکلیف ہوئی۔ اوتن نے سوچا۔ لیکن اس کے مر جانے سے وہ تھوڑے ہی مر جائیں گے۔ زندگی کے ساتھ ٹکر لیں گے۔ تو وہ اور بھی اچھے آدمی بن جائیں گے پدما ان بچوں کے آسرے پر جیتی رہے گی۔ ہو سکتا ہے وہ دوسری شادی کر لے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اسی منہ سے دوسرے آدمی کے سامنے، انہی الفاظ میں محبت کا اقرار کرے۔ جن الفاظ میں اس نے اوتن کے سامنے اقرار کیا تھا ؟ ۔ ۔ ۔ لیکن اگر ایسا ہو جائے۔ تو آخر کیا ہو جائیگا ؟ ۔ ۔ ۔ ۔

تھوڑی دیر کے بعد اوتن کو پتہ چلا۔ اس کا ساتھی سرکاری آدمی ہے۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ امید اور خوف کے ساتھ۔ اس آخری نذر کو خرچ کر دینے پر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ گھٹنے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ جیسے ذبح ہونے سے پہلے مرغ کی چونچ کھل جاتی ہے۔ اور تنفس کی تیزی کی وجہ سے اس کے نتھنوں، اس کا گلا، اس کی ادھری ہوئی پیٹھ پھڑکتی ہے۔ ایسے ہی اوتن کا منہ کھل گیا تھا۔ سب انتظار سے نتھنے تک کانپ رہے تھے۔ آخر وہ سیدھا بیٹھ گیا۔ اور اپنی آنکھوں پر زور ڈالتے ہوئے تنز ماشٹے کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ اور وہ بولا۔

”آپ کیا چھٹا تھا آپ ...

"اوہ، پرا ہمن باڑیا آپہنچے!" مسز مہاشے نے کہا۔

کچھ دیر وہ دو تو ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس اثنا میں ایک اور گاڑی آئی۔ اور جھنجھناتی ہوئی گزر گئی۔ اس دفعہ نقاہت سے اوتن نے اسے کھڑا کرنے کی کوشش نہ کی۔ شاید دوسرے آدمی کو پاس کھڑے دیکھ کر اسے حوصلہ ہو گیا تھا۔ پھر اسی مبہم سے احساس نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ کہ وہ مر نہیں سکتا آخر اس نے کون سا قصور کیا ہے؟

جنگل کے ساتھ ایک دھول سی چھا گئی۔ تیلنگری دور سے آتے ہوئے پرندے، بڑے بڑے پہاڑی کتے ہوا کی اوپر کی سطح پر تولنے لگے۔ وہ جس مقام پر اترنا چاہتے۔ اس سے کئی میل دور جا پڑتے۔ لیکن پھر وہ اپنے حساب سے منزل سے بہت دور سے اترنے کی کوشش کرتے۔ اور ہوا انہیں دھکیل کر عین مطلوبہ جگہ پر بٹھا دیتی

اوتن اور مسز مہاشے میں کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اوتن کی جان میں جان سی آ گئی تھی۔ اس نے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی سے دھول جھاڑتے ہوئے کہا "اب ہمارے پاس کچھ نہیں رہا۔ دادا! امن کی فصل لینے کے لئے ہم نے اپنا سب کچھ بیچ دیا۔ لیکن وہ فصل بھی کنگلوں نے لوٹ لی۔ اور بونے کی ہمت کس میں تھی؟"

مسز مہاشے نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "عجب ہے۔ اس سال تو لوگ بھی بھوکوں مریں۔"

"کیوں، اس سال میں کیا ہے؟"

"اس سال میں کیا ہے؟ — سارا بنگال بھوکوں مر گیا۔ لیکن سرکار کو جنگ کے لئے یہاں سے کوئلہ لینا تھا وہ اس سال کے مزدوروں کو کیسے مار سکتی تھی؟"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے" اوتن نے کہا "لیکن اس علاقے میں جو سفید پوش لوگوں کا حال ہوا۔ وہ تم نہیں جانتے۔ مانگنا وہ عار سمجھتے تھے۔ اور دینا ان کے بس میں نہیں تھا۔ کان کے مالکوں تک کو کچھ ملتا تھا۔ وہ حیلے سے چھین جھپٹ کر کھاتے تھے...." یہاں اوتن سانس لینے کی غرض سے رکا۔

"یہ چھینا جھپٹی وہ ہمیشہ کر سکتے تھے" مسز مہاشے نے اوتن کو کم بات کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں مسز مہاشے . . ." اوتن نے رکتے ہوئے کہا "انہیں اتنا کم ملنے لگا۔ کہ مشکل سے ان کا پیٹ بھرتا تھا۔ ہم سب کچھ چور بازار سے پیسے کے زور خریدتے۔ لیکن اب اس ایماندار سرکار نے پیچھے سے چور بازار بھی ختم کر دیا . . . چور بازار بری چیز ہے نا!"

اور پھر جانے اوتن کو شک سا گزرا۔ غصہ بھی نشے سے کم نہیں ہوتا۔ پھر اوتن میں طاقت عود کر آئی۔

"تم چور بازار بند کرنے آتے ہو؟" اس نے پوچھا "تم چور بازار بند کرنے آتے ہو، تو یہاں سے چلے جاؤ۔ یہاں سب لوگ بھوکوں مر جائیں گے..... صب ..... مزدور ..... مزدوروں کے مالک..... سب"

"میں چور بازار بند کرنے نہیں آیا۔"

"تو پھر تم چور بازار میں نفع کمانے آتے ہو؟" اوتن نے اور غصے ہوتے ہوئے کہا۔ "... لیکن اس کے

منہ پہ کف سی آگئی۔ اوتن نے مسٹر مہاشے کا چہرہ ٹٹولنے کی غرض سے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن اس کے ہاتھ پاؤں نے اسے ہلنے نہ دیا۔ ایک بے پناہ ہیبت اس پہ چھا گئی۔ اور اس نے کہا۔ "ہماری جان بچانا تمہارا فرض ہے۔ ۔ ۔ تم سرکاری آدمی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مسٹر مہاشے بٹر بٹر اوتن کی طرف دیکھتے رہے۔

اوتن بولا۔ "تم مجھے اس سول بچا سکتے ہو۔ مزدور بچوا سکتے ہو۔ ۔ ۔ ۔ مرنے سے پہلے۔ ۔ ۔"

مسٹر مہاشے نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں لوگوں کی جان بچانے نہیں آیا۔"

"نہیں ؟" اوتن نے پھر گھٹنے سکیڑتے ہوئے کہا۔ "تم کیا کرنے آئے ہو ؟"

"مجھے مرنے والوں کی تعداد گننے پہ لگایا گیا ہے۔"

اوتن نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں سے دیکھا۔ مسٹر مہاشے آنکھوں سے نمی پونچھ رہے تھے۔ اس نے دیکھا۔ مسٹر مہاشے کسی اچھے خاندان کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے خاندان کے آدمی جسے اس بیماری یا بھوک کے لئے جدوجہد نہیں کرنا پڑی۔ جس کی بہنوں کو دبے پاؤں اپنے ہال کے چند دروازے سے رات کے وقت جانا اور آنا نہیں پڑا۔ وہ رحمدل تھے۔ ان کی آنکھیں نمناک تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اوتن نے سوچا ان کے رحمدل ہونے کا اسے کیا فائدہ۔ اس قسم کا ترحم بھی کیا عیاشی تھی ؟

تلڈے کے اوپر سے بتاشوں کی طرح کے جھاگ کے چند قطرے گرے۔ سائیں سائیں کی آواز میں اوتن کی آہ گم ہوگئی۔ وہ پھر چلانا چاہتا تھا۔ اور مسٹر مہاشے کو کہنا چاہتا تھا۔ ۔ ۔ پھر یہاں کیوں کھڑے ہو ۔۔ جاؤ۔ اپنے کاغذوں میں ایک اور نام لکھ لو۔ مسٹر مہاشے دیکھنے میں آنسو بہا رہے تھے۔ لیکن وہ اوتن کے سکڑے ہوئے جسم پہ یوں کھڑے تھے۔ جیسے کوئی گدھ ہو۔ اور کسی جانور کے مرجانے کا انتظار کر رہا ہو۔ اگر وہ چلے جاتے تو خانہ پری کیلئے پھر انہیں لوٹنا پڑتا۔

مسٹر مہاشے نے اوتن کے کندھے چھوتے اور کہا۔

"اوتن دادا۔ ۔ ۔ ۔ تم لوگ خود کچھ بھی تو نہیں کرتے۔ ہر کوئی اپنی مدد آپ کرے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔"

اوتن نے ہلکے سے سر ہلایا۔ مسٹر مہاشے بولے۔

"اوتن دادا، تم کلکتے کیوں نہیں چلے جاتے۔ ۔ ۔ کلکتے ؟"

اوتن پہ ایک غنودگی سی طاری ہوگئی۔ اس کی ابھری ہوئی پھڑک پھڑک کر ماند پڑ چکی تھی۔ اور اس کا دماغ ایک جالا سا بنتا لگا تھا۔ اس کے ذہن کے افق پہ ایک دھول سی چھا گئی۔ پھر کچھ ہوش آئی۔ اب کے مسٹر مہاشے خواب کے عالم میں تھے۔ ۔ ۔ اوتن کسی زمانے میں خود مسٹر مہاشے تھا۔

. . . .

اوتن کے وقت تک یہ لوگ بھی پلشیا کے گاؤں اوتی میں رہتے تھے۔ اوتن کا باپ ایک معمولی حیثیت سے ریلوے

ورکشاپ میں نوکر رہا تھا۔ وہ صرف بجلی کے پنکھوں پر تار پیٹا کرتا تھا۔ اس زمانے میں پنکھے صرف رئیسا کے ہاں ہوتے تھے۔ اسلئے ایک پنکھا اصلی سا خراب ہو جانے پر چند دن تک جوتن کے باپ کی گورنر تک رسائی ہو جاتی تھی۔

جوتن بابو ورکشاپ سے اکثر تاریں، اسکرو، گاڑیوں کا روغن اور ایسی کئی ایک چھوٹی موٹی چیزیں اڑا لیا کرتے تھے۔ ایندھن کی ان کے ہاں ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ تیل میں بھیگے ہوئے چیتھڑے جن سے انجن صاف کئے جاتے تھے بکثرت مل جاتے تھے۔ بیٹری کے ذریعے ان کے ہاں بتیاں جلتیں۔ اور یہ بات آس پاس کے دس بیس گاؤں کا عجوبہ تھی۔ اس کے باوجود جوتن بابو کو کسی نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ لیکن اسے بھی گر یاد تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز بچہ خوش ہو کر کہا کرتا تھا۔ .. مانگ کیا مانگتا ہے۔

اکثر طالب علموں کی خواہش ہوتی تھی۔ کہ وہ بیرے کی حیثیت سے صاحب کے ہاں نوکر ہو جائیں۔ اور جان بوجھ کر انگریزی کا کوئی لفظ نہ بولیں۔ اور پھر میم صاحب یا صاحب کو کہیں کہ انہیں انگریزی پڑھا دے۔ پھر ایک دن میں انگریزی کی گرامر اس حد تک پڑھ جائیں۔ کہ صاحب ان کی "خداداد لیاقت" کا قائل ہو جائے۔ اور فوراً کہے۔ تم پلیٹیں دھونا چھوڑ دو۔ .. تم ناحق رکابیاں چمکاتے ہو۔ حالانکہ تم ہندوستان کی قسمت چمکا سکتے ہو۔ ... اور پھر صاحب فرلو پر ولایت جائیں۔ تو انہیں بھی ساتھ لے جائیں۔ اور انہیں آکسفورڈ میں داخل کرا دیں ... اپنے خرچ پر ... صاحب جو ٹھہرے، اور ہر صاحب فراخدل ہوتا ہے ... پھر آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کر کے لوٹیں تو قریب قریب وہی مرتبہ حاصل کر لیں۔ جو ان کے صاحب کو حاصل تھا۔ وہ لوگوں کو حیران کر دیں۔ اور پھر ان تمام بھائیوں سے بدلہ لیں۔ جن کے ساتھ ان پشت سے مقدمہ چل رہا تھا یا جنہوں نے نوکری کے سلسلے میں ان کی بات تک کرنا گوارا نہ کیا تھا۔

کرسمس کے دنوں میں اپنے ہاں ڈالی لے جاتے اور

May God Bless you ; May God Show er Good Luck on you And your Near and Dear ones ; May God ....

ایسے الفاظ کہنے والوں کو صاحب لوگوں نے ابھی نفرت کرنا شروع ہی کیا تھا۔ بظاہر خوش ہوتے تھے لیکن جونہی خوشامدی لوگ کوٹھی کے احاطے سے باہر نکلتے۔ صاحب لوگ، میم لوگ اور بابا لوگ خوب ہنستے اور نفرت سے Bloody Swines these! اور اس قسم کے خطابات سے ان لوگوں کو یاد کرتے۔ لیکن ایک اور طریقہ بھی تھا۔ جسے جوتن بابو نے کامیابی کے ساتھ اختیار کیا۔ اس نے گورنر کی بیوی کے ہاں بجلی والی گھنٹی لگا دی۔ گورنر صاحب بہادر کے سلام بولنے پر ہز ایکسیلینسی جاگ بھی پڑتیں۔ اور ان کے اعصاب پر بھی گھنٹی کی کرخت آواز سے کوئی برا اثر نہ پڑتا۔ ہز ایکسیلینسی نے فوراً کہا۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔ جوتن نے کہا۔ میم صاحب، آپ کا دیا بہت کچھ ہے۔ آپ کے جوتوں کے صدقے سب کچھ حاصل ہے۔ جب میم صاحب نے تیسری مرتبہ کہا۔ تو جوتن

بلا۔ یور ایکسیلینسی! میرا عہدہ بڑھا دیا جائے۔ اسی دن ملٹری سیکرٹری کے نام چٹھی لکھی گئی۔ ملٹری سیکرٹری نے ایجنٹ صاحب کے نام لکھا۔ اور جوتن بادشدہ شدہ جسنی مین کے عہدے تک جا پہنچے۔ وہ فوربین بھی ہو سکتے تھے۔ بشرطیکہ وہ عہدہ انگریز کے لئے وقف نہ ہوتا۔

تو گھر بھر میں اس قدر فراغت تھی۔ اوتن ابھی اسکول سے نکلے ہی تھے۔ صحت بنانے کا انہیں خوب خیال تھا۔ آخر تمام زندگی یہی صحت خرچ کرنا تھی۔ وہ صبح شام ڈنٹر بیلا کرتے۔ مالش کرتے۔ پہلے تو وہ صبح دہی کا بھرا ہوا ایک کٹورہ پی جاتے۔ پھر سورج نکلتے سے پچاس بادام الائچی کے ساتھ کوٹ کر لڈو سا بنا لیتے اور کھا جاتے۔ پھر میاں شمس الدین کے ہاں کا سابونت پلاؤ۔ اور مرغن چیزیں کھائی جاتیں۔ پھر دودھ پیا جاتا۔ پیٹ پر اتنا بوجھ ہو جانے سے رات کو اکثر "سوپن دوش" ہو جاتا۔ اور اس کمزوری کو پورا کرنے کیلئے اگلے روز اور کھلایا جاتا۔

جسم میں قوت وافر تھی۔ جذبات کا خزینہ بھی بہت تھا۔ معمولی سی بات پر آنسو امڈ آتے تھے۔ چونکہ طاقتور آدمی ہر کسی کو معاف کر دیا کرتا ہے۔ اس لئے اوتن کسی کو کچھ نہ کہتا۔ ہر ایک کو معاف کر دیتا۔ اور معاف کر دینے کے بعد وہ سوچتے۔ خدایا! میں تیرا کتنا عاجز بندہ ہوں۔ اور پھر آنسو اس کی آنکھوں میں چھلکنے لگتے۔ اسے اکثر خیال آتا۔ اگر میں چاہتا۔ تو ایک پل میں اس شخص کا کچومر نکال سکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے مارا نہیں۔۔۔ اس کی بیوی بیچاری ہمیشہ بیمار رہتی ہے۔ پھر یہ ناتھ آئیہ کا منتری ہے۔ اور ہر سال اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔ اور پھر آنسو۔۔۔۔

چنانچہ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ کہ سانیالوں کے مزارع نریندر کی بیوی منیکا بیمار پڑی تھی۔ اس کا خاوند بوڑھے والدین، نصف درجن بچوں اور وقت بے وقت کی نوکری کے درمیان کس قدر پریشان پھرتا تھا۔ اوتن اکثر اس کے ساتھ ہسپتال جایا کرتا۔ اسے تمام مریضوں کی حالت پر رحم آتا۔۔۔ وہ لوگ چاہتے تو تندرست ہو سکتے تھے۔ وہ ہوا خوری کرتے۔ پھل کھاتے تو چند دنوں میں راضی ہو جاتے۔۔۔ ایکدن اوتن ایف وارڈ میں جہاں اسٹیشن ماسٹر گروپ کے لوگ اور ان کے وابستگان بیمار پڑے تھے۔ منیکا کے پاس پہنچا۔ منیکا کو کثیر الاولادی سے دق ہو چکی تھی۔

"میں تمہیں علاج بتاؤں۔۔۔ دیدی؟" اوتن نے آنا فانا سوال کیا۔

"ہاں اوتن بھیا۔۔۔ مگر تم مجھے صحت دے سکو۔ تو میں آرام سے بچے پال سکوں۔۔۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں"

اس وقت نریندر آگیا۔ وہ دفتر سے چھٹی لے آیا تھا۔ چونکہ ہر روز اسے اپنی بیمار بیوی کے لئے ڈبہ پہنچانا پڑتا تھا۔ اس لئے دفتر سے دیر ہو جاتی تھی۔ اور اس کے افسر دھمکی دیتے تھے۔ نریندر اپنے اسٹیشن کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں دو پیسے اوپر سے آمدنی ہو جاتی تھی۔ ورنہ اتنے بچوں کا پیٹ کہاں پل سکتا تھا۔ اس لئے وہ جانتا تھا۔ جیسے بھی آتے ہیں۔ اور منیکا بھی بچ جائے۔ البتہ اسے منیکا کی زیادہ پروا تھی۔ اور وہ بچوں کو نہیں جنتا تھا۔ جن بلاشبہ جانوں کی طرح پیدا ہی نہیں چھوڑتے تھے۔۔۔ نریندر کو سامنے دیکھ کر اوتن جھینپ گیا۔

لیکن اس کی نیت صاف تھی۔ اس لئے وہ بہت جلد سنبھل گیا۔ فنیکا کے دبلے پتلے نحیف و نزار مالک نے بھی ایک تیکھی نظر سے اوتن کی طرف دیکھا۔ کیونکہ وہ اس کی غیر حاضری میں بھی ہسپتال پہنچنے لگا تھا۔ زمیندار تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نیت بھی صاف تھی۔

اوتن نے کہا۔ "فنیکا میری بہن ہے!"

فنیکا کے خاوند نے کہا۔ "وہ میری بیوی ہے۔ اور وہ دق سے مری جا رہی ہے۔"

"اس کی علاج تو بتانے آیا ہوں، دادا۔۔۔ سنو گے؟"

"کہو، کیا دارو بتاتے ہو؟"

"دیکھو، پیٹ بیماری کا مرکز ہے۔ ہر بیماری پیٹ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر تمہارا پیٹ صحیح کام کرنے لگے۔ تو تمہارا دل دماغ اور اعضائے رئیسہ ٹھیک کام کرنے لگیں گے۔ پھر تم کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔ کبھی بیمار نہ ہو گے۔ ہم نے پیٹ تو مصنوعی قسم کی گرمی سے تباہ اور برباد کر رکھا ہے۔ ہم چائے پیتے ہیں۔ انگریزوں کی نقل میں۔ لیکن تم نہیں جانتے چائے کتنا نقصان کرتی ہے۔ اور انگریز چائے کے ساتھ کتنا مکھن کھاتے ہیں۔ چائے پیٹ میں انتڑیوں کے اندر ایک چکنی اور غلیظ سی تہ جما دیتی ہے۔ جو کبھی دور نہیں ہوتی۔ سو اگر چائے پینا اتنا ہی ضروری ہے۔ تو مکھن کھایا کرو۔ تم لوگوں کے پیٹ جلے ہوئے ہیں۔ میں انہیں ہرا کر سکتا ہوں۔ مثلاً اگر تم مٹی کو اپنے پیٹ پر باندھے رکھو صاف اور شدھ مٹی کو، تو مٹی مساموں کے راستے سے تمہارے پیٹ کی تمام غلاظت کو کھینچ لے گی۔ مٹی میں صاف اور شدھ کرنے کی بہت طاقت ہے۔ تم سیمنٹ پر غلاظت پھینکو۔ فوراً بدبو پھیل جائے گی۔ خدا کی زمین کروڑوں انسانوں کی غلاظت سے ہر روز خراب ہوتی ہے۔ لیکن اس میں سے بدبو نہیں آتی۔ اور پھر مٹی پہ کون سے دام لگتے ہیں۔ خدا کی سب۔۔۔ بڑی نعمتیں تمہیں مفت ملتی ہیں۔ لیکن چونکہ انسان دام خرچ کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔ اسے یقین ہی نہیں آتا۔ کہ مفت بھی آرام حاصل ہو سکتا ہے۔۔۔۔ ہر روز آسمان پر ستارے نمودار ہوتے ہیں۔ اور چاند اپنی کرنوں سے ساری دنیا کو منور کرتا ہے۔ کوئی چاہے تو انہیں پہروں دیکھتا رہے۔۔۔۔ مفت۔۔۔ بالکل مفت۔۔۔۔ برخلاف اس کے کوئی مصور ان کی نقل اتار دے تو اسے ایک نظر دکھانے کے لئے دام وصول کر لیتا ہے۔۔۔ روشنی۔۔۔ پانی۔۔۔ ہوا۔۔۔ قدرت کی سب نعمتیں مفت ملتی ہیں، اتنی کثرت سے، اتنی بہتات سے،"

پھر اوتن نے ہاتھ رگائے بغیر، لکڑی کی تھیلی کی مدد سے پٹ سن کے ایک کپڑے پر مٹی کی پتیں جما کر دکھائیں پٹیاں بنا چکنے کے بعد اوتن کہنے لگا۔ تمہیں مٹی آدبی گاؤں کے قریب سے نہیں لینا ہو گی۔ مٹی چکنی ہو کر کنارے کی ہو تو بہتر ہے۔ سب سے اچھی مٹی گنگا کے کنارے ملتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے اندر گرد کی مٹی غلاظت سے اٹی پڑی ہے۔ اور بہت ریت ہونے کے باعث مفید نہیں ہو سکتی۔

فنیکا کے خاوند نے کہا۔ "جو گنگا کے کنارے سے مٹی لینے جائیں تو۔۔۔"

اوتن نے سنی ان سنی ایک کرتے ہوئے کہا۔ "تو تمہیں کسی صاف جگہ سے مٹی لے لی جا سکتی ہے۔"

"پٹیوں کے بعد دوسرا علاج سٹز باتھ ہے۔" اوتن نے کہا۔ "آؤ میں تمہیں سٹز باتھ کا طریقہ سمجھاؤں۔ ملیکا میری بہن ہے۔ آخر اس میں شرم کی کونسی بات ہے۔" پھر وہ جھجک کر بولا "ملیکا کپڑے اتار کر پانی میں بیٹھ جائے۔ پانی ہمیشہ ٹھنڈا ہو۔ چشمے کا ہو تو بہت اچھا ہے۔ ہمارے میدانوں کے دریا تو یہاں تک پہنچتے پہنچتے گرم اور گندے ہو جاتے ہیں.... "

"دیکھو! یوں بیٹھ جاؤ..... یوں..... ہاں! سب جگہ پانی میں ڈوبی رہے۔ پھر بائیں ہاتھ سے دونوں جگہوں کے درمیان پانی ملو۔ ارے! اس میں شرم کی کونسی بات ہے۔ یہاں اعصاب کی گانٹھ ہوتی ہے۔ یہاں سے مصنوعی غیر قدرتی گرمی نکل جانی چاہیئے۔ ہم نے ان جگہوں کو غیر قدرتی اور کثرت استعمال سے بیماری کا مسکن بنا دیا ہے.... پھر شرم.....!

ملیکا نے اپنا منہ شرم سے تکیئے میں چھپا لیا۔

اوتن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ سب جھوٹی شرم ہے دیدی!" اور پھر اوتن نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میرا تو ارادہ ہے کہ ایک بستی بساؤں جس میں سب لوگ ننگے رہیں۔ آج ہم نے خدا کے دیئے ہوئے خوبصورت جسم کو طرح طرح کے رنگ نگار رکھے ہیں۔ آج کون آدمی ہے اور کون عورت ہے جو کسی کے سامنے ننگی کھڑی ہو سکتی ہے.... کون کہہ سکتا ہے، کہ جس قسم کا خوبصورت جسم اسے خدا نے دیا تھا۔ اسے اس نے برقرار رکھا ہے بھیا، کپڑے پہننے میں مساوات کہاں؟ ننگے پن میں مساوات ہے۔ سب لوگ بہن بھائیوں کی طرح رہ سکتے ہیں،... ہاں... ہاں!" اور پھر اوتن نے سر کو جھٹکا دیا۔ اور بولا "بلکہ یہ کہ ننگوں کی اس بستی میں جب کوئی نیا آدمی آئے۔ تو اس کے اعزاز میں محبت اور اخوت کا ایک گیت گایا جائے۔ تاکہ آنے والے کو پتہ چلے کہ وہ چیرنے پھاڑنے والے جلادوں اور درندوں کے پاس نہیں جا رہا۔ بلکہ ایسے لوگوں میں جا رہا ہے۔ جو اسے بہن بھائی سمجھتے ہیں.... صرف محبت سے انسان کی بیماریاں دور ہو سکتی ہیں۔

ملیکا کے خاوند نے ایک اور کڑی نگاہ اوتن پر ڈالی۔

محبت اور جوش کے ساتھ اوتن کا گلا بھر آیا۔ ایک مصمم ارادے کے ساتھ اس نے گلا صاف کیا۔ اور بولا "ننگا رہنے سے خواہشات کم ہو جاتی ہیں۔ بلکہ حکما کا خیال ہے۔ کہ عورت اور مرد کی ایک دوسرے کے لئے کشش ہی نہیں رہتی۔ اگر رہے گی تو اتنی جتنی قدرتی طور پر ہونی چاہیئے۔ اس وقت سب کچھ غیر قدرتی ہے مصنوعی ہے...... ہمارا رہنا سہنا، کھانا پینا، پہننا، بچے پیدا کرنا.... ہمارے علاج کے سب طریقے مصنوعی اور غیر قدرتی ہیں۔"

پھر اسی طرح اوتن سٹز باتھ کے متعلق ہدایات دینے لگا.... کسی قسم کا بیمار میرے پاس آئے۔ تو وہ چند دنوں میں تندرست ہو جائیگا۔ پیٹ ٹھیک ہو جائے۔ تو پھیپھڑے اپنے آپ درست ہو جائیں گے۔ تم ملیکا کو میرے پاس لاؤ۔ سٹز باتھ میں اپنے ہاتھ سے نہیں دوں گا۔ یہ کام تمہارا ہے۔ تم اس کے خاوند ہو۔ بچ پوچھو۔ تو میں اپنے ہاتھ سے علاج کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتا۔ بلکہ سب عورتیں میری بہنیں ہیں۔"

" ہو سکتا ہے میں ہندوستان میں ننگے لوگوں کی بستی قائم کروں۔ تو پہلے پہل مردوں اور عورتوں کو مصلحت کی ۲ بنا پر ایک دوسرے سے علیحدہ رکھوں۔ ممکن ہے عورت اور مرد لنگوٹ باندھے رہیں۔ اور پھر ایک حال آئے کہ وہ کپڑے اتار کر کھڑے ہو جائیں۔ ننگے... ایسے ننگے جیسے وہ خدا کے پاس سے آتے تھے۔

اس قسم کی بستی پہاڑ کے دامن میں ہونی چاہیئے۔ ایسی جگہ پہ جہاں نہ پہاڑ ہو اور نہ بالکل میدان۔ نہ بہت سردی ہو اور نہ بہت گرمی۔ وہاں پھل پھول کثرت سے اگائے جائیں۔ وہاں انسان صرف چلنے کے لئے جائے گھناؤنی سے گھناؤنی بیماری کے مریض کو پہاڑ پہ بھیجو تاکہ وہ چشموں پر نہائے۔ پھل کھائے۔ چٹان پہ بیٹھ کر دھوپ تاپے، ہنسے اور کھیلے... اور پھر جب تندرست ہو جائے۔ تو لوٹ آئے۔"

اس آخری فقرے پہ نرپیندر ناتھ کو بہت غصہ آیا۔ نینکا آخر لوٹ نہ آئیگی تو آخر کہاں چلی جائیگی۔ نینکا کا تصور چمک اٹھا تھا۔ اسے اپنے صحن میں بچے ہنستے کھیلتے کودتے دکھائی دے رہے تھے۔ اور وہ.... ان کی معصوم ماں، ان کے درمیان بیٹھی فرحت کے احساس سے ٹک ٹک کہہ رہی تھی۔ نینکا نے نرپیندر کو روکا بھی لیکن وہ نہ مانا۔ اس نے اوتن کو خوب گالیاں دیں۔

"کیا بک رہا ہے... فلاں فلاں کے جنے...؟"

پھر وہ بولا۔ "پھل تیری ماں کے پاس سے آئیگا۔ اور پہاڑ پہ تیرا باپ لے جائیگا۔ بچے تیرے کون ہوتے سنبھالیں گے اور دوادارو یہاں.... نوکری میں پہلے ہی ایک چوتھائی تنخواہ پہ چھٹی لے چکا ہوں۔ چھٹی کے نئے قوانین کے مطابق اصل تو چھٹی ملے گی نہیں۔ اور جو مل بھی گئی۔ تو بغیر تنخواہ کے.... نوکری کا سلسلہ ٹوٹ جائیگا۔ اور پنشن میں فرق پڑیگا.... اڑے پڑے رہیں گے تو کل ہی کیرتی زمین کی دوسری مینڈھ پر بھی اپنا ہل چلا دیں گے....؟"

ایک لمحے کے لئے اوتن کو غصہ آیا۔ لیکن وہ غصہ اپنے آپ اتر گیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ وہ ان لوگوں کو زندہ رہنے کا راستہ بتا رہا تھا۔ اور وہ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ وہ ان لوگوں پہ اپنا آپ قربان کر رہا تھا۔ مخلوق کے لئے اس کے دل میں کتنا درد تھا..... اوتن کا منہ سرخ ہو گیا.... اوتن نے نینکا اور نرپیندر ناتھ کو معاف کر دیا۔

لیکن اس کے معاف کر دینے سے کیا ہوتا تھا۔ نینکا اس کی باتیں سن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بچ جانے کے خیال نے اس میں اتنی طاقت پیدا کر دی تھی۔ کہ وہ اپنے سوجے ہوئے پاؤں کے باوجود چلنے لگی۔ لیکن جب نرپیندر نے اسے اپنی مجبوریوں کا احساس دلایا۔ تو وہ ایک دم بیٹھ گئی... کچھ دیر بعد اس پہ بحران طاری ہو گیا.. پھر ماں کا غرور اور تکبر ہمیشہ کے لئے خاک میں مل گیا۔

. . . .

اسی غنودگی کے عالم میں دوسرا واقعہ جو اوتن کو یاد آیا۔ وہ [illegible] کے ہال کی آگ تھی [illegible] درباری تھے کسی زمانے میں خاصے امیر تھے۔ لیکن چند تافلوں کی زد میں آکر مفلس اور تلاش ہو گئے۔

ادبی باڑیا میں یا اودتن کا گھر اچھا گنا جاتا تھا یا سانیال کا۔ لیکن جب سے ستندر کے چھوٹے بھائی نے پہلے پہل ہوٹل کھولا۔ اور بعد میں چینی کے برتن بنانے کا کارخانہ بنایا۔ تب سے وہ مکان بھی رہن رکھ دیا گیا۔ یہی بہت تھا۔ کہ جس شخص کے پاس مکان رہن رکھا گیا اس نے انہیں وہاں رہنے کی اجازت دیدی۔ جس آدمی کا دماغ ساہوکاری سے ہوٹل تک پہنچتا ہے۔ اور جسے ہوٹل اور بھٹے کے درمیان اور کوئی کاروبار نظر نہیں آتا۔ وہ کیا کام کریگا۔ . . .

جیسے عام طور پر ہوتا ہے۔ . . بھئی فلاں کاروبار شروع کر دو۔ ہاں بھئی شروع کر دو۔ اور یہ کوئی جاننا پوچھتا نہیں کہ جو آدمی کاروبار کرتا ہے۔ وہ اس کام کی استعداد بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ ہوٹل کنفیکشنری کے آسرے پر چلتا تھا۔ تمام ٹافیاں، کینڈی اور پیسٹری بہرے لے گئے۔ گاہکوں میں سے جو بہروں کو زیادہ ٹپ کرتے تھے۔ بہرے انہیں وہ چیزیں اٹھا کر سستے داموں دے دیتے۔ اسی طرح چینی کے برتنوں کا پورا بھٹہ ناہموار آنچ کی وجہ سے خراب ہو گیا۔

ایک دن اودتن اپنے ہاں بیٹھا نارنگی میں لوکاٹ کا پیوند لگا رہا تھا۔ کہ کوئی دوڑا دوڑا آیا۔ "آگ لگ گئی . . . آگ۔"

"کہاں ؟" اودتن نے اپنا کام چھوڑتے ہوئے کہا۔ "کہاں آگ لگ گئی ؟"

اودتن نے غور سے دیکھا۔ وہی راہو تھا جو دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے اس نے کہا۔

"ہمارے ہاں، اودتن دادا . . . . ہم کہیں کے نہ رہے۔"

اودتن نے سانیالوں کے گھر کی طرف دیکھا۔ اس دن ہوا کا رخ پچھم کی طرف تھا۔ سانیالوں کے مکان سے لیکر دور پچھم تک دھوئیں کے بیسیوں تیرتے نظر آتے تھے۔ اگرچہ ادبی باڑیا میں اودتن کے مکان اور سانیال کے مکان کے درمیان دو تین ٹیلے تھے۔ لیکن آگ کا تیج وہیں سے محسوس ہو رہا تھا۔ دھوئیں کے ساتھ ایک ہلکی سی سرخی بھی آسمان پر نظر آ رہی تھی۔ چونکہ ابھی دن تھا۔ اس لئے وہ سرخی اتنی تیکھی دکھائی نہ دیتی تھی۔

اودتن دونوں ٹیلے پھاند کر ادبی باڑیا کے دوسری طرف سانیال کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آگ کے شعلے بڑی بڑی اور خون آلودہ زبانوں کی طرح لپک رہے تھے۔ خونخوار جانور کی طرح اس آگ نے اپنے شکاروں کو دہشت زدہ کر رکھا تھا۔ اور وہ مکان میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ شعلوں کے پیچھے گھر کی نوجوان لڑکیوں اور بوڑھی عورتوں کے اڑتے ہوئے بال شہابی ہو رہے تھے۔

پائیں تالاب میں پانی کم تھا۔ شکایت یہ تھی۔ کہ پانی کم آتا تھا۔ اور کیچڑ زیادہ۔ لیکن آگ بجھانے کے لئے کیچڑ بھی غنیمت تھی۔ اودتن نے اپنے اردگرد دیکھا۔ اس وقت سورج پچھم میں آدھا کٹ چکا تھا۔ اس لئے پورب کی طرف سے گویا اٹھتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ آگ کی روشنی مل کر ارغوانی ہو رہی تھی۔ اردگرد کھڑے لوگوں کے چہرے تمتما رہے تھے۔ لوگ باہر سے پانی، کیچڑ، ڈھیل پھینکتے تھے۔ لیکن کسی کو اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آگ لگ گئی . . . . آگ

آگ..... آگ.....

دور سے آواز آئی "معلوم ہوتا ہے۔ آگ لگ گئی ہے!"

اتنے کربناک منظر کے باوجود ایک قہقہہ بلند ہوا۔

آگ..... آگ..... اور باہر کھڑے لوگ آگ میں گھرے ہوئے لوگوں کی سراسیمگی میں اضافہ کرنے لگے۔ چاروں طرف سے چیخ پکار ہونے لگی۔ بچے اور عورتیں اور کچھ مرد بدستور مکان کے اندر ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔

اوتن بدستور باہر کھڑا ان سراسیمہ لوگوں کی طرف دیکھتا رہا۔ ترحم سے اس کا جی بھر آیا۔ اس وقت آگ کے اندر کو دتا۔ تو وہ خود جل جاتا..... وہ باہر کھڑا تھا۔ اور دیکھ رہا تھا۔ آگ کھڑکیوں تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے شعلوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے لوگوں کی طرف حیرت سے دیکھا۔ وہ سوچنے لگا۔

"یہ لوگ بھاگ کیوں نہیں جاتے؟"

. . . .

اوتن نے پھر کہاوے کی صورت میں اپنا تن بدن سکیڑ لیا۔ اور خالی خالی نگاہوں سے ناڑ کے درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ہوا کے تیز ہونے سے دھول سی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ متر بھاشے کی شکل دھندلی دھندلی سی نظر آنے لگی۔ اتنے میں ایک لاری اور آئی۔ اور ہارن بجاتی ہوئی گڑھوں کے پاس سے گذر گئی۔ اوتن کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ جب کہ متر بھاشے نے اپنا سوال دہرایا۔

"تم کلکتے کیوں نہیں چلے جاتے؟"

اوتن کے ہونٹوں پر غصے اور کرب کی ایک ہلکی سی تحریر دکھائی دی۔ وہ کچھ نہ بول سکا۔ کچھ دیر بعد اس کا کبڑا پن اپنے آپ سیدھا ہونے لگا۔ متر بھاشے اس کا مطلب نہ سمجھا۔ اس نے سوچا۔ شاید اوتن آرام کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی ململ کی چادر کا ایک پلو اٹھایا۔ اس سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ اور "من بنگلہ ہو گیو رے" گنگناتا ہوا سامنے نظر آنے والی بارڈی کی طرف چل دیا۔

(انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلاس امرتسر پڑھا گیا۔)

جاوید اقبال

چیچک

منظر:- کسی پھیلتے ہوئے ویرانے کا ایک حصہ۔ جس میں چند درختوں کے صرف تنے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ راکھ کے ڈھیروں میں مختلف جگہوں پر سیاہ لوہے کے مثلث اور مستطیل نما ابھار دی گئی کٹے بکھرے پڑے ہیں جگہ جگہ شکستہ چرخیاں اور چند پہیے سے رکھے ہیں۔ جو کسی تباہ شدہ سواری کے آثار باقیہ معلوم ہوتے ہیں۔

سب سے قریب کے موٹے تنے سے قدرے ورے تین گلی سڑی لاشیں پڑی ہیں۔ ایک مرد کی نعش ہے جس کا نچلا حصہ بالکل گل چکا ہے۔ اور جس پر زرد سے رنگ کے چھوٹے رینگ رہے ہیں۔ دوسری نعش ایک عورت کی ہے جس کا چہرہ، سینہ اور دایاں بازو خراب ہو چکے ہیں۔ بازو کی سفید سی خشک ہڈی اور گرد کی آبنوسی جلد میں چمک رہی ہے دایاں رخسار پھٹ چکا ہے اور اس پر چربی کی تہ جمی ہوئی ہے تیسری نعش ایک بچے کی ہے جو فقط اوندھے منہ پڑا ہوا ایک ڈھانچہ معلوم ہوتا ہے۔

ان نعشوں کے سرہانے ایک نہایت نحیف، چند لمحوں کا مہمان، خارش زدہ کتا بیٹھا اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے دردناک آواز میں چیخ رہا ہے۔ پرے کسی درخت کے تنے پر دو گدھ بیٹھے کبھی کبھار ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کر لیتے ہیں۔ کسی کسی وقت ان میں سے ایک گدھ کتے سے ہم کلام ہونے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

منظر پر تاریکی چھائی ہے۔ کبھی کبھار جب روشنی کی ایک شعاع ان نعشوں پر پڑ جاتی ہے۔ تو دھندلے میں کچھ دکھائی دے جاتا ہے۔ مگر پھر مسلسل تاریکی چھا جاتی ہے۔

پس منظر میں بہت سے لوگوں کے کراہنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت کے گفتگو کرنے کی آواز کسی قدر نمایاں ہے۔ جو بغیر توجہ دیئے بھی سنی جا سکتی ہے۔

عورت:- ... ہمیشہ، میں جھوٹ نہیں کہتی۔ تم نے ہمیشہ ....

مرد:- بڑھو!

عورت:- تم نے ہمیشہ مجھ سے محبت کی ہے

مرد:- ہمارا رستہ کونسا ہے۔ کدھر ہے، کدھر ہے؟

گدھ:- تم نے ہمیشہ....

*

گدھ:- مجھے کتے اچھے لگتے ہیں۔

کتا:۔ خاموش:

گدھ:۔ کیا تم زندہ رہنا چاہتے ہو۔

کتا:۔ خاموش!

گدھ:۔ و ۔۔ ی ایک مہمل لفظ ہے۔

کتا:۔ خاموش

مرد:۔ میرے رستے میں کانٹے ہیں۔ میرے پاؤں لہولہان ہیں۔
ان کبوتروں کے خونیں محمل کی طرح جو مزاسل کا
طواف کرتے ہیں۔

عورت:۔ پہلی مرتبہ جب تم مجھے ندی کنارے ملے۔ تو تم نے کچھ
کہا تھا۔ کیا تمہیں یاد ہے؟

مرد:۔ مجھے یاد نہیں

عورت:۔ ندی کا کنارہ۔ آہ۔۔۔۔

مرد:۔ بڑھو، یہ ٹکڑا ویران ہے

عورت:۔ سنو مجھے ندی کے بہنے کی آواز آرہی ہے۔ جیسے
کوئی خواب۔۔۔

مرد:۔ یہ آوازیں کن کن کی ہیں

عورت:۔ مجھے ایک سفید سانپ رینگتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

مرد:۔ نہیں سفید چیونٹیوں نے زمین میں سوراخ کر دیئے ہیں

عورت:۔ ندی اس دفعہ تو برف کی ایک خاموش سل تھی۔
یا مجھے ہی یوں دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اپنی سلیٹی آنکھیں
تک اٹھا رکھی تھیں۔ اور ندی ہیں دور تک نکل گئی تھی۔ اس
جگہ جہاں چاند اس کی چھاتی پر ندی بچے کی مانند لیٹ
رہا تھا۔ میں باہر چودھویں رات وہاں کسے چومنے جایا
کرتی تھی۔

مرد:۔ سوراخ۔ سوراخ۔۔۔۔

عورت:۔ یوں ہی ایک روز میں سرِ شام کنارے پر جا بیٹھی
ابھی چاندنی پر دہ اٹھا تھا۔۔۔ ہم میں بہتا ہوا پیالہ

اپنے سر اٹھا اٹھا کر دہکتے انگارے کو نگلنے کی کوشش
کر رہی تھیں۔ جیسے انہوں نے پے در پے حملوں سے
زخمی کر دیا تھا۔ اور جس کے خون کی بوندوں میں تمام
فضا ڈوب گئی تھی۔

مرد:۔ انگارہ، کائنات کی دہکتی ہوئی رگ، اسکے پاؤں کے
تلوے پر چھنگلی سے ذرا نیچے، رستا ہوا چھالا، رستا
ہوا، بہیم:

عورت:۔ تم میری پیٹھ کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے۔ میں نے
تمہارے چہرے کا عکس پانی میں دیکھا۔ پانی میں گرا
ہوا گلاب کا ایک پژمردہ پھول میری نظروں کے
سامنے سے لرزتا نکل گیا۔ کنول کی کوک گھنے سایوں
میں گونجی۔ جیسے کسی ابھاگن نے جماہی لی ہو۔ میں نے
تمہیں اپنے قریب بٹھا لیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو پہلے
کبھی نہ دیکھا تھا۔۔۔

مرد:۔ بڑھو، مجھے چاندنی سے نفرت ہے۔

(چار کوے اڑ کر گنبد جاتے ہیں)

عورت:۔ چیت، بیساکھ، جیٹھ، اساڑھ، ساون، بھادوں
اسوج، کاتک، مگھر، پوس، ماگھ، پھاگن۔ کس
قدر مختصر تھی ہماری خوشی اور کس قدر دلکش تھا وہ باغ
جس میں ہم نے اپنی زندگی کے چند لمحے پھول چنتے اور
کھیلتے گزار دیئے تھے۔ تمام دن درختوں میں جھوما کرتے
ناصحات گھاس پر لوٹا کرتے تھے۔ میں جنگلی ہرنی کی طرح بھاگتی
اور تم مجھے پکڑنے کی بیہودہ کوشش کیا کرتے۔

مرد:۔ غلط، غلط، غلط۔۔۔۔

عورت:۔ مگر جب کبھی رات چاندنی ہوتی۔ میں تم سے
چوری اپنی ساڑھی دانتوں میں دبا کر ندی میں دور
نکل جایا کرتی۔ آخر ایک شب تم نے مجھے چاندنی

آغوش میں اس کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھ ہی لیا۔
تمہاری آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ تم نے
اپنی کمان میں تیر جوڑا۔ اور اس کی طرف رخ کر کے
چھوڑ دیا۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ چاند کے سینے سے لہو کا
دھارا بہ نکلا۔ لوگوں نے ڈر کے مارے اپنے چہرے
بانہوں میں چھپا لئے۔ کیا یہ برا شگون تھا۔

مرد۔ ہائے، انہوں نے اس کی صورت بگاڑ دی ہے
وہ تمہارے پیٹ کی طرح ہموار تھی۔ تمہاری رانوں
کی طرح خاکستری اور تمہارے سینہ کی طرح گداز۔
مجھے اس پر ہمیشہ یہی گمان ہوتا۔ گویا میں
تمہاری چھاتی پر سر رکھے ہوں۔ جب کبھی بارش ہوتی
تو وہ تمہارے نیم وا ہونٹوں کی طرح گیلی ہو جایا کرتی۔

عورت۔ پھاگن میں ایک ستارہ ٹوٹ کر میری گود میں
آن گرا، روتا ہوا۔ کیا میں کسی خدا سے کم تھی؟
تم مجھے ندی کے کنارے لے گئے۔ رات ابھی نہا کر
ہی نکلی تھی۔ اس نے بال سکھانے کے لئے اپنی ساری
لٹیں کھول رکھی تھیں۔ پانی کے قطرے اس کی زلفوں
میں جھلملا رہے تھے۔

مرد۔ نہیں، نہیں، نہیں، نہیں۔

عورت۔ اور تم نے میرے کان میں کہا۔ کہ میں.....
تمہیں تمہاری ماں یاد آ گئی۔ جو تمہیں بلا ناغہ پیٹا
کرتی تھی۔ اور جس کی مار کے نشان ابھی تک
تمہاری پیٹھ پر ثبت ہیں۔ مگر جس کے لاتعداد بوسے
تمہارے رخساروں کی سیاہی مائل سرخی میں مخفی ہیں
تمہاری وہی ماں جس نے بچپن میں تمہیں گھی کی چوری
کھلائی تھی۔ اور جب پہلی بار تم کلمہ پڑھنے لگے۔ تو
تمہیں اس نے پیار سے [illegible] ویران، بل

کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر دور تک اس کی نگاہیں
تعاقب کرتی رہیں۔ اس کی دھندلی سی آنکھوں
میں سمندر مقید تھے۔ اور جب تم درختوں کے
گھنے سایوں میں ڈوب گئے تو اس نے آہ بھر
کر آسمان کی طرف دیکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے
میں پاس ہی تو کھڑی تھی دہلیز کا سہارا لئے۔
کس قدر پیاری تھی وہ... جب تم مجھے بازو سے تھامے
اس کے سامنے لائے۔ تو اس نے گھونگھٹ اٹھا کر
پہلے میرے خاموش چہرے کو دیکھا تھا۔ پھر میری
پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ ابھی تک اس کے لبوں
کی گرمی میرے ماتھے پر موجود ہے۔ جیسے مجھے کسی
نے داغ دیا ہو۔ اس نے مجھے ایک سنگاردان بھی
دیا تھا جس میں خوشبوؤں کی ڈبیا تھی۔

مرد۔ آہ.....

عورت۔ اس تاریک رات تم رو دیئے تھے۔ اس تاریک
رات تم نے اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا لیا تھا۔
گویا میں تمہاری..... اس تاریک رات تم میری
گود میں کراہتے رہے تھے۔ تم اس قدر خوفزدہ
کیوں تھے—؟ تم نے کہا تھا۔ خدارا مجھے تنہا
نہ چھوڑ جانا۔ اور میں نے تمہیں پیار سے بھینچا تھا۔
یہاں تک کہ میری چھاتی کی جلد تمہاری سخت داڑھی
کی رگڑ سے دہک اٹھی تھی...

گدھ: موت دوسروں کے ورا ہے!
کتا: دوسروں کی موت سے بے نیاز ہے۔
گدھ: کیا تم جانتے ہو انسان لہو کے ٹکڑوں کو کہاں
پھینک گیا ہے

کتّا :- نہیں
گدھ :- یہ درخت کیوں جُھلس گئے ہیں۔
کتّا :- نہیں۔
گدھ :- ان راکھ کے ڈھیروں میں لاشیں کیوں اَٹی
پڑی ہیں۔
کتّا :- نہیں۔
گدھ :- انسان انسان کا دشمن کیوں ہے؟
کتّا :- نہیں، نہیں، نہیں۔
گدھ :- اس ویرانے کے سارے کتّے عاقبت نااندیش ہیں۔
کتّا :- خاموش۔ میں تمہیں ان کے قریب نہ پھٹکنے دونگا
گدھ :- اسی قربت کی خاطر ہی تو لوہے کے ٹکڑے یہاں
بکھرے ہیں۔ درخت جُھلس گئے ہیں۔ راکھ کے
ڈھیروں میں لاشیں اَٹی پڑی ہیں۔ انسان انسان
کا دشمن ہے۔ بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں
اسی قربت کی خاطر صرف ـــ
کتّا :- خاموش
گدھ :- آخر کے دن تک ـــ تم کم از کم یہ تو ضرور
جانتے ہو کہ ہم تمہاری موت کا انتظار کر سکتے ہیں۔
کتّا :- خاموش۔
گدھ :- مخلوق کا رازق کون ہے۔
کتّا :- خاموش
گدھ :- اور اس دفعہ تو . . .
کتّا :- خاموش۔

مرد :- کیچڑ . . . .
عورت :- اس ایک رات کس قدر خوفناک آندھی چلی تھی
یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کائنات کا نظام بدل جائیگا۔
سایوں میں ہچکیاں ہی ہچکیاں رہ گئیں تو چاند نکلا۔ ابھی تک اس
کے زخم کے اردگرد خون کی پپڑی سی جمی ہوئی تھی
کبھی کبھار اس کے زخم سے ایک آدھ بوند رس جاتی
ـــ وہ کس نوعیت کا زلزلہ تھا جس نے ہماری
زمین کو ایک کوڑھی کی جلد کی طرح جگہ جگہ سے پھاڑ
دیا۔
مرد :- بیکار ہے، میں نے لعل کھو دیا۔
عورت :- رات کے بال سوکھے تو چیونٹیاں ہمارے دانے
سمیٹ کر لیجا چکی تھیں ٹڈیوں کے دَل نے درختوں پر ایک
پتہ تک باقی نہ چھوڑا تھا۔ اس وقت وہ کونسی عورتیں
تھیں جن کی پکاریں کرتاروں کی آنکھوں سے آنسوؤں
کی لڑیاں نہ نکلیں۔ کیا وہ اپنے بچوں کے لئے رو رہی
تھیں یا اپنے خاوندوں کے لئے . . . .
مرد :- پھٹکار، پھٹکار ـــ مجھے تم سے قطعی الفت نہ
تھی۔ میں تمہیں . . . .
عورت :- چٹیل میدانوں میں ہم بھاگتے رہے۔ جہاں کبھی
کھیت لہلہایا کرتے تھے۔ کتنی بار گڑھوں میں ہمارے
پاؤں بھی پھسلے۔ کس قدر تاریک تھے وہ گڑھے۔
ـــ ان میں کچھ رکھا تھا۔ میں نے دیکھنے کی کوشش
نہیں کی۔
مرد :- کسی گدھ کی شادی تھی۔
عورت :- ساماوس کی چار کبڑی راتیں سسکتی اپنے
چہروں کو بالوں میں چھپاتے آئیں۔ ان میں سے
ایک نے اپنے خون آلود ناخنوں سے میرے گلے
کا ہار توڑ لیا۔ اس میں ایک ہی تو موتی تھا۔ ننھا سا
مگر نہایت ہی بیش قیمت ـــ اس قدر کہ کائنات
کے سارے خزانوں کے عوض دے سکتی ایسا ہیرا

بھی نہ خرید سکے۔

مرد :۔ کہہ دو، میں تمہیں معاف نہیں کر سکتی۔

عورت :۔ صحرا نے آنسو پونچھے تو کوئل کی کوک گونجی، آہ
کس قدر بھیانک تھی وہ گونج۔ رات کی قبا سے
پھاڑا ہوا پیتھڑا جو دن کے وقت ویران فصلوں
میں تن تنہا بے خانماں خزاں رسیدہ پتہ کی طرح
لہرا رہا ہو۔ اور یہ چیخ چیخ کر بیتی راتوں کی یاد دلاتے
بیتی راتوں کی حسرت ناک یاد۔ بیتی بہاروں کی
حسرت ناک یاد . . . .

مرد :۔ کہہ دو . . . .

عورت ۔ دلدل، کیچڑ . . . کیچڑ، دلدل . . . دلدل
کیچڑ . . . . ڈلیں، تھوکیں، پسلیاں، پیپ، خون
دق . . . . پنجر گاڑے ہوتے . . . . انہیں ہر روز
کون گاڑ جاتا تھا . . . بسے ہوئے گوشت کی بدبو
مردار . . . میں تو ڈر جایا کرتی۔ تم نے اپنا وعدہ
پورا نہ کیا . . . تم مجبور رہتے . . . .

مرد ۔ بیمار، بیمار . . . چیچک زدہ انسان کا چہرہ —
سوراخ ۔

عورت ۔ آج وہ پھر کراہ رہے ہیں — آؤ میرے
ساتھ چلو۔

مرد ۔ کہاں ۔

عورت ۔ پکڑو، میری انگلی پکڑو — وہ دیکھو بوڑھا
خدا کمبل اوڑھے بیٹھا اونگھ رہا ہے۔

مرد ۔ بھوکا . . .

عورت ۔ میں اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو
جاؤنگی۔ تم خاموش رہنا۔ میں گڑگڑاؤنگی۔ اس
کے قدموں میں اپنا سر رکھ دونگی اور کہونگی . . . .

مرد :۔ آہ، آہ، آہ . . .

عورت :۔ اور کہونگی۔ ان مقدس دل کی آنکھوں میں دھول
جھونک دو۔ چاند کو سیاہ نقاب اوڑھا دو۔ سورج
کے چہرے پہ کیچڑ کا لیپ کر دو۔

مرد آہ . . .

عورت :۔ انسان زندہ رہنے کے قابل نہیں ہے۔ مجھے
کل کسی نے کہا تھا۔ بہشت دوزخ کا غلط نام ہے
زندگی فانی ہو یا باقی، ایک مسلسل جہنم ہے . . . کیا
اس نے مجھے غلط کہا تھا۔

گدھا (آہستہ آہستہ) ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات
آٹھ، نو، دس، گیارہ . . . .

کتا :۔ میں تمہیں ان کے قریب نہ پھٹکنے دوں گا۔

گدھا ۔ بارہ، تیرہ، چودہ، پندرہ، سولہ، سترہ . . .

کتا :۔ میں تمہیں ان کے قریب . . . .

گدھا ۔ اٹھارہ، انیس، بیس، اکیس . . . .

کتا :۔ میں تمہیں . . . .

گدھا ۔ بائیس، تئیس، چوبیس، پچیس . . .

کتا :۔ میں . . . .

گدھا :۔ چھبیس، ستائیس . . . .

کتا :۔ . . . . . .

گدھا ۔ اٹھائیس . . . . چلو

(منظر پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ پس منظر سے لگ کر کراہنے کی
آوازیں لگاتار آتی ہیں۔ ایک چیخ گونجتی ہے جیسے کوئی کسی کا گلا گھونٹ
رہا ہو۔ بلی بلی خراٹے کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ ماند روشنی کی
شعاع لمحہ بھر کیلئے آخری بار فرش پر پڑتی ہے۔ کتا مرد کی نعش پر بیٹھا
[illegible] زمین پر رکھ دی ہے۔ گدھا
[illegible] نعش کے بہت قریب آ پہنچے ہیں۔ منظر ایک بار پھر کل

اختر حسین رائے پوری

پتھر کی مورت

تالاب کے کنارے اونچے سے ٹیلے پر شراب خانہ تھا۔ گھاس پھوس کی جھونپڑی جس کے اندر لکڑی کے بیڈول بڑے ٹوٹی پھوٹی ٹانگوں پر کھڑے ہوئے شرابیوں کا بوجھ اُٹھاتے تھے۔ اور اوندھی سیدھی میزیں جو چیڑ کے صندوقوں کو کاٹ چھانٹ کر بنائی گئی تھیں۔ دھوئیں سے لپٹی ہوئی دیواروں پر دیوٹ جس میں شام ہوتے ہی دھندلے چراغ ٹمٹمانے لگتے تھے۔ اور ایک کونے میں کلوار کی چوکی جو تاڑی کے مٹکوں اور ٹھرے کی بوتلوں کے انبار میں اپنے سیاہ فام جسم کے ساتھ یوں روپوش ہو جاتا تھا گویا خود سرکے کا بہت بڑا پیپا ہو۔ شراب خانہ کے دروازہ پر ایک جواں عورت سرِشام سے بیٹھی انگاروں پر کباب بھونا کرتی تھی۔ اور آگ کی آنچ میں دُور سے اس کا تمتمایا ہوا چہرہ بڑا بھلا لگتا تھا۔

دن بھر شراب خانہ میں سناٹا رہتا۔ لیکن شام ہوتے ہی اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے تھے۔ مستری، قصاب، بڑھئی اور اسی قماش کے لوگ ایک ایک کر کے آنے لگتے۔ پہلے وہ تالاب میں ہاتھ منہ دھوتے اور کئی تو اس کے پانی میں ننگ دھڑنگ نہانے بھی لگتے تھے۔ جیسے ہی دیوٹ پر دیئے روشن ہوتے اور کباب والی ہوا میں اپنی خوشبو پھیلاتی شراب خانہ میں جھاگ سی پڑ جاتی تھی۔ بوتل کے کاگ اچھلتے مٹکے گردش کرنے لگتے۔ کباب کی سیخیں تلملا اٹھتیں۔ پیچھے کی کوٹھڑی میں کوڑیاں کھڑکتیں۔ دن بھر کی تھکن کافور ہو جاتی اور دنوں کے دُکھ ٹھرے کی جگہ بوندوں سے دم بھرنے کیلئے ڈھل جاتے تھے۔

اس رات شراب خانے میں غیر معمولی بھیڑ تھی۔ مویشیوں کا بازار ابھی پوری طرح بھرنے بھی نہ پایا تھا کہ ہیضہ کے ڈر سے میونسپل کمیٹی نے اسے منتشر کر دیا۔ دیہاتی سوداگر ہیضہ سے زیادہ کمیٹی کو کوستے ہوئے اونے پونے سودا چکا کر واپس چلے گئے۔ لیکن شہر کے قصاب اور گڈریے کوڑیوں کے مول بھیڑ بکری خرید کر جشن منانے شراب خانہ میں آ

گنڈیریوں کے چودھری نامی نے ہر شخص کو ٹھرّے کے ایک ایک ادھے کی پیشکش کی - اور کباب والی کو گود میں کھینچ کر کہا: " اری آج تو میں تجھے بھون کر کھا جاؤں گا!"

چمپا نے للچائی ہوئی چیتونوں سے نامی کے شلوکے کی جیب کو تاکا - جس کا بخیہ روپیوں کے بار سے ادھڑ گیا تھا - لیکن کلوار کے ڈر سے اس کی آنکھیں جھک گئیں -

راجو دھوبی خدا جانے کب سے دروازہ کی اوٹ میں کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا - عرصہ طول سے اس کی یہی کیفیت تھی - کلوار کا قرض لوٹانے کی اس میں سکت نہ تھی اور کلوار نے اس کا آنا جانا بند کر دیا تھا - بیچارہ راجو رات کے اندھیرے میں آتا - باہر کھڑا کھڑا کباب اور شراب کی مہک سونگھتا اور نامراد اُلٹے پاؤں گھر لوٹ جاتا - لیکن آج نامی کی دریا دلی نے اسے سہارا دیا اور عین اس وقت جب نامی کے حکم سے حاضرین محفل کے خالی کلھڑ دوبارہ بھرے جا رہے تھے - راجو اندر گھس آیا - وہ تیر کی طرح نامی چودھری کے سامنے آیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا: "چودھری، آج تو مجھ دکھیا پر بھی دیا ہو جائے!"

نامی کا دل اس وقت دوست داری کے جذبہ سے بھرپور تھا - مویشیوں کے بازار میں اس نے اتنا سستا سودا کیا تھا کہ ہزار روپیہ سے کم منافع کی امید نہ تھی - اور پھر یہ راجو لاکھ گیا گزرا سہی لیکن اس میں ایک بڑا وصف تھا - کہ اس کے گلے میں بلا کا رس تھا - اور جب وہ گاتا تو اس کی تان بادلوں کی خبر لاتی تھی - سننے والوں کا بیان تھا کہ کئی بار سانپ اس کے گانے پر سر دھنتے پائے گئے - اور یہ تو سب جانتے تھے کہ راجو کے گلے سے آواز نکلتے ہی تالاب کے مینڈکوں کا لامتناہی کورس بالکل ساکن ہو جاتا تھا -

لہٰذا کلوار کے احتجاج کی پروا نہ کر کے نامی نے آج کی رات راجو کی سرپرستی کا تہیہ کر لیا اور اپنی گری ہوئی مونچھوں کو تاؤ دینے کی بیہودہ کوشش کرتے ہوئے رئیسانہ تپاک سے کہا: "راجو آؤ بھلے پراجو - بولو، کیا پیوگے، تاڑی یا ٹھرّا؟"

راجو نے ایک سانس میں تاڑی کی لبنی ختم کر دی - اور دیر تک بیٹھا ہونٹ چاٹتا رہا - کلوار جو اس کی حرکتوں پر جلا جا رہا تھا - اپنی جگہ بے پناہ سے پکار اُٹھا: "بہت بڑا چار سو بیس ہے یہ راجو - کام نہ دھام، نہ گانٹھ میں دام - دن بھر مدک خانوں میں پڑا مکیوں کو کہانیاں سناتا اور مفت مدک وصول کرتا ہے - رات کو یہاں ادھار یا مفت کی ٹوہ میں آتا ہے - میں نے تو اس کا آنا جانا بند کر دیا ہے"-

راجو کے بجھے دیئے پر ستم قصاب نے اس الزام کی تائید کی: " ٹھیک بڑا پاجی ہے یہ راجو ایسا نکھٹو تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا - اس کی بڑھیا ماں سویرے سے شام تک گھر گھر پانی

ڈھوتی ہے۔ چکی پیستی ہے اور اسے روٹی کھلاتی ہے۔ اور یہ سالا سانڈ بنا یہاں وہاں آوارہ گردی کیا کرتا ہے۔"

سب نے حتیٰ کہ نامی نے بھی راجو کی طرف حقارت سے دیکھا۔ لیکن اس کے ماتھے پر بل تک نہ آیا۔ اپنی بھیگی ہوئی مونچھوں کو زبان کی نوک سے چاٹتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا۔ "بھائیو، رام جی کی مرضی یہی ہے کہ کچھ کام کریں اور کچھ بیٹھے کھائیں۔ یہ سادھو مہنت اور لالہ بنئے کون سا پہاڑ توڑ دیتے ہیں۔ پھر بھی حلوہ پوری کے سوا اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ تو پھر میں نے بھی کون سا پاپ کیا ہے۔"

ممکن ہے کہ یہ بحث طول کھینچتی لیکن اسی وقت دروازہ چرچرایا اور پنچم مستری کی شکل نمودار ہوئی۔ اب تو شراب خانے میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ گو پنچم بوڑھا تھا لیکن گانے میں راجو کا مقابل اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ ان دونوں کا ساتھ مل بیٹھنا بڑی بات تھی۔ اور لوگ ایسی سنگت کے آرزومند رہتے تھے۔

پنچم کی آؤ بھگت بھی ہر طرف سے صدا بلند ہوئی۔ بلکہ راجو بھی اپنے ٹوٹے ہوئے اسٹول پر اچھل کر پکارا "استاد، بہت دنوں بعد پکڑے میں آئے۔"

پنچم نے اپنی کم بیں آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے اسے دیکھا اور پہچان کر مسرت سے مسکرایا۔ "ٹھہر جا بے بدمعاش! آج میں تیرا پول کھول کر رہوں گا۔ ارے تو نہ تال کا نہ سُر کا۔ چلا ہے مجھ سے باتیں بنانے۔"

کسی نے ٹوک کر کہا: "مستری یہ نہ کہو۔ یہ جو کچھ بھی ہے۔ مگر ہے بھدّے خاں استاد کا سکھایا ہوا۔"

پنچم کے گلے کا گھونٹ وہیں اٹک گیا۔ "ایں! تم جیسے نہ سیکھے بھی میرے منہ آنے لگے۔ آج اس بھدّے خاں کو ہی کیا آتا تھا۔ ٹھمری کے سوا وہ گا ہی کیا سکتا تھا۔ اور اس کی آواز ——" پنچم نے فاتحانہ انداز سے سب کو دیکھا۔ "اس کی آواز کومل سے اوپر چڑھتی چڑھتی بانس کی طرح پھٹ جاتی تھی۔ پنچم سُر پر تو ایک پنچم مستری ہی گا سکتا ہے۔"

تلسی پنواڑی نے لقمہ دیا: "کیوں نہ ہو، پاربتی دیوی کی دین ہے مستری کو۔" مگر راجو کے ایک حامی نے بات چلنے نہ دی۔ "ابھی اس دیوی میں بھی کوئی جان ہے۔ پتھر کی مورت ہے۔ نہ مستری کے کام کی نہ اور کسی کے کام کی۔"

پنچم اس ڈھیٹ کو مار ہی بیٹھتا لیکن نامی چودھری نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ اس نے راجو کو ڈانٹا "کیا میں نے تجھے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لئے بلایا ہے۔"

راجو کو بھی طیش آگیا ” چمپا نکالنا تو طبلے کی جوڑی ۔“
نامی نے حکم دیا : ” پلا دو سب کو ایک ایک ادھا ۔“
کسی نے طبلے پر تھاپ دی ، راجو نے ملہار کا الاپ کھینچا ۔ اور کلوار اپنی شکایت کو بھول کر چلایا : ” ارے دیکھتی کیا ہے ۔ باندھ لے گھنگھرو ۔“
بادل برس کر کھل چکے تھے اور ہوا میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بسی ہوئی تھی ۔ ایک عجب والہانہ شان سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ۔ اور آسمان اتنا صاف ہو گیا تھا ۔ کہ زمین سے تاروں کی آنکھوں کا اشارہ نظر آتا تھا ۔ راجو کے گلے سے راگ کے بول نکلے ۔ سُر گویا ہوائی سیڑھیوں پر چڑھتے گئے چڑھتے گئے ۔۔۔ اور رفتہ رفتہ بادلوں کی طرف جاکر غائب ہو گئے ۔ یک بارگی بجلی کی طرح وہ نیچے جھپٹے اور قریب آکر ہر طرف بکھر گئے ۔ ملہار کا سرگم کبھی بادلوں کی طرح امنڈ امنڈ کر آتا کبھی گرجتا اور کبھی ہلکے ہلکے برس کر پھر کھل جاتا تھا ۔ اور چمپا اپنے میلے لہنگے کے سرے کو کمال نزاکت سے ایک ہاتھ میں تھامے اور دوسرے سے اوڑھنی کا پھوندنہ پکڑے زمین پر ٹھوکر لگاتی شرابی ملوں کو گھنگھرو کی چھاچھم پر نچاتی اِدھر اُدھر گردش کر رہی تھی ۔
اور جب راجو چپ ہوا تو دم بھر ویسا ہی سناٹا رہا جیسا تیز بارش کے یک بیک تھمنے کے بعد ہوتا ہے ۔ پھر وہ جادو ٹوٹا اور جوش کے عالم میں ہر سمجھدار اور ناسمجھ واہ واہ کرنے لگا ۔ کلوار اپنے جسمانی ہیولے کو اٹھائے ہوئے قریب آیا اور ایک پوری بوتل راجو کے منہ سے لگا کر کہا : ” جیتے رہو راجو ۔ کما کھاؤ گے ۔“
اب پنچم مستری کی باری تھی ۔ اس نے بہاگ کا نقشہ کھینچا اور سب سانس روک کر بیٹھ گئے ۔ گویا اُس دیس کی تھکی ہاری انسانیت کا قدیمی غم کراہنے لگا ۔ اور وہ لوگ جن کے شب و روز غلاظت اور کثافت میں رنگے ہوئے تھے ۔ آپ ہی آپ کسی نامعلوم درد کے احساس سے رو پڑے ۔ نغمہ مرغِ بسمل کی طرح کراہا ، تڑپا اور مجروح پرندے کی طرح کبھی اوپر اٹھا اور کبھی نیچے گرا ۔ بوڑھے گویّے کی ہر تان ایک ہوک تھی جو پھانس بن کر ہر سننے والے کے دل میں کھٹک اٹھی ۔
اسی طرح وہ دیر تک گاتے رہے ۔ اور سنگیت کی موج نے ان کے دلوں کی کدورت کو دھو دیا ۔ جب بہت رات بیت گئی تو وہ سب لڑکھڑاتے ڈگمگاتے اُٹھے اور چودھری نامی نے چمپا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گانا شروع کیا :۔
ندیا نارے ہیا آئی کنگنا ۔

سب نے آواز ملائی اور چمپا نے گھنگھرو کی ٹھوکر لگا کر اس تاؤ بھاؤ سے سانس بھر کے روایتی جھگڑے کا خاکہ اڑایا کہ سب عش عش کر اُٹھے ـــــــ اور نامی چودھری کو چمپا کباب سے زیادہ لذیذ معلوم ہوئی۔

پنچم کو قدرت نے گویا بنایا تھا۔ اس شوق میں وہ دُر دُر مارا پھرا۔ برسوں کسی اُستاد کا حقہ بھرا، کسی گنی کے پاؤں دبائے کسی کے لیے بھنگ گھونٹی۔ جوانی میں اس کے گانے کا ایسا شہرہ ہوا کہ پاربتی کے مندر میں وہ نوکر رکھ لیا گیا۔ اس علاقہ کا یہ سب سے بڑا مندر تھا۔ اور راج رجواڑوں نے اس کی رکھوالی کے لیے اچھی خاصی جاگیر دے رکھی تھی۔ پنچم صبح شام مندر میں حاضری بھرتا اور بھجن کیرتن گاتا ہوا کبھی اس حسینہ کو گھورتا کبھی اس مہ پارہ سے آنکھیں لڑاتا۔ آخر اس کی رنگ رلیوں نے گل کھلایا۔ پجاری نے اسے نکال باہر کیا۔ یوں تو یہ پجاری بذاتِ خود اخلاق کا چوکیدار نہ تھا۔ بنجر عورتوں کو زرخیز بنانے کے منتر اسے خوب یاد تھے۔ مگر ایک تو وہ ٹھہرا برہمن اور دوسرے پجاری ابن پجاری۔ البتہ چیلے چانٹوں کو وہ تاک جھانک کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اور مندر کے سیوکوں کو لنگوٹ کے سچے بن کی تلقین کیا کرتا تھا۔

پنچم کو بھی اپنے فن پر بڑا گھمنڈ تھا۔ مندر سے برخاست ہونے کے بعد اس نے اپنے گھر پاربتی کی مورت بٹھالی۔ ایک اندھیری سی کوٹھڑی میں اس نے طاق پر یہ دیوی بٹھلائی اسے سیندور سے لال گلال کیا۔ اسے چاندی کی آنکھیں عطا کیں۔ ہر روز اس پر پھول نچھاور کیے اور گھی کے چراغ لیکے حضور میں روشن کیے۔ ہر روز صبح اُٹھ کر وہ مورت کو نہلاتا اور شام کو اس کے سامنے دو زانو بیٹھ کر سنگیت کی مشق کرتا تھا۔ لیکن نہ تو شہر والے اس دیوی پر مہربان ہوئے اور نہ دیوی نے ان پر کرم کیا۔ اس دوران میں کئی مرتبہ چیچک ہیضہ اور پلیگ کی یلغار ہوئی۔ لیکن پنچم کی دیوی اپنے طاق پر بے حس بیٹھی رہی۔ کسی کی بنتی پر اُس نے دھیان نہ دیا اور نہ پنچم کی خستہ حالی پر اسے رحم آیا۔ آخر کار لوگوں نے اس دیوی کے درشن بند کر دیے اور پنچم فاقوں سے تنگ آکر موٹر کے کارخانہ میں مستری بن گیا۔

اس کے باوجود عمر کے ساتھ ساتھ دیوی پر پنچم کا اعتقاد بڑھتا گیا۔ دیوی کی کوٹھڑی بوسیدہ ہو گئی۔ دیواروں کی سفیدی جھڑ گئی۔ چھت کی کھپچیوں کو گھن کھانے لگی، چاندی کی آنکھوں کی جوت ماند پڑ گئی۔ یہاں تک کہ پنچم کے بیوی بچوں نے بھی دیوی کے درشن ترک کر دیے۔ لیکن پنچم کی عقیدت میں فرق نہ آیا۔ ہر روز صبح وہ کنوئیں سے پانی لاتا اور

اسے نہلاتا۔ ہر شام کو وہ ٹوٹا ہوا ستار لاتا اور ایک دو گت اسے سناتا۔ اور جب اس کے پاس پھول یا کلی کے لئے پیسے نہ ہوتے تو وہ دیوی کے آگے پھوٹ پھوٹ کر روتا "دیوی! سب نے تجھے بھلا دیا اور تو نے مجھے بھی بھلا دیا۔ پر میں تو تیرا پجاری ہوں۔ تو سنسار کی ماتا ہے۔ ایک بار جاگ ماں اور ان پاپیوں کو دکھلا دے کہ اصل پاربتی تو ہے وہ نہیں جو چھیل چھبیلی بنی ہوئی مندر میں بیٹھی پاپوں کا تماشہ دیکھا کرتی ہے۔ اور پنچم کو محسوس ہوتا کہ پاربتی کی آنکھیں اندھیرے میں مسکرا رہی ہیں۔

لوگوں کی یاد میں ایسا ہیضہ ملک میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ ہر طرف کہرام برپا تھا۔ اسپتال بیماروں سے مرگھٹ اور قبرستان مردوں سے اٹے ہوئے تھے۔ کفن چوروں اور گدھوں کی بن آئی تھی۔ کپڑے اور لکڑی کے دام چوگنے ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر ملک الموت کے ساتھ ساتھ پھرکی کی طرح چکر لگا رہے تھے۔ اور بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ اپنے کاغذات لے کر فرار ہو گئے تھے۔ میونسپل کمیٹی کے داروغے بازار میں سڑی گلی ترکاریوں اور پھلوں کو پھنکوا رہے تھے۔ تاہم گھروں میں اور گھروں کے باہر اچھے خاصے تندرست جانے کیسے بیمار ہو ہو کر چشم زدن میں مر جاتے تھے اور ان کی لاشوں کو اٹھانے والے بھی نہ ملتے تھے۔

ڈاکٹروں اور حکیموں سے منہ موڑ کر لوگوں نے مندروں اور درگاہوں کا رخ کیا خصوصاً پاربتی کے مندر میں دن رات انسانوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ وہ سب پرشاد کی مٹھائی کھا کر اور باؤلی کا پانی پی کر سمجھتے تھے کہ ہیضہ سے نجات مل گئی۔ لیکن ایک دن سب کے دیکھتے دیکھتے پجاری خود ہیضے کا شکار ہو گیا۔ اور اس کے بعد اس کے چیلوں میں یہ وبا اس تیزی سے پھیلی کہ بھگتوں نے یہ راستہ چلنا چھوڑ دیا۔ مندر کے کلس پر چند ایسی فدائی آواز میں موت کا راگ گانے لگا اور اس کی محرابوں میں چمگادڑیں پر پھڑ پھڑانے لگیں۔ ڈاکٹروں، پیروں اور پجاریوں سے ناامید ہو کر لوگ حیوانوں کی طرح اپنے گھروں میں پڑے موت کا انتظار کرنے لگے۔

اتنے میں افواہ مشتہر ہوئی کہ پنچم مستری کی دیوی جاگ گئی ہے۔ ہیضہ کے کئی بیمار اس کے درشن سے اچھے ہو گئے ہیں۔ پہلے تو بہت کم لوگوں کو اس کرشمہ پر یقین آیا۔ جب اتنے بڑے مندر کی دیوی اس آسمانی مصیبت کا مقابلہ نہ کر سکی تو بوڑھے مستری کے گھر میں پڑی ہوئی پتھر کی مورت میں کیا سکت تھی۔

لیکن اسے اتفاق کہیئے یا اور کچھ —، افواہ بے بنیاد نہ تھی۔ پنچم کا محلہ اب تک

ہیضہ سے محفوظ تھا۔ دور دور کے لوگ مکھیوں کی طرح مرے جا رہے تھے۔ لیکن اس محلہ کے لوگوں کو وبا چھو کر بھی نہ گئی تھی۔ اور کسی کو ہیضہ کا خدشہ ہوا تو پنچم نے دیوی کے درشن کرا دیئے اور چلو بھر پیاز کا پانی پلا کر اسے اچھا کر دیا۔

اچانک پنچم کی مراد بر آئی اور بڑے مندر پر اس کی دیوی کو فتح حاصل ہونے لگی۔ عقیدت مندوں نے چند روز میں اُس کی کوٹھڑی کو درست کر دیا۔ چھت پر نئی کڑیاں پڑ گئیں، دیوار پر سفیدی ہونے لگی۔ دیوی کے دیدوں میں سونا بھر دیا گیا۔ سیندور کی بجائے اس پر صندل کی مالش ہونے لگی۔ اس کی ڈیوڑھی پر رنگ برنگی جھنڈیاں اڑنے لگیں اور رات کو اس کے در پر چراغاں ہونے لگا۔ صبح اس کے دروازہ پر پھول پتیوں کے انبار لگ جاتے تھے۔

رات کو بے شمار بھگت اس کے گھر کے سامنے جمع ہوتے اور پنچم کی سرکردگی میں جھوم جھوم کر بھجن گایا کرتے تھے۔ بکرے کے خون سے دیوی روز نہلائی جاتی اور حال قال کی حالت میں کوئی بھگت تلوار اپنی زبان کے آر پار کر لیتا تھا اور دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اسے ذرا بھی چوٹ نہ آتی تھی۔ وحشت و جنون کی عجب کیفیت ہوتی اور فرطِ مسرت سے دیوی کے قدم چوم کر پنچم چلا پڑتا کہ "سنسار کی ماں! تو نے مجھ پاپی کی پکار سُن لی۔ جنہیں تجھ پر بھروسہ نہ ہو انہیں موت کے منہ میں دے کر جو تیری ڈیوڑھی پر آئے ہیں انہیں بچالے۔"

دیکھتے دیکھتے پنچم سارے شہر کا پجاری بن گیا اور اس کے گھر کے آگے ایسی بھیڑ لگی کہ اس نے مورت کو تاریک حجرے سے نکال کر برآمدہ میں چوکی پر بٹھلا دیا۔ اجالے میں آ کر دیوی کے مکھڑے پر تجلی سی دوڑ گئی۔ اور شہر کے برہمن چوروں کی طرح دور سے اسے نمسکار کر کے دل ہی دل میں پنچم کی مقبولیت پر رشک کرنے لگے۔

اب پنچم کو اپنی زندگی کے سب سے محبوب خواب کی تعبیر نظر آئی۔ بچپن سے وہ دیکھتا آیا تھا کہ ساون کی چودھویں کو بڑے مندر کی دیوی کی سواری نکلتی ہے۔ بہت بڑے رتھ پر وہ سجا بنا کر رکھی جاتی ہے اور سینکڑوں آدمی اس رتھ کو کاندھوں پر اٹھائے گلی کوچوں میں پھرتے ہیں۔ ڈھول منجیروں اور شہنائیوں کے پرے کے پرے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور شہر بھر کی رنڈیاں رتھ کے آگے ناچتی چلتی ہیں۔ ناقوسوں اور گھنٹوں کے شور سے ہوا کانپ جاتی ہے۔ سارا شہر درشن کو آتا ہے اور ایسا جلوس سال بھر میں کبھی نہیں نکلتا۔

اس جلوس کو دیکھنے کے بعد پنچم اپنی دیوی کے پاس آتا اور آب دیدہ ہو کر گڑگڑاتا :۔ "ماں! میرا ایک ارمان پورا کر دے۔ تجھے میں ایسے ہی رتھ پر بٹھلاؤں اور تیرا جلوس ایسا ہو کہ رہتی دنیا تک لوگ یاد رکھیں۔"

کتنی مدت بعد اس ارمان کی تکمیل ہوئی۔ شہر والوں نے پنچم کے ارشاد کو کان لگا کر سنا۔ اور جب ساون کی چودھویں آئی تو انہوں نے بڑے مندر کے توشہ خانے کو کھولا۔ اس میں سے رتھ، انباری اور روما مے نکالے۔ پنچم کی دیوی کے لئے بنیوں نے مخمل اور کمخواب کے لباس دیے ،۔ دھیرج سنگھ زمیندار نے اپنے دونوں ہاتھی جلوس کی زینت کے لئے بھیجے۔ ان پر بڑے بڑے نقارے رکھے گئے۔ پیچھے گھوڑ ول پر سیوا سمتی کے نوجوان ناقوس لئے نمودار ہوئے۔ بینڈ والوں نے اپنی خدمات مفت پیش کیں اور بھٹی پرانی وردیوں کو جھاڑ کر عجیب و غریب باجوں کے ساتھ جلوس میں شامل ہوئے۔ بالا خانوں پر عورتیں آرتی کی تھالیاں لے کر جمع ہوئیں اور سڑکوں کے دائیں بائیں ہزاروں بچے بوڑھے اکھٹے ہوئے۔ رتھ کے روپہلے کلس دھوپ میں جگمگانے لگے اور سینکڑوں ہانپتے کانپتے انسان جوش کے عالم میں اسے پیٹھ پر لاد کر لے جانے لگے۔ رتھ کے اندر ڈھول مجیروں نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور ان کی آواز کو دبا کر ذرا ذرا دیر میں پیتل کے وزنی گھنٹے بڑے وقار سے بجنے لگے تھے۔ رتھ کے اندر دیوی کے عین مقابل آسن جمائے پنچم مستی بیخود و مست حمد گا رہا تھا۔ پاربتی کی مورت پھولوں کی ڈھیری میں چھپی ہوئی تھی۔ فقط اس کی سنہری آنکھیں دھوپ میں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے آگے جو لال چادر بچھی ہوئی تھی وہ روپیوں اور چھوٹے موٹے گہنوں سے لد گئی تھی۔ قدم قدم پر بالا خانوں سے پھولوں کی بارش ہوتی اور جے جے کار کی صدا سے فضا گونج اٹھتی۔

یہ پنچم کی زندگی کا سب سے بڑا دن تھا۔ اس کا چہرہ خوشی کے مارے دمک رہا تھا۔ رقت کے مارے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کے گال محبت کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ اس کے پاس راجو دھوبی بیٹھا دونوں ہاتھوں سے مالِ غنیمت کو بٹور رہا تھا۔ کبھی وہ چاندی کی چھاگلوں کو ہاتھوں میں تولتا۔ کبھی سونے کے چھلوں کے دام آنکتا۔ اور بیچ بیچ میں دیوی کے آگے سجدہ کر کے کوئی نیا راگ چھیڑ دیتا تھا۔

رتھ چیونٹیوں کی چال چلتا ہوا بڑے مندر کے سامنے پہنچا اور یک بارگی پاربتی کی جے کے نعروں سے اس کے سنسان در و دالان گونج اٹھے۔ ڈھول مجیروں اور گھنٹوں کا شور اتنا بڑھ گیا کہ کان کے پردے پھٹنے لگے۔ راجو دھوبی کے اشارے پر ہر طرف مشعلیں

سنگ اٹھیں، گیس کے لیمپ روشن ہو گئے۔

بڑے مندر کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے چوروں نے دیوی کے گہنے چرا کر مورت کو باؤلی میں پھینک دیا ہے۔ کسی نے ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بلکہ ایک مگڑے دل نے سب کو سنا کر کہا کہ پنچم کی پاربتی کو بڑے مندر میں جگہ ملنی چاہیئے۔

یہ پنچم کی فتح و شادمانی کی معراج تھی۔ وہ تن من کی سدھ بھول کر اپنی دیوی کو رجھانے کیلئے گوری راگ گانے لگا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ دیوی اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔

یک بیک وہ تیورا کر آسن سے گرا اور منجیرے اس کے ہاتھ سے نیچے ڈھلک پڑے۔ اور دفعتاً چہار سُو سناٹا چھا گیا۔ باجے بند ہو گئے۔ ہاتھی گھوڑے کھڑے ہو گئے۔ سب سکتے میں آ گئے۔

پنچم کا جسم لرزا۔ اس میں اینٹھن ہوئی اور وہ برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ قے اس کے مُنہ سے نکل کر کلوں اور گردن پر بہنے لگی۔

ہیبت کے مارے سب لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ کئیوں کے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ رتھ بانوں نے اپنے کاندھے الگ کر لیئے۔

پنچم کے سر کو ذرا سی جنبش ہوئی اور اس نے دھیمی آواز میں کہا: "چپ کیوں ہو گئے راجو! گوری راگ گاؤ بھیا! دیوی کو یہ راگ بہت پسند ہے۔"

اور گوری کا سرگم ایک فریاد کی طرح آسمان کی طرف اڑا۔ کبھی وہ سہمے ہوئے عبادت گزار کی طرح گڑگڑا کر رویا اور کبھی بہرے دیوتاؤں کے کان میں چلایا کہ پجاریوں کے اخلاص کو نہ ٹھکراؤ۔ راگ کے بول میلے میں بھٹکے ہوئے بچوں کی طرح مچل مچل کر رہ گئے اور کسی طرح انہیں تسلی نہ ملی ——

مرد کی زندگی میں کمزور ترین لمحہ اس وقت آتا ہے، جب کہ عورت اسے کہے
"توبہ! تمہارے آگے کون دم مار سکتا ہے۔"

. . . .

عورت کو اس وقت تک مستقبل کی فکر رہتی ہے۔ جب تک وہ بیاہی نہیں جاتی۔ اور مرد کو مستقبل کا فکر اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب وہ بیاہا جاتا ہے ٭

شفیق الرحمٰن

پچھتاوے

تمہارے متعلق پہلی مرتبہ میں نے کلب میں باتیں سُنیں، تم پر نکتہ چینی ہو رہی تھی کہ تم انتہا درجے کی خود سر اور خود پسند ہو۔ تمہیں اپنے حسین ہونے پر بیحد ناز ہے، تمہیں اپنے ابا کے عہدے پر اس قدر غرور ہے کہ تم کسی سے اچھی طرح بات نہیں کرتیں۔ تمہارے چہرے پر ہر وقت کی مسکراہٹ زہر دکھائی دیتی ہے۔ تمہاری گفتگو طنز آمیز ہوتی ہے۔ تمہارے لباس اس قدر شوخ اور بھڑکیلے ہوتے ہیں کہ ایک لڑکی کو زیب نہیں دیتے۔ اسی طرح کی بہت سی باتیں۔

نہ جانے میں نے اس ذکر میں کیوں اتنی دلچسپی لی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں اور لڑکیاں نہیں تھیں اور میں نسوانی رفاقت چاہتا تھا۔ سنگلاخ چٹانوں اور سیاہ پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس مقام میں زندگی کی رفتار کافی تیز تھی۔ رقص تھے، پارٹیاں تھیں، مسکراتے ہوئے حسین چہرے تھے، موسیقی تھی، آزادی تھی، سب کچھ تھا۔ میں وہاں نیا نیا گیا تھا۔ میں تمہیں بالکل نہیں جانتا تھا۔ نہ میں نے تمہیں دیکھا تھا، اور تمہارے خلاف باتیں سُننے کے باوجود نہ جانے مجھے تم سے دلچسپی کیوں ہو گئی۔ اس کے بعد اکثر میں اسی قسم کی باتیں سُنا کرتا، تمہارے رویے کے متعلق، تمہارے لباس کے سلیقے کے متعلق، تمہارے نظریوں کے متعلق۔ ہر مرتبہ سخت قسم کی تنقید سننے میں آتی۔ اور ہر مرتبہ مجھے یہی محسوس ہوتا کہ یہ سب کچھ غلط ہے، تم کچھ اور ہو۔ تم بالکل مختلف ہو۔ تمہیں کسی نے سمجھا نہیں۔ لڑکیاں تمہیں بُرا اس لئے کہتی ہیں کہ وہ تم پر رشک کرتی ہیں، اور لڑکے اس لئے کہ تم ان کی پہنچ سے باہر ہو۔

لیکن بعد میں مجھے اس خیال نے کیا کیا ستایا کہ کیوں نہ میں بھی اُسی ہجوم میں شامل ہو گیا۔ کیوں نہ میں بھی ان کی باتوں میں شریک ہو گیا، کیوں نہ میں نے تمہارے خلاف باتیں کر کر کے تمہیں دیکھنے سے پہلے ہی تم سے نفرت پیدا کر لی۔

اور پھر میں نے تمہیں دیکھا۔ میں پکنک پر مدعو تھا۔ کچھ دُور پہاڑوں کے ایک خوشنما

کنج میں۔ مجھے بتایا گیا کہ تم بھی آؤ گی۔ اور تم آئیں بھی تو کس طرح، ساری نگاہیں تم پر جم کر رہ گئیں۔ جب تمہارے ابا نے مجھ سے تمہارا تعارف کرایا تو میں نے تمہاری ایک جھلک سی دیکھی، جہاں تک مجھے یاد ہے تم نے مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی تھی۔ بعد میں تم نے بتایا کہ تم نے اس ایک نگاہ میں مجھے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ میں بیحد افسردہ تھا۔ میری آنکھوں میں اُداسی جھلک رہی تھی، میرے بال پریشان تھے، میرے کوٹ کے کالر میں ایک مرجھایا ہوا پھول لگا ہوا تھا۔ حالانکہ اس روز مجھے اُداس نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اس روز فضا نہایت خوشگوار تھی، اونچی چوٹیوں سے خنک ہوائیں آ رہی تھیں، نہایت چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ لاتعداد ننھے ننھے پھول گھاس میں سے سر نکال نکال کر جھوم رہے تھے۔ پہاڑی چشمے گاتے ہوئے بہہ رہے تھے۔ دُنیا مسرور تھی، چہرے مسرور تھے۔ ایک سازندہ رباب بجا رہا تھا، نہایت دلکش گت بج رہی تھی۔ اس سے مجھے چند ماہ پہلے کی ایک یاد تازہ ہو گئی۔ جب میں رات گئے۔ ایران کے ایک کیفے میں تنہا بیٹھا تھا۔ رباب پر بالکل ایسی ہی گت بج رہی تھی۔ مدھم روشنیوں میں ہلکا ہلکا معطر دھوآں پھیلا ہوا تھا۔ سامنے رقص ہو رہا تھا۔ رقاصہ موسیقی میں جذب ہو کر رہ گئی تھی۔ یکایک اس نے مجھے دیکھا اور میرے سامنے آ گئی۔ جب تک رباب بجتا رہا وُہ مجھے دیکھتی رہی اور رقص کرتی رہی پھر وہ میرے ساتھ آ بیٹھی، اور باتیں کرنے لگی۔ وُہ اپنے محبوب کے لئے غمگین تھی۔ جس کی شکل مجھ سے بہت ملتی تھی۔ وُہ اُسی میز پر بیٹھا کرتا تھا، مجھے دیکھ کر اُسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے، وُہ بار بار مجھ سے یہی پوچھتی تھی کہ کہیں میں اپنا نام تو نہیں چھپا رہا ہوں، میں جھوٹ تو نہیں بول رہا ہوں۔ آخری رقص کے اختتام پر اس نے مجھ سے التجا کی کہ میں اسے گھر چھوڑ آؤں۔ اسی یاد نے مجھے اُداس بنا دیا تھا۔ تمہارے ابا نے کئی مرتبہ مجھے ٹوکا۔ میں نے کئی مرتبہ مسکرانے کی کوشش بھی کی۔—— نزدیک ہی کسی پُرانے قلعے کے کھنڈر تھے۔ اسے دیکھنے گئے۔ کئی مرتبہ سیڑھیوں پر اُترتے چڑھتے میرا تمہارا آمنا سامنا ہوا۔ لیکن میں تمہیں بالکل نہ دیکھ سکا۔ بس مجھے اتنا احساس ہوا کہ تم قریب سے گذر گئی ہو۔ جب تم ایک اونچے سے پتھر سے اُترنا چاہتی تھیں۔ اور میں نے تمہیں بازو سے سہارا دیا تو میں نے تمہاری ایک جھلک پھر دیکھی، اس مرتبہ تمہاری پیشانی پر دمکتی ہوئی بندی میری آنکھوں کے سامنے کوند کر رہ گئی۔ جب تم میرے قریب سے گذر رہی تھیں تو میں نے وہ پھول دیکھے جو تمہارے بالوں میں لگے ہوئے تھے، ہلکی سی خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور چلا گیا۔

کئی دن میں نے تمہارے قریب گزارا۔ پھر بھی میں تمہارا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ تم نے بعد میں مجھے بتایا کہ اس روز تمہیں میری افسردگی نے متوجہ کر لیا تھا۔ اور دن بھر تمہیں میرا خیال رہا تھا۔

اس کے بعد کسی نامعلوم کشش سے ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ ہر روز کوئی حادثہ یا کوئی اتفاق ہمیں ملا دیتا۔ میں نے دیکھا کہ تمہارے چہرے پر وقار ہے تمکنت ہے، بعض اوقات تم مغرور دکھائی دیتیں، تم سب سے الگ تھلگ رہتیں۔ خواہ اسے خود پسندی کہا جائے یا خودسری لیکن تم میں انفرادیت ضرور تھی، تم ان سب لڑکیوں سے مختلف تھیں، ان سب میں نمایاں تھیں، سب سے حسین تھیں اور حسین بھی ایسی کہ تمہارے حسن میں بھی انفرادیت تھی۔

تم جتنی حسین تھیں اتنا ہی حسین چیزوں سے تمہیں پیار تھا۔ تمہیں رنگوں کی تمیز تھی۔ تمہیں رنگوں سے کھیلنا آتا تھا۔ تم جو لباس پہنتی تھیں نگاہوں میں کھب کر رہ جاتا تھا یوں معلوم ہوتا کہ تمہارا لباس ہی ماحول کے مطابق نہیں ہے بلکہ ماحول تمہارے لباس کے مطابق دکھائی دینے لگتا۔ اور اسی سے رنگ لیتا۔

ایک روز گھٹائیں امڈ امڈ کر آ رہی تھیں، بادل جھوم رہے تھے، میں نے تمہیں دیکھا تم اودے لباس میں ملبوس تھیں، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تم فضا کا ایک حصہ ہو۔ میں نے ایک اداس شام کو تمہیں دیکھا، جھکڑ چل رہے تھے، سوکھے ہوئے پتے اڑ رہے تھے۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا۔ تم نے خزاں کے خشک پتوں کے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ پھر ایک اندھیری رات کو میں نے تمہیں دیکھا، آسمان پر چاند نہیں تھا تارے بھی مدھم سے تھے، تم نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا، اور کائنات کا سارا نور تمہارے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ —— ایک دفعہ چاروں طرف بہار آئی ہوئی تھی۔ نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، خشک پہاڑوں پر سبزہ اگ رہا تھا، دریچوں پر عشق پیچاں کی بیلیں بل کھاتی ہوئی چڑھ رہی تھیں، تم مجھے ملنے آئیں، جدھر نظر جاتی تھی سبز ہی سبز رنگ دکھائی دے رہے تھے، تم سبز لباس میں ملبوس تھیں۔ —— پھر ایک رات پارٹی میں آتش بازی تھی۔ رنگ برنگے قمقموں کی قطاریں تھیں۔ جھلملاتی ہوئی روشنیاں تھیں۔ تمہارے لباس میں اس رات کتنے رنگ تھے، تم دہکتا ہوا تڑپتا ہوا شعلہ معلوم ہو رہی تھیں جنہیں دیئے کے دل کے شعلے دکھائی دے رہے تھے تمہارا ہار چنگاریوں سے پرویا ہوا نظر رہا تھا۔

اور پھر وہ خوشبو کا جھونکا جو تمہارے ساتھ آیا کرتا۔ وہ خوشبو بھی وقت اور موقعے کے مطابق ہوتی۔ پارٹیوں اور تقریبوں میں کبھی تم نے یہ خوشبو نہیں لگائی، بس ایسی مدھم سی خوشبو جو ہوتی بھی اور نہیں بھی ہوتی۔ صبح کو تم ایسی ہلکی ہلکی خوشبو لگاتیں جیسے غنچے چٹک رہے ہوں، پھول جاگ رہے ہوں، شبنم کے قطرے سورج کی پہلی کرن سے جھلملا رہے ہوں۔ دوپہر کو نہایت شوخ خوشبو ہوتی جس میں تیز کرنوں کی تمازت، جاگی ہوئی کائنات کا ہنگامہ، چنچل پن، چھیڑ، قہقہے اور شوخیاں ہوتیں۔ شام کو ایسی خوشبو آتی جیسے تھکے ہوئے پھولوں سے آ رہی ہو۔ ایسے پھولوں سے جو سورج کو دیکھ دیکھ کر تھک گئے ہوں، جو تتلیوں کے بوسوں سے تھک گئے ہوں، جو ہوا کے جھونکوں سے جھوم جھوم کر تھک گئے ہوں۔ رات کو تم ملتیں تو ایسی نشہ آور اور مخمور کن خوشبو اپنے ساتھ لاتیں کہ آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہو جاتیں، چاندنی مدھم پڑ جاتی، ہوا کے جھونکے رک جاتے، فضا میں ہلکے ہلکے نغمے سما جاتے، پُر سحر اور رنگین خواب مچلنے لگتے۔

ہم دونوں کے درمیان اجنبیت حسن کی توں تھی۔ وہ کھنچاؤ بدستور تھا۔ تم مجھ سے اتنی ہی دور تھیں جتنی ملاقاتوں سے پہلے تھیں۔ پھر وہ شام آئی۔ کلب میں رقص تھا۔ جہاں سب نے بھڑکیلے اور رنگین لباس پہن رکھے تھے وہاں تمہارا ملبوس ملگجے رنگ کا تھا۔ اس رات چودھویں کا چاند طلوع ہونا تھا۔ شاید تم نے چاندنی رات کا لباس پہنا تھا۔ تمہارے آویزے سفید تھے، تمہاری چوڑیاں سفید تھیں، تمہارے گلے میں سفید ہار تھا۔ اس لباس نے تمہیں اس قدر نمایاں کر دیا کہ سب کن انکھیوں سے تمہیں بار بار دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک گوشے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میرا دل کسی آنے والے حادثے کے خیال سے بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں طلوع ماہتاب کا ذکر کر رہا تھا۔ کلب کے چاروں طرف ایک بہت بڑا باغ تھا۔ اس باغ میں حوض کے کنارے ایک لمبا سا درخت تھا جس میں نہ پتے تھے نہ پھول، بس پتلی پتلی سوکھی ہوئی ٹہنیاں تھیں۔ چودھویں کا چاند ہمیشہ اس درخت کے عقب سے طلوع ہوا کرتا۔ باہر نکلتے ہی ٹہنیوں میں اُلجھ کر رہ جاتا۔ درخت کی چوٹی تک پہنچنے اور آسمان میں تیرنے کے لئے اسے کافی دیر لگتی۔ حوض میں چاند اور درخت دونوں کا عکس پڑتا۔۔۔ میں تمہیں یہ نظارہ دکھانا چاہتا تھا۔ جب موسیقی شروع ہوئی اور لوگ رقص کرنے لگے تو میں نے چلنے کو کہا اور تم مان گئیں۔ ہم باہر نکل آئے، جب روشن سڑکوں کو چھوڑ کر تاریک گوشوں میں داخل ہونے لگے تو تم ٹھٹھک گئیں، تم چلتے چلتے رُک گئیں۔ تم نے کچھ دیر سوچا بھی۔ میں نے اصرار کیا اور تم

میرے بازو کا سہارا لیکر گھاس اور پودوں کے تختوں پر میرے ساتھ چلنے لگیں۔ چاند ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ اونچے اونچے درخت بالکل خاموش کھڑے تھے، ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک نہایت تاریک کنج آیا اور نہ جانے کیونکر تم میرے بازوؤں میں آ گئیں، تمہارے لب میرے لبوں سے آ ملے، تم میرے سینے سے لگی ہوئی تھیں اور میں سرگوشیوں میں نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ شاید میں نے بہت سی فالتو باتیں بھی کہہ دیں، ایسی باتیں جن کے متعلق میں نے پہلے کبھی نہ سوچا تھا، جو میں ویسے کبھی نہ کہتا۔ جن کی اہمیت کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ چاند طلوع ہوا اور کرنوں سے تمہارا چہرہ جگمگا اٹھا۔ تمہارا ململی لباس اور چاندنی گھل مل کر رہ گئے، یوں معلوم ہو رہا تھا، جیسے تم چاند کی پہلی کرن کے ساتھ زمین پر اتری ہو۔ کلب سے موسیقی کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی، بڑی پیاری دھن بج رہی تھی۔ جب تم میرے بازوؤں میں سمٹی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھیں تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ تم ہی ہو۔ تم جو کہ اتنی مغرور، شوخ اور خودسر تھیں، جس کے قرب کے لئے وہاں سب ترستے تھے۔ جو چند لمحے پیشتر مجھ سے اتنی دور تھیں۔ جتنے آسمان کے تارے۔ اور تم خود وہاں آ گئی تھیں۔ تمہیں دنیا کی کوئی طاقت، وہاں آنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ تم خود آنا چاہتی تھیں۔ وہ شام زندگی کی رنگین ترین شاموں میں سے تھی۔ لیکن بعد میں میں نے محسوس کیا کہ وہ شام بہت جلد آ گئی۔ میں نے بہت جلد وہ سب کچھ تم سے کہہ ڈالا۔ مجھے ابھی کچھ دیر انتظار کرنا چاہیے تھا۔ کاش کہ میں نے اتنی جلدی نہ کی ہوتی۔ جب تم میرے ساتھ چلتے چلتے اس تاریک گوشے میں ٹھٹھک کر رہ گئی تھیں۔ کاش کہ تم واپس لوٹ آتیں۔ کاش کہ میں نے اتنی جلدی وہ سب کچھ نہ کہا ہوتا

اس کے بعد تم میری دنیا پر چھا گئیں، میرے دل و دماغ میں بس گئیں۔ تمہیں پھول پسند تھے اور مجھے پھولوں کا خبط ہو گیا۔ ہر روز طرح طرح کے پھول چن کر تمہارے لئے لاتا۔ جب آس پاس کے پھول باسی ہو گئے تو میں کار لے کر نکل جاتا اور دور دور سے پھول لاتا۔ ویرانوں کے اداس پھول، ندیوں کے کناروں کے جھومتے ہوئے پھول، چٹانوں میں اگے ہوئے اکے دکے پھول۔ ننھے ننھے خودرو پھول۔ اونچے اونچے پودوں میں تھرتھراتے چھپے ہوئے پھول۔ کئی کئی سو میل تک جتنے باغ تھے میں نے اجاڑ دیئے۔ تمہیں پھولوں کی زبان آتی تھی۔ ایک دفعہ تم مجھ سے خفا تھیں تم نے مجھے زرد پھول بھیجے جن سے نفرت عیاں تھی۔ میں کچھ روز تمہارے ہاں نہیں گیا تم نے مجھے نرگس کے پھول بھیجے اور مجھے یقین ہو گیا، کہ تم میرا انتظار کر رہی ہو۔ ایک روز تم نے مجھے کلب میں روک کر کہا

جھرمٹ میں دیکھا جن سے میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا، تم نے مجھے ایک گلدستہ بھیجا جس کے وسط میں ایک شوخ پھول تھا اور چاروں طرف کلیاں تھیں، تم مجھے ہرجائی کہنا چاہتی تھیں۔ جب میں نے ایک روز چھیڑ کے طور پر ایک ایسا گلدستہ بھیجا جس میں ایک کلی شوخ پھولوں سے گھری ہوئی تھی تو تم نے مجھے سفید غنچے بھیجے، ان سفید غنچوں میں سادگی تھی۔ معصومیت اور عفت تھی۔ ایک مرتبہ میں تم سے روٹھ گیا۔ تمہارا پیغام آیا۔ اس کے ساتھ سُرخ پھول آئے، ان پھولوں کے پیغام کو بھی میں سمجھ گیا۔ جس میں محبت کی حدت تھی۔

مجھے چند مہینوں کے لئے باہر جانا پڑا۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ خط لکھو گی۔ لیکن تمہارا خط نہ آیا، جب میں واپس لوٹا تو مجھے تم میں کچھ تبدیلی سی محسوس ہوئی۔ شاید یہ واہمہ تھا لیکن تمہارے رویے میں کچھ روکھا پن سا تھا، کچھ بے توجہی سی تھی۔ ایک شام کو ہم اُسی کنج میں ملے۔ میں نے تم سے خط نہ لکھنے کی شکایت کی۔ تم بولیں۔ لکھنے کو جی تو چاہتا تھا بس یہی سوچتی رہی کہ القاب کیا لکھوں۔ لیکن میری اس سے تسلی نہ ہوئی۔ شاید یہ تھا ردِ عمل پھر تم نے کلب میں آنا کم کر دیا۔ تم وہاں جانے سے گریز کرنے لگیں۔ جہاں میرے آسکنے کا امکان ہوتا۔ لیکن ساتھ ساتھ چھیڑ بھی جاری تھی۔ ایک صبح میں لاری لے کر باہر جا رہا تھا، رات بھر بارش ہوتی رہی تھی اور پہاڑی سڑکیں پہلے سے خراب تھیں۔ تمہارا ملازم آیا۔ تمہارا پیغام لے کر کہ سنبھل سنبھل کر آہستہ آہستہ جانا۔ اس خیال نے مجھے دن بھر مگن رکھا کہ تم میرے متعلق سوچتی رہی ہو۔ ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ میرے تبادلے کے احکامات آئے تھے اور تم نے اپنے ابا سے کہہ کر منسوخ کرا دیئے۔ میں نے تم سے پوچھا — کیوں؟ تم بولیں۔ بس یونہی۔

پھر ایک روز تمہارے ہاں ایک لڑکا آگیا۔ مجھے اس سے ملایا گیا۔ وہ تمہارا منگیتر تھا۔ ایک سال پہلے تم نے خود اسے چُنا تھا۔ وہ نحیف سا ایک مخلص اور حساس لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ تم نے اس کی دی ہوئی انگوٹھی پہن رکھی تھی، میں تم دونوں کو اکٹھے دیکھا کرتا۔ مجھ سے تمہاری بے رُخی بڑھتی گئی۔ تمہارے ہاں میرا آنا جانا کم ہو گیا۔ تم نے بھی مجھے بُلانا چھوڑ دیا۔ ایک سہ پہر کو تم مجھے تنہا مل گئیں، تم بیحد مسرور تھیں۔ تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں شوخیاں۔ میرا خیال تھا کہ تم میرے نہ آنے کی وجہ پوچھو گی۔ شاید تمہیں کچھ افسوس ہو گا۔ شاید تم شکایت کرو گی۔ لیکن تم نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ میں نے تمہیں شام کو باغ میں تنہا بُلایا۔ تم ٹال گئیں۔ میں نے تمہاری بے رُخی کا شکوہ کیا تو تم نے بڑی سرد مہری سے کہا کہ تمہاری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے۔ تم نے کلب کی دلچسپیوں کے

نام لے لے کر مجھے چھیڑنا شروع کر دیا۔ میں تم سے کسی اور قسم کی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تم دانستہ طور پر ایسی باتیں کر رہی تھیں۔ تم ہنستی رہیں، قہقہے لگاتی رہیں۔ اس کے بعد میں تمہارے ہاں مدتوں نہیں گیا۔ میں سُنا کرتا کہ آج تم اپنے منگیتر کے ساتھ کلب میں آئی تھیں، آج تم پارٹی میں مدعو تھیں، آج تم پک نک پہ آئی ہوئی تھیں۔ آج تم اتنی خوش تھیں۔ یہ سُن سُن کر میں کتنا اُداس ہو جایا کرتا۔ میں نہ کہیں باہر جاتا نہ کسی سے ملتا۔ ایک ایک دن گزارنا مشکل ہو گیا۔ پھر ایک روز میں نے سُنا کہ تمہارے ابا کا تبادلہ ہو گیا ہے، چند دنوں تک وہ چلے جائیں گے۔ اسی سلسلے میں کلب میں ڈنر ہوا۔ میں ڈنر پر نہ جانا چاہتا تھا۔ وہ شام میں کہیں باہر گذارنا چاہتا تھا۔ لیکن اتفاقاً راستے میں تمہارے ابا مل گئے اور مجھے اُن کے ساتھ جانا پڑا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ آج کلب میں لڑکیوں کے ساتھ خوب ہنسوں گا، چہلیں کروں گا۔ اُنہیں چھیڑوں گا۔ ان کے ساتھ رقص کروں گا۔ تمہاری طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔ اُن میں سے چند ایک مجھے پسند بھی کرتی تھیں، اتفاق سے اُس رات چاند کی چودھویں تھی اور میں آسانی سے کسی لڑکی کو طلوعِ ماہتاب کے بہانے باغ میں لے جا سکتا تھا۔ لیکن تمہیں دیکھ کر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ میں ایک طرف تنہا جا بیٹھا۔ بس بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ تم جا رہی ہو۔ شائد میں تمہیں اب کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ تم کئی دفعہ میرے قریب سے گذریں۔ ایک مرتبہ تم اپنے منگیتر کے ساتھ تھیں۔ ڈنر میں تم میرے برابر بیٹھی تھیں۔ میں بالکل خاموش تھا، تم نے مجھے بتایا کہ تم جا رہی ہو۔ تم نے یہ بھی کہا کہ کل شام کو میں تمہیں کلب میں ملوں۔ میں خاموش رہا۔ اس رات میں نے نہ لڑکیوں سے بات کی، نہ رقص میں شامل ہوا۔ بلکہ بہت جلد لوٹ آیا۔

دوسرے روز میں کلب میں نہیں گیا۔ مجھے کسی نے بتایا کہ تم وہاں آئی تھیں، تمہیں کسی کا انتظار تھا۔ تم بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اگلے روز تمہارا ملازم پیغام لایا۔ کہ تم رات کو چلی جاؤ گی۔ تم نے شام کو مجھے بلایا تھا۔ اپنی کوٹھی کے عقب میں درختوں کے جھنڈ میں۔ لیکن میں نہیں گیا۔ میں رات کو تمہارے ابا سے ملنے بھی نہیں گیا۔ اور تم چلی گئیں۔ میں ایک اونچے ٹیلے سے اس سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جو سیدھی اُن پہاڑوں کی طرف جاتی تھی جن میں سے چاند طلوع ہو رہا تھا۔ سڑک یوں چمک رہی تھی جیسے چاندی کا تار۔ پھر تمہاری کوٹھی سے نکلتی ہوئی تمہاری کار نظر آئی۔ جو آہستہ آہستہ سڑک پر جا رہی تھی۔ کچھ دیر میں پہاڑوں میں گم ہو گئی۔ جب کبھی پہاڑوں سے چاند طلوع ہوتا اور سڑک چمک اٹھتی۔ مجھے وہ لمحات یاد آ جاتے جب تم نے مجھے بلایا تھا۔ اور میں نہیں گیا تھا۔ جب تم میرا انتظار

کرتے کرتے چلی گئی تھیں۔

چند ماہ کے بعد میں نے سُنا کہ تمہارے منگیتر نے کسی اور لڑکی سے شادی کر لی۔ مجھے بہت دنوں تک یہی افسوس رہا کہ شاید اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ وہ تمہارا منگیتر تھا جسے تم نے خود چنا تھا۔ تمہارا اور اُس کا ایک مقدس رشتہ تھا۔ جو میری وجہ سے ٹوٹ گیا۔ کاش کہ میں اس رات اس قدر آوارہ نہ ہوتا۔ اس رات میں لڑکیوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا، رقص کرتا۔ اور تم پر ظاہر کر دیتا کہ میں بھونرا ہوں ہرجائی ہوں، مجھے تمہاری اتنی سی پروا نہیں ہے۔

نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم مجھے خط لکھو گی۔ ہر روز مجھے تمہارے خط کا انتظار رہنے لگا۔ لیکن خط نہ آیا۔ جب کچھ عرصے کے بعد میں بالکل نااُمید ہو گیا۔ تو میں نے تمہارے پرانے ملازم کو کسی بہانے تمہارے ہاں بھیجا۔ اس کے ہاتھ کچھ چھوٹے موٹے تحفے بھیجے اور کچھ پیغام۔ اس نے واپس آکر بتایا کہ تم وہاں یہاں کی نسبت کہیں زیادہ خوش ہو، تمہارا کالج کمپلیٹ ہو چکا ہے، تم مصوری سیکھ رہی ہو، جب تمہیں میرے پیغام ملے تو تم نے ہنس کر موضوع بدل دیا، اس کے بار بار کہنے پر بھی تم نے کوئی جواب نہ دیا۔ تم نے میرے بھیجے ہوئے تحفے واپس لوٹا دیئے۔ تم نے صرف اتنا کہا کہ تم خط و کتابت میں سُست ہو۔ تم نے پیغام بھجوایا تو یہ بھجوایا کہ میں تمہیں علیحدہ خط ہرگز نہ لکھوں۔ تم بڑی آسانی سے مجھے خط لکھ سکتی تھیں اور کسی اور پتے پر میرے خط تمہیں مل سکتے تھے، لیکن تم چاہتی نہ تھیں۔

آخر وہاں سے میرا تبادلہ ہو گیا۔ سفر کرتے ہوئے میں صحراؤں سے گذر رہا تھا کہ ایک جگہ تمہارے ابا مل گئے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ چند دن اُنکے ساتھ گذاروں۔ ان کا تبادلہ ابھی ابھی اس ریتلے علاقے میں ہوا تھا۔ تمہاری چھٹیاں تھیں اور تم بھی وہاں آئی ہوئی تھیں۔ تم بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ملیں، تم نے مجھے کلب کی چند لڑکیوں کے نام سے چھیڑا۔ تمہاری باتوں میں نشتر تھے۔ دیر تک تم چُرکے لگاتی رہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تمہارا دل پتھر کا بنا ہوا ہے۔ رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ میں غصے سے تلملاتا رہا۔ صبح صبح تم مجھے تنہا مل گئیں اور مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے تمہیں سنگدل کہا۔ بے وفا کہا، بے مروت کہا۔ مغرور، خود غرض، اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ اور تم چپ چاپ سُنتی رہیں، جیسے کہ میرے پاس الفاظ نہ رہے، جب میں سب کچھ کہہ چکا تو تم چلی گئیں۔ میں اسی روز جانا چاہتا تھا، تمہارے ابا سے اجازت مانگی۔ وہ کہ نہ مانے، اسی شام کو کسی تقریب

پر تمہارے ابّا اور امّی مدعو تھے۔ اُنہوں نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا، میرا جی نہ چاہا۔ نہ جانے تم نے کیوں دردِ سر کا بہانہ کر دیا ـــــ شام کو میں برآمدے میں بیٹھا تھا، سامنے ریت کے ٹیلوں میں ایک نخلستان تھا جہاں کھجور کے درخت ایک جھیل پر جھکے ہوئے تھے۔ آسمان میں چند دنوں کا نکلا ہوا پتلا سا چاند چل رہا تھا۔ خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور تم آگئیں۔ سولہ سنگار کیے۔ ایسی سج دھج کے ساتھ، کہ تم پر نگاہیں نہ جمتی تھیں تمہارے چہرے پر نرالا روپ تھا۔ تمہارے رخساروں پر صبحِ صادق کی جلا تھی اور آنکھوں میں پشیمانی۔ تم مجھ سے کچھ مانگنے آئی تھیں۔ تم اتنی پیاری معلوم ہو رہی تھیں کہ اس وقت تم اگر جان مانگتیں تو میں وہ بھی قربان کر دیتا۔ تم نے مجھ سے مانگا بھی تو کیا ـــ معافی۔

جب میں تمہاری نئی تصویر کی تلاش میں تمہارے کمرے میں گیا تو ایک چھوٹے سے چمڑے کے بٹوے میں میری کچھ چیزیں ملیں، میری تصویریں، میرے رومال، اور ایک سگرٹ کا جلا ہوا ٹکڑا۔ پوچھنے پر تم نے بتایا کہ ایک شام کو حوض کے کنارے اُسی کنج میں میں نے سگرٹ کا ٹکڑا پھینک کر پاؤں سے کچل دیا تھا، تم نے اُسے اُٹھا کر رکھ لیا۔ تمہاری یہ ادا مجھے بہت بھائی۔

پھر ہم ریت پر چلے گئے، نخلستان آیا، وہاں کائنات خوابیدہ تھی۔ دُور دُور تک ریت کے روپہلی ٹیلے سوئے ہوئے تھے، جھیل کا پانی بالکل ساکن تھا، لرزدار پتوں میں سے جھانکتے ہوئے چاند کا عکس پانی میں جم کر رہ گیا تھا۔ کھجور کے لمبے لمبے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ دُور کوئی ساربان بنسری پر ایک نہایت مدہوش کن لے بجا رہا تھا۔ جب تم میرے شانے سے سر لگائے باتیں کر رہی تھیں تو میں سب گلے شکوے بھول چکا تھا۔ مجھے وہ طویل اور تلخ وقفہ بھی بھول گیا تھا۔ جو ہماری دونوں ملاقاتوں کے درمیان آگیا تھا ـــ میں وہی باتیں دہرا رہا تھا جو پہلے کی تھیں۔

تب مجھے محسوس ہوا کہ وہ الفاظ نہایت سخت تھے جو میں نے تمہیں کہے تھے، وہ انداز نہایت تلخ تھا۔ اور پھر مجھے حق کیا تھا۔ میں نے یونہی وہ سب کچھ کہا۔ اور تم چپ چاپ سنتی رہیں۔ تم نے آگے سے ایک لفظ بھی تو نہیں کہا ـــ کاش میں نے ذرا ضبط سے کام لیا ہوتا۔ کاش میں نے وہ الفاظ نہ کہے ہوتے۔ مدتوں اس خیال نے مجھے پشیمان رکھا۔

تم نے خط لکھنے کے وعدے کیے تھے، یہ بھی کہا تھا کہ تم اپنی کسی سہیلی کی معرفت میرے خط منگوا لیا کرو گی، اور میں تمہیں تمہارے کالج میں ملنے آؤں، تم میرا انتظار کیا کرو گی۔

ہفتے گذرے، مہینے گذرے، لیکن تمہارا خط نہ آیا۔ ایک مرتبہ تم اس سٹیشن سے گذریں جہاں میں تھا، تمہیں یہ بھی پتہ تھا کہ میں وہاں ہوں پھر بھی تم نہیں ملیں نہ تم نے اطلاع دی۔ اسی سٹیشن پر تمہارے ابا سے ملاقات ہوئی۔ وہ چھٹی سے واپس آ رہے تھے، انہوں نے بتایا کہ آج کل تم رقص سیکھ رہی ہو، تم نے کئی نئے ساز سیکھے ہیں۔ تمہاری بنائی ہوئی چند تصویریں کسی نمائش میں رکھی گئی تھیں اور بیحد مقبول ہوئیں۔ تم نہایت مسرور رہتی ہو۔ میں افسردہ ہو گیا، شاید میں تمہیں مسرور نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ شاید تمہاری خوشیوں سے مجھے رنج پہنچتا تھا۔ میں تمہارے کالج میں تم سے ملنے گیا، میں نے اطلاع بھجوائی، تم کلاس کے بعد بھی نہ آئیں۔ میں نے پھر کہلوایا، دیر تک انتظار کرتا رہا۔ تم ذرا سی دیر کے لئے آئیں، تم نے یوں ظاہر کیا جیسے تمہیں میرے آنے پر ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی، میں نے شکایتیں کیں تو تم نے فوراً موضوع بدل دیا۔ میں نے پکچر کے لئے کہا۔ تم نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ سہ پہر کو ہم کہیں اکٹھے چائے پئیں گے تم نے انکار کر دیا۔ میں نے دوبارہ ملنے کے لئے پوچھا تم نے نفی میں جواب دیا۔ تم نے مجھے مزید انتظار کرایا۔ تمہارے کالج کے ختم ہونے تک میں تمہاری راہ تکتا رہا جب تم واپس برآمدے میں آئیں تو تمہاری یہ کوشش تھی کہ کہیں تمہاری سہیلیاں مجھے تمہارے ساتھ نہ دیکھ لیں۔ تم نے جلدی سے اپنی سائیکل لی، بڑی تیزی سے ہم نے میدان عبور کیا اور جب ہم سائیکلوں پر جا رہے تھے تو میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ تم ہر چوک پر چاہتی تھیں کہ میں کہیں چلا جاؤں۔ ایک دو دفعہ تم نے کہا بھی۔ ایک موڑ پر تم بغیر کچھ کہے ایک طرف مڑ گئیں، میں دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ تم نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ تمہارا رویہ ایسا تھا جیسے تم مجھے بالکل نہیں پہچانتیں۔ تم نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تم مجھ سے آیندہ کبھی ملنا نہیں چاہتیں۔ میں واپس چلا آیا، میں نے فیصلہ کر لیا کہ پھر کبھی تم سے نہیں ملوں گا۔ تمہارا خیال چھوڑ دوں گا۔ تمہیں بالکل بھلا دوں گا۔ میں نے تمہارے ابا سے خط و کتابت بند کر دی۔

میں ان دنوں ایسے جنگلوں میں تھا جہاں ہر وقت بارش ہوتی رہتی تھی، جہاں اس قدر تنہائی تھی کہ نہ زندہ رہنے کی خوشی تھی نہ افسوس۔ چاروں طرف وحشت ہی وحشت تھی۔ بہت صبحیں ایک سی تھیں، سب شامیں ایک سی تھیں۔ دن گذرتے جا رہے تھے اور سپتہ تک نہ چلتا تھا۔۔۔ ایک روز تمہارا خط ملا۔ یہ تمہارا پہلا خط تھا۔ تم نے میرا پتہ بالکل صحیح لکھا تھا۔ تم جانتی تھیں کہ میں کہاں ہوں۔ خط میں القاب نہیں تھے۔ تم

نے اپنا پروگرام لکھا تھا کہ تم اگلے ہفتے اپنی کسی پروفیسر اور چند سہیلیوں سے ملنے چند دنوں کے لئے دارجیلنگ جا رہی ہو۔ تم نے مجھے بلایا تو نہیں تھا لیکن اپنے جانے کی تاریخ اور ٹرین کا وقت لکھا تھا، اس جنکشن کا خاص طور پہ ذکر تھا۔ جہاں ٹرین دیر تک ٹھہرتی تھی، اپنا دارجیلنگ کا پتہ بھی لکھا تھا۔

میں ہرگز نہ آتا اگر اس قدر اداس اور تنہا نہ ہوتا۔ شاید یہ تنہائی تھی جس نے مجھے مجبور کر دیا میں نے چھٹی لی، وقت تھوڑا رہ گیا تھا اور ریل کے لئے بہت چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ میں نے کچھ راستہ موٹر سے طے کیا، کچھ سٹیمر سے، اور کچھ پیدل۔ وہ جنکشن نزدیک ہی تھا کہ موٹر خراب ہو گئی۔ ہم گھنے جنگل میں تھے، اندھیری رات تھی، موسلادھار بارش ہو رہی تھی، میرے ساتھ چند لڑکے دارجیلنگ جا رہے تھے، انہوں نے فیصلہ کیا کہ صبح والی گاڑی سے چلیں گے۔ لیکن مجھے یہ خیال تھا کہ تم منتظر ہو گی، اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر ان مصیبتوں سے میں نے وہ دشوار راستہ پیدل طے کیا۔ تم مجھے منتظر ملیں۔ تم سٹیشن پر مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس ڈبے میں چند اور مسافر بھی تھے جو سو رہے تھے۔ نہ ہم نے آپس میں باتیں کیں نہ ایک دوسرے کو دیکھا، بس نیچی نظریں کئے بیٹھے رہے۔ ہم دارجیلنگ پہنچے تو تمہاری سہیلیاں منتظر ملیں، یہ وہی لڑکیاں تھیں جن کو میں نے تمہارے کالج میں دیکھا تھا، جن کے سامنے تمہیں میرے ہمراہ چلنے میں احتراز تھا۔ ان سے تم نے میرا تعارف کرایا اور میرا نام نہ لیا۔ تم نے مجھے شام کو ملنے کو کہا۔ اور ان کے ساتھ چلی گئیں۔

شام کو میں تمہیں لینے گیا۔ بادل نیچے اتر آئے تھے اور ہلکی ہلکی دھند پھیلتی جا رہی تھی۔ بوندیں پڑنی شروع ہو گئیں اور ہم زیادہ دور نہ جا سکے۔ ایک کیفے میں ہم موسیقی سنتے رہے، پھر دیکھیں۔ جب رات گئے ہم واپس آ رہے تھے تو بالکل خاموش تھے۔ وہ جگہ آئی جہاں سے تمہاری پروفیسر کے مکان کو راستہ جاتا تھا۔ میں منتظر تھا کہ تم اس طرف کا رخ کرو گی اور میں تمہیں چھوڑ آؤں گا، لیکن تم اس راستے کی طرف نہیں گئیں۔ تم میرے ساتھ چلتی رہیں حتیٰ کہ میرا ہوٹل آ گیا۔ میرا کمرہ اوپر تھا، سامنے چھوٹی سی بالکنی تھی۔ ہم دونوں بالکنی میں کھڑے تھے، دھند بڑھتی جا رہی تھی، بوندیں تیز ہو گئی تھیں۔ ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ یکایک تمہاری آنکھیں چھلک گئیں۔ تم نے سر جھکا لیا اور آنسو پونچھنے لگیں۔ میں تمہارے قریب ہو گیا۔ اور تم خود میری آغوش میں آ گئیں۔

تم کو بہت ہی ٹپ ٹپ بوندیں گر رہی تھیں۔ بادل امڈ آئے تھے، بڑھتی ہوئی

دھند نے ہمیں یوں گھیر لیا تھا کہ فضا میں ہم دونوں تنہا رہ گئے — تمام رات ہم نے گذری ہوئی باتوں کا ذکر کیا، نہ مستقبل کے عہد و پیمان ہوئے، بس ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ بارش تیز ہوتی گئی۔ بادل گرجتے رہے، بجلیاں چمکتی رہیں، ٹین کی چھت پر بوندیں شور مچاتی رہیں، دھند نے ہمیں گھیرے رکھا۔

جب بارش تھمی تو میں تمہیں چھوڑنے گیا، سڑکیں سنسان پڑی تھیں، آسمان پر تارے چمک رہے تھے، مشرق میں ہلکی ہلکی روشنی آمدِ صبح کا پتہ دے رہی تھی۔ رخصت ہوتے وقت تم نے بڑے انداز سے اپنی ہتھیلیاں ملا کر سر کی ہلکی سی جنبش سے مجھے سلام کیا۔ اتنے پیار سے تم نے پہلی مرتبہ مجھے سلام کیا تھا۔

پھر نہایت چمکیلا اور روشن دن طلوع ہوا، تم مجھے لینے آئیں۔ تم نے قوسِ قزح کے رنگوں کی ساڑی پہن رکھی تھی، تمہارے گلے میں ایک شوخ رومال تھا، کانوں میں رنگین آویزے تھے، تمہارے چہرے پر بلا کی چمک دمک تھی۔ تم نے اصرار کیا کہ میں بھی شوخ لباس پہنوں آسمان بالکل صاف تھا، فضا نکھری ہوئی تھی، نہایت چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی، دور دور کے پہاڑ اور وادیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہم دونوں بچوں کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس مسحور خطے میں پھر رہے تھے جہاں کا گوشہ گوشہ طلسم زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ ہم باغ کے اس حصے میں گئے جہاں شیشے کی دیواروں میں شیشے کی چھتوں کے نیچے لاتعداد پھول کھلے ہوئے تھے، قسم قسم کے، رنگ رنگ کے، طرح طرح کے پھول، سادہ رنگین، معطر؛ پھول مسکرا رہے تھے، پھول شرما رہے تھے، پھول متحیر تھے، پھول کچھ سوچ رہے تھے، پھول قہقہے لگا رہے تھے۔ تم اپنے شوخ لباس میں اس رنگین ماحول میں کچھ اس طرح کھو گئیں کہ چند تتلیاں پھولوں کو چھوڑ کر تمہارے گرد طواف کرنے لگیں۔ بوڑھا مالی تمہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چند شوخ و شنگ پھول چن کر تمہیں دیئے۔ شاید یہ ایک معتقد کی پیش کش تھی، بارگاہِ حسن میں ایک ادنےٰ سا نذرانہ تھا۔ تم نے پھول لے لئے اور مجھے کہا کہ میں انہیں تمہارے بالوں میں لگا دوں۔ جب میں انہیں تمہارے بالوں میں سجا رہا تھا تو نہ جانے کیوں تمہاری پلکیں جھک گئیں، تمہارا چہرہ تمتما اُٹھا۔ تم نے ساڑی کا پلو سر پہ کھینچ لیا۔

ایک کیفے میں تمہاری سہیلیاں نظر آئیں، انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا تھا لیکن تم نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں متوجہ کرایا، تم چاہتی تھیں کہ وہ ہمیں ساتھ دیکھ لیں۔ ان میں ایک دو اور لڑکیاں بھی تھیں، ان سے تعارف کراتے وقت تم نے پھر میرا

نام نہیں لیا اور مجھے خود بتانا پڑا۔

اگلی صبح میں تمہیں لینے گیا تو تم اکیلی بیٹھی کچھ لکھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر تم نے وہ کاغذ چھپا لیا۔ میں نے دیکھنے کے لئے اصرار کیا۔ تم نہ مانیں، بڑی مشکلوں سے وہ کاغذ چھینا، اس پر تم نے کئی جگہ ایک نیا نام لکھا تھا۔۔۔ اپنے اور میرے نام کا پہلا حصہ ملا کر۔

چلتے وقت میں نے تمہیں یاد دلایا تم بندی لگانا بھول گئی تھیں، تم آئینے کے سامنے گئیں۔ پھر تمہیں کچھ خیال آگیا۔ اور تم نے مجھ سے کہا کہ میں لگا دوں۔ جب میں نے تمہاری پیشانی پر سرخ دہکتی ہوئی بندی لگائی تو تمہاری نگاہیں جھک گئیں، چہرہ گلابی ہو گیا۔

ہم چیڑ کے جنگل سے گذر رہے تھے جہاں اونچے اونچے درخت سر ملائے کھڑے تھے، ٹہنیوں اور پتوں سے چھنتی ہوئی کرنیں زمین پر طرح طرح کے نقوش بنا رہی تھیں۔ روشنی اور سایوں کا یہ امتزاج نہایت دلآویز تھا۔ دیر تک ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے یوں چلتے رہے جیسے راستہ بھول گئے ہوں۔ جنگل ختم ہوا اور ایک نہایت خوشنما آبشار آئی، پانی بڑی بلندی سے گر رہا تھا۔ دور دور تک پھوار اڑ رہی تھی۔ ہم ایک پتھر پر بیٹھ کر پھوار میں بھیگنے لگے۔ سامنے ایک وسیع وادی تھی جس پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ہوا کے تیز جھونکوں سے دھند پھٹ گئی اور کنچن چنگا نظر آنے لگی۔ وہ نظارہ ایسا تھا کہ ہم مرعوب ہو کر رہ گئے، خاموشی سے برف کی اس جھلمل جھلمل کرتی ہوئی دیوار کو دیکھتے رہے جو آسمان کو چھو رہی تھی۔ پھر دھند آگئی۔ اور چوٹی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

راستے میں میرا ایک امریکن دوست مل گیا جس نے تمہاری طرف اشارہ کرکے کچھ زیر لب پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ اچھا تو پھر تمہاری ہونے والی۔۔۔ اور میں نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کرا دیا۔ تمہارا تعارف کرایا۔ ہم تینوں باتیں کرتے رہے۔ ایک جوہری کی دکان پر وہ کچھ خرید رہا تھا۔ تمہاری خالی انگلیاں دیکھ کر میں یونہی انگوٹھیوں کی باتیں کرنے لگا۔ تم نے بتایا کہ تمہیں سادہ انگوٹھی پسند ہے۔ ایسی جس میں نہ نگ ہو، نہ نام لکھا ہو، نہ کسی رنگ کی آمیزش ہو، بس بالکل سادہ سی ہو۔ تم کسی معمولی انگوٹھی کا ذکر ہرگز نہیں کر رہی تھیں، بلکہ ایسی انگوٹھی کا ذکر کر رہی تھیں جو ایک خاص موقعے پر پہنی جاتی ہے۔ پھر میں نے تم سے پوچھا کہ تم میرا نام کیسے جانتی تھیں۔ تم نے آہستہ سے کہا ۔۔۔ ہمارے ہاں نام نہیں لیا کرتے۔

اس وقت تمہارے چہرے پر مجھے ایک ایسی جھلک نظر آئی جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی، جس میں اعتماد تھا، معصومیت تھی، پیغام تھا۔

"جب میرا دوست مجھے پھر ملا تو اس نے تمہاری بڑی تعریفیں کیں، اس نے بتایا کہ حسین ہونے کے علاوہ تم میں ایک بہت نمایاں جاذبیت ہے۔ تمہاری رگ رگ میں زندگی کی تڑپ ہے، تمہاری آنکھوں میں زندگی رقصاں ہے، تم مجسم زندگی ہو۔

صبح کاذب کا وقت تھا جب ہم بلندیوں پر طلوعِ آفتاب دیکھنے گئے۔ نہایت سرد ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر تارے بڑی تیزی سے چمک رہے تھے۔ کہکشاں اتنی قریب معلوم ہو رہی تھی جیسے ہاتھ بڑھا کر چھوئی جا سکتی ہو۔ جدھر نظر جاتی تھی آسمان سے ملی ہوئی برفانی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اونچے اونچے پہاڑوں کے سلسلوں نے ہمیں گھیر رکھا تھا۔ ہم دونوں بیٹھے مشرق کی ہلکی ہلکی روشنی کو دیکھ رہے تھے، ہوا کے جھونکوں سے تمہارے بال پریشان ہو رہے تھے، تمہارے چہرے پر خوشگفتہ پھولوں کی تازگی تھی۔ اس نیم تاریک ماحول میں سب سے روشن شے تمہارا چہرہ تھی، جس پر تاروں سے زیادہ نور تھا۔ برفانی چوٹیوں سے زیادہ جگمگاہٹ تھی۔ صبح کا تارا طلوع ہوا۔ پھر مشرق کا اُجالا بڑھ گیا۔ کنچن جنگا سے روشنی منعکس ہونے لگی۔ دفعتاً تارے دھندلے پڑ گئے اور برف کی اس عظیم دیوار کا رنگ بدل گیا۔ ہلکی ہلکی گلابی جھلک آگئی۔ آس پاس کی تمام پہاڑیوں پر عکس پڑنے لگا۔ رنگ تیز ہو کر یکلخت بدل گیا اور ساری کائنات اُودی ہو گئی۔ اودا رنگ نیلا ہو گیا۔ پھر سبز۔ زرد، نارنجی، سُرخ — قوسِ قزح کے سارے رنگ باری باری آئے اور برفانی چوٹیوں پر منعکس ہوتے رہے۔ پھر مشرق سے پگھلا ہوا سونا بہنے لگا۔ اور چاروں طرف آگ سی لگ گئی۔ سامنے سے ایک بہت بڑی گھومتی ہوئی سنہری گیند جھانکنے لگی، لوگ ایک سمت اشارہ کر رہے تھے، دُور تین چھوٹی چھوٹی سفید چوٹیاں نظر آ رہی تھیں، یہ وہی چوٹیاں تھیں جنہیں "تین بہنیں" کہا جاتا ہے۔ اُن میں سب سے چھوٹی ماؤنٹ ایورسٹ تھی۔ دُنیا کی سب سے اونچی چوٹی جو فاصلے کی وجہ سے اتنی ذرا سی معلوم ہو رہی تھی۔ سورج نکلا اور اس پر ایک سبزی مائل نیلا نیلا عکس جھلملانے لگا، جسے کہتے ہیں کہ بحرالکاہل کا عکس ہے۔ اور پھر سب کچھ اتنی تیزی سے چمکنے لگا کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔

طلوعِ آفتاب کا وہ نظارہ میری زندگی کی حسین ترین یادوں میں سے ہے۔ جب کبھی یاد آتا ہے تم یاد آ جاتی ہو۔ جیسے خواب کی دُنیا میں میرے ساتھ تھیں، جہاں رنگوں کے

طوفان مچل رہے تھے، نور کے اس بیکراں سمندر میں قدرت نے اپنے رنگ ختم کر دیئے تھے۔

وہ چند دن کیسے خوشیوں میں گذرے۔ ہم نے کیسی کیسی حسین چیزیں دیکھیں۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ تم سے بہت سی شکائتیں کروں گا، تم سے خوب خفا ہوں گا۔ لیکن نہ جانے کیوں میں نے وہ ذکر بالکل نہیں چھیڑا۔ تمہارے چہرے پر اس قدر پیار تھا کہ میں نے سب کچھ بھلا دیا۔ جب ہم واپس آرہے تھے تو تم کہہ رہی تھیں کہ مجھے ہر تیسرے روز خط لکھا کروگی، تمہیں لمحہ لمحہ میرا انتظار رہے گا۔ اگر میں نے آنے میں دیر کر دی تو تم خود مجھے لینے آجاؤ گی۔

جب اس جنکشن پر ہم جدا ہوئے تو تمہاری آنکھیں نمناک تھیں۔ تمہاری ٹرین چل دی، میں دروازے میں کھڑا تم سے باتیں کر رہا تھا، جب انجن نے لگا تو تم بولیں ——— ذرا سنبھل کر اتریئے۔ تمہارے یہ الفاظ مجھے بہت پیارے لگے۔ یہ فقرہ میرے حافظے میں جم کر رہ گیا۔ جب میں واپس چلا گیا تو مجھے ایک خیال نے کتنا ستایا۔ کتنا بے چین کیا۔ اس مرتبہ تم کس قدر مختلف تھیں۔ تمہارا رویہ تمہاری باتیں، میرا نام لینے سے گریز، انگوٹھی کا ذکر، بات بات پر شرمانا۔ اور وہ جھلک جو میں نے پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ تم چاہتی تھیں کہ ہم مستقبل کی باتیں کریں، میں تمہیں شادی کے لئے کہہ دوں۔ سچ مچ تمہارا بہت جی چاہ رہا تھا کہ میں تمہیں شادی کے لئے کہہ دوں۔ ایک دو مرتبہ مجھے یونہی خیال بھی ہوا۔ اگرچہ ایسا کرنا ایک حد تک خود فریبی ہوتی، میں جھوٹ بولتا۔ تم بھی سمجھ جاتیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اور اگر تم ہاں کہہ دیتیں تو شائد تمہیں بعد میں احساس ہوتا کہ تم نے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن ان دنوں تم میرے منہ سے وہ الفاظ سننے کے لئے بے قرار تھیں۔ کاش کہ میں نے یونہی کہہ دیا ہوتا۔ ہم کچھ دیر اکٹھے بیٹھ کر آئندہ زندگی کے منصوبے باندھتے، تم شرما شرما جاتیں، بڑی پیاری پیاری باتیں ہوتیں۔

کاش کہ میں نے کہہ دیا ہوتا۔

ایک طویل عرصہ گذر گیا اور تم نے مجھے یاد نہیں کیا۔ بڑے انتظار کے بعد تمہاری ایک سہیلی کا خط ملا، یہ وہی لڑکی تھی جس سے تم نے ڈرائینگ میں ملایا تھا۔ یہ خط اس نے تمہارے ایما پر لکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ تم مجھے خط نہیں لکھو گی، میں انتظار کرنا چھوڑ دوں۔ اور تمہیں ملنے بھی نہ آؤں۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ میں نے لکھ کر اس سے وجہ دریافت کی۔ جواب آیا۔ لیکن اس میں صرف اتنا لکھا تھا کہ [illegible]

گیا بھی تو تم شامل ہوگی۔

میں موقعہ پاکر چند دنوں کے لئے تمہاری سہیلی سے ملنے گیا۔ وہ تمہارے کالج کے نزدیک ہی اور لڑکیوں کے ساتھ علیحدہ رہتی تھی۔ وہ مجھے بہت اچھی طرح ملی۔ پہلے تو وہ اس موضوع پر گفتگو کرنے سے جھجکتی رہی۔ پھر میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ تم مجھے پسند نہیں کرتیں۔ تم اکثر میرا مذاق اڑایا کرتی ہو، تم نہیں چاہتیں کہ مجھ سے کسی قسم کی خط و کتابت ہو۔ مجھے تب بھی یقین نہ آیا۔ جب میں نے بہت زور دیا تو اس نے پروگرام بنایا کہ وہ اگلے روز تمہیں اور کئی اور لڑکیوں کو چائے پر بلا سکے گی، دانستہ طور پر میرا ذکر چھیڑا جائے گا، اور میں سب کچھ اپنے کانوں سے سن لوں گا۔

اگلے روز میں نے سب کچھ اپنے کانوں سے سنا۔ تمہاری سہیلی کے پاس میری ایک تصویر تھی جو اس نے تم سے لی تھی، اس تصویر پر تبصرے ہونے لگے۔ تم نے میرے متعلق سب سے سخت الفاظ کہے۔ کہ میں اجتماع ضدین ہوں، مجھے کوئی نہیں سمجھ سکتا، میں ہرجائی ہوں، میں آوارہ گرد ہوں۔ جہاں میں اس قدر اکھڑ ہوں وہاں میں کبھی کبھی اس قدر جذباتی بن جاتا ہوں کہ دوسروں کو پریشان کر دیتا ہوں میں بالکل معمولی سا لڑکا ہوں، بالکل فضول اور نکما۔ اسی قسم کی بہت سی باتیں کیں۔ میں نے شیشوں کی اوٹ سے دیکھا، تمہارے ہاتھ میں میری تصویر تھی، لبوں پر وہی زہر بھری مسکراہٹ اور آنکھوں میں نفرت تھی۔ تم اس وقت ایسے اجنبی کا ذکر کر رہی تھیں جس سے تمہیں شدید نفرت تھی، جسے تم دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔

کسی اور کے لبوں سے یہ سن کر مجھے ہرگز افسوس نہ ہوتا کیونکہ میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتا تھا۔ لیکن تمہارے لبوں سے یہ الفاظ سن کر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوگئی۔ تم سے نفرت ہوگئی۔ میں نے اس وقت کو کوسا جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ تمہارے ہرجائی کہنے پر مجھے ہرجائی بننے کا خیال ہوگیا۔ میں نے تمہاری سہیلی کی بڑی تعریفیں کیں۔ اس کی آنکھوں کی تعریفیں کیں، ہونٹوں کی، رخساروں کی، زلفوں کی۔ اور شاید اسے میں کچھ پسند بھی تھا۔ میں نے اس دو تین دن کے قیام میں تمہیں جلانے کی کوشش کی۔ اور واپس جا کر اُن لڑکیوں کو خط لکھے جن سے محض تمہاری وجہ سے خط و کتابت بند کر دی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد میرا تبادلہ اور شعبہ ہوگیا، جہاں تنہائی کئی گنا زیادہ تھی، حد درجہ خشک تھی، ویرانیاں تھیں، ظلمتیں تھیں۔ پرانی یادیں دفن ہوگئیں، کچھ مشغلے کیلئے زندگی

دفن ہو گئی۔

میں واپس لوٹا اسٹیمر کے لمبے سفر کے بعد ایک ایسی جگہ اُترا جہاں باغ ہی باغ تھے، لیکن بہار ابھی نہیں آئی تھی، وہ جگہ کچھ ایسی خوشنما بھی نہیں تھی۔ اور میں مسرور بھی نہ تھا پھر بھی جب میں آوارہ پھر رہا تھا تو مجھے ٹہنیوں میں نئی نئی کونپلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ کملائے ہوئے پھولوں پر نہ جانے اتنی ساری تتلیاں کہاں سے آگئی تھیں، پنکھے کی شکل کے پتوں والے لمبے لمبے درخت ہوا سے جھوم رہے تھے، سمندر پر اُجلے اُجلے آبی پرندے اُڑ رہے تھے اُن کی سیٹیاں فضا میں گونج رہی تھیں۔ سمندر بالکل پُرسکون تھا، نیلا اور چمکتا ہوا، دُور اُفق پر جہاں سمندر اور آسمان ملتے تھے وہاں اِکّی دُکّی کشتیوں کے بادبان نظر آ رہے تھے۔ آسمان بالکل نیلا اور شفاف تھا۔ کہیں ایک بھی بادل دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک ان جانی مسرت میری روح میں سمائی جا رہی تھی، میرا دل کہہ رہا تھا کہ ابھی کوئی آیا چاہتا ہے۔ اور تم مجھے مل گئیں۔ تم نے ہلکا ہلکا نیلا لباس پہن رکھا تھا، بالکل آسمان کے رنگ کا، سمندر کے رنگ کا۔ تمہارے بالوں میں نیلے نیلے پھول لگے ہوئے تھے، تمہارے آویزے آسمانی رنگ کے تھے۔ تمہارے گلے میں آسمانی منکوں کا ہار تھا۔ تمہاری کلائیوں میں دو دو چوڑیاں تھیں آسمانی رنگ کی۔

تم نے بتایا کہ تمہارے ابا ان دنوں نزدیک ہی ایک کیمپ میں ہیں۔ تم یہاں چند دنوں کے لئے ہو پھر تم ان کے پاس چلی جاؤ گی۔ تمہاری امّی ابھی گئی ہیں۔ تمہارے ساتھ تمہارے ننھے بہن بھائی ہیں۔ میرے ہوٹل کے بالکل سامنے وہ کوٹھی تھی۔ جس میں تم ٹھہری ہوئی تھیں۔ جب ہم سمندر کے کنارے بیٹھے تھے تو ماضی نے میرے دل کو مسوسنا شروع کر دیا۔ بیتے ہوئے تلخ لمحات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے، میں نے تم سے کچھ نہ کہا۔ بس یونہی خاموش بیٹھا لہروں کو تکتا رہا۔

میں نے صرف تمہاری طرف ایک یا دو مرتبہ دیکھا۔ مجھے اپنے اوپر اعتماد نہیں تھا۔ اگر میں کچھ دیر لگاتار تمہارے چہرے کو دیکھتا رہتا تو مسحور ہو کر رہ جاتا۔ تمہارے چہرے سے محبت جھلک رہی تھی، تمہاری آنکھوں میں پشیمانی تھی، اور باتوں میں التجا تم مجھے منانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہم دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ سمندر کے افق پر سورج غروب ہونے لگا، شفق پھیلی، سمندر سرخ ہو گیا، فضا [illegible] رنگین [illegible] میں چھپ گیا اور اندھیرا پھیل گیا۔ ہوا کے جھونکے تیز ہوتے جا رہے تھے، لہریں مچل رہی تھیں۔ جدا ہوتے وقت تم نے کہا تمہارے کمرے میں بات کرنی [illegible]

رہتی ہے۔ اس کمرے کا ایک دریچہ سمندر کی طرف کھلتا ہے، وہاں سے میرا ہوٹل سامنے نظر آتا ہے۔ تم نے یہ بھی کہا کہ رات بھر تم اپنے کمرے میں تنہا ہوگی اور اداس ہوگی۔

جب میں تمہیں چھوڑ کر واپس آ رہا تھا تو سمندر سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں کہ جیسے رات کو طوفان آئے گا۔ اور رات کو طوفان آیا، مہیب لہریں ساحل سے ٹکراتی رہیں۔ آندھی کے تند تھپیڑے شور مچاتے رہے، آبی پرندوں کی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ تمہارے کمرے میں سبز روشنی ہے اور تم دریچے میں کھڑی ہو۔ میں سیڑھیوں سے اترا بھی، کچھ دور گیا، دریچے کے قریب تاریکی میں کھڑا تمہیں دیکھتا رہا۔ پھر واپس لوٹ آیا۔

رات بھر تمہارے کمرے میں روشنی رہی، تم بار بار دریچے میں آتی تھیں۔ رات بھر تم نے میرا انتظار کیا۔

اگلے روز مجھے وہاں سے جانا تھا اور میں چلا گیا۔

بعد میں دل کیسا کیسا تلملایا، نہ جانے اس رات تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھیں جو تمہیں رات بھر میرا انتظار رہا۔ اگر میرے دل و دماغ میں وہ تلخی اس شدت سے حلول نہ کر جاتی تو میں آسانی سے وہ فقرے بھلا سکتا تھا جو تم نے میرے متعلق اپنی سہیلیوں سے کہے تھے۔ شاید تم ان کی چھیڑ سے بچنے کے لئے ان کے سامنے جھوٹ موٹ میری برائیاں کر رہی تھیں۔ تمہارے خط نہ لکھ سکنے کے سلسلے میں بھی اپنے دل کو بہلانے کے لئے کئی بہانے تراش سکتا تھا۔ شاید تم مجبور تھیں، شاید تم پر ایسی بندشیں ہوں جن کا مجھے علم نہیں۔ لیکن اس رات میں بیتی ہوئی تلخ باتیں دہراتا رہا۔ تم دریچے میں کھڑی میرا انتظار کرتی رہیں۔ کاش کہ میں کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول جاتا۔ کاش کہ میں اس رات تمہیں ملنے چلا جاتا۔

ان باتوں کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ میں تو تمہیں بھول ہی گیا تھا، کیا ہوا جو کبھی کبھار ذرا سی یاد آ گئی۔ اور اب اتنے دنوں کے بعد سمندر پار سے تمہاری آپا کا خط آیا ہے۔ جس میں تمہارا ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ تم ہر وقت اداس رہتی ہو۔ بے حد افسردہ رہتی ہو۔ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر کبھی کی کالج سے چلی آئی ہو۔ تم نے اپنے سارے مشغلے ترک کر دیئے ہیں۔ دن بھر کسی تنہا گوشے میں چپ چاپ بیٹھی کچھ سوچتی رہتی ہو۔ تمہارے چہرے پر اداسی کچھ اس طرح چھائی ہے کہ کبھی نہیں جاتی۔ مشکل سے تم ہنسیں مسکرائیں۔

شاید میں تمہیں اب بھی یاد آتا ہوں، شاید یہ پشیمانی ہے۔ شاید اب تمہیں میرے خط کا اتنا ہی انتظار رہتا ہے جتنا آج سے کچھ سال پہلے مجھے تمہارے خط کا رہا کرتا تھا۔ شاید وہ تلخیاں تم اب محسوس کر رہی ہو۔ جو میں نے چند سال پہلے محسوس کی تھیں۔

جب سے یہ خط آیا ہے تم بری طرح یاد آ رہی ہو۔

ایک رات بارش ہو رہی تھی، بوندیں ٹین کی چھت پر ٹپ ٹپ گر رہی تھیں، مجھے دارجلنگ کی وہ ملاقات یاد آگئی جب ہم دھند میں گھرے ہوئے ایک دوسرے کو رات بھر دیکھتے رہے تھے۔ بالکل ایسی ہی رات تھی۔ اسی طرح بوندیں شور مچا رہی تھیں۔ چند منٹ پہلے کلب میں کسی نے پیانو پر وہ دھن چھیڑ دی۔ یہ وہی دھن تھی جو اس رات پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس باغ میں سنائی دے رہی تھی۔ جب پہلی مرتبہ میں نے تمہارے لب چوم لئے تھے۔ رات میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر آ رہا تھا۔ یکایک سامنے کے اونچے پہاڑ کے پیچھے روشنی پھیل گئی اور بڑا سا چاند طلوع ہوا، سڑک چاندی کے تار کی طرح چمکنے لگی۔ مجھے وہ لمحات یاد آگئے جب اسی طرح چاند طلوع ہو رہا تھا اور چمکتی ہوئی سڑک پر تم میرا انتظار کرتے کرتے چلی گئی تھیں۔

تم نے مجھے جس قدر مسرتیں دی ہیں اسی قدر تاریکیاں بھی۔ جہاں زندگی کی حسین ترین چیزوں سے تمہاری یادیں وابستہ ہیں وہاں زندگی کے تلخ ترین اور تاریک لمحات بھی تمہاری وجہ سے آئے تھے۔ شاید تمہاری فطرت ہی ایسی تھی کہ تم پر کیفیتیں طاری ہوتی تھیں، یہ کیفیتیں اس طرح بدلتی تھیں کہ تم بھی بدل جاتی تھیں۔ ایسے لمحات آتے تھے جب تم محبت کرتی تھیں اور ایسے لمحات بھی آتے تھے جب نفرت اجنبیت میں بدل جاتی تھی اور کبھی کبھی نفرت میں —— لیکن جب تم نے محبت کی ہے شدید طور پر کی ہے اس قدر شدت سے کی ہے کہ مجھ پر محبت کی بارش ہونے لگی۔ محبت نے مجھے جیت لیا —— اور وہ تمہاری شوخ مسکراہٹ، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تمہاری آنکھوں میں زندگی سمٹ گئی ہے۔ تمہارے چہرے سے زندگی کی کرنیں پھوٹتی تھیں، تم خود زندگی تھیں سب سے پیارا تو وہ تل تھا جو تمہارے لبوں کے کونے پر تھا۔ اس تل میں بلا کی دلکشی تھی۔ اور پھر وہ تمہارے لبوں کا عجیب سا تناؤ جیسے ہر وقت مسکرا رہے ہوں۔ مدتوں تم نے میرے خیالات کو بسایا ہے۔ مدتوں تمہاری ہستی کائنات پر چھائی رہی ہو۔ میں نے لق و دق صحراؤں میں ریت کے سنہرے ٹیلوں پر تمہارا نام لکھا ہے۔ میں نے سمندر کے کنارے سنگریزوں سے تمہارا نام لکھا ہے۔ میں نے بنفشوں پر [illegible] ملائم برف پر تمہارا نام لکھا ہے۔ میں نے جھیلوں میں تیرتے ہوئے کنول کے پھولوں کو اس طرح ترتیب دیا کہ تمہارا نام پڑھا جاتا تھا۔ [illegible] چمکتے ہوئے [illegible] کی چٹانیں [illegible] تمہارا نام [illegible] میرا جی چاہتا تھا کہ اندھیری راتوں میں ستاروں سے تمہارا نام اس طرح لکھوں کہ آسمان جگمگا اٹھے —— آج تک میں نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا۔ کچھ دنوں سے میرا جی چاہ رہا ہے کہ تمہیں خط لکھوں، طویل اور [illegible] [illegible] بھلا نہیں۔ اگر میں [illegible] [illegible] جو تم نے [illegible]

ممتاز مفتی

معظم پور

۱

ویرانے کے وسیع پھیلاؤ میں ــــ ، دور چھلیے ہوئے ٹنڈ منڈ درختوں کے جھنڈ کے پرے ایک اونچے ٹیالے ٹیلے پر نانک چندی اینٹوں کی دیواریں نظر آتی ہیں جن میں یہاں وہاں چار ایک سہ منزلہ چوبارے مغلیہ وقار سے کھڑے ہیں ان کے پرے پورہ کی جامع مسجد کے مینار استادہ ہیں اور مندر کا کلس سورج کی روشنی میں چمک رہا ہے۔ خانکوٹ کی طرف جاتے ہوئے عظمت آباد روڈ کے مختصر سے ریلوے سٹیشن سے شاید آپ نے کھڑکی سے سر نکال کر دور افق پر معظم پورہ کو دیکھا ہو۔

ویرانے سے ایک سہمی ہوئی، گھبرائی ہوئی پکی سڑک گرتی پڑتی پورہ کی طرف بھاگی جاتی ہے جس پر مریل گھوڑے کھچا کھچ بھرے ہوئے ٹمبو کاٹ کو کھینچنے کی کوشش میں ہانپتے رہتے ہیں۔ گاڑیبان بانس پر بیٹھ کر اونگھتے ہیں۔ اندر متشرع چہروں، محراب زدہ پیشانیوں اور متفکر نگاہوں والے جامہ دساں لوگ تنگی جا کی تکلیف کے باوجود اطمینان کا غلاف اوڑھے ٹمبو کاٹ کے ساتھ لڑھکتے چلے جاتے ہیں۔

پورہ کے قریب چھوٹی اینٹوں کی بوسیدہ چار دیواریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ جو آج تک پورہ کے ان تاریخی باغات کی یاد دلاتی ہیں۔ جن میں سوکھے کبڑے اور بوڑھے درخت کمر پر ہاتھ رکھے، خمیدہ ہیں اور ان پر مریل چیلیں چپ چاپ بیٹھی ہر آتے جاتے کو غور سے دیکھتی ہیں۔ باغات کے پاس ہی "پورہ" گھٹنوں کے بل کھڑا ہے۔ جیسے رکوع میں ہو۔ چار دیواری کے اندر ایک تنگ بازار ہے۔ جہاں دکاندار نہایت اطمینان اور فراغت سے بیٹھے اونگھتے ہیں۔ اونگھتے اونگھتے دفعتاً چونک کر کھانس بھی لیتے ہیں۔

پورہ کے بازار میں کوئی حرکت گزرتی دکھائی نہیں دیتی۔ گویا قصبہ میں صرف موہی

مرد ہوں۔ گزرے بھی، تو آنچل بار بار پاؤں میں پھنس جاتا ہے۔ پاؤں لڑکھڑا جاتے ہیں۔ جیسے بند ہوتی ہوئی ہوا میں کوئی نازک سی پتنگ ڈول رہی ہو۔

لیکن بل کھاتی ہوئی تنگ گلیوں میں عورتیں بے تکلفی سے گھومتی ہیں۔ ایک دوسری سے ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتی ہیں۔ کوئی، چھاتی تھام کر رہ جاتی ہے "ہائیں"۔ کوئی کھڑکی سے سر نکال کر کچھ پوچھتی ہے۔ ایک دہلیز پہ آ بیٹھتی ہے۔ دوسری گلی میں چوکی بچھا لیتی ہے۔ نوجوان لڑکیاں دروازوں اور کھڑکیوں سے جھانکتی ہیں۔ گلی کی نکڑ پر محلے کے بچے کھیلتے پھدکتے ہیں۔ کبھی کوئی مرد گلی میں آ جائے تو گھبرا کر یوں نکل جاتا ہے جیسے کٹا ہوا پتنگ زمین پر گر رہا ہو۔ اور واحد علی گلی میں آ نکلتے ہیں تو نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ عورتیں دبک کر بیٹھ جاتی ہیں۔ نوجوان لڑکیاں کھڑکیوں سے سرک جاتی ہیں۔ بچے اور کتے پاؤں کی چاپ سنتے ہی منتشر ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اب واحد علی گلی میں نہیں آتے۔ پھر بھی رات کے سناٹے میں وقار منزل سے واحد علی کی کھنکار گونجتی ہے تو روتے ہوئے بچے سہم کر ماؤں سے چمٹ جاتے ہیں۔ بھونکتے ہوئے کتے چپ چاپ کسی نالی پر جا لیٹتے ہیں۔ راہ چلتا فقیر دو منٹ کے لئے صدا دینا بھول جاتا ہے اور منزل کے اندر بھی نوکرانی کے ہاتھ سے کانچ کا گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے تختی پہ لکھتے ہوئے اعظم کا بازو کانپنے لگتا ہے۔ دوات الٹ جاتی ہے۔ ننھا وقار دفعتاً دودھ پینا بند کر دیتا ہے اور ہونٹ نکال کر ماں کی طرف دیکھتا ہے اور پھر مسکرا دیتا ہے جیسے وہ واحد علی کی کھنکار کی ماہیت سے واقف ہو۔ اور وحیدہ زیرِ لب ہنس دیتی ہے۔

لیکن یہ قصہ اس وقت کا ہے۔ جب وقار ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ جب وحیدہ محض جانتاں تھی اور اس نے زیرِ لب ہنسنا نہیں سیکھا تھا۔ جب واحد علی گلی میں سے آیا جایا کرتے تھے۔ اور آتے جاتے ہوئے بوڑھی عورتوں سے باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ جب ان کی کھنکار سے اعظم کی دوات نہ الٹتی تھی۔ جب معظم پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اور لوگ اسے موجِ پھدہ کہا کرتے تھے۔

ان دنوں وحیدہ واقعی "موجِ بھری" تھا گلیوں اور بازاروں میں "موجھ" کی دھوم مچی رہتی تھیں عورتیں بازار میں بے تکلف آتی جاتی تھیں چلتے چلتے کہتیں "بھائی چھینٹ کس بھاؤ دو گے؟" "بھائی آٹھ بیچتا" "آؤ بہنا میرے پاس چھینٹوں کے نئے نمونے آئے ہیں۔ دیکھ لو پہلے پھر بھاؤ کی بات بھی ہو جائے گی۔" صمد وستار کی الماری کی طرف دیکھ کر کہتیں "اے ہے بچا ہندوؤں کے یہ فیشن تو بالکل پرانے ہیں" صمد بچا ہنس کر کہتا۔ "بی بی اپنا زمانہ بڑا ناسمجھ ہے" سو گلیوں میں کھڑے

ہوکر باتیں کرنے لگتے ''بہن ناطاں! تو تو عید کا چاند ہو گئی؟'' تائی جیواں! کیا لڑکے کے رشتے کی بات چیت طے ہو گئی۔ بھئی ہمیں کب تک انتظار کرنا ہوگا۔ میں تو اب بڈھا ہو گیا!'' گلی میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر مرد دروازے کی دہلیز پر جا بیٹھتے اور ان سے باتوں میں مصروف ہو جاتے۔ پھر ان کے قہقہوں سے گلی میں شور مچ جاتا۔ کھڑکیوں میں سے جوان لڑکیاں کھی کھی کرتیں۔ تندور پر کھڑی ہوئی مٹیاریں ہاتھ چلا چلا کر چچا صمدو کی باتوں کا جواب دیتیں۔ بچے شور مچاتے۔ کتے بھونکتے اور مرغیاں کڑ کڑ کرنے لگتیں۔ اور یہ شور واحد علی کی بیٹھک تک پہنچ جاتا۔ واحد علی مسکرا کر پوچھتے ''بھئی، آج گلی میں کون پٹ رہا ہے۔ چچا صمدو!؟'' وہ ہنستے۔ ''چچا صمدو کو چپ کرانا آسان کام نہیں۔ سب سے نبٹ لیگا۔'' وہ قہقہہ لگا کر کہتے۔ اور ان کا قہقہہ گلی میں گونجتا تو گلی کی عورتیں اور بھی بپھر جاتیں اور چچا صمدو پر برس پڑتیں —— ہاں، ایک برس پہلے موج پورہ میں ''موج'' کی ندیں رواں رواں تھیں۔ لیکن اب تو وہ معظم پور ہے۔ مرد کی چاپ پر عورتیں گلی میں سمٹ جاتی ہیں۔ چُپ ہو جاتی ہیں۔ بازار سے عورتیں گزریں تو مرد کھانس کر منہ موڑ لیتے ہیں۔ واحد علی کی بیٹھک ویران رہتی ہے۔ اور ان کی کھنکار سن کر تندور والی کے ہاتھ کی سیخ کانپ جاتی ہے اور روٹی راکھ پر جا گرتی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ موج پورہ معظم پور بن گیا اور رجا تاں کی گودیں وقار کھیلنے لگا۔ ان دنوں بھی پورہ میں واحد علی کو بڑی اہمیت دی جاتی۔ ان دنوں بھی لوگ ان کی باتوں کا احترام کرتے۔ پورہ بھر میں انہیں سب سے بڑا جانتے۔ لیکن ان دنوں تنور والی ان کی کھنکار سن کر ٹھٹکتی نہیں تھی۔ لوگ ان کی عزت تو کرتے تھے۔ مگر ان سے چھپتے یا گھبراتے نہیں تھے۔ کیسے گھبراتے؟ جب واحد علی انہیں دور سے ہی دیکھ کر ''السلام علیکم'' کہہ کر مزاج پرسی کرنے لگتے تھے۔ پاس بٹھا کر جملہ عزیزوں کی خیریت کی خبر پوچھتے تھے۔ اور دکھ درد میں ان کی مدد کرتے۔

مثلاً قائم علی کی بات لیجئے۔ حالانکہ وہ ایک معمولی کسان تھا۔ پھر بھی واحد علی گھنٹوں پاس بٹھا کر اسے تسلیاں دیا کرتے۔ ''فکر نہ کرو قائم علی! دکھ کے دن بھی بیت ہی جاتے ہیں۔ خدا کا فضل شامل حال ہو۔ بس'' لیکن قائم علی کو گویا اپنے دکھوں سے محبت تھی۔ وہ انہیں بچوں کی طرح پالتا پوستا رہتا تھا۔ ہر وقت گود میں لئے پھرتا۔ ہر کسی کو دکھاتا پھرتا۔ ''یہ دیکھو بھائی! ایک مصیبت ہو تو کوئی بات بھی ہے۔ ہزاروں روگ ہیں بھائی جی! کس کس کا رونا روؤں؟ گھر میں لڑکی جوان ہو رہی ہے، یہ بوجھ بھی میرے کندھوں پر پہاڑ بن کر پڑا ہوتا ہے۔'' ''یہ کام بھی ہو ہی جائے گا۔'' واحد علی کہتے ''خدا خود مسبب الاسباب ہے،

ہر روز قائم علی اپنے کنوئیں سے آتے ہوئے واحد علی کے پاس بیٹھ جاتا اور فصل، مویشی یا پاکستان کا قصہ چھیڑ دیتا۔ پھر چلتے چلاتے یہ قصہ اس کی بیٹی تک جا پہنچتا۔ جو گھر میں بیٹھے بٹھائے جوان ہوئی جا رہی تھی۔ اور واحد علی ہر روز اُسے تسلیاں دیتے رہتے۔ پھر ایک دن جاناں کی بات چھیڑتے ہوئے قائم علی کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ پچکے ہوئے گالوں پر دو قطرے ڈھلک آئے۔ "حوصلہ کرو۔ قائم علی!" واحد علی نے اُسے تھپکی دی "خدا مسبب الاسباب ہے"۔ مگر نہ جانے اس روز قائم علی کو کیا ہوا تھا بولا "مسبب الاسباب ہوتا تو ہمارا یہ حال نہ ہوتا بھائی جی!" اور نہ جانے اس چھوٹے سے فقرے نے کیسی قیامت بپا کر دی۔ کہ یہ فقرہ واحد علی کی روح میں جا پھنسا۔ جسم میں سوئیاں بن کر بہہ گیا۔ اور چند ساعت کے لئے اسے اتنا شل کر دیا کہ وہ قائم علی کو تسلی بھی نہ دے سکے۔ دل ہی دل میں انہوں نے محسوس کیا جیسے خدا کی خدائی فنا ہوئی جا رہی ہے۔ ایمان کی کشتی ڈول رہی ہے۔ قائم علی تو یہ بات کہہ کر چلا گیا۔ لیکن واحد علی اس چھوٹے سے فقرے کے بھنور میں پھنس گئے۔ چاروں طرف سے ایک طوفان سا اُمڈ آیا۔ اور بیچ منجدھار میں جیسے وہ نوح کی کشتی لئے کھڑے رہ گئے۔ رات کے سناٹے میں چاروں طرف سے گھنا اندھیرا موجیں مارنے لگا۔ اور ان موجوں کے درمیان ایک چھوٹا سا چراغ جھلملانے لگا۔ "چراغ نہیں بجھے گا!" انہوں نے فیصلہ کر لیا اور پھر فوراً ہی دونوں ہاتھوں سے چراغ کی لو کو ڈھانپ لیا —— دفعتاً طوفان رُک گیا۔ بادل پھٹ گئے۔ اندھیرا کافور ہو گیا۔ اور سامنے آسمان پر منور چاند ڈولنے لگا۔ "جاناں!" —— وہ مسکرا دیئے۔

اگلے روز جب پورہ کی بزرگ مائی جیواں، قائم علی کی بیوی کے پاس واحد علی کے سب سے بڑے بیٹے کبیر علی کے لئے جاناں کے رشتے کا پیغام لے کر آئی تو قائم علی کی بیوی حیران رہ گئی۔ حیرانی کی بات تو تھی ہی؟ کہاں اتنے بڑے زمیندار کا لڑکا اور کہاں ایک معمولی کسان کی لونڈیا۔ خود مائی جیواں حیران تھی لیکن واحد علی کے اصرار پر اسے جانا ہی پڑا تھا۔ کیسے نہ جاتی۔ جب واحد علی نے صاف صاف کہہ دیا "مائی جیواں! خدا کے سامنے سب چھوٹے بڑے ایک ہوتے ہیں۔ خدا کے فضل سے وہ بھی مسلمان ہیں اور ہم بھی۔ پھر سوچ کس بات کی؟"

پورہ والوں نے جب اس انوکھے رشتے کی خبر سنی تو وہ دانتوں تلے انگلی داب کر رہ گئے۔ مانا کہ جاناں پورہ کی حسین ترین لڑکی تھی۔ لیکن حسن تو کوئی معتبر خصوصیت نہیں۔

مانا کہ قائم علی ایک شریف آدمی تھا۔ مگر زمیں شرافت کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ مانا کہ واحد علی کا بڑا بیٹا کبیر علی بیمار رہتا تھا لیکن آخر وہ واحد علی کا بیٹا تھا۔ اور واحد علی پیسہ کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ مانا کہ واحد علی اونچ نیچ کے قائل نہ تھے لیکن اونچ نیچ کا قائل نہ ہونا اور بات ہے۔ مگر اونچ نیچ کی اس قدر تحقیر کر دینا؟ — یہ کھلی تحقیر! ؟ —— حیرانی کی بات تو تھی ہی۔

جاناں واحد علی کے گھر آئی تو واقعی اندھیرے میں نور کی ایک کرن چمک اُٹھی۔ اس کرن سے سارا گھر منور ہو گیا۔ واحد علی کی بیوی کو مرے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ مرنے سے پہلے بھی اس نے دو ایک سال چارپائی پہ پڑے پڑے گذارے تھے۔ بیٹی کوئی تھی نہیں کہ گھر کو گھر بنائے رکھتی۔ اگرچہ تین تین بیٹے تھے۔ لیکن بیٹوں کے ہونے سے بھلا گھر بنتا ہے کہیں؟ ہونے کو تو دو عورتیں بھی تھیں جو دودھ دوہتیں۔ لسی بلوتیں۔ کھانا پکاتیں۔ کبیر علی کی تیمارداری کرتیں۔ اعظم کو مدرسے بھیجتیں اور اس کے بڑے بھائی صغیر علی کی دیکھ بھال بھی کرتیں۔ لیکن وہ تو نوکرانیاں تھیں، عورتیں نہیں، جبھی تو گھر کے رکھ رکھاؤ کے باوجود وہ اسے گھر نہ بنا سکتی تھیں۔

لیکن ادھر جاناں آئی ادھر گھر میں رنگدار اور ریشمیں کپڑے جھلملانے لگے۔ چوڑیوں کی جھنکار سنائی دینے لگی۔ نازک بندے ہوائیں جھولنے لگے۔ خس اور چنبیلی کے عطر کی خوشبو پھیلتی گئی اور مہندی کی خوشبو کٹوروں سے نکل کر انگلیوں میں آ بسی۔ دیئے کی سیاہی طاق سے نکل کر آنکھوں میں چمکنے لگی۔ واحد علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آنا شروع ہو گئی۔ کبیر علی کی مریض آنکھوں میں زندگی کی ہوس چمک بن کر لہرائی۔ اور یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے گھر میں عورت آ گئی ہے۔

کہتے ہیں زندگی کی ہوس چمک بن کر آنکھوں میں اس وقت لہراتی ہے۔ جب زندگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا ہو۔ اور کبیر علی اس ذیل میں آتا تھا یا نہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جاناں پر ہسٹیریا کے دورے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اکثر کبیر علی کی طرف دیکھ کر وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی اور پھر بھاگ کر چارپائی پر لیٹ جاتی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھتے دیکھتے بیہوش ہو جاتی۔

گھر کی اس آبادی پر واحد علی میں بھی چند ایک تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ لیکن وہ تبدیلیاں اس قدر مبہم اور گہری تھیں کہ انہیں ایک بے نام اضطراب کے سوا اور کچھ محسوس نہ ہوتا تھا۔ کئی بار جب وہ اس بھرے پرے گھر میں داخل ہوتے تو دفعتاً انہیں

محسوس ہوتا کہ وہ اکیلے ہیں۔ اور اتنے بڑے گھر میں یہ مختصر سی رونق بیحد تھوڑی ہے۔ چاناں کے آنے سے جو ایک چھوٹی سی آبادی پیدا ہوئی تھی۔ اس وسیع مکان کے ایک بہت بڑے حصے کو ویران کر گئی تھی۔ نہ جانے اس مبہم سے احساس کی وجہ سے یا کیوں؟ واحد علی نے مکان کے بند حصوں کو کھلوایا انہیں صاف کروایا تاکہ قابل رہائش ہو سکیں۔ اپنے وقت کا بڑا حصہ ان ویران کمروں میں بیٹھ کر گزارنا شروع کر دیا۔ شاید وہ انہیں آباد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یا شاید اپنے دل کی ویرانی کے مبہم احساس کو جھٹلا رہے تھے۔ بہر حال انہوں نے اپنی بیٹھک میں بیٹھنا کم کر دیا۔ بیٹھک میں نہ بیٹھنے سے ان کا اضطراب اور بھی بڑھا۔ اور وہ گھر میں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں پھرنے لگے۔

ایک دن وہ یونہی گھومتے گھامتے تہ خانے میں جا نکلے۔ اور ایک کونے میں پرانی کتابوں کے ڈھیر پڑے دیکھ کر چونکے یہ وہ قلمی کتابیں تھیں جو انہوں نے کبیر علی کو مطالعہ کے لئے دی تھیں۔ تاکہ وہ انہیں دیکھ کر معلوم کرے کہ ان میں سے کون کون سی کام کی ہیں۔

اگلے روز انہوں نے اپنی پڑھنے والی عینک صاف کی۔ قلمدان کو سنوارا اور چوبارے پر جا بیٹھے۔ لیکن انہیں وہاں بھی اطمینان حاصل نہ ہوا۔ وہ سنوارا ہوا قلمدان اور صاف کی ہوئی عینک انہیں اور بھی مضطرب کر رہے تھے۔ اسی اضطراب میں وہ نیچے اتر آئے۔ نحیف و نزار کبیر علی آنکھیں بند کئے بے سدھ پڑا تھا۔ دوسرے پلنگ پر چاناں لیٹی کالی چھت کی طرف گھور رہی تھی۔ جیسے اس بوسیدہ اور دھندلی چھت کے آئینے میں اپنا مستقبل دیکھ رہی ہو۔ "اعظم!" واحد علی نے آواز دی۔ چاناں چونک کر اٹھ بیٹھی۔ خوشبو کی ایک لپٹ سی آئی اور واحد علی نے منہ موڑ لیا۔ "اعظم! ذرا لالٹین جلا کر میرے ساتھ تہ خانے تک چلو، وہاں کتابیں دیکھنی ہیں۔" لیکن اس وسیع دالان میں ان کی آوازیں کھو گئیں۔ جیسے اُس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ جواب میں سناٹا پا کر انہوں نے منہ موڑے موڑے چاناں سے کہا۔ "بی بی! اعظم کہاں گیا ہے؟" چار ایک منٹ کی مسلسل خاموشی کے بعد دفعتاً انہوں نے منہ موڑ کر دیکھا تو چاناں لالٹین لئے پاس کھڑی تھی۔ وہ چونک پڑے۔ "اعظم نہیں ہے — ؟ — وہ کمبخت ......" انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ "اچھا لالٹین بھی جلالی ہے!" اور یہ کہہ کر وہ اضطراری کیفیت میں تہ خانے کی طرف چلنے لگے۔

واپسی پر چاناں تھکی سے آ کر پلنگ پر گر پڑی۔ اس نے ایک حسرت بھری نگاہ کبیر پر ڈالی جو چارپائی پر آنکھیں بند کئے بے سدھ پڑا تھا۔ ایک موہوم سی آہ کے ساتھ وہ پھر اس کالی

چھت کو گھورنے لگی۔ پلنگ کے پاس پڑی ہوئی لالٹین جلتی ہی رہی۔ چولہے پہ رکھی ہوئی ہنڈیا یک بیک کھدبدانے لگی۔ صحن میں گڑا ہوا تنور سرخ ہو کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور وہ چولی کی توں پڑی دھوئیں سے اٹی ہوئی چھت کی طرف تکتی رہی، تکتی رہی ——

چوبارے پر جاکر واحد علی نے عینک صاف کی، قلمی کتاب کو کھولا۔ اور پھر رکھ دیا۔ قلم کو سیاہی میں ڈبو دیا، ناخن پر اسے آزمایا اور قلمدان میں رکھ دیا۔ پھر سے کتاب اٹھالی۔ لیکن فوراً اسے رکھ کر عینک صاف کرنے لگے۔ پھر دفعتاً حقے کی طرف دیکھ کر مسکرائے "اہم"۔ ان کی آواز گلی میں گونجی۔ اور وہ خود ہی چونک پڑے۔ انہوں نے محسوس کیا جیسے پورہ والے چاروں طرف گوش بر آواز بیٹھے ہیں۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور دالان جانے میں کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔ پھر گھومتے گھامتے واپس آکر بیٹھ گئے "اِیں!" وہ چونکے۔ قلمی کتاب کے سر ورق پر معظم پورہ کا نام جلی قلم سے لکھا ہوا۔ انہوں نے جلدی جلدی ورق الٹا دوسرے ورق پر لکھا تھا۔ "حکایاتِ معظم پورہ مرتبہ عظمت علی راست قلم۔ "اہیم۔ ہم۔ ہم" ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ جیسے وہ اونچی کھنکار سے پورہ والوں سے انتقام لے رہے ہوں۔ پھر وہ کتاب کے مطالعہ میں کھو گئے۔

شام کے وقت وہ حقہ لے کر کبیر علی کے پاس آ بیٹھے کھنکار کر گلا صاف کیا حقے کے دو کش لیئے اور بولے "کبیرا ہمیں اپنے خاندان کی تاریخ مل گئی۔ ہم صدیقی ہیں صدیقی اہیم —— !! ہمارے بزرگ شیخ عظمت علی سیدھے عرب سے یہاں آئے۔ اور اس شہر کی بنیاد ڈالی معظم پور اس کا نام رکھا۔ بعد کے جاہلوں نے اسے بگاڑ کر موجو پورہ کہنا شروع کر دیا۔ اہم —— !!" بیچارہ کبیر علی آنکھیں بند کئے کراہ رہا تھا لیکن واحد علی اس کراہ سے الگ ہو کر معظم پور کی حکایات دہرائے جا رہے تھے۔

دالان سے نکل کر وہ حکائتیں بیٹھک میں جا پہنچیں۔ بیٹھک سے گلی میں اور گلی سے بازار میں۔ جنہیں سن کر تنور پر عورتیں جمع ہو گئیں۔ بازار میں مردوں کے ٹھٹ لگ گئے سگھر میں واحد علی کی کھنکار گونجنے لگی۔ اس کھنکار کا صوتی اثر کچھ ایسا تھا۔ جیسے حلق میں کوئی صدیقی، صدیقی!! کہہ رہا ہو۔ پورہ بھر میں صرف جاتاں ہی ایسی تھی۔ جو معظم پور کی حکایات سے متاثر نہ ہوئی۔ ویسے ہی پلنگ پر پڑے پڑے، دھوئیں کی کالک سے اٹی ہوئی چھت کو گھورتی رہی اور کبیر علی کی طرف دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتی رہی۔

واحد علی "حکایات معظم پور" کی گوناگوں دلچسپیوں کے باوجود پریشان سے تھے۔ ان کا اضطراب "اہیم" بن کر گونجتا۔ تو اپنی آواز سن کر وہ آپ ہی چونک اٹھتے چاروں

طرف دیکھتے۔ اور پھر مطمئن دکھائی دینے کی کوشش کرتے۔

پہلے وہ چھوٹے موٹے کاموں کے لئے اعظم کو آواز دیا کرتے تھے۔ لیکن چند دنوں سے یہ عجیب اتفاق ہو رہا تھا کہ جب بھی انہیں کوئی کام کروانا ہوتا اور اعظم موجود نہ ہوتا تو وہ جاناں کو آواز دینے کے لئے مجبور ہو جاتے۔ وہ اسے بی بی کہا کرتے تھے۔ لیکن نجانے کیوں؟ "بی ——" کہنے کے بعد دفعتاً رک جاتے۔ ادھر جاناں اُن کی آواز سننے کے باوجود جوں کی توں پڑی رہتی حتیٰ کہ کبیر علی کروٹ بدل کر جاناں کی طرف غور سے دیکھنے لگتا۔ اسی طرح کئی مرتبہ واحد علی کو بی —— پر رک جاتے ہوئے اور جاناں کو جوں کی توں پڑے رہتے ہوئے دیکھ کر اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور نجانے کب تک وہ دیکھا کیا، دیکھا کیا۔

دوسرے دن اعظم نے جب جاناں کو حسب معمول بی بی کہہ کر پکارا تو واحد علی چونکے۔ انہوں نے کتاب تخت پوش پر اُلٹی کر کے رکھ دی۔ عینک اُتار کر صاف کی اور اعظم کو بلا کر کہنے لگے "اسیم! اعظم! تم بڑے خاندان کے لڑکے ہو تمہیں بی بی کہہ کر بلانا اچھا نہیں لگتا۔ کہو بی بی جان —— بی بی جان" انہوں نے وضاحت سے سمجھانے کے لئے دہرایا۔ پھر چند لمحوں کے بعد —— وہ کھنکار کر کہنے لگے "بی - جان ذرا چلم میں آگ بھر دینا" یہ سنکر اعظم چونکا کیونکہ چلم میں آگ بھرنا تو اُسی کا فرض تھا۔ ادھر مریض نے بھی کروٹ لی اور غور سے جاناں کی طرف دیکھا حتیٰ کہ جاناں اُٹھ کر آگ بھرنے پر مجبور ہو گئی۔

اس کے بعد واحد علی کے گھر میں پے بہ پے تبدیلیاں آنی شروع ہو گئیں۔ اُن کے "اسیم —— " واضح اور پُر زور ہوتے گئے۔ بات بات پر خاندانی وقار کو قائم رکھنے کی ہدایتیں دی جانے لگیں۔ بیٹھک میں صدیقی خاندان کی رسومات بیان ہوتی رہیں۔ بیٹھک میں بیٹھنا روز بروز منسوخ ہوتا گیا۔ یوں بیٹھک میں بیٹھ کر عام لوگوں کی باتوں میں وقت ضائع کرنا خاندانی آدمیوں کو زیب نہیں دیتا۔ مطالعہ ہی ایک اعلیٰ شغل ہے چنانچہ وہ چوبارے میں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے۔

چوبارے پر سے انہوں نے اُس کھڑکی کی طرف دیکھا جو اُس روز سے ویسے ہی بند پڑی تھی۔ نہ جانے اُن پر کیا اثر ہوا بھاگے بھاگے نیچے آئے۔ "کبیر علی! یہ کھلے دروازے اور کھلی کھڑکیاں —— ؟ بہت جاہلیت بات ہے۔ اس طرح رہنا صدیقیوں کا شیوہ نہیں [illegible] —— جان [illegible] انہوں نے جاناں [illegible] کر بلایا [illegible]

لئے چقیں پڑنی چاہئیں۔ اور باہر کا بڑا دروازہ ہر وقت بند رہنا چاہئے۔ ہر آدمی منہ اُٹھائے اندر چلا آتا ہے۔ انسان کبھی کسی حالت میں بیٹھا ہوتا ہے کبھی کسی میں اپنے گھر ہی میں۔ اپنے گھر ہی میں آزادی نہ ملے تو گھر خاک ہوا۔ اور ہاں!۔ لڑکانیاں باہر مردانے میں کھانا پکایا کریں اور وہیں رہا کریں۔ وہ جگہ ویران پڑی ہے۔۔ فضول۔" یہ سُنکر جاناں کے ہونٹوں میں ایک موہوم سی جنبش ہوئی۔ جسے محسوس کر کے کبیر علی چونک اُٹھا اور پھر کھانسنے لگا۔

لڑکانیوں نے واحد منزل کے مردانے میں رہنا شروع کر دیا گھر کے بڑے دروازے پر لکڑی کی بلی لگا دی گئی۔ کھڑکیوں پر چقیں لٹکنے لگیں۔ مریض کا کمرہ الگ کر دیا گیا۔ اعظم اور صفیہ کے لئے ایک علیحدہ کمرہ مخصوص کر دیا گیا۔ اور بی بی جان کیلئے" لیکن وہ تو گھر کی مالک ہے۔ خاندان کا وقار اسی کے دم سے قائم ہے وہ جہاں جی چاہے رہے" واحد علی نے کبیر کو سمجھانے کی کوشش کی اور کبیر سوچ میں پڑ گیا۔ واحد علی سمجھاتے رہے اور وہ سوچتا رہا۔ آخر وہ تھک کر بولے" کیوں کبیر! کیا خاندانی عزت اور وقار کے لئے ہر قربانی دینی نہیں چاہئے؟۔ میرا مطلب ہے۔" ہاں" وہ بولا۔" خاندانی وقار" اور اُسے کھانسی کا طویل دورہ پڑ گیا۔

اگلے روز جب جاناں اُس کے کمرے میں گئی تو وہ چپ چاپ، بے سدھ سا پڑا ہوا تھا۔ پہلے تو جاناں اُسے بلاتی رہی۔ پھر پاس آ کر دیکھا تو ایک چیخ نکل گئی۔ پل بھر میں سارا گھر اکٹھا ہو گیا۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا حکیم آئے مگر کبیر نے آنکھ نہ کھولی۔ پورے شہر میں چرچے ہونے لگے۔ گلی میں، بازار میں، ہر جگہ، ہر کسی کی زبان پر کبیر علی کا تذکرہ تھا۔ کوئی کبیر علی کی شرافت کی بات کرتا اور کوئی جاناں کی مصیبت کی۔ ایک نے کہا" خاندانی وقار کا بڑا خیال تھا بیچارے کو۔ اُس کی چارپائی کے پاس دیوار پر موٹے حروف میں" وقار" لکھا تھا۔" دوسرا بولا۔ کہتے ہیں غلطی سے مالش کی دوائی پی لی۔ تقدیر کا لکھا کون موڑ سکتا ہے"۔ تنور پر ایک آواز سنائی دی۔ لیکن اس وقت بیوی کہاں تھی۔ اپنے ہاتھ سے ہی پلاتی دوائی"۔

واحد علی نے کبیر کی موت پر کوئی رسم نہ ہونے دی۔ حتیٰ کہ گلی محلے کی عورتوں کو بھی گھر میں نہ آنے دیا کیونکہ ایسی باتیں ایک صدیقی کے لئے شایان شان نہ تھیں۔ تقدیر کا لکھا پورا ہو چکا تھا۔ اب ماتم کرنا کفر تھا۔ البتہ سوگ کے دن بیت جانے پر انہوں نے چند ایک بزرگوں کو اکٹھا کیا اور کہا۔ کہ لڑکی کی عمر برباد کرنا اچھا نہیں۔ اور چونکہ اس گھر کا وقار اُسی سے قائم ہے، اس لئے اُسے گھر میں وہی پہلا مرتبہ حاصل رہے گا۔ بیاہ اللہ

ہے کہ لڑکی کا نکاح چھوٹے لڑکے صغیر علی سے کر دیا جائے۔" اور محلے والوں نے سبحان اللہ سبحان اللہ کا شور مچا کر بات پکی کر دی۔ اگرچہ عملی طور پر اس کا طے ہونا ابھی ممکن نہ تھا۔ کیونکہ جاناں پورے دنوں سے تھی۔ جاناں دو ایک دن تو چپ چاپ پڑی اُس کالی چھت کو گھورتی رہی پھر دفعتاً یوں اٹھ بیٹھی جیسے مدتوں سے کیچڑ میں پھنسی ہوئی ناؤ بہہ نکلی ہو۔ اُس کے پاؤں میں سبک روی پیدا ہو گئی۔ بُندے ہوا میں جھولنے لگے۔ لباس سمٹ کر جسم کے ساتھ جا لگا اور خس کی خوشبو اڑانے لگا۔ پھر جب اُس نے سُنا کہ اُس کا نکاح صغیر سے ہونے والا ہے۔ تو اُس کے ہونٹوں نے ایک شرارت بھری مسکراہٹ کو بھینچنے کی کوشش کی اور وہ گھر کے کام کاج میں کھو گئی۔ شام کو واحد علی نے گھر والوں کو اکٹھا کیا اور اعلان کر دیا کہ "آئندہ سے بی جا آن کا نام وحیدہ ہو گا۔ جاناں بھی کوئی نام ہے۔ صدیقی خاندان میں ایسے ویسے نام نہیں ہونے چاہئیں۔" لڑکا پیدا ہوا تو اس کا نام وقار علی رکھا گیا۔ اس سے بہتر نام اور کیا ہو سکتا تھا۔ خاص طور پر جب کبیر علی نے دیوار پر لکھ کر اشارتاً یہ بات یوں واضح کر دی تھی۔ جیسے یہ اس کی وصیت تھی۔ ادھر نکاح کے بارے میں صغیر علی کی ہچکچاہٹ روز بروز واضح ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ ایک دن باپ بیٹے میں تکرار بھی ہو گئی۔ "بے وقوف!" واحد علی چلائے "تمہیں خاندانی وقار کی بھی پروا نہیں۔" "آپ ہاتی باتوں میں خاندانی وقار کو خاطر میں کیوں نہیں لاتے؟" صغیر دبی آواز میں بولا۔ "ہاتی باتیں؟" واحد علی نے حیرت سے پوچھا۔ "ہاں!" وہ بولا "مجھے یہاں معظم پور میں نہیں رہنا چاہیے۔" واحد علی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ "ہمارے بزرگ عالم تھے اور میں دسویں پاس کر کے گھر بیٹھا ہوں۔ اہم" واحد علی نے فاتحانہ انداز میں کھنکارا۔ "تو نکاح کے بعد تم تحصیل علم کے لئے چلے جاؤ۔ ہاں ہاں واقعی یہ بات خوب ہے خوب ہے" اور اس کے بعد پندرہ میں علم اور خاندانی وقار کا خوب خوب چرچا ہوا۔ جیسے سنکر واحد علی کی کھنکار اور بھی بلند اور گہری ہو گئی۔ وحیدہ [illegible] ہوگئے ہونٹ [illegible] اور اس کی گود میں وقار نے مسکرانا سیکھ لیا۔ گھر کے لئے نئی چیزیں خریدی گئیں۔ [illegible] سے پر نئی بیل لگا دی گئی۔ مکان کا نام واحد منزل کی بجائے وقار منزل رکھا گیا۔

جوں جوں واحد علی خاندانی وقار کا پرچار کرتے گئے۔ وحیدہ کی مسکراہٹ واضح ہوتی گئی۔ اُس کی چال میں لچک [illegible] میں چمک پیدا ہوتی گئی۔ جوں جوں وحیدہ کی باتوں میں لوچ اور کپڑوں میں رنگ آتا گیا۔ واحد [illegible] احساس، وقار اور [illegible]

گیا۔ "بی جاآن! کھڑکی میں کھڑا رہنا اچھا نہیں۔ ایسا کرنے سے ہماری عزت پر حرف آتا ہے۔ بی جاآن عورتوں کو گھر مت آنے دیا کرو۔ کہاں تم کہاں یہ" ان کی باتیں سن کر وحیدہ کی گود میں کھیلتا ہوا وقار ہنسنے لگتا۔ جیسے وہ ان کی ماہیت سے واقف ہو۔ "شیطان!" وہ چلاتے۔ "ابھی سے ہماری باتوں پر ہنستا ہے۔ ابھی بچہ ہے نا خاندانی وقار کو نہیں سمجھتا۔" "وقار۔ وقار" منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا چیختا۔ "وقار۔ وقار" پرے کی مسجد کے مینار سے موذن کی آواز سنائی دیتی۔ "وقار وقار وقار وقار وقار" پھر وہ کی چکی چلاتی۔ احمد علی چونک اٹھتے اور ایک ساعت کے لئے واحد علی محسوس کرتے گویا وہ سب انہیں چڑا رہے ہوں۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے اور انہیں یوں لگتا جیسے چاروں جانب اک طوفان موجیں مار رہا ہے اور اس طوفان کے درمیان وہ خود کیچڑ میں پھنسی ہوئی کشتی کو کھینے کی کوشش کر رہے ہوں۔ "وقار وقار!" کشتی کے چپو کیچڑ سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتے۔ چاروں طرف سے گھنا اندھیرا امڈا چلا آرہا تھا۔ اور درمیان میں ایک چھوٹا سا معطر چراغ جل رہا تھا۔ "چراغ نہیں بجھیگا!" انہوں نے دانت پیس کر کہا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اسے ڈھانپ لیا۔ "بی جاآن تم کھڑکی میں کھڑی نہ ہوا کرو۔ عورتوں سے نہ ملا کرو۔ تمہیں خاندانی وقار کا خیال رکھنا چاہئے۔" ہی ہی ہی ہی۔ وقار ہنستا۔ اور وحیدہ مسکرا دیتی۔

ہجوم

سیزر کے قتل کی خبر پا کر مشتعل ہجوم روم کے بازاروں میں سے گذر رہا تھا۔ ایک آدمی ہجوم کے سامنے سے گذرا۔

"تم کون ہو؟" ہجوم میں سے کوئی پکارا

"میرا نام سینا ہے" گذرنے والے نے جواب دیا

"اسے قتل کر دو۔ یہی غدار سینا ہے" ہجوم میں سے ایک آدمی چلا اٹھا۔

"میں غدار سینا نہیں۔ شاعر سینا ہوں"

"یہ شاعر ہے۔ لیکن سینا کیوں ہے۔ اسے بھی قتل کر دو۔"

اور ہجوم گذرنے والے پر خونخوار بھیڑیے کی طرح جھپٹ پڑا۔

بشیر رومانی

سُورما

(نکرتونسوی نے ایک عجیب و غریب کتاب مرتب کی ہے "خد و خال"۔ اس میں ہندوستان کے بیس ترقی پسند افسانہ نگاروں کے کیریکٹر اسکیچ شامل ہیں۔ اس میں فنکاروں کا فن نہیں۔ بلکہ شخصیت پیش کی گئی ہے۔ "سورما" اسی مجموعے کا ایک اسکیچ ہے)

ممتاز مفتی کے بارے میں کچھ کہنا آسان نہیں۔ آپ کسی اسکول میں چلے جائیں۔ جہاں وہ پڑھاتا رہا ہے۔ اور اس کے متعلق پوچھیں۔ تو ان کے شاگرد کہیں گے۔ "اُن کی باتیں؟ کیا بات ہے اُن کی باتوں کی مگر ان کا ڈنڈا۔ توبہ ہے!!" اساتذہ مسکرا دیں گے۔ "ہاں یار تھا تو آدمی، مگر کچھ عجیب سا تھا۔" ہیڈ ماسٹر اطمینان بھرا سانس لیگا۔ "خیر اب تو یہاں سے چلا گیا چھوڑیئے اس بات کو۔" آل انڈیا ریڈیو کے کسی رکن سے پوچھیے۔ "وہ شخص؟ خصوصیت تو خیر۔ ویسے خوب آدمی ہے۔ اچھا ہی ہے۔ میرا مطلب ہے آپ سمجھتے ہی ہیں نا۔" "نیا ادارہ" میں بات چھیڑیئے۔ ان کی آنکھوں میں چمک لہرا جائیگی۔ "ممتاز مفتی — ممتاز مفتی، ممتاز مفتی ہی ہے۔ ہاں ذرا پیسوں کے معاملے میں۔ لیکن خیر حاجت مند کون نہیں"۔ اس کے والد سے بات کیجیے۔ ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو جائیں گے۔ پھر حقّے کا ایک لمبا کش سا لے کر کہیں گے۔ "اب تو جو ہونا تھا۔ ہو چکا۔ ہاں اگر وہ اتنا خود سر نہ ہوتا۔ اور عقل سے کام لے سکتا۔ تو اس کی زندگی سنور ہی جاتی۔" اس کی پہلی بیوی سے بات کی جاتی۔ تو وہ ہنس دیتی۔ "اچھا۔ تو آپ انہیں مرد سمجھتے ہیں"۔ اور دوسری بیوی سے پوچھیے۔ تو وہ ہونٹ پر انگلی رکھ لے گی۔ "ان کی بات کر رہے ہیں آپ؟ ان کی کیا بات ہے!"

ممتاز مفتی کی ان [illegible] سنجیدگی کا امتزاج ہے۔ [illegible] آدمی ہے تو چہرہ کھل کھل جائیں آنکھیں بڑا سا سر۔ بات کیجیے تو آپ حیران رہ جائیں گے [illegible] ان کی ایک لہر آپ کی رگ رگ میں [illegible] جائیگی [illegible] باہر [illegible] آئیگی۔

کسی موضوع پر چاہے وہ کتنا ہی مضحکہ خیز ہو۔ اس کی رائے دریافت کیجیے۔ تو نہایت خلوص اور دیانتداری ۹
سے آپ کی ہاں میں ہاں ملا دیگا۔ اس کی موجودگی میں کسی معاملے پر بحث کر لیجیے۔ چپکا بیٹھا سنتا رہے گا اس سے استفسار کیجیے۔ تو آپ کی ہنسی نکل جائیگی۔ کیونکہ وہ آپ کے اور آپ کے مخالف کے ساتھ بیک وقت اتفاق کر رہا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ نکتۂ متنازعہ فیہ آپ کی حیرانی اور ہنسی کے درمیان کہیں کھو جائیگا۔ اگر آپ ذرا سنجیدہ قسم کے انسان واقع ہوتے ہیں۔ تو آپ کو غصہ آنے لگیگا۔ یا آپ اسے مشکوک نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔

ممتاز مفتی کو آپ اس روپ میں صرف اسی صورت میں دیکھیں گے۔ جبکہ آپ کی اس سے محض رسمی ملاقات ہو۔ لیکن اگر آپ اس کے دوست ہیں۔ پناہ بخدا! کاش کہ میں اور ممتاز مفتی محض شناسا ہوتے، دوست نہیں۔ جب میں اس سے پہلی مرتبہ ملا۔ تو وہ چارپائی پر بیٹھا طبلہ بجا رہا تھا۔ رسمی تعارف کے بعد اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ "مزاج اچھے ہیں؟ تشریف رکھیے۔" اور پھر سے طبلہ بجانے میں منہمک ہو گیا۔ "یہ ہے ممتاز مفتی؟" میں نے سوچا۔ اب اکثر مجھے محسوس ہوتا ہے۔ کہ ممتاز مفتی شاید مجھ سے اس ان کہے فقرے کا انتقام لے رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ان دونوں میں سے حقیقی ممتاز مفتی کونسا ہے۔ وہ جو کچھ سال پیشتر مجھ سے متعارف ہوا تھا۔ اور مہینوں محض واقف کار کی حیثیت سے ملتا رہا یا یہ جو اس وقت میرے پاس بیٹھا ہے۔ اور دوستی کا دم بھر رہا ہے۔

دوستی کی ابتدا میں وہ آپ کی شخصیت میں انوکھے گن دیکھے گا۔ اور ان کا آپ سے بے تکلف اظہار کریگا، ایسے انوکھے گن جن کے وجود کا آپ کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا آپ سمجھیں گے کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ اور آپکو یقین نہیں آئیگا۔ لیکن اثر قبول کئے بغیر اس کی باتوں کے رنگین جال سے نکل جانا کچھ آسان کام نہیں۔ اس کی دلیل کا رنگ عجیب ہوتا ہے۔ "بے تعلقی، بے تکلفی اور سرِ راہے" اس کی گفتگو کی تین خصوصیات ہیں۔ بظاہر وہ آپ کی شخصیت کی کسی خامی کے بارے میں بات کریگا۔ لیکن بات کی تہ میں آپ کی شخصیت کی کسی انوکھی خوبی کی طرف اشارہ ہوگا۔ اور اس رنگین اشارہ کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس خوبی کے انوکھے پن اور منفرد نقطہ نگاہ کی شگفتگی کی وجہ سے آپ حیران کھڑے رہ جائیں گے۔ وہ نیا گن نہ جانے کہاں سے چپکے چپکے آپ کی شخصیت میں ابھر آئے گا۔ کچھ دیر کے بعد آپ کو اپنے اندر اتنے نئے گن محسوس ہونے لگیں گے کہ آپ اپنے کردار کے انوکھے پن پر شیدا ہو جائیں گے۔

آپ یہ دیکھ کر متعجب ہوں گے۔ کہ آپ کوئی عجیب ترین شخصیت ہیں۔ چنانچہ آپ کے اندر ایک نیا کردار پیدا ہو جائیگا۔ جب یہ نیا کردار آپ کے معمولات پر چھا جائیگا۔ تو مفتی دفعتاً آپ کی کمزوریاں دکھانے لگیگا۔ آپ کی ہر بات کا تجزیہ کریگا۔ اور آپ کی شخصیت کے کھوکھلے پن کو اس شدت سے ریزہ ریزہ کر دیگا۔ کہ نئی شخصیت استوار ہونا تو کجا آپ کی پہلی شخصیت بھی کچی دیوار کی طرح بیٹھتی ہوئی محسوس ہوگی۔ اور آپ کے اندر ایک بے پناہ اداس خلا پیدا ہو جائے گا۔ آپ اس اداس خلا کو تجسس سے پر کرنے کی کوشش کیجئے

مگر اس سے الجھنوں میں اضافہ ہو جائیگا۔ آپ چاہیں گے کہ اس کی پھینکی ہوئی کمند کو اتار پھینکیں۔ اسکی باتوں کو بے وقعت بنا دینے کی کوشش کریں۔ جی چاہے گا۔ کہ آپ اس سے کہیں دور بھاگ جائیں۔ مگر آپ بے بس ہو چکے ہونگے آپ اس کی باتوں کو سننے کی کوشش کریں گے۔ ان کا مذاق اڑانا چاہیں گے۔ مگر اس کی باتیں زبردستی آپ کے اندر قیام کر چکی ہونگی۔ آپ پر چھا چکی ہونگی۔ آپ بے حد مظلوم اور مجبور ہو جائیں گے لیکن آپ کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہوگی۔ کہ اس کا یہ نیا رُخ آپ کو اور بھی متاثر کر دیگا۔ آپ کے دل میں اس کے لئے ایک خاص جگہ پیدا ہو جائیگی۔ اور آپ پھر اس کی طرف بھاگنا چاہیں گے۔ آپ کا جی چاہے گا۔ کہ آپ پر یہ ظلم ہوتا رہے۔ اور بھی۔ اور بھی۔

ممتاز مفتی ایک حالتیں بدلنے والا کیڑا ہے۔ میں گرگٹ کا لفظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے پہل تو وہ آپ کو محض ایک کیڑا سا نظر آتا ہے۔ پھر آپ محسوس کرتے ہیں۔ کہ وہ کیڑے کی طرح رینگ رہا ہے اور آنکھ کے جھپاکے میں آپ دیکھتے ہیں۔ کہ وہ ایک پھدکتا ہوا سنپولیا بن کر آپ کے گرد دھنڈلا رہا ہے اپنی عجیب کیفیتوں کی وجہ سے اس کے بارے میں لوگوں کے خیالات بہت مختلف اور دلچسپ ہیں۔

آپ مفتی سے اس کے اپنے بارے میں دریافت کریں۔ تو وہ کندھے سکوڑ کر کہیگا: "اوہ! میں؟ یعنی — میرا مطلب ہے۔ آپ میرے بارے میں پریشان کیوں ہوتے ہیں — ؟" لیکن اگر آپ اس کی ڈائری دیکھیں۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ وہ اپنے بارے میں واقعی پریشان ہوتا رہا ہے۔ اس کی ڈائری کا ایک ورق ملاحظہ ہو۔

ملتان :-

"میں"

"سندباد جہازی کی طرح میرے کندھوں پر بچپن کا بڈھا سوار ہے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ لوگ اس بھید سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ اور مجھ پر ہنستے ہیں۔ مدت تک میں کوشاں رہا۔ کہ لوگ مجھے ایک سنجیدہ آدمی سمجھیں۔ اور مناسب اہمیت دیں۔ لیکن اس مسلسل کوشش کا صرف یہی نتیجہ ہوا۔ کہ میرے ماتھے پر ایک تیوری سی اُبھر آئی۔ اور اب میں اسے مٹانے کی ناکام کوشش میں لگا رہتا ہوں۔

میری طبیعت بے ہنگم، بے لگام اور بے صبر ہے۔ اس میں روانی نہیں نظم نہیں، ضبط نہیں میری طبیعت میں بنیادی طور پر جو جذبہ کارفرما ہے۔ وہ جھجک اور کمتری ہے۔ مجھ میں باقاعدہ چلنے کی ہمت نہیں۔ ہاں کبھی کبھی بہک کر بے تحاشا دوڑ پڑتا ہوں۔

میری شخصیت پر عورت کا عنصر وضاحت کے ساتھ غالب ہے۔

اگر میرا ذہن ایک پکی سڑک ہے تو دل ایک الجھی ہوئی پگڈنڈی۔ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں جس کی وجہ سے میری طبیعت میں توازن نہیں۔ ربط نہیں سکون نہیں۔ ہر گھڑی ایک کشمکش سی رہتی ہے

میں بے حد ڈرپوک ہوں۔ اور بسا اوقات اس خوف سے کہ میرا پول نہ کھل جائے۔ احمقانہ دلیری کے کام کر دکھاتا ہوں۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ اور اسی لئے اس کی شان میں گستاخی کرنے سے مجھے تسکین ملتی ہے۔ دل ہی دل

دنیا سے ناواقف ہوں۔ اور اس بات پر مجھے اپنے اوپر بڑا غصہ آتا ہے۔ چنانچہ میں قطعی بے پروا ہو کر دنیاداری کو اخلاقاً ایک عظیم گناہ سمجھتا ہوں۔ بلندیوں سے اس قدر ڈرتا ہوں۔ کہ اگر مجھے کسی اونچی چٹان پر بٹھا دیا جائے۔ تو میں اس ڈر سے بچنے کے لئے کہ گر نہ پڑوں۔ اپنے آپ کو نیچے گرا دوں گا۔ عورت سے ڈرتا ہوں۔ اور اس کی طرف کھچا جاتا ہوں عشق ہو جائے۔ تو محبوب کو ملنے کی بجائے میری خواہش ہوتی ہے۔ کہ اپنے آپ کو فنا کر دوں۔ میری محبت کی گاڑی شک اور کمتری کے پہیوں پر چلتی ہے۔ محبوبہ کے نقاب کا ہر تار مجھے ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مجھے کنواری لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں کسی طیار کی ایک مستغنی نظر پہ دوشیزگی، نوخیزی، معصومیت اور الہڑپن تج دینے کو تیار ہوں۔ مجھے بدمعاش عورت سے عشق ہے۔

میرا ذہن قومی، مذہبی، خاندانی اور رسمی تعصبات سے خالی ہے۔ میں عزت اور خودداری کے جذبات سے قطعی کورا ہوں۔"

ممتاز مفتی

اگرچہ آج کا ممتاز مفتی کل کے ممتاز مفتی سے مختلف ہے۔ لیکن بنیادی طور پر بالکل وہی ہے۔ بچپن میں وہ سوتیلی ماؤں کے زیر پرورش رہا۔ چنانچہ اس نے عمر کا پہلا حصہ اس غصے کے خلاف جہاد کرنے میں گذارا جو اسمیں کثرت ازدواج کے خلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس ماحول میں بچپن گذارنے کی وجہ سے اس کی طبیعت میں ڈر اور غصہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور ان دونوں جذبوں پر اس کی شخصیت کی بنیاد رکھی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ بیحد شرمیلا اور چپ چاپ ہو گیا۔ جس سے اس کی کالج کی زندگی برباد ہوئی۔ یہ زمانہ اس نے الیمودی ماتٹی اور پیڈو بہادر کی خاموش فلمیں دیکھ کر، سستے سگریٹ پی کر، مونگ پھلی کھا کر اور کالج سے بھاگ کر گذارا۔ زندگی کا دوسرا حصہ اس نے ایک عورت کے اثر سے آزاد ہونے کی ناکام کوشش میں کاٹا۔ اور زندگی کی تیسری منزل افلاس کے خلاف لڑنے میں بسر کی۔ کیونکہ اسے پینتالیس روپے کی حقیر رقم میں آٹھ پیٹ پالنے پڑتے تھے۔ اور اب وہ زندگی میں پہلی بار مطمئن ہے۔

ممتاز مفتی مجلسی آدمی نہیں۔ وہ کسی کو ملنے سے بہت ہچکچاتا ہے۔ اسے گھر بیٹھے رہنے کا بیحد شوق ہے۔ اگر آپ اسے کچھ کتابیں، چائے، پان، کچھ کھانے کو، کبھی کبھار کوئی آدمی بات کرنے کو یا ایک ریڈیو سیٹ دے کر ایک جگہ مقید کر دیں۔ تو اُسے بہت دیر تک پتہ ہی نہ چلیگا۔ کہ وہ مقید ہے۔ اس کے برعکس اگر اُسے کسی ایسی جگہ رکھیں۔ جہاں بہت سے آدمی اور ہنگامے ہوں۔ تو وہ گھبرا کر کہیں بھاگ جائیگا۔

گھر کا شوقین ہونے کے باوجود وہ فرمانبردار خاوند اور گھریلو مرد نہیں۔

ممتاز مفتی وقت کے احساس سے قطعی آزاد ہے۔ اس کا کلاک کبھی ٹھیک وقت نہیں دیتا۔ کہا جاتا ہے کہ مشینری ہمیشہ اپنے چلانے والے کی ذہنیت کے مطابق خصوصیات پیدا کر لیتی ہے۔ بہت ہوا۔ کسی نے اس کے کلاک میں کوک بھر دی۔ تو عموماً صبح دس بجے سوئیاں تین پر ہونگی۔ اور گھنٹہ چھ بجائیگا۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ صبح دس بجے سوئیاں ٹھیک دس پر ہی ہوں۔ تو آپ یقین رکھیں۔ کہ گھڑی پر رات کے دس بج رہے ہیں

مقولہ ہے۔ کہ شہر اس مقام کو کہتے ہیں۔ جہاں لوگوں کو روپے کی قیمت کا اندازہ نہ رہے۔ اس لحاظ سے ممتاز مفتی مستقل طور پر شہر میں رہتا ہے۔ اسے فضول خرچی میں بڑی تسکین ملتی ہے۔ خصوصاً جب اس کا ہاتھ تنگ ہو۔ تو تسکین کی خواہش اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ زندگی بھر قرض ہی اس کی پونجی رہی ہے۔ لیکن تعجب ہے وہ کہیں نہ کہیں سے ادھار کا انتظام کر ہی لیتا ہے۔ آپ نے کیسا ہی عزم کیا ہو۔ کہ آپ اسے کچھ نہ دیں گے مگر وہ آپ سے مانگے گا ہی کچھ ایسے انداز میں کہ آپ اپنے سارے ارادوں کو یکسر بھول جائیں گے۔ خوش قسمتی سے اس میں خودداری نام کو بھی نہیں۔ اور اسی سے وہ اپنی سدا بہار غربت اور بدنامی کے قبیح نتائج سے بچا ہوا ہے۔

وہ خودداری کو ایک بہت بڑی خوبی سمجھتا ہے۔ مگر اس کا خیال ہے۔ کہ خودداری کا نہ ہونا بھی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔

دفتر جاتے ہوئے اسے اکثر خیال آتا ہے کہ چپڑاسیوں کو سلام کرنے کی عادت اچھی نہیں۔ اسے اپنی اس کمزوری پر غصہ آنے لگتا ہے۔ اور وہ فیصلہ کر لیتا ہے۔ کہ آج چپڑاسیوں کو سلام نہیں کریگا۔ ہاں ان کے سلام کے جواب میں صرف سر ہلا دیگا۔ جیسا کہ ایک خوددار آدمی کو کرنا چاہیئے۔ لیکن موقعہ آنے پر اس کا ہاتھ خود بخود اٹھ جائیگا۔ "آداب عرض!"

اگر اس کا افسر اس سے کہے۔ "دیکھیئے صاحب! آپ نہیں سمجھتے"۔ تو سوچے سمجھے بغیر اس کے منہ سے نکل جائیگا۔ "جی ہاں۔ جی ہاں"۔ پھر ملاقات کے بعد دفعتاً اسے احساس ہوگا۔ کہ چاہے وہ افسر ہے۔ لیکن اسے یہ نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ "میں نہیں سمجھتا۔ ہیں؟"

وہ اپنی حماقتوں کا اعلانیہ اظہار کرنے سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بلکہ اسے اپنی کئی ایک حماقتوں پر ناز ہے وہ دوستی محبت ایثار اور قربانی کو حماقتیں سمجھتا ہے۔ اور عام آدمی کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے خیال میں عام ذہین آدمیوں سے بہتر مخلوق ہیں۔ اس کے نقطہ نظر کے مطابق ذہنی قابلیت حاصل ہونے سے انسانیت کی خوبی کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ علم کو انحراف سمجھتا ہے۔ اور جذبہ کو صراط مستقیم۔ اس کی رائے میں زندگی کی تمام تر دلچسپی، رنگینی اور خوشی عوام کے دم قدم کا نتیجہ ہے۔

ممتاز مفتی حتی الوسع جھوٹ نہیں بولتا۔ مگر یہ خوبی عمدہ اخلاق کا نتیجہ نہیں۔ کیونکہ اس کے نزدیک جھوٹ سچ بولنے کا عمدہ اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا خیال ہے۔ کہ جھوٹ بولنے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب لوگوں کا ڈر غالب ہو۔ یا یہ خوف ہو کہ مخاطب میں سچائی برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔ چنانچہ ممتاز مفتی محض آپ کے جذبات اور احساسات کے احترام اور اخلاق کی خاطر جھوٹ بولنا گوارا کریگا اور جھوٹ بول کر آپ کی ذات پر بہت بڑا احسان کریگا۔ چونکہ ابتداً وہ لوگوں سے ڈرتا اور خائف رہتا تھا۔ اس لئے اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولنے سے نہیں جھجکتا تھا۔ مگر اب وہ جان گیا ہے۔ کہ جھٹ سے سچ بول دینا لوگوں کو

دھوکہ دینے کا کامیاب ترین ذریعہ ہے۔ اس میں رازداری کی اہلیت بیشک ہے۔ مگر وہ اس اہلیت کا استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔ آپ اُسے کسی بات کے راز رکھنے کی تاکید کر دیں۔ وہ بات اس کے سر پر سوار ہو جائیگی دل پر بوجھ سا بن جائیگی یہنتی کہ وہ راز فاش کر دینے پر مجبور ہو جائیگا۔ تاکہ اسے سکون مل سکے۔ اگر یہ بات آپ کے ناموس سے متعلق ہے۔ اور اس کا راز میں رہنا ضروری ہے۔ تو وہ کسی کو اعلانیہ تو نہیں بتائیگا۔ مگر چھپا کر بھی نہیں رکھ سکیگا۔ اس لئے وہ اسے یکسر بھول جائیگا۔ تاکہ اسے چھپانے کی زحمت سے چھوٹ جائے وہ ذہنی الجھنوں سے بہت ڈرتا ہے۔ اگر اسے بتایا جائے۔ کہ وہ نوکری سے برخاست کر دیا گیا ہے۔ تو وہ ایک لمحے کیلئے پریشان ہو جائیگا۔ مگر فوراً ہی اپنے آپ کو اس مشکل کے لئے تیار کر لیگا۔ اور اس طرح اپنی زندگی سے الجھن اور غم کو مٹا دیگا۔ تھوڑے ہی وقفے میں وہ اس تبدیلی کے لئے اس قدر تیار ہو چکا ہوگا۔ کہ اگر دوبارہ اطلاع پہنچے کہ وہ بحال کر دیا گیا ہے۔ تو وہ پریشان ہو جائیگا۔ اور اسے اپنی نئی سکیموں کے ضائع چلے جانے کا بہت دُکھ ہوگا۔

اس کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے۔ کہ وہ بڑے سے بڑے حادثے پر بھی سناٹے میں نہیں آتا۔ عزیز ترین دوست کی موت پر بھی اسے دھکا نہیں پہنچتا۔ ایسی خبر سن کر وہ خالی الذہن ہو جائیگا۔ اور اس کے برتاؤ سے مترشح ہوگا۔ کہ وہ غمزدہ نہیں۔ بلکہ کھویا کھویا سا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے غم اس کے احساسات میں سرایت کریگا قطرہ قطرہ ہو کر۔ اچانک اور فوری خوشی پر بھی اس کا طبعی توازن قائم رہتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے گرد تسکین و اطمینان کا ایک خول سا بنا رکھا ہے۔

وہ زیادہ بلند امیدیں اور توقعات استوار نہیں کرتا۔ تاکہ پوری نہ ہونے پر اسے دُکھ نہ پہنچے۔ کوئی مسرور کُن توقع ہو تو وہ اسے بھلا دیگا۔ بھول نہ سکے تو زیادہ اہمیت نہیں دیگا۔ اور دل ہی دل میں امید رکھے چلا جائیگا۔ کہ وہ توقع پوری ہو کر اسے ایک اچانک اور خوشگوار تعجب بخشے۔ اور اگر وہ پوری نہ ہو تو مایوسی کے صدمے سے اپنے آپ کو محفوظ کر لے۔

اسے سپنے دیکھنے کی عادت ہے۔ عام طور پر جب اسے سائیکل پر کہیں دُور جانا ہو۔ تو رستے کی تکان سے بچنے کے لئے کسی سپنے میں کھو جائیگا۔ جوانی کے زمانے میں وہ کرائیڈن سے کراچی تک ہوائی تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کیا کرتا تھا۔ جب وہ ہوا بازی سے سیر ہو گیا۔ تو دنیا کا مشہور کرکٹ باؤلر بن گیا۔ اور بسا اوقات ایم۔ سی۔ سی کی ساری کی ساری ٹیم تینتیس رنوں میں آؤٹ کر لی۔ یہ گیند پھینکنے کا شغل بھی کچھ زیادہ دیر تک دلچسپ نہ رہ سکا۔ اس لئے اس نے دیپک راگ کی صحیح بندش کھوج نکالی۔ وہ محفلوں میں اس راگ کا الاپ کیا کرتا۔ دیپک کی جلتی ہوئی تانوں سے اہل محفل کے دل سلگ سلگ جاتے۔ بتیاں جل جل اٹھتیں اور لوگ حیرانی سے بت کے بت بنے تکتے رہتے۔ آج کل اس کے خواب بین الاقوامیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے ایسی عجیب شعاعیں ایجاد کر رکھی ہیں۔ جن کی مدد سے وہ بارود کو پھٹنے سے روک سکتا ہے۔ انسان شعاعوں کی

مدد سے وہ آج کل دنیا کے امن کو محفوظ کر رہا ہے۔ مگر ان سپنوں میں اس نے کبھی روپیہ اور حکومت کے حصول کا پروگرام نہیں بنایا۔ اگرچہ اسے یہ بھی پسند ہے۔ کہ خرچ کرنے کے لئے اسے روپیہ مل جائے۔ لیکن اگر اس کے پاس بہت سا روپیہ آ جائے۔ تو اس کی زندگی کا آدھا لطف ختم ہو جائیگا۔ آج کل اس کی صرف یہی آرزو ہے۔ کہ اس کے پاس ایک ریڈیو سیٹ ہو۔ کار یا بنگلے کا مالک ہونے کی خواہش اس میں کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ اپنے آپ کو بڑا آدمی یا حاکم تصور کرنا اسے قطعی پسند نہیں۔ چند ایک امیرانہ چیزیں حاصل ہو جائیں۔ تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بشرطیکہ اس کی موجودہ حالت جوں کی توں رہے۔ اس کی موجودہ زندگی بے پرواہی اور مفلسی کا امتزاج ہے۔ عمر بھر اس کے سامان میں ایک چٹائی ایک بستر ایک ٹرنک اور دو ایک کرسیاں شامل رہیں۔ اس کے گھر اور کردار کی سب سے بڑی خصوصیت بے ترتیبی ہے۔

وہ صبح سویرے ہی اٹھ بیٹھتا ہے۔ اور اس جگہ سے اٹھ کر جہاں سویا ہوا تھا۔ کسی اور جگہ پر جا کر پھر سو جاتا ہے۔ اور پھر چائے دانی کی کھنک سنے بغیر آنکھیں نہیں کھولتا۔ کیونکہ چائے پینے کی اسے لت ہے۔ حلق میں پہلا پیالہ انڈیلنے کے بعد اس کے ارد گرد کی دنیا بیدار ہونے لگتی ہے۔ تا آنکہ چیزوں کی ماہیت کا تناسب پوری طرح قائم ہو جاتا ہے۔ وہ دن میں دو بار چائے کو پانی کی طرح ٹھنڈا کر کے پیتا ہے۔

سٹرانگ چائے پی کر اسے بار بار پیشاب کرنے کی عادت پیدا ہو گئی ہے۔ اس شکایت سے عاجز آ کر ایک دفعہ اس نے ایک مشہور و معروف ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے ملنے کے لئے دور دراز کا سفر اختیار کیا۔ اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کو بتایا۔ کہ بیماری اس قدر پرانی ہے۔ کہ اسے اس کی ابتدا کی ماہیت کے متعلق کچھ یاد نہیں رہا۔ اور اب وہ اس کا اس قدر عادی ہو گیا ہے۔ کہ اپنے آپ کو اس کے بغیر تصور ہی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر جو بیک وقت معالج، فلسفی اور درویش تھا۔ یہ سن کر خوب ہنسا۔ اور کہنے لگا۔ کہ پھر علاج کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مغنی ڈاکٹر کی بات سے اس قدر متاثر اور محظوظ ہوا۔ کہ دوائی لئے بغیر ہی لوٹ آیا۔ اس دن کے بعد اس نے کبھی بھول کر بھی علاج کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس کی زندگی کا زیادہ وقت چیزیں ڈھونڈنے میں گذرا ہے۔ مثلاً پنسل بنانے کے لئے وہ چاقو کی تلاش کریگا اور اس تلاش کے دوران میں قطعی بھول جائیگا۔ کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے۔ بفرض محال چاقو اس کے ہاتھ آ جائے۔ تو اس کی پنسل گم ہو جائیگی۔ اور وہ اس پنسل کو ڈھونڈنے میں کھو جائیگا۔ جو ان جانے میں اس نے کان پر اٹکالی تھی۔ گھر میں اسے ننگے پاؤں اَن دُھلے منہ اور بالوں کے گنجل کے گنجل بکھرائے پریشان پھرتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے کیوں آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جائیگا۔ ممکن ہے کہ آپ اس سے بگڑ کر بیٹھیں۔ کام کرنے بیٹھتا ہے۔ تو اس کا سارا وقت ادھر اُدھر کی معمولی ضروریات کو پورا کرنے میں کٹتا ہے اور کام ایک ضمنی چیز ہو کر رہ جاتا ہے چند ہی سطریں لکھ کر وہ پانی کا ایک گلاس پیتا ہے۔ اور پھر پان کھاتا ہے۔ پھر پیشاب کرتا ہے اور پھر پانی پیتا ہے۔ اس طرح وہ ایک گھنٹے میں بیس سطریں لکھتا ہے

چار گلاس پانی پیتا ہے۔ دو پان چباتا ہے۔ دو دفعہ پیشاب کرتا ہے۔ اکثر وہ ایک سگریٹ بھی پی لے تو مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اس کے باوجود اگر اس کی بیوی اس چارپائی پر گڑے شخص سے جو ہر وقت اس سے پانی، پان، سگریٹ ایسی ہی چیزیں مانگتا رہتا ہے۔ تعلق قائم رکھنا چاہتی ہے۔ تو تعجب کا مقام ہے۔ مگر اس کے علاوہ اسکی بیوی کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ممتاز مفتی ایک اچھا خاوند ہے۔ لیکن ٹھہرئیے یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے۔

ممتاز مفتی ایک ایسا بچہ ہے۔ جو یہ پسند نہیں کرتا۔ کہ اسے کوئی بچہ سمجھے۔ دل ہی دل میں وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اس کی دیکھ بھال کرے۔ اور اسے مناسب وقت پر مناسب کام کرنے پر مائل کرے۔ لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے ہو۔ کہ اسے معلوم نہ ہو۔ کہ اس کی دیکھ بھال کی جا رہی ہے اگر اسے شک پڑ جائے۔ کہ اس سے ایک بچے کا سا سلوک کیا جا رہا ہے۔ تو اس میں سویا ہوا مرد بیدار ہو جائیگا۔ اور اپنی تحقیر کے خلاف جہاد کرے گا۔ کیونکہ کسی دوسرے کی مرضی پر چلنا اسے قطعاً گوارا نہیں۔ اس کے برعکس اگر اس کی بیوی اس سے مردوں کا سا سلوک کرے۔ اور رشد کرے۔ تو وہ اسے جاہل نکمی اور بے عقل سمجھنے لگیگا۔ اسے گھریلو جھگڑوں سے اس قدر نفرت ہے کہ بسا اوقات وہ جھگڑے کے خطرے کو روکنے کے لئے اپنی بیوی سے جھگڑا چھیڑ دیتا ہے۔

ممتاز مفتی نے زندگی میں دو بار محبت کی۔ پہلی دفعہ جب وہ محض ایک نکما لڑکا تھا۔ اور اسے اپنا کوئی بہتر مصرف سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کے گرد ایک بیگانہ اور بے پرواہ دنیا بکھری پڑی تھی۔ ایک ایسی دنیا جس میں نہ تو اس کی کوئی حیثیت تھی نہ وقعت۔ اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لئے اس نے یہ روگ لگا لیا۔ اس کی پہلی محبت کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی۔ کہ وہ تعمیری نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا اندازِ محبت بذات خود تخریبی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ عمر بھر کے لئے اس کے ماتھے پر بدنامی کا ٹیکہ لگ گیا۔ اس کے ذہن میں ایک دائمی کشمکش کی داغ بیل پڑ گئی۔ محبت کے لئے وہ اپنے اقربا کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سے بھی برسرِ پیکار رہا۔ وہ اپنی محبوبہ سے بیک وقت مجنونانہ محبت اور نفرت محسوس کرتا تھا۔ اس کی دوسری محبت درحقیقت اپنی پہلی محبت سے چھٹکارا پانے کی ایک شدید کوشش تھی۔ اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب ہو گیا لیکن حالات سازگار نہ ہوئے۔ اور وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوئی صورت نہ پاکر اتفاقاً پھر سے اسی پہلے جھمیلے میں جا پھنسا۔ تعجب کی بات یہ نہیں۔ کہ وہ شدید ذہنی کرب اور رسوائی میں کیسے زندگی گزار سکا۔ بلکہ یہ کہ وہ ان مشکلات کے باوجود جیتا رہا ـــ اور آج ان جھمیلوں سے قطعی طور پر آزاد ہو چکا ہے۔

اس کی روزانہ زندگی میں سستی کا جذبہ بے حد کارفرما ہے۔ وہ اپنی کاہلی اور ناکارہ پن کو علانیہ تسلیم بھی کرتا ہے۔ وہ سارا دن کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ مگر شام تک مجموعی طور پر کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ بہت ضروری کام کرنا ہو۔ تو اس وقت اس کا دل یک ایکٹ کے ڈرامے پڑھنے کے لئے مچل جائیگا۔ عین اس وقت جب اسے نفسیاتی مقالہ لکھنا ہو۔ تو راگ کی کتاب لے بیٹھے گا۔ جب کہانی لکھنے کی شدید ضرورت ہو

ہو۔ تو نفسیات پڑھنے لگیگا۔ چھوٹی عمر ہی سے اسے راگ سے عشق ہے۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ ایک مقامی میوزک کالج میں داخل بھی ہوا۔ لیکن انہی دنوں کالج میں ایک مدراسی آنے جانے لگ گیا۔ جو راگ کا دیوانہ تھا۔ اتفاقاً وہ مدراسی ہندوستانی نہیں سمجھتا تھا۔ اور راگ ماسٹر انگریزی سے بے بہرہ تھا۔ چنانچہ ان دونوں کی ترجمانی کرنے کا فرض ممتاز مفتی کو ادا کرنا پڑا۔ وہ راگ کا دیوانہ، گانے کی دھن راگ ماسٹر سے سیکھ لیتا۔ اور پھر ممتاز مفتی سے گانے کے بول انگریزی ترجمہ کرواکے عجیب مضحکہ خیز انداز میں گانا شروع کر دیتا۔ جیسے سٹ ڈاؤن اِن دا ڑبن کو انٹ لی۔ آر آئی وِل۔ گو یُو اے سلیپ۔ بلیّے۔۔۔ اس دلچسپ راگ شکشا میں مفتی کو اس قدر مزا آنے لگا کہ خود کچھ سیکھنے کی بات پس پُشت پڑ گئی۔ بعدۂ اس نے راگ کا غائر مطالعہ بھی کیا۔ اور رسوں کے نوجات، ٹمپرڈ سکیل۔ آروہی امروہی سبھی معلومات حاصل کر لیں۔ اور اب وہ راگ کو پورے طور پر سمجھتا ہے۔ آپ صرف اسے اتنا بتا دیں۔ کہ ؟ گایا جا رہا ہے۔ پھر وہ فوراً اسے پہچان لیگا۔ اور معاً اس کی دکھ چال اور جذبات پیدا کرنے والے آثار چڑھاؤ سے محظوظ ہونے لگیگا۔ نہ سمجھے تو بھی وہ راگ سے بیحد متاثر ہوتا ہے۔ کچھ دن راگ سننے کے بعد اس کے دل میں شدید جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ کچھ لکھے یا گائے۔ راگ سے اسے تسکین ملتی ہے۔ ایسی تسکین جو اس میں ایک تعمیری اضطراب پیدا کرتی ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنے گرد و پیش کی ہر ایک چیز میں ایک عجیب سی دو رُخی کو شدت سے محسوس کیا۔ وہ اس بات کو جان کر حیران ہوا۔ کہ آدمی کے دل میں بیک وقت مختلف اور متضاد خواہشات اور رجحانات موجود ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ فطرت کی عجیب ترین چیز سے بھی عجیب تر ہے۔ اس نے محسوس کیا۔ کہ اردو ادب اس حیران کن ہفت رنگی سے قطعاً ناواقف ہے۔ اردو ادب نے نفس لاشعور کی آر نعقل کو ابھی نہیں پہچانا۔ محبت کو محض محبت کے سوا کچھ نہیں سمجھا۔ اور یہ سب کچھ دیکھ کر اس کے دل میں لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ ممتاز مفتی زیادہ تر داستاوسکی، یونگ، ایڈلر، برٹ رینڈ رسل اور فرائڈ کی تحریروں سے متاثر ہوا۔ کہانیوں میں نفسِ لاشعور کی ڈھکی چھپی باتوں کا اظہار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس لئے ممتاز مفتی کو آج تک اپنی تحریروں کے متعلق یہ یقین پیدا نہیں ہوا۔ کہ وہ اِن اَن کہی باتوں کا اظہار کامیابی سے کر سکا ہے یا نہیں پھر بھی اسے تسکین ہے کہ وہ قاری کی توجہ کامیابی سے اس طرف مبذول کر سکا ہے؛

جائزے

امریکہ کی تجارتی تجویزیں اور ہندوستان

بین الاقوامی تجارت کو فروغ دینے کے لئے امریکہ نے دنیا کے سامنے جو تجارتی تجویزیں پیش کی ہیں اُن کی آڑ میں دراصل یہ خواہش کام کر رہی ہے کہ کمزور ملکوں کی معاشی پستی سے فائدہ اُٹھا کر اُن کو امریکی مال اور اشیا سے بھر دیا جائے۔ یہ حقیقت اب پورے طور پر منظر عام پر آچکی ہے۔ ہندوستان میں امریکی تجویزوں سے جو ردّ عمل ظاہر ہوا ہے۔ وہ اسی حقیقت کے احساس پر مبنی ہے۔ وہ ردّ عمل "تجارت اور محصولات کی ذیلی کمیٹی" کی مدلل اور مفصل رپورٹ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس مسئلے پر ہندوستان کے تمام معاشیئین بالکل متفق اور یک رائے ہیں اور سب کا یہ مشترکہ فیصلہ ہے کہ امریکی تجویزیں بعینہٖ نہیں قبول کی جا سکتیں۔ ان میں کافی ردّ و بدل کی ضرورت ہے۔ ہندوستان اپنی مخصوص معاشی صورت حال کے پیش نظر اس ردّ و بدل سے کسی حالت میں بھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔

ہم یہ ضرور محسوس کرتے ہیں کہ بین اقوامی تجارت کو جلد از جلد فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اور جنگ سے پہلے بین الاقوامی تجارت پر جو پابندیاں عائد تھیں۔ اُن کو دوبارہ اُسی شکل میں نافذ کرنا غلط اور خطرناک ہے۔ ہندوستان حتی المقدور اُن پابندیوں سے باز رہنے کی کوشش کرے گا۔ مختلف ملکوں کے درمیان اشیا اور مال کی آزاد آمد و رفت ایک خاص لحاظ سے ہندوستان کے لئے مفید ہے ورنہ ہندوستان اپنی معاشی توسیع و ترقی کے پروگرام پر عمل پیرا نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر دینا سخت غلطی ہے کہ اس وقت تمام سرمایہ دار ملکوں کی معاشی پوزیشن اور حیثیت یکساں اور ہموار نہیں ہے اور ان کے درمیان صنعتی قوت پیدائش کا زبردست فرق پایا جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں امریکی تجویزوں سے صرف ایک ہی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ امریکہ اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کے سامنے کمزور اور پچھڑے ہوئے ملکوں کی قوت پیدائش ہتھیار ڈال دے۔ امریکی اشیا نہ صرف ہندوستان اور نو آبادیات کے بازاروں میں بھر جائیں اور ہماری صنعتی ترقی کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ اگر امریکی تجویزوں کے بانیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ بین اقوامی

تجارت کو فروغ دے کر پچھڑے ہوئے ملکوں کو بھی ترقی کا راستہ دکھانا چاہتے ہیں تو پھر اُنہیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ پچھڑے ہوئے ملکوں کے لئے امریکی اور برطانوی اشیائے صَرف (Consumer Goods) کی درآمد پر کوٹا بٹھانا، اُن پر مقداری پابندیاں عائد کرنا اور محصولات کے ذریعے اُن کے سیلاب کو روکنا ضروری ہے۔ ذیلی کمیٹی نے امریکی تجارتی تجویزوں پر جو فیصلہ دیا ہے اُس میں اسی چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ مزید ہے کہ یہ محصولات، تعدادی پابندیاں اور کوٹے محض ضرورت کے مطابق ہوں گے۔ اور عارضی تاکہ جب ہندوستان کی صنعتی قوت پیدائش بیرونی دنیا سے مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو انہیں خیرباد کہہ دیا جائے۔

ان تجویزوں کی نوعیت اور مقاصد کا واضح طور پر اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ اُن کے عالمگیر معاشی پس منظر پر بھی ہم ایک نظر ڈال لیں۔

۱۹۲۹ء سے پہلے دُنیا میں کم و بیش آزاد تجارت کا رواج تھا، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کا تجارتی چکر ۱۹۲۹ء کے بعد سے جس طرح گردش کرنے لگا۔ اُس سے آزاد تجارت کے تار و پود بکھر گئے۔ ساری دنیا میں معاشی بحران رونما ہوا۔ قوت خریداری کی عدم موجودگی میں مال کی پیدائش رکنے لگی۔ بیکاری عام ہو گئی جس نے قوت خریداری پر اور بھی کاری ضرب لگائی۔ اس کا اثر بین الاقوامی تجارت پر پڑنا لازمی تھا۔ تمام سامراجی ملکوں نے اپنے اپنے مقبوضات اور نوآبادیات کو صرف اپنے مال کے لئے مخصوص کر لیا۔ غیر ملکی مال پر محصولات عائد کئے گئے۔ گروہ گیری کی دیواریں کھڑی کر دی گئیں۔ غیر ملکی مال پر کوٹا بٹھا دیا گیا۔ برطانیہ اس سلسلے میں سب سے آگے آگے تھا۔ بین الاقوامی تجارت کے اس طرح تباہ و برباد ہو جانے کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان امریکہ کو پہنچا۔ امریکی قوت، پیدائش تمام سرمایہ دار ملکوں میں سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے آزاد مقابلہ اور آزاد تجارت کی صورت میں امریکہ تمام ملکوں کو معاشی لحاظ سے شکست دے سکتا ہے اور اُن کو اپنے مال سے بھر سکتا ہے۔ لیکن اب جب کہ ہر ملک نے غیر ملکی مال کے خلاف دیواریں حائل کر دی تھیں۔ امریکہ کو لازمی طور پر بہت نقصان برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے امریکہ نے الگ الگ ملکوں سے دو طرفہ تجارتی عہد نامے کرنے شروع کئے۔ اس طرح اُس نے یورپ کے ملکوں سے اور دنیا کے دوسرے ملکوں سے اپنے مال پر پابندیوں اور محصولات کو کم کرانے کی کوشش کی لیکن یہ طریقہ کچھ بہت کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اسی عرصے میں اٹلی، جرمنی اور جاپان میں فاشی جماعتوں نے اپنی طاقت بہت مضبوط کر لی۔ اور اُن ملکوں کی سیاسی باگ ڈور ہاتھ میں لے کر دنیا کو تیزی کے ساتھ جنگ اور تباہی کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔ معاشی بحران کا نتیجہ جب پرولیتاری انقلاب کی شکل میں ظاہر نہ ہوا تو پھر فاشی نظام کا قیام ایک لازمی امر تھا۔ شکست طاقتوں کے عروج سے آزاد

تجارت کے امکانات اور بھی ختم کر دیئے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ اور عالمگیر معیشت نے ایک نئی منزل میں قدم رکھا۔ جنگ کے دوران میں امریکہ کی قوت پیدائش دوسرے ملکوں کے مقابلے میں، خاص کر برطانیہ کے مقابلے میں اور بھی زیادہ ہوگئی۔ امریکہ نے اپنی معاشی طاقت اور زبردست فوجی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر برطانیہ سے یہ وعدے کرائے کہ جنگ کے بعد آزاد مقابلے اور آزاد تجارت کو جاری کرنے کے کام میں وہ پورا پورا تعاون کرے گا۔ ۱۲ر اگست ۱۹۴۱ء کا چرچل اور روزولٹ کا متحدہ اعلان اور ۲۳ر فروری کا برطانوی امریکی معاہدہ اس سلسلے کی دو اہم ترین کڑیاں ہیں۔ مؤخر الذکر معاہدے کی دفعہ سات میں صاف طور پر درج ہے کہ جنگ کے بعد بین الاقوامی تجارت میں کسی ملک کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں پچھڑے ہوئے ملکوں میں امریکی مال کے سیلاب کو روکنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ تجارتی محصولات کو خیرباد کہہ دینے کے بھی یہی معنی نہیں نکلتے۔ امریکہ کی موجودہ تجویزیں دو طرفہ تجارتی عہد ناموں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان میں دو ملکوں کے درمیان نہیں بلکہ بہت سے ملکوں کے درمیان تجارتی پابندیوں کے اُٹھانے کی اسکیم ہے۔ یہ ہے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تجارتی تجویزوں کا پس منظر۔ اب ہم ہندوستان کے مخصوص نقطۂ نظر سے ان تجویزوں پر ایک نظر ڈالیں گے۔

ہندوستان کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ اپنی تجارتی پالیسی کا تعین کرنے بیٹھے تو دو باتوں کا خیال رکھے۔ (۱) ہندوستان میں عنقریب معاشی تعمیر و توسیع کا پروگرام عمل میں آنے والا ہے اس لئے اُس سے پیدا ہونے والی ضروریات کے مطابق ہی کسی تجارتی پالیسی کی تشکیل ہونی چاہیئے۔ (۲) ہندوستان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ اشتراک عمل کے ذریعے عالمگیر تجارت کو فروغ دینے اور بے روزگاری کا قلع قمع کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن ہندوستان اپنے مؤخر الذکر فرض سے اس وقت تک سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ جب تک پہلی شرط پوری نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں ہندوستان اپنی معاشی توسیع و ترقی کرنے کے بعد ہی عالمگیر تجارت اور عالمگیر روزگار کو فروغ دے سکتا ہے۔ لیکن کیا امریکی تجویزیں ہندوستان کی اس ضرورت کو تسلیم نہیں کرتیں اور آزاد تجارت کے بہانے اُسے اپنا بازار بنانا چاہتی ہیں۔ ہندوستان چونکہ معاشی لحاظ سے امریکہ کا ہمسر نہیں ہے۔ اس لئے آزاد تجارت سے وہ گھاٹے میں رہیگا۔ دراصل یہ تجویزیں امریکہ اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملکوں کی ضرورت کو تسلیم کرتی ہیں اور انہیں کے لئے سود مند بھی ہیں۔ ہندوستان جیسے پچھڑے ہوئے ملک کے لئے نہیں جسے ابھی اپنی صنعتوں کے تحفظ کے لئے غیر ملکی مال کی درآمد پر پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ یہ ضرور ہے کہ یہ پابندیاں ویسی نہیں ہوں گی۔ جیسی دو دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے تھیں۔ یہ پابندیاں صرف تعمیری مقاصد کے تحت اور ضرورت

کے مطابق لگائی جائیں گی اور ضرورت کے ختم ہونے کے فوراً ہی یہ پابندیاں دور کی جائیں گی۔ پھر یہ پابندیاں صرف مشینوں کے صرف کی درآمد پر لگائی جائیں گی۔ جہاں تک اشیائے اصل (Capital Goods) یعنی مشینوں اور کلوں کا تعلق ہے۔ ہندوستان کو ان کی سخت ضرورت ہے اور وہ امریکہ یا برطانیہ اور دوسرے ملکوں سے خرید کر درآمد کی جائیں گی۔

امریکی تجویزیں سراسر منفیت پر مبنی ہیں۔ یعنی وہ محض ممنوعات کا پلندہ ہیں۔ عالمگیر تجارت اور روزگار کو آگے بڑھانے کے لئے یہ تجویزیں یہ ترکرو اور وہ نہ کرو سے آگے نہیں جاتیں۔ وہ ہمارے سامنے کوئی مثبت چیز پیش نہیں کرتیں۔ یعنی وہ یہ نہیں بتاتیں کہ عالمگیر خوشحالی پیدا کرنے کے لئے یہ کرو اور وہ کرو۔ موخرالذکر چیز کا تقاضا تھا کہ ترقی یافتہ ملکوں کو یہ بتایا جاتا کہ وہ عالمگیر روزگار کو فروغ دینے کے لئے پچھڑے ہوئے ملکوں کی مدد اور اعانت کریں۔ ان کو اشیائے اصل مہیا کریں تاکہ ان کی اپنی تجارت ترقی کر جائے اور پچھڑے ہوئے ملکوں کی بڑھتی ہوئی معیشت کے مطابق خود اپنی معیشت میں ردوبدل کریں۔ ان تمام باتوں کو امریکی تجارتی تجویزیں بالکل نظرانداز کر دیتی ہیں۔ حالانکہ ان کے بغیر نہ تو عالمگیر تجارت ترقی کر سکتی ہے اور نہ عالمگیر روزگار کی افراط ہو سکتی ہے۔ اگر ان مثبت چیزوں کو عمل میں لائے بغیر امریکی تجویزیں مان لی جائیں تو آپ جانتے ہیں کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ کچا مال پیدا کرنے والے ممالک ہمیشہ کچا مال پیدا کرتے رہیں گے اور یہاں صنعتی ترقی کبھی نہ ہو سکے گی اور صنعتی لحاظ سے جو ملک ترقی یافتہ ہیں وہ ہمیشہ ان کا استحصال کرتے رہیں گے۔ کیا عالمگیر روزگار پیدا کرنے کی یہی صورت ہے؟

لیکن دوسری طرف اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بین الاقوامی تجارت کی توسیع و ترقی خود ہندوستان کے حق میں مفید ہے۔ اور وہ عالمگیر تجارتی کانفرنس میں ضرور حصہ لیگا۔ اس سلسلے میں تین باتیں بہت اہم ہیں۔ (۱) ہندوستان اس وقت مقروض نہیں بلکہ قرض خواہ ملک ہے۔ عالمگیر تجارتی کانفرنس میں شرکت کر کے ہندوستان اپنا نقطۂ نظر دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور قرضے کی وصولی پر زور ڈال سکتا ہے۔ پھر بین الاقوامی تجارت ہی کے فروغ سے ہندوستان کا قرضہ وصول ہو سکے گا۔ (۲) بین الاقوامی تجارت کی ترقی اس لئے بھی اہم ہے کہ ہندوستان کو اس وقت کلوں اور مشینوں کی سخت ضرورت ہے۔ جب بین الاقوامی تجارت ترقی کرے گی۔ تب ہی ہندوستان ایک جگہ میں اپنا مال فروخت کر کے دوسرے ملک سے کلیں اور مشینیں خرید سکے گا۔ (۳) خود ہندوستان میں تجارت اور صنعت کی حالت بہتر نہیں بنائی جا سکتی جب تک دنیا کے دوسرے ملکوں میں خوشحالی نہ ہو اور جو ظاہر ہے کہ بین الاقوامی تجارت کی توسیع و ترقی ہی سے ممکن ہو سکتی ہے۔

ہندوستان عالمگیر تجارت کی ترقی کو آگے بڑھانے کی کوشش کرے گا اور اس سلسلے میں دوسرے ملکوں سے تعاون اور اشتراک عمل سے بھی کام لے گا۔ تاکہ دنیا سے بے کاری اور بے روزگاری دور ہو۔ (۲) لیکن ہندوستان اپنی ضرورت کے مطابق اور اپنی صنعتی ترقیوں کی خاطر خاص خاص مرتبوں کے لحاظ سے محصولات کی پابندی، کروڑگیری اور مقداری پابندیوں سے ضرور کام لیگا۔ تاکہ ہندوستان میں انہیں اشیا کی درآمد ہو جن کی ضرورت ہے اور اُن اشیا کی درآمد بند ہو جن سے یہاں کی صنعتی ترقی کے رُک جانے یا سست رفتار ہو جانے کا خطرہ ہے۔ ان دو بظاہر متضاد باتوں میں درا اصل کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہے۔

طفیل احمد

سویٹ یونین کا نیا پنج سالہ پلین

بالشویک انقلاب کے بعد سویٹ یونین میں رجعت پسندوں اور انقلابیوں میں جو لڑائی ہوئی۔ اس نے ملک کو کافی نقصان پہنچایا۔ انقلاب پسندوں کی کامیابی اس نقصان کی تلافی کی فکر میں تھی کہ سویٹ یونین کو قحط کے بھوت نے آن دبوچا۔ سارے ملک کی معاشی حالت بگڑنے لگی۔ اس موقعہ پہ باشویکوں کے لیڈر لینن نے نئی معاشی پالیسی اختیار کی۔ لینن نے ذاتی ملکیت اور ذاتی منافع کی کسی حد تک اجازت دے دی۔ چنانچہ ن م پ کے ماتحت بہت سے کسان دوسرے کسانوں سے زیادہ دولت کمانے لگے۔ تاجر اور چھوٹے چھوٹے کارخانہ دار بھی ہاتھ رنگنے لگے۔ ۱۹۲۴ء میں لینن کی موت کے بعد سٹالین نے اس صورت حالات کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں پہلا پنج سالہ پلین تیار کیا گیا۔ اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے سویٹ یونین کے لوگوں نے ان تھک ہمت کا ثبوت دیا۔ دوسرا پنج سالہ پلین ۱۹۳۲ء میں شروع کیا گیا ۱۹۳۷ء میں تیسرے پنج سالہ پلین کا آغاز ہوا۔ ان پلانوں نے سویٹ یونین کی پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ کر دیا۔

	۱۹۲۷	۱۹۳۸
کوئلہ	۳۵ ملیون ٹن	۱۴۰ ملیون ٹن
فولاد	۳ ملیون ٹن	۱۸ ملیون ٹن
تیل	۱۱ ملیون ٹن	۳۰ ملیون ٹن
سیمنٹ	۱۱ ملیون ٹن	۴۶ ملیون ٹن
موٹر	×	ایک لاکھ ستر ہزار (گاڑیاں)

زرعی پیداوار میں ۱۹۱۳ء کی نسبت ایک سو اٹھارہ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ سوویٹ یونین میں تیسرے پنج سالہ پلین پر عمل ہو رہا تھا۔ کہ جرمنی نے اس پر حملہ کر دیا۔ سوویٹ یونین کو چار سال تک حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس اثنا میں سوویٹ یونین کا جو نقصان ہوا اس کا اندازہ ستر لاکھ جانوں کے اتلاف، تقریباً سات کھرب روبل ڈیڑھ ہزار شہروں اور ستر دیہات کی تباہی کی صورت میں لگایا جا سکتا ہے۔ صنعت و حرفت کی تباہی واضح اور عیاں ہے۔ بہر حال سوویٹ یونین نے جس بہادری کے ساتھ حملہ آوروں کو شکست دی اسی ہمت کے ساتھ سوویٹ یونین اپنی تعمیر نو میں مصروف ہو گئی۔ سوویٹ یونین کا چوتھا پنج سالہ پلین (۱۹۴۶ء۔ ۱۹۵۰ء) یہ ہے۔ کہ سوویٹ یونین کو جنگ سے پہلے کی اکانومی پر جلد از جلد پہنچا دیا جائے جنگ کے زمانے میں سوویٹ یونین کے مغربی رقبوں کو بہت زیادہ تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان رقبوں میں ایک سال کے اندر اندر سابق نقصانات کی کافی تلافی کی جا رہی ہے نئے پلین کے پیش نظر یہ بھی ہے۔ کہ ۱۹۴۸ء تک سوویٹ یونین کے مغربی رقبوں کی انڈسٹری کو جنگ سے پہلے کی سطح تک پہنچا دیا جائے۔ اس پلین کا دوسرا منشا یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ۱۹۵۰ء میں سوویٹ یونین کی صنعتی پیداوار ۱۹۴۰ء کی نسبت اڑتالیس فی صد زیادہ ہو۔ اسی طرح اس پلین کے ذریعہ زرعی پیداوار کو ۱۹۴۰ء کی نسبت ۲۷ فی صد بڑھانا ہے۔ سوویٹ یونین کے نئے پنج سالہ پلین کا مقصد محض جنگ سے پہلے کی اکانومی کو بحال کرنا نہیں بلکہ اس میں اضافہ کرنا ہے قیمتوں میں کمی، اجرتوں میں اضافہ اور معیار زندگی میں بلندی۔ اس پلین کے نتائج ہوں گے

باری

فلموں میں نفسیاتی زاویہ

قصہ گوئی ایک پرانا فن ہے۔ جس کی اصل غایت انتقال محسوسات ہے یعنی کسی کے دل کی کیفیت کو ایسے انداز میں بیان کرنا کہ سامعین یوں محسوس کریں جیسے وہ آپ بیتی ہو یا جیسے اُس خارجی واقعہ سے انہیں براہ راست گہرا جذباتی تعلق ہو یا کچھ وقت کے لئے وہ اپنی شخصیت کو معطل کر کے اُسے کہانی کے کسی کردار کی شخصیت میں منتقل کر سکیں۔

فنون لطیفہ کا مقصد ہمارے دلوں کو جذبات لطیف سے سیراب رکھنا ہے۔ اور فنی طور پر دوسروں کے جذبات سے آشنا کرنا بھی۔ ہمارا نفسیاتی تار و پود داخلی و فطری طور پر ایسا ہے کہ ہم دوسروں کے جذبات کو براہ راست محسوس نہیں کر سکتے۔ دوسروں کے جذبات کو جاننے کے لئے ہمیں محض قیاس سے کام لینا پڑتا ہے۔ افراد کے درمیان قیاس کی اونچی لمبی دیواریں [illegible] ہر فرد اپنی "میں" کے کنویں میں غوطے کھا رہا ہے۔ اور اس گہما گہمی میں رہنے کے باوجود

تھی جو پیشہ ورانہ تھی جیسی کہ غریب عوام داستانوں کے دکھ سکھ سے بھی بیگانہ سمجھا ہے
رنج و غم کے بیان میں محبت اور ہمدردی کا اظہار پیدا کرنے کے لئے فنون لطیفہ ہی کا سہارا لیتے ہیں
اور اسی لحاظ سے ان کی اہمیت ہمارے نزدیک قصہ و دیگر علوم سے کہیں زیادہ ہے۔ فنون لطیفہ میں کہانی
کہنے کے فن کی قدر و قیمت کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کی بنیاد بلاواسطہ انسانی تجربے پر ہے

قدیم مصر کا قصہ گو جہاں بھی بیٹھ جاتا تھا اس کے ارد گرد عورتوں بچوں اور بوڑھوں کا جمگھٹا
لگ جاتا۔ قصہ سنانے کے دوران میں بچے یہ بھول جاتے کہ وہاں پاس ہی مٹھائی کی دکان ہے
عورتیں کھانا پکانا بھول جاتیں اور ہنڈیا جل جاتی ہے۔ بوڑھے موت کے ڈر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں
مجمع سب قصہ گو کے ہاتھ کی کٹھ پتلیاں بن جاتے۔ انسان کے محسوسات قصہ گو کے فنی
اشاروں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے۔ اسی بات میں قصہ گو کے فن کا کمال مضمر تھا۔

یہ سامعین کے جذبات پر قدرت حاصل کرنے کیلئے یعنی اپنے کرداروں کے محسوسات کو
ان تک منتقل کرنے کے لئے قصہ گو کو صرف چند محدود ذریعے حاصل تھے یعنی مناسب
لفظوں کا چناؤ، مناسب توقف و تعطل، موسیقی اتار چڑھاؤ اور [illegible] ان ذرائع کے اظہار کی مدد
سے وہ سامعین کے دل میں جذبات پیدا کرتا انہیں بھڑکاتا اور کچھ دیر کے لئے قیام عطا کرتا۔

ناول نگار کی طرح افسانہ نویس کو یہ تمام ذرائع اظہار حاصل نہیں۔ اسے صرف الفاظ اور ان کے
صوتی اثرات پر انحصار کرنا پڑتا ہے لیکن فلمی افسانہ پیش کرنے کیلئے ذرائع اظہار کی ایک دنیا کھلی پڑی ہے
کیونکہ متکلم اور متحرک تصاویر دیکھنے والے کے سامنے فریب سماعت اور فریب نظر کا ایسا جال بن
سکتی ہیں کہ اس پر حقیقت کا گمان ہونے لگے۔ بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ کہانی چاہے الفاظ کے
ذریعے کہی جائے یا تصاویر کے ذریعے اس کی بنیادی غایت انتقال محسوسات ہی ہے۔

اگر آج تک کوئی پروڈیوسر اچھی کہانی پیش نہیں کر سکتا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسے اس
بات کا احساس نہیں کہ اس کی پیش کش کا مقصد انتقال محسوسات ہے۔ وہ اپنی بنیادی مقصد کو
نظر انداز کر کے ضمنی فروعات میں پھنس جاتا ہے۔ بڑے بڑے سیٹ تیار کرواتا ہے۔ حسین چہرے تلاش
کرتا ہے۔ کرداروں سے ہیجان انگیز حرکات کا مطالبہ کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تصویر کا بنیادی مقصد
پس پشت چلا جاتا ہے اور کبھی خیال تک نہیں آتا ہے۔ وہ تماشائیوں کے دل میں جذبات پیدا نہیں
کر سکتا جیسے [illegible] تصویر کی ناکامی کی وجہ وہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ بنیادی مقصد سے
انحراف کر لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ کوئی سین کمزور رہ گیا چنانچہ اگلی پیش کش کو
کامیاب بنانے کے لئے وہ [illegible] تزئینات میں کھو جاتا ہے اور [illegible] بنیادی مقصد سے ہٹ جاتا ہے

آج کل کہانی پر دوسری بات چھوڑ دیجئے وہ تو محض بیوپار میں مصروف ہیں [illegible]

کہ اُسے معطر گود میں بیٹھ کر پیار کرنے کا شوق ہے۔ اسے اس تجارت سے اس لئے دلچسپی ہے کہ اس میں تجارت کے ساتھ ساتھ جذباتی ہیجان بھی پیدا ہوتا رہتا ہے۔

سمجھدار پروڈیوسر بھی اس نقطے کو نہیں پا سکا۔ کہ اس کا کام صرف کہانی پیش کرنا نہیں بلکہ کہانی کو ایسے انداز سے پیش کرنا بھی ہے کہ وہ تماشائیوں کے محسوسات کا جزو بن جائے تماشائی اُسے دیکھیں ہی نہیں بلکہ محسوس کریں۔ کرداروں کے جذبہ کے مقابلہ میں عظیم الشان سیٹ اور یونہی مناظر اور ضمنی اشتعال پیدا کرنے والے سین محض ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اُسی صورت میں اہم ہو سکتے ہیں جب وہ کرداروں کے جذبات کو تقویت دینے اور قیام بخشنے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ ایسے ضمنی اثرات صرف اسی صورت میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ جب وہ تماشائیوں کے دل میں کردار کے جذبہ کے تاثرات کو اپنا لینے کی قبولیت یا صلاحیت پیدا کریں۔ اُس مرکزی نقش کے لئے مناسب پس منظر پیدا کریں یا اُس مجسمہ کیلئے پائے ستون بنیں۔ کسی کے دل میں کسی اثر کے لئے قبولیت پیدا کرنا اور پھر وہ اثر پیش نہ کرنا ایک ایسے وعدے کے مترادف ہے جو نبھایا نہ جائے۔ پس منظر تو بنا دیا جائے لیکن اُسے زندگی بخش نقش سے محروم رکھا جائے یا پائے تو استوار کر دیا جائے لیکن اس پر مجسمہ نصب نہ کیا جائے۔ عظیم الشان سیٹ اور ساتھ ہی مناظر مغربی آرکسٹرا کے مصداق ہوتے ہیں جس میں بیک وقت سینکڑوں سازینے بجتے ہیں۔ ہندوستانی پروڈیوسر کو ان سے کام لینے کا شوق تو ہوتا ہے۔ مگر وہ اس بات کا شعور نہیں رکھتا کہ سازوں کی کثرت کے باوجود مغربی آرکسٹرا سامعین کے دل پر ایک واحد اثر پیدا کرتا ہے۔

مغربی آرکسٹرا کی فنی عظمت کے روبرو سر تسلیم خم ہے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ہندوستانی ایک بھدے سے اکتارے پر ایک سیدھا سا گیت گا کر آرکسٹرا کے مجموعے اثر سے کہیں گہرا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈائرکٹر محبوب اپنی پکچر ہمایوں میں باغات اور محلات کے نظر فریب مناظر پر اسراف کے باوجود وہ بات پیدا نہ کر سکا جو ڈائرکٹر شوکت زینت میں محض سادگی اور جذبہ کی مدد سے پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ زینت کی کردار سے قطع نظر اس کی وجہ محض یہ بھی کہ اول تو ہمایوں میں کوئی کردار ایسا نہ تھا جس کے جذبات کی رفعت مناظر کے مقابلے میں برابر ہو سکتی ہو۔ اور اگر تھا بھی تو اس کے جذبات اچھے انداز سے پیش نہ کئے گئے کہ وہ تماشائیوں کے دل میں زینت کی طرح گھر پیدا کرتے

کسی کہانی میں چاہے وہ فلمی ہو یا ادبی ڈائیلاگ کو حد سے زیادہ اہمیت دینا یا تفصیلات کو اتنا پھیلانا کہ کہانی کے مرکز کی طرف راغب کرنے کے بجائے وہ تماشائیوں کی توجہ کو اس سے منحرف

کرے اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔

آپ کسی بچے کو کہانی سنائیے۔ "ایک تھا دیو۔" "اچھا" وہ شوق سے پوچھے گا۔ اگرچہ وہ دل میں خوب سمجھتا ہے۔ کہ دیو دیو کوئی نہیں یہ تو محض قصہ ہے لیکن اگر آپ اُسے کہیں کہ ہمارے گھر میں ایک دیو رہا کرتا تھا۔ "ہمارے گھر میں؟" وہ چلّا اُٹھیگا "پھر" صرف اتنی سی تبدیلی پر بچہ قطعی بھول جائے گا کہ آپ اُسے کہانی سنا رہے ہیں۔ اور کہانی وہ ہے جو صرف سنائی جاتی ہے۔ آپ کی کہانی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بات دیو کی تھی اور دیو ہی کی رہی۔ صرف ہمارے گھر کی کلی تانک کر آپ نے بچے کا زاویہ نگاہ بدل دیا ہے۔ پروڈیوسر کو یہ سمجھنا چاہئیے کہ اُسے کہانی ہی پیش نہیں کرنا بلکہ تماشائیوں کے نقطہ نظر کو یوں بدلنا ہے۔ کہ وہ اُسے اپنا لیں اور دیکھنے کی بجائے اُسے جینا شروع کر دیں کہ اُسے کہانی کو اس زاویہ نظر سے پیش کرنا ہے جو تماشائیوں پر مناسب نفسی کیفیت طاری کرے ایسا زاویہ نظر جو نفسیاتی ہو۔

چونکہ تماشائی فلمی مناظر کو اُسی زاویے سے دیکھتے ہیں جس زاویے سے اُسے کیمرے نے دیکھا ہو اس لئے نفسیاتی زاویے قائم کرنا کیمرے پر منحصر ہے۔ کسی سین کو فلمانے سے پیشتر اس بات کا تعین ضروری ہوتا ہے کہ تماشائی کے دل پر کیا اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس اصول پر عمل نہ کیا جائے تو فلم کی حیثیت محض خارجی منظر بندی کی رہ جاتی ہے۔ خارجی منظر بندی سے پروڈیوسر یا ڈائرکٹر تماشائیوں کے جذبات پر قادر نہیں رہ سکتا۔ اور اگر وہ تماشائی کے جذبات پر قدرت نہیں رکھتا تو اُسے فلمی کہانی پیش کرنے کا کوئی حق نہیں۔

مثال کے طور پر اگر آپ کسی کردار کو بلندی سے گرتے ہوئے دکھانا چاہتے ہیں۔ اس منظر کی تصویر بندی سے پہلے لازم ہے کہ آپ اس بات کا تعین کر لیں کہ آپ کو تماشائی کے دل میں گرنے والے سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا ہے یا گرانے والے سے۔ اگر آپ گرنے والے سے ہمدردی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو یہ لازم ہوگا کہ ایسے زاویہ سے فلمایا جائے کہ نمائش کے وقت تماشائی اُسے دیکھ کر ایسے محسوس کرے جیسے وہ خود گر رہا ہے۔ یہ اثر پیدا کرنے کے لئے کیمرے کے زاویہ کو گرتے ہوئے آدمی کی نگاہ سے منطبق کرنا پڑے گا۔ یا تو قریب سے قریب تر آتی ہوئی زمین کو دکھلایا جائے گا اور یا منڈیروں اور چھجوں کو یوں ہٹتے ہوئے کہ تماشائی کے ذہن کو جھٹکا لگے۔ اس کے برعکس اگر تماشائی میں گرانے والے سے ہمدردی پیدا کرنا مقصود ہے تو گرنے کی تفصیلات دکھانے کی بجائے گرانے والے کے چہرے پر ہول اور ندامت دکھانا ہی کافی ہوگا۔

ایسے ہی اگر اس شخص کے احساسات کو تماشائی کے دل میں منتقل کرنا ہو جو خودکشی کرنے کیلئے ریل کی لائن پر لیٹ گیا ہو۔ تو عام پروڈیوسر جذباتی تسلسل پیدا کرنے کے لئے گاڑی کو آتے ہوئے بار بار

دکھاتا ہے۔ اور پھر مخصوص مقام پر اُسے یوں پیش کرتا ہے کہ اس منظر کی حیثیت محض خارجی رہ جاتی ہے اس طرح جذباتی تعطل کی حیثیت بھی بے معنی ہو جاتی ہے اگر پروڈیوسر یا ڈائرکٹر گاڑی کو اس زاویہ نگاہ سے دکھلائے جس سے خودکشی کرنے والا اُسے آتے ہوئے دیکھتا ہے تو لازمی طور پر تماشائی یہ محسوس کرے گا کہ وہ خود گاڑی تلے کچلا جانے والا ہے۔ اس طرح گرنے والے یا کچلے جانے والے کو واضح طور پر دکھانے کی بھی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ انہیں دکھائے بغیر تماشائی کو گرنے اور گاڑی تلے کچلے جانے کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔ یہ اختصار تصویر بندی کے لئے بے حد اہم ہے۔

فلمی کہانیوں میں آپ نے کئی بار قتل کے سین دیکھے ہیں ایسے مناظر دیکھ کر ہم محسوس کرتے ہیں جیسے اخبار میں قتل کی واردات پڑھ رہے ہیں یعنی اُن کا اثر براہ راست ہمارے جذبات پر نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ڈائرکٹر تماشائیوں کا زاویہ نظر مقتول کے زاویہ نظر سے منطبق کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

نفسیاتی زاویہ نظر کو نظر انداز کرنے سے تصویر کی فنی حیثیت ہی پر اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ با اوقات تماشائیوں کے اخلاق پر بھی اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔ فرض کیجئے ڈائرکٹر ایک منظر پیش کر رہا ہے جس میں ایک بدمعاش کردار بُری نیت سے آدھی رات کے وقت کسی پاکیزہ لڑکی کے کمرے میں داخل ہوتا ہے ایسے حالات میں لازم ہے کہ بدمعاش کے شہوانی جذبہ کے بجائے لڑکی کی دہشت کو نشر کیا جائے تاکہ تماشائیوں میں اس قبیح حرکت کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا ہو لیکن ایسے عام طور پر آپ کے سامنے پردہ سیمیں پر بدمعاش آ کھڑا ہوتا ہے آنکھوں میں شہوانیت کی چمک اور ہونٹوں پر غنڈوں کی سی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ہال میں بیٹھی ہوئی عورتیں یوں محسوس کرتی ہیں۔ جیسے وہ اُن کی طرف بڑھ رہا ہو۔ ان کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ جاتی ہے۔ مانا کہ شعوری طور پر وہ اس قبیح حرکت کیخلاف احتجاج کی کیفیت محسوس کریں گی۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کپکپی اپنے عقب میں لذت کی ہلکی سی رو چھوڑ جائیگی چھپی چوری ان کے دل میں آرزو پیدا ہو گی۔ کہ اُن کی زندگی میں بھی کبھی ایسے حالات پیدا ہوں اس کے برعکس اگر بدمعاش کو منظر سے خارج کر دیا جائے۔ اور صرف لڑکی کے تاثرات کو تصویر بند کیا جائے تو تماشائیوں کے دل میں واضح طور پر نفرت کا ایسا جذبہ بیدار ہو گا۔ جسے جنسیات یا شہوانیت سے قطعی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ منظر عریانی کے خدشے سے بھی پاک ہو جائیگا۔ ایسے مناظر پیش کرتے وقت تاثر، اختصار اور پاکیزگی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نفسیاتی زاویہ نہ صرف تاثر بلکہ اختصار اور پاکیزگی بھی پیدا کرتا ہے۔

ممتاز مفتی

دو ناول

گزشتہ دنوں ہندوستان کے اردو ادب میں دو ضخیم اور قابلِ قدر ناولوں کا اضافہ ہوا ہے۔ ترقی پسند مصنفین ان ناولوں کی اشاعت اس لئے بھی اہم ہے کہ ان میں انسانی زندگی کو براہِ راست دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے ان میں پہلا ناول ہے عصمت چغتائی کا۔

ٹیڑھی لکیر جسے ترقی پسند اشاعتی ادارے مکتبہ اردو نے شائع کیا ہے — پانسو صفحات کا یہ ناول ایک لڑکی کے اور صرف ایک کردار "شمن" کے گرد گھومتا ہے۔ یہ ٹیڑھا بینگا کردار ایک متوسط مسلمان خاندان کی پیداوار ہے اور جس کے متعلق بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کردار کے پردے میں مصنفہ ہی کی غیر مستقیم آپ بیتی سنائی جا رہی ہے۔ خود اپنے ہی ذہنی اور جسمانی عوامل کی رُوداد نے ناول میں بے جان تصنع اور مصنوعی ماحول کو حاوی ہونے سے بیشتر روکے رکھا۔ اگرچہ بعض مقامات پر جب اسے "ادب برائے ادب" کی راہوں سے گزرنا پڑا ہے تو یہ تصنع ذرا واضح ہو گیا ہے اور اپنے مکلف لبادے کی غمازی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شاید یہاں اسلوب کی اس آئیڈیالوجی کا تسلط ہے۔ جو اس کی فنی تشکیل میں ایک لازمہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

"شمن" کی زندگی میں گرد و پیش کے مختلف اور متعدد کرداروں کا داخلہ اور پھر خارجہ بڑی سیمابی رفتار سے ہوتا ہے۔ اور "شمن" مسلسل تیتری بن اور زندگی کو ایک منفرد ڈھب سے دیکھنے اور اپنے انفرادی عمل کا قانون بنانے کی وجہ سے ان کرداروں میں سے کسی کو بھی استقامت نصیب نہیں ہو سکی۔ پہلی منزل میں "شمن" کے دائرۂ حیات میں مختلف مبلغ زدہ عورتوں، کوڑھتے بسورتے بچوں اور رسمی لڑکیوں کا عمل دخل ہوتا ہے جنہیں وہ اپنے تنفر کے تازیانے لگا لگا کر اپنے وجود کی اہمیت کا احساس دلاتی، انہیں چڑاتی، انہیں اپنی غیر معمولی ذہانت کی چوٹیں لگاتی، اپنی شوخی اور غیر معمولی پھرتی سے مرعوب کرتی۔ اور پھر ان سب کو پیچھے دامن جھٹکتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ سلوک ان اولین کے دوسرے منازل میں شامل ہونے والے مرد کرداروں، شوخ و شنگ ماحول زدہ لڑکیوں، ترقی پسند گروپ اور ریاکار کنول، انقلابی دہشت پسندوں، پروگریسو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ بھی روا رکھتی ہے۔ اگرچہ ان میں بعض کرداروں کی جابجا انفرادیت، شمن کے ٹیڑھے پن پر بھی حاوی ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس لئے کہ شمن کی غیر مستقیم شخصیت میں شدتِ احساس بھی پوری پامردی کے ساتھ شامل ہو چکی تھی۔ اور یہی شدتِ احساس (کہ جس کی تہ بتہ کروٹیں لینے والی میں جنسی ناآسودگی بھی شامل ہے) اور فطری انسانی عنصر کو بیدار رہنا پا کر اکثر اس کی اس حقیری ذہنیت کو شکست دیتی رہی۔ انقلابی، ایسا مستقبل اور ماضی تھا جب ۔۔۔ ان سبھی کرداروں نے شمن کو کسی نہ کسی پہلو سے دبوچ لیا۔ یہی طرح کہ ان کی زندگی میں بچے ہوئے ٹیڑھے پن، اس کی فطرت کا جزوِ لاینفک بنی ہوئی سنگینی اور سختی کو پگھلا اور لچکا دیا۔ اپنی دو پردہ کمزوریوں کی واضح شکست اور نتیجتہً ندامت سے بچنے کے لئے اس نے تسلیم

شکست کا روپ اختیار کیا۔ اگرچہ تسلیم شکست کے بعد پیدا ہونے والی جھنجھلاہٹ اسے کرچھاتی اور جھنجھوڑتی ضرور رہی اپنی زندگی میں داخل ہونے والے کرداروں کے نفسی تجزیے کرنے میں عصمت چغتائی نے سحر اور طلسم کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ جہاں جہاں اس کا وار چلا ہے۔ وہ اپنی مخصوص بیباک نگاری، اپنے مخصوص لب و لہجہ، اپنی مخصوص قوت اظہار و بیان، اور اپنے مخصوص نظریاتی اسلوب کے سارے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر نکلی ہے۔ ہر نیا کردار اور اس کا نیا نفسی تجزیہ شمن کی زندگی میں نفرت، برتری اور انفرادیت کے جراثیم کی نشوونما کرتا اور انہیں پالتا پوستا چلا گیا ہے۔ اس کے محسوسات میں نئے نئے رنگ بھرتا چلا گیا ہے۔ اس کے مشاہدات میں غم، شوق، محبت، نفرت، جنس اور جسم کے نت نئے پہلوؤں کا اضافہ کرتا چلا گیا ہے۔۔۔۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ کہ جب شمن کی زندگی میں پہلا مرد کردار "رشید" شامل ہوا۔ تو اپنی جنسی ناہمواری کے باعث شمن کی کشتی ڈولنے لگی۔ اگرچہ جب اسے جنسی ناہمواری میں گرفتار دوسرے مردوں سے دوچار ہونا پڑا۔ تو اس کا یہ لچکیلا پن، تنفر اور حقارت میں بدل گیا۔ کیونکہ شاید اسے ایسے مردوں میں دو جنس کے اشتراک کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے "سنیل" کے جسمانی اقدامات سے وہ خوفناک حد تک متاثر ہوئی۔ اور یہاں ایلما سے غیر شعوری رشک کی بنا پر اس میں ماممتا نے جنم لیا۔ وہ ماممتا، جو ایلما پر ٹھونس دی گئی تھی۔ لیکن شمن کی زندگی میں صرف ایک نا مختتم حسرت کی شکل ہی کارفرما تھی۔ اور پھر جس حسرت کی تکمیل اس نے "ٹیلر" کے توسط سے کی۔ ٹیلر جو اس کی زندگی میں آسمان سے ٹپک پڑا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اسی طرح جیسے وہ اسی تکمیل ہی کے لئے اس کی زندگی میں در آیا۔ اور اپنے مشن میں کامیاب ہو کر امریکہ چلا گیا۔ امریکہ اور ہندوستان کا یہ گٹھ جوڑ غیر اتفاقی تو نہیں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ناول کے داخلی اور ترتیبی تقاضے اس حادثاتی اقدام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ضرور دکھائی دیتے ہیں۔

اس ناول کے بعض ٹکڑے تو ہمارے اردو ادب کی تاریخ میں ایک مثالی اور امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ عصمت زندگی کے جن جن مخصوص مراحل میں اپنے مخصوص تجربے کرتے ہوئے گزری ہے۔ وہاں اس کی تندی اور تیزی میں ایک اچھوتا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ علی الخصوص کالج اور سکول کی زندگی کے ماحولی تجزیے اور نفسی تنقیدیں، ایلما کے حرامی بچے سے پہلی ملاقات اور پھر ایلما سے منتقمانہ تاثرات کی تصویریں وغیرہ ۔۔ اپنے ناول میں عصمت نے اپنے دل میں بسے رہنے والے اس جذبہ کی بھی متواتر تسکین کی ہے۔ جو لاشعوری طور پر مرد سماج سے متعلق ہے۔ ہم اس جذبے کو عورت مند کہیں یا نہ کہیں۔ کیونکہ ہمارے جدید ہندوستان کی بیدار نسوانیت کا احتجاج ابھی جبلتی فضا میں ہے۔ اور وہ ابھی عصمت ختم نہیں ہوئی۔ لیکن با ایں ہمہ عصمت کا انداز سکون یا فن کارانہ مزہ ہے۔ اگرچہ جسم کی یہ دلکشی کی بات اور ہے۔

سیاسی بحثوں، جنگ کے ہنگاموں اور سوشل تحریکوں کو عصمت نے اپنے خاص انفرادی زاویے کی عینک سے دیکھا ہے۔ اور چونکہ اس کے ذہن پر کسی سیاسی ازم کا بھوت مسلط نہیں ہے۔ اس لئے اس نے ایک بےغرضانہ فنکاری اور بےباکانہ طور پر جا کر جانچ پرکھ کی ہے۔ ان صفحات پر اس کے تاثرات ان معنوں میں نمایاں کئے گئے ہیں

اقتصادی اور سیاسی بحث کو نفسی جذباتیت میں محصور کرنے کے قائل ہیں۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ عصمت ان معاشیاتی صداقتوں کی حد تک ہمدردی کا سلوک کرتی ہے۔ یہ سلوک 'بول کا دانہ' ہے۔ یہ سلوک، جو خلوص سے بھرا ہوا ہے ۔۔ یہ سیاسی مباحث "ٹیڑھی" والے حصے میں تجربات کے افلاس کی چغلی کھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ پلاٹ اور تجربہ کے پھیلاؤ پر بھی: ان آئنوں کے بعد سیاسی بحثیں خشک، بے ڈھنگ اور نکیلی جھاڑیوں میں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور اس طرح عصمت "ناولیت" کے حلقے سے نکل کر قصرِ مقصود کا آسرا لے لیتی ہے۔

شروع سے آخر تک "جسم اور جنس" اس ناول کی ہیئتِ ترکیبی میں کارفرما ہیں۔ "جسم" عصمت کا محبوب موضوع ہے۔ بلکہ یوں کہئے۔ کہ جسم کے شدید ترین اور گوناگوں تجربات نے ہی اسے فن کی مشعل عطا کی۔ یہ تجربات تلخ بھی ہیں تیز بھی، شیریں بھی، طنزیہ بھی، دلچسپ بھی، مخلصانہ بھی، مریضانہ بھی اور صحت ور بھی ۔۔ اور تجربات کا یہ تنوع در حقیقت ہماری سماج ہی کا دیرینہ اور مسلمہ تنوع ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ جسم کے روپ میں ان تجربات کی قائل بھی ہے اور ناقائل بھی۔ ایک خاص معیار کے مطابق وہ تجربات کو سختی سے ڈانٹتی بھی ہے۔ انہیں ایک استاد کی طرح جھڑکتی بھی ہے۔ اگرچہ سماجی پہلو سے اسے لاگ بھی ہے اور لگاؤ بھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ دھوکہ نہیں دیتی۔

زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کی بساط پر گھمانے پھرانے کے بعد جنس کی کیفیت ایک ہارے ہوئے جواری کی سی ہو جاتی ہے۔ وہ بساطِ حیات پر اپنے 'مہروں' کو پٹتے، لڑھکتے اور سرنگوں حالت میں دیکھتی ہے۔ تو انتقام کا ایک اور بھیس بدل لیتی ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو تصنعات میں بھینچ سکیڑ لیتی ہے۔ ایک خالصتاً مصنوعی زندگی گزارنے پر تل جاتی ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ گویا اس گہری اور ابدی حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے۔ کہ زندگی کے منفرد پیمانے ہمیشہ غیر مطمئن اور بھڑکتے تڑپتے نخچیر کی سی حیثیت میں رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے۔ کہ وہ اپنے انتقام کو خوشی، بہادری، حسن محبوبیت اور اطمینان کا روپ دے دیں۔ اور ہر رنگ میں صبح تک جلتے رہیں۔ لیکن نتیجہ معلوم۔

عصمت کا یہ ناول خوبیوں سے خالی نہیں۔ کمزوریوں سے محفوظ نہیں۔ لیکن ہمارے جدید ناولی دور کے لئے نشانِ راہ کا حکم رکھتا ہے۔ ایسا نشانِ راہ جس کے اشاروں پر تعمیری، افادی اور لافانی ناول تخلیق کئے جا سکتے ہیں۔ شدید ترین انفرادیت کے خول میں اجتماعی احساسات کی پھڑپھڑاہٹ' پرواز کے لئے واضح پیغام ہے۔

اور ڈان بہتا رہا

مائیکل شولوخوف کا یہ ناول جسے مکتبہ جدید لاہور نے اردو کا جامہ پہنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ روسی ادب میں ایک ممتاز ترین ناول کا مرتبہ حاصل کر چکا ہے۔ یہ ناول دریائے ڈان کے ساحل کی ایک کاسک بستی تاتارسک سے شروع ہوتا ہے۔ اور کاسک قبیلے کی وہی طرزِ بود و ماند اور جنگجو عسکری فطرت کے ڈانڈے پہلی جنگ عظیم سے ملاتا ہوا، زار کی استبدادی حکومت پر روس کے سرخ انقلاب کے شعلے بھڑکاتا ہوا، بالشویکی انقلابیوں کو پامردی کے ساتھ شہنشاہ پرست قوتوں کے ہاتھوں اذیت، تشدد، قتل و غارت اور فسادِ جنگی کا نشانہ بنتا ہوا ختم ہوتا ہے۔

ناول پڑھتے پڑھتے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ہم ہندوستان ہی کے کسی سرحدی قبیلے کی داستان پڑھ رہے

ہیں۔ وہی جفاکشی، وہی بے تکلف گرم جوشی، وہی گنجینے کے مانوس کھیت، گھوڑے، مچھوندر، وہی اخلاقی اور ادائی نظریے، وہی فلسفہ حسن و عشق، وہی گائے بیل بچھڑے، بھیڑ بکری اور وہی سے اٹھتے ہوئے سحر خیز نغمے وہی قہقہے، وہی شامیں، وہی ازدواجی مسائل اور معیارات۔ جیسے مشرق کی روح ایک لمبے تار کی طرح کھنچ کر ڈان کے کناروں تک پہنچا اور پھونکتی چلی گئی ہے۔

شولوخوف کا یہ ناول روسی تاریخ سے ایک بہت عظیم اور اہم ترین باب کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ انقلاب سے پہلے کی کاسک زندگی کے تجزیے اور ان کی ماحولی تصویریں، ان کی مسکراہٹیں، قہقہے، آنسو، کراہیں، رقابتیں اور نفرتیں، محبت کے گیت، پیچیدہ اور وسیع سیاست کا ثبوت دیتی ہیں۔ اس کے بعد شہنشاہیت زار کی جنگ عظیم میں شمولیت پر کاسک زندگی کی بلیشتی ہوئی کیفیتیں، میدان جنگ کے لرزہ خیز اور دلدوز مناظر دوران جنگ ہی میں بالشویکی عناصر کی نمود اور پرداخت اور اشتراکی رفقا کی خفیہ اور جانبازانہ سرگرمیاں، کاسک جیسے وحشی، اجڈ لیکن بہادر قبیلے کے نوجوانوں میں انقلابی روح پھونکنے کے انداز نہایت چابکدستی، خلوص اور دیانت کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ جابر زار کی حکومت کا تختہ الٹ جانے کے بعد کا حصہ ناول کا طویل، اثر انگیز اور اہم حصہ ہے کیونکہ یہ وہ دور تھا جب کہ انقلابی قوتوں کے سامنے اندرونی دشواریاں پہاڑ بن کر حائل ہو گئی تھیں۔ صدیوں تک زار شاہی تلے کچلی جاتی ہوئی کاسک قوم، جبر و استبداد سے غیر شعوری طور پر مانوس ہو چکی تھی۔ ان کے اذہان، عمل کی حد تک شہنشاہیت سے سمجھوتہ کر چکے تھے۔ اس لئے وہ انقلاب کے شعلوں کو قبول کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ بالشویکی نظام انہیں کسی نامحسوس خطرے کا پیش خیمہ دکھائی دے رہا تھا۔ متضاد دور کی اس چکی میں سرخ انقلابیوں کو بیش بہا قربانیاں دینی پڑ رہی تھیں۔ ان کی یہ قربانیاں ایک فرسودہ اور گلی سڑی قوم کے بطن سے ایک نئی، تازہ اور خوشحال قوم کو جنم دے رہی تھیں۔ رسمی دیوانوں کی اٹل اور وحشیانہ دیواریں، انقلاب دشمن بورژوائی کی سرکشی اور ان کے اندر دم توڑتی ہوئی زہریلی شاہ پسندی اور ان سب کے ساتھ ساتھ نئے نئے کاسک انقلابیوں کے اوہام و شکوک — ایسی ان گنت رکاوٹوں کے درمیان انقلابی قوتوں کا سیلاب اپنی قیمتی اور لافانی قربانیاں دیتا ہوا بڑھتا چڑھتا رہا، متواتر، مسلسل اپنے پیارے دیرینہ اور مانوس ساتھی ڈان کی طرح بہتا رہا۔ بہتا رہا۔ بہتا رہا —

شولوخوف کا فن اپنے کرداروں، اپنی پہاڑیوں، اپنے جنگلوں، اپنے دیہات، اپنے شہروں اور اپنے کاسکوں کا مشتاق اور ماہر شکاری کی طرح احاطہ کر لیتا ہے۔ شاعر بن کر، داستان گو بن کر، مصور بن کر، انقلابی بن کر اور سب سے زیادہ ایک کاسک بن کر — ایک جدید ترین اشتراکی کاسک جسے سوویت طرز نظام کی ہمہ گیری اپنی تاریخ عزیز ہے اور آزاد عوام کی آزاد کاسک ریاست عزیز ہے۔ مخالف اور موافق طبقوں کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں اس نے کمال دیانت کا ثبوت دیا ہے۔ وہاں اس نے [illegible] عجیب و غریب [illegible] کو کسی مقام پر بھی [illegible] [illegible]

ادارۂ مکتبہ جدید شکریہ کا مستحق ہے جس نے یہ ناول شائع کرکے ہمارے اردو ادب میں ایک مثالی اضافہ کیا ہے اور آنے والے عوامی انقلاب کے لئے ذہنی تعاون کی ترتیب و تکمیل کا فرض سرانجام دیا ہے۔

جناب محمود رجا اللہ مصری نے ترجمہ کرتے ہوئے جیسے کارک تبیلے اور مائیکل شولوخوف کے دلوں کو جاکر ٹٹول لیا ہے۔ چونکہ ماحول مدح میں مشترقیت تھی۔ اس لئے الفاظ اور محاورات کے انتخاب میں محمود صاحب کی صحیح اور پوری قوت کارفرما رہی؛

فکر تونسوی

مطبوعات مکتبہ جدید

مکتبہ جدید اپنی مطبوعات کے ساتھ ہندوستان کے مشہور ادبا شعرا کی کتابوں کی مختصر سی فہرست پیش کرتا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ آپ کے آرڈر پر ہر ایک کتاب مہیا ہو سکتی ہے۔ آپ کی سہولت کیلئے بزنس ریپلائی کارڈ ساتھ چسپاں ہے۔ (بغیر ٹکٹ) آرڈر کیلئے استعمال فرمائیں ؛

اور ڈان بہتا رہا۔ میخائیل شولوخوف کو اس ناول پر تین لاکھ روپے انعام ملا۔ اس ناول کی تین کروڑ جلدیں مختلف زبانوں میں چھپ چکی ہیں۔ اس ناول میں روسی انقلاب کا عمل اور ردعمل نہ صرف ہو بہو دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ ہو بہو محسوس ہوتا ہے۔ "تند، سریع الحرکت، بہیمیت اور طوفانی" (فیض احمد فیض) ایک ہی خوبصورت اور مضبوط جلد میں۔ قیمت آٹھ روپے ؛

شفیق الرحمٰن۔ شگوفے ۲/۸۔ پرواز -/۲۔ مدوجزر ۲/۱۲۔ اردو کے مزاح نگاروں میں شفیق الرحمٰن ایک مستقل حیثیت کا مالک ہے۔ اس کا اسلوب اس کی زبان، اس کا موضوع، سب کچھ اس کا اپنا ہے۔ اسی لئے اس کے قہقہوں میں خلوص اور مسکراہٹوں میں پاکیزگی ہے۔ شفیق الرحمٰن موجودہ دور میں شگفتہ اور صحت مند ادب کا بانی ہے (حماقتیں، لعبہ۔ زیر طبع)۔ لہریں ۲/۱۲۔ کرنیں -/۲ ؛

کنہیا لال کپور۔ شیشہ و تیشہ -/۲۔ چنگ و رباب -/۲۔ سنگ و خشت -/۲۔ کنہیا لال کپور نہ مصلح قوم ہے اور نہ معلم اخلاق وہ سنگین حقیقتوں کو ٹکرا کر پھلجھڑیاں پیدا کرتا ہے۔ اس نے تخیل سے کبھی فریب نہیں کھایا وہ بڑا سفاک جراح ہے۔ مگر اس کے مرہم میں سکون و سرور ہے۔ جو مریض کو بھی کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے

عزیز احمد۔ گریز -/۴۔ رقص ناتمام ۳/۸۔ ہوس -/۲۔ عزیز احمد کا موضوع بین الاقوامی ہے اور اس کے کردار مشرق و مغرب کی سرزمینوں کے چلتے پھرتے بولتے چالتے اور اپنے ہاں کی سماج کے سچے نمایندے ہیں۔ گریز کے بیان میں جمالی اور بے تکلفی اور زبان میں گھلاوٹ اور سادگی ہے۔ تکنیک، پلاٹ اور کردار سازی کے اعتبار سے بہت کم جدید اردو ناول گریز سے ٹکر لے سکتے ہیں۔ رقص ناتمام عزیز احمد کے بالکل نئے اور اچھوتے افسانوں کا پہلا خوبصورت مجموعہ ہے ؛

بلونت سنگھ۔ تار و پود -/۲۔ سنہرا دیس -/۳۔ بلونت سنگھ پنجاب کی روح کو اردو کے حسین جسم میں اس طرح پھونکتے ہیں کہ وہ جیتی جاگتی مورت ہنستی ہوئی ہمارے من کے مندر میں آن بیٹھتی ہے۔ اور پھر اس کے ہونے ہوئے کسی اور سندر مورتی کا وہاں جگہ پاتا بہت کٹھن ہوتا ہے۔ پنجابی گاؤں کی زندگی کو بلونت سنگھ جیسا ترجمان آج تک میسر نہ آیا تھا۔ بلونت کے منتخب افسانوں کے مجموعے پڑھیں ؛

خدیجہ مستور۔ بوچھار ۲/۸۔ آپ نے کبھی نکولیاں تو دیکھی ہونگی۔ نکولیاں۔ دیکھنے میں خوبصورت کھانے میں کڑوی زہر مگر فائدے کے لحاظ سے مصفی خون۔ یہ بوچھار بھی نکولیاں جیسی سمجھ لیجیئے۔ جس کا رخ آپ کے ذہن کی طرف ہے۔ افادی ادب کا شاندار نمونہ ؛

محمود جالندھری۔ تلاطم ۲/۸۔ خاص ۳/۴۔ محمود جالندھری کی شاعری میں سحر ہے روانی ہے۔ محمود نئی ترکیبیں

نئی تشبیہوں سے اپنے فکر کو مزین کرتاہے مختصر چھوٹے چھوٹے معنی خیز جملوں سے اتنے حیرت انگیز خاکے تیار کرتا ہے کہ اس کے مشاہدہ کی داد دینا پڑتی ہے۔ جلوہ گاہ -/۲۔ مختصر نظمیں ہیں ؛

پینڈرل مون (سابق ڈپٹی کمشنر امرتسر) ہندوستان میں اجنبی راج -/۳۔ ہندوستان کا مستقبل ۱/۸ مسٹر مون ہندوستان آتے تھے کہ ہندوستان کو آزاد کرائیں گے۔ مگر یہاں آکر ارباب حکومت کی روح فرسا سیاست اور ہولناک بدنیتی نے ان پہ واضح کر دیا کہ ہندوستان غلام ہی رہے گا۔ اسی مایوسی کے عالم میں وہ اپنے منصب جلیل سے مستعفی ہو گئے۔ ہندوستان چھوڑتے وقت یہ دو کتابیں لکھیں۔ جو آئینہ ہیں۔ ان میں برطانوی جعلسازی ہی کو عریاں نہیں کیا گیا بلکہ ہندوستان کے مستقبل اور مقدر کی قلمی تصویر بھی پیش کی ہے۔

پیر علیدی۔ خودکشی میں دنیا کے حسین و جمیل واقعات پیش کئے ہیں۔ جو دنیا کے مشہور زبانوں کے شاہکار ہیں خودکشی کا موضوع بڑے انوکھے انداز اور بالکل انوکھے واقعات کی تفسیر ہے۔ قیمت ۳/۴ ؛

کوثر لکھنوی۔ سفیر سخن -/۲ فن شاعری اور شعر و سخن میں یہ کتاب بیش قیمت اضافہ ہے علم عروض پر سب سے اچھی کتاب ہے۔ بڑا سائز تین سو صفحات مجلد ؛

حاجی لق لق۔ رفتار لق لق ۱/۱۲۔ میں شوخ بیانی، ندرت خیالی اور ظرافت نگاری کے اعلیٰ نمونے ملیں گے ارباب حکومت کی شاطرانہ چالیں، ذاتی مفاد کی سحر کاریاں کو لق لق نے "سیاسی سرکس" میں نئے انداز سے پیش کیا ہے جس میں ساتھ ساتھ کارٹون بھی دیئے گئے ہیں ؛

تاجور سامری۔ کانٹے ۱/۸۔ رونک ۱/۴ تاجور سامری ایک اچھا ادیب ہے۔ کانٹے میں ان کے بہترین افسانے ہیں۔ اور رونک میں فن ڈرامہ ٹکنیک اور سٹیج کی ضروریات (بناؤ سنگار وغیرہ) پر بہترین کتاب ہے ؛

انسان کی پوشیدہ طاقتیں ۱/۴۔ انگل شام ۱/۸۔ مخزن صنعت و تجارت ۱۲/۴۔ محافظ شباب -/۲ قد بڑھانے کی ورزشیں ۱/۴۔ ریڈیو کورس پانچ حصص -/۱۵۔ سادہ کرسٹل سیٹ -/۸۔ کرسٹل سیٹ مع لاؤڈ سپیکر -/۱۔ آرمیچر وائنڈنگ (اے۔سی۔ڈی۔سی) -/۵ ؛

موبیل
منو نمبر ۱

شعری ادب کے دو مقبول ترین مجموعے

نقش فریادی

شاعری کے جدید اسکول میں فیض وہ پہلا فن کار ہے، جس نے انفرادی دکھوں کو سماجی پس منظر میں جانچا اور حقیقت اور رومان کا سنگم تلاش کیا،
فیض کا ہر شعر قاری کے دل پر ایک ایسا راز فاش کرتا ہے جسے فن کار صدیوں سے اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے تھے،
وہ غمناک ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے بھی انسان کو اس بہتر مستقبل کی نوید دیتا ہے جب موجودہ سطوت اسباب اور گرانباری آداب بھی یکسر اٹھ جائیگی
سوز اور خلوص محبت اور سیاست تغزل اور تفکر کا دلفریب امتزاج
چوتھا ایڈیشن
قیمت دو روپے

تلخیاں

ساحر کی شاعری بدلتی ہوئی تاریخ کے ہمرکاب جا رہی ہے وہ کسی ایک طبقے ایک فرقہ یا ایک قوم کا شاعر نہیں ساری انسانیت کا شاعر ہے ——— لازوال خلوص لافانی محبت اور لامتناہی جدوجہد کا شاعر،
طبقاتی کشمکش اور تاریخی محرکات کو سمجھ کر اس نے اپنے فن کا رشتہ ان نامیاتی قوتوں سے جوڑا ہے، جن کے ہاتھوں ایک بہتر مستقبل کی داغ بیل پڑ رہی ہے۔
اس کے فن میں [illegible]ت براہ راست اپیل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جدید تر شعرا میں اردو [illegible] سب سے زیادہ پیار کرتا ہے،
زندہ، جاندار، متحرک اور پائندہ ادب کا مثالی مجموعہ جو رنگین بھی ہے اور سنگین بھی،
تیسرا ایڈیشن قیمت دو روپے

نیا ادارہ ——— لاہور

(۴)

ادب کی ترقی پسند تحریک کا ترجمان

سویرا

ترتیب دینے والے:
ساحر لدھیانوی
نذیر چودھری

نیا ادارہ۔ لاہور

حالی پبلشنگ ھاوس۔ دھلی
PUBLISHING HOUSE

ترتیب

نذیر چودھری نے سول اینڈ ملٹری گزٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا

ادارہ

بات چیت

گاندھی جی کی موت کے بعد پاکستان اور ہندستان کی سیاسی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے، اس نئے دور میں ترقی اور رجعت کے نمائندہ طبقوں کی جنگ واضح اور نمایاں تر ہوگئی ہے، گاندھی جی کی موت نے عوام پر جو نفسیاتی اثر چھوڑا تھا، ہندستان اور پاکستان کی حکومتوں نے اس سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا۔ کیونکہ ابھی تک دونوں حکومتوں میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو یہ نہیں چاہتے، کہ عوام کا ذہن غلط قسم کے فرقہ وارانہ جنون سے ہٹ کر زندگی کے حقیقی اور بنیادی مسائل کی طرف مبذول ہو، اور وہ اپنی روزمرہ ضروریات کی تکمیل کے لئے دیسی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف صف بستہ کھڑے ہو جائیں۔ اسی لئے وہ عوام کو مختلف نعروں میں الجھائے رکھنا چاہتے ہیں اور اس میں شک نہیں، کہ وہ ایک طویل عرصے تک اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی رہے، لیکن عوام کا شعور جاگ رہا ہے، اور جماعتی احساس پروان چڑھ رہا ہے یہ صحیح ہے، کہ ابھی اس سرزمین کے رگ و پے سے فرقہ پرستی کا زہر پوری طرح خارج نہیں ہوا لیکن فسادات کا سیلابی دور گذر گیا ہے، اور اپنے پیچھے جلی ہوئی بستیوں، قحط زدہ آبادیوں اور لٹی ہوئی عصمتوں کا ایک لامتناہی کارواں چھوڑ گیا ہے، جوں جوں نئے حکمران اپنے اصلی روپ میں عوام کے سامنے آتے جا رہے ہیں، پرانے طلسم ٹوٹ رہے ہیں، قومیت کے وہ محل چکنا چور ہو رہے ہیں، جن کی بنیاد مذہب کے غلط نظریئے پر رکھی گئی تھی، عوام اپنے اصلی دشمنوں کو پہچان رہے ہیں، اور دونوں مملکتوں میں اپنے اپنے رجعتی حکمرانوں کے خلاف ایک بہتر اور توانا زندگی کے حصول کی جد و جہد شروع کر رہے ہیں۔ ہمارے ادیبوں اور فنکاروں کا فرض ہے، کہ وہ عوامی مطالبات کا ساتھ دیں، اور اس جد و جہد میں ان کی رہنمائی کریں۔

جوں جوں اس برعظیم میں طبقاتی جنگ تیز ہوگی، فرقہ پرستی کا جنون کم ہوگا، اور عالمگیر انسانی اخوت کا تصور پروان چڑھے گا۔ رجعتی ادارے کمزور ہونگے، اور جمہوریت اور اشتراکیت کی طاقتوں کو فروغ ملے گا۔ جب تک ہندستان اور پاکستان میں موجودہ حکمران طبقوں کی جگہ باغی

بازو کی قوتوں کا اقتدار قائم نہیں ہو جاتا، خوشحال زندگی اور متوازن سماج کے حصول اور اقلیتوں کو از سرِ نو بسانے کے خواب پورے نہیں ہو سکتے۔

ہمارے ادیبوں اور فن کاروں کو اس نئے دور میں پہلے سے بھی زیادہ سختیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ ہمارے بہت سے رفیقوں کو یورپ اور چین کے ادیبوں کی طرح قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ یہ بھی ممکن ہے، کہ بہت سے ادیب ہمارا ساتھ چھوڑ جائیں، اور ہم تعداد میں کم رہ جائیں، لیکن ہمیں ان چیزوں سے ہراساں نہیں ہونا چاہیئے۔ ہر دور اپنے ترجمان خود پیدا کرتا ہے، ہم جہاں کچھ پرانے اور بوسیدہ بتوں کو ٹوٹتے دیکھیں گے، وہاں نئی انقلابی جد و جہد کے بطن سے لاتعداد نئے فن کاروں کو جنم لیتے بھی دیکھیں گے۔ اور پھر اگر ہمارا احساس پختہ، ہمارے جذبات صالح، اور ہمارے نظریات ٹھوس بنیادوں پر قائم ہیں، تو کوئی وجہ نہیں، کہ ہم اس نئے دور میں خوف یا مصلحت کی بنا پر پسپائیت کا رجحان اختیار کر لیں۔ اور وقت اور ماحول کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکیں۔

ہمیں اپنے ادیب ساتھیوں کے مجلسی شعور اور سیاسی بصیرت پر بھروسہ ہے، اور ہم متوقع ہیں کہ وہ اس نئے دور میں نہ صرف عوام کی رہنمائی کریں گے، بلکہ ان حملوں کا متحدہ جواب بھی دیں گے جن کی تیاری میں اس وقت حکومت کے رجعت پسند حلقے منہمک ہیں۔

سویرا کی سالانہ ممبری

سویرا عوامی فن کاروں کا ترجمان ہے۔ عوام دوست طبقوں کا فرض ہے کہ سویرا کی سرپرستی کریں،

نیا ادارہ — سال بھر میں سویرا کے سلسلہ کی چھ کتابیں پیش کرے گا۔ ہر کتاب کی قیمت دو روپے ہوگی۔ لیکن مستقل ممبروں سے صرف دس روپے لئے جائیں گے۔

منیجر نیا ادارہ

ساحر

جان پہچان

خواجہ احمد عباس: اردو کے ان ترقی پسند ادیبوں میں سے ہے جنہوں نے اس راز کو پالیا ہے کہ عظیم اور بلند پایہ ادب کی تخلیق دوامی قدروں کے پیچھے بھاگنے سے نہیں ہنگامی موضوعات کو اپنانے ہی سے ہو سکتی ہے۔ عباس کا فن اس کے دور کی سیاسی اور سماجی الجھنوں کا عکاس ہی نہیں نقاد بھی ہے اور اسی میں اس کی فنکارانہ عظمت ہے۔

انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتا ہے اور بہت تیز لکھتا ہے۔ محنت اور جفاکشی میں اپنا جواب نہیں رکھتا، یہاں تک کہ وہ رات کو ایک انگریزی ڈرامہ لکھے گا، صبح اس کا اردو میں ترجمہ کر دے گا، دوپہر کے وقت ہندستانی عوامی تھیئٹر کے اداکاروں کو اس کی ریہرسل کروائے گا شام کے ساڑھے سات بجے اسے سندر بائی ہال میرین لائنز بمبئی میں سٹیج کرے گا، اور رات کے دس بجے گھر جاتے ہوئے اس ڈرامے پہ تبصرہ لکھ کر "بمبئی کرانیکل" کے آخری صفحے پر شائع بھی کروا دے گا۔

سر کے بیشتر حصے پر بال نہیں ہیں، لیکن آثار بتاتے ہیں، کہ کسی زمانے میں رہے ضرور ہوں گے ایک عرصے سے بمبئی میں مقیم ہے۔ ایک انگریزی روزنامے کا ایڈیٹر ہے۔ تین چار فلموں کی کہانیاں لکھ چکا ہے۔ دو تین فلموں میں ڈائریکٹر کے فرائض سرانجام دے چکا ہے اور آجکل ایک ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کی دھن میں ہے۔

شدید فسادات کے دنوں میں بھی بمبئی کے خالص ہندو علاقے شیواجی پارک میں رہتا تھا اور پیدل گھر جاتا تھا۔ ــــ یہ اس کے ایمان کی پختگی کا عملی ثبوت ہے۔ عالمگیر انسانی اخوت کے نظریے پر ایک انسان کے ایمان کا ثبوت۔ گاندھی جی کی موت پر اردو میں سب سے پہلی کہانی عباس نے لکھی ہے اور غالباً اسی کا یہ حق تھا۔

ظہیر کاشمیری: صورت شکل سے انقلاب فرانس کے زمانے کا کوئی مرحوم ادیب" معلوم ہوتا ہے۔ لمبوترا چہرا، نکیلی اور تیکھی ناک، سرخ رنگ، لمبے اور گھنے بھورے

بال اور برش جیسی داڑھی ـــــ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس میں اور انقلاب فرانس کے ادیبوں میں بہت سی خصوصیات ہیں بھی مشترک۔ دو بار جیل جا چکا ہے اور سالہا سال تک مزدوروں اور کسانوں کی عملی جدوجہد میں حصہ بھی لیتا رہا ہے، بات چیت کا انداز خطیبانہ ہے اور اس حد تک خطیبانہ، کہ اچھی خاصی محفل پر سٹڈی سرکل کا رنگ طاری ہو جائے۔

امرتسر میں پیدا ہوا، اور یہیں پہ مسلم اینگلو اورینٹل کالج میں بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ گذشتہ چند برس سے لاہور میں مقیم ہے اور فلموں کے گانے، مکالمے لکھتا ہے،

تنقیدی مضامین کا مجموعہ "ادب کے مادی نظریے" کے عنوان سے چھپ چکا ہے اور نظموں کا مجموعہ "عظمت آدم" عنقریب نیا ادارہ لاہور سے چھپنے والا ہے

سیف الدین سیف : نوجوان شعراء میں سیف غالباً وہ واحد شاعر ہے، جس نے غزل کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی ہے، طبعاً رومانی واقع ہوا ہے، اور زندگی کے متعلق اس کا رویہ بھی بڑی حد تک رومانیت پسندانہ ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ ارتقا اور انسانی مستقبل کی بہتری پر یقین رکھنے کے باوجود اس کی شاعری ایک گونہ تھکن اور یاسیت کا پرتو لئے ہوئے ہے اس یاسیت نے اس کی شاعری میں ایک ایسی چبھن اور مٹھاس پیدا کر دی ہے جو براہِ راست پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتی ہے،

شروع کالج کے زمانے میں خاکسار تحریک سے وابستہ تھا، آج کل ہر فسطائی یا نیم فسطائی تحریک کا مخالف اور مذہبی توہمات کا باغی ہے۔

کیفی اعظمی : گھنے اور خشک بالوں والا سانولا سا نوجوان ـــ جس کی شاعری کھیتوں کی دھول اور کارخانوں کی گڑگڑاہٹ میں پیدا ہوئی، اور وہیں پروان چڑھی آجکل اردو ادب میں متنازعہ فیہ مسئلہ بنا ہوا ہے۔ فن اور پراپیگنڈے کی کوئی بحث ہو، اس میں کیفی کا ذکر ضرور آتا ہے، متوسط طبقے کے نقاد اس کی رومانی شاعری کی تعریف کرتے ہیں، لیکن سیاسی نظموں کا ذکر آتے ہی یک لخت بدک اٹھتے ہیں، کیفی کسی یونیورسٹی کا سند یافتہ نہیں اور نہ اُسے انگریزی ادب پر دسترس حاصل ہے، ورنہ شاید وہ بہ آسانی اپنے فنی نظریات کے جواز میں جدید روس سے مایئکافسکی، جدید فرانس سے لوئی اراگان اور جدید ہسپانوی شاعری سے پبلو نرودا کے حوالے دے کر تحت الشعوری ادیبوں کا منہ بند کر دیتا۔ لیکن وہ ان سب کی شاعری سے متعارف نہیں، ہاں اپنی شاعری کو اچھی طرح پہچانتا ہے اور جانتا ہے کہ ادب کا صحیح مقام امرا کی گھٹی گھٹی محفلیں نہیں زندگی کے کھلے میدان ہیں ـ وہ میدان جن میں انسانیت درانتیوں اور ہتھوڑوں کے سائے میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کے قلعوں کی جانب

پیش قدمی کر رہی ہے'

اعظم گڈھ (یو پی) میں پیدا ہوا، وہیں اردو اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، اور وہیں سے اپنی شاعرانہ زندگی کا آغاز کیا۔

۱۹۴۲ء سے بمبئی میں مقیم ہے' اور ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کا کُل وقتی کارکن ہے' جہاں سے اسے دو وقت کھانا اور چائے اور نو روپے چودہ آنے ماہوار ملتے ہیں' پچھلے سال اورنگ آباد کے ایک خوشحال گھرانے کی لڑکی ــــ شوکت سے اس کی شادی ہوگئی ہے' جو اس کی شریکِ حیات بھی ہے' اور شریکِ کار بھی۔

ناہید عالم: گہری آنکھوں' اور گولائے ہوئے سنہری بالوں والی لمبی سی گوری سی لڑکی ــ جس نے ابھی لکھنا شروع ہی کیا تھا، کہ لکھنا چھوڑ بھی دیا، ہمارے دور کی سب سے نوعمر افسانہ نگار ہے' اس کے کردار۔ ملں کی الجھنیں عام طور پر داخلی ہوتی ہیں' اور وہ بالعموم ان کا حل بھی داخلیت ہی میں تلاش کرتے ہیں۔ پھر بھی اس کی کہانیاں پڑھ کر اس گھٹن کا احساس نہیں ہوتا، جو اس کی پیشرو خواتین کے افسانوی ادب کا نمایاں جزو رہی ہے، اسی لئے یہ بات یقینی ہے' کہ اگر اس نے لکھنا چھوڑ نہ دیا، تو اس کے فن کو اپنا سماجی منصب تلاش کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔

۱۹۲۵ء میں جلال آباد (ضلع فیروز پور) میں پیدا ہوئی' ریاست پٹودی میں پلی اور پٹودی ہی سے جہاں اس کے والد ریاست کے دیوان تھے' پرائیویٹ طور پر بی اے کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۴۷ء میں اجمیر کے ایک امیر گھرانے میں اس کی شادی ہوگئی تھی' جہاں سے قیامِ پاکستان کے بعد وہ اپنے شوہر کے ہمراہ لاہور چلی آئی ہے۔ ایک سال کی طویل خاموشی کے بعد' رخشی' اس نے پہلی کہانی لکھی ہے' شاید یہ تمنا کرنا نامناسب نہ ہوگا، کہ وہ پھر لکھنے لگے ــــ اور لکھتی رہے'

غروبِ عظمت

قضا سے ساز کر کے بند کرتے ہو زباں میری
خدا چاہے تو خود کہتے پھرو گے داستاں میری

(جگرؔ)

عبدالمتین عارف

۳۰ ر جنوری

ہوا کا جھونکا،
ہوا کا تند اور تیز جھونکا،
کچل گیا شمعِ زندگی کی حسین لَو کو،
حسین لَو، جس کی نرم تنویر موت کی اژدھا صفت انجمن کے شانے ہلا رہی تھی!

ہوا کا تند اور تیز جھونکا ہے سخت ناداں،
پلٹ کے اک بار بھی نہ دیکھا،
افق سے خورشیدِ زندگی سرخ پرچموں کی حسین چھاؤں میں بڑھ رہا ہے،
یہ موت کی اژدہا صفت انجمن ابھی جگمگا اٹھے گی،
ذرا نہ سوچا،
یہ شمعِ ہستی تو اپنا کارِ عظیم انجام دے چکی ہے،
تمام شب جھلملا چکی ہے
اسے بجھانے سے فائدہ کیا — خرامِ خورشیدِ زندگی تو نہ رک سکے گا!

حامد عزیز مدنی

مرے رشی مرے درویش

ہزار بار زمانے میں انقلاب آئے
ترے مقام سے تجھ کو ہٹا نہیں سکتا

تو پا گیا کھلے بندوں جسے وہ رازِ حیات
ہزار پردوں میں بھی کوئی پا نہیں سکتا

بجھا تھا جس کی ہوا سے ترا چراغِ حیات
وہ شام دامنِ صبحِ نشور تک پہنچی

زمیں کے دکھتے ہوئے پہلوؤں سے آئی صدا
ترے لہو کی چمک دور دور تک پہنچی

صدائیں آئیں وہ سقراط و ابنِ مریم کی
کہ آدمی کو شعورِ حیات کچھ بھی نہیں

کسی فقیر کا دامن شکن شکن اک دن
لہو لہو نہ اگر ہو تو بات کچھ بھی نہیں

یہ ترے سوگ میں ڈوبی ہوئی فضا یہ رات
نگہ کفیلِ غمِ کائنات ہو کے رہی

مرے رشی مرے درویش میرے زندہ باپ
حیات تیری دلیلِ حیات ہو کے رہی

ابھی زمین کا مردہ سکوت ٹوٹا تھا
تری صدائے قدم سے ترے اشارے سے

مرے شہید مرے ناخدا مرے رہبر
ابھی لگا تھا سفینہ مرا کنارے سے

ہزار صدیوں کے سناٹے راہ میں ہونگے
یہ گولیوں کی صدائیں نہ رک سکیں گی کبھی

یہ فتنۂ سرِ فلک یہ عتابِ شر کیا ہے
کہ دیدہ ور کی نگاہیں نہ جھک سکیں گی کبھی

میں جانتا ہوں کہ سر فنائے ذات ہے یہ
کہ آشکار بہ رنگِ صفات ہو جائے

نگاہ و دل کی صداقت کا خون ہوتا رہا
کہ فاش کچھ تو رموزِ حیات ہو جائے

کنول پرشاد کنول

مہاماری

یہ کون مہاماری آئی؟
اس کے چھیتے ہی دم بھر میں انسان ہو جاتا ہے پاگل
اور گھر والوں کے ہاتھوں ہی ہر گھر بن جاتا ہے مقتل
لے سنگ کال کی پرچھائیں یہ کیسی بیماری آئی
یہ کون مہاماری آئی؟
کچھ خون بھوک نے چھوڑا تھا اس نے ہر بوند نچوڑ لیا
اڑنے سے پہلے ہی بندی پنچھی کا پنکھ مروڑ دیا
آزادی کا سواگت کرنے یہ کیسی ہتیاری آئی
یہ کون مہاماری آئی؟
صدیوں پر سپنا دیکھا تھا کچھ پھول کھلے ہیں آنگن میں
جب آنکھ کھلی، دیکھیں ہر سُو، لپٹیں ہی لپٹیں گلشن میں
پھولوں کے رنگوں سے اڑ کر یہ کیسی چنگاری آئی؟
یہ کون مہاماری آئی؟
لوہو کی موجیں چڑھتے ہی پنجاب کا پانی اتر گیا
بنگال، بہار، نواکھالی سب کا شیرازہ بکھر گیا
بے ہوشی بڑھتی جاتی ہے ہم سمجھے بیداری آئی
یہ کون مہاماری آئی؟
یہ آگ جو پھیلی اور، تو پھر سارا مٹ جائے گا چمن میں
مل جل کر ساتھی اٹھ بیٹھو مضبوط ارادے لے من میں
کندھوں پہ تمہارے ہی اب یہ بھاری ذمہ داری آئی
یہ کون مہاماری آئی؟

منیب الرحمٰن

مہاتما گاندھی

کیا فقط گردشِ انفاس ہے انساں کی حیات؟
کیا گرفتار ہے وہ وقت کی زنجیروں میں؟
کیا وہ ظلمت گہِ تقدیر کا زندانی ہے؟
اور کیا اس کا وجود
ایک تنکے کی طرح ہے جو بہا جاتا ہو
سر ٹپکتے ہوئے بپھرے ہوئے طوفانوں میں
بیکسی جس کی ہو بیگانۂ ذوقِ منزل؟
میں نے ہنگامِ سحر
ڈوبتے چاند ستاروں سے کیا ہے یہ سوال
سرد ہوتے ہوئے نمناک شراروں سے کیا ہے یہ سوال
اور وہ ہنس دیئے جیسے انہیں معلوم نہ ہو
یہی بیباک تمسخر تھا مگر ان کا جواب!

زندگی ایک حقیقت ہے عیاں
ہم سے ممکن ہے تعین جس کا
ہم پرکھ سکتے ہیں احساس کے پتھر پہ صفاتِ ہستی
ڈال دیتی ہے مگر موت جب اس پر پردہ
تو ہمارے یہ حواس

عجز سے سر کو جھکا لیتے ہیں
ٹوٹنے لگتی ہیں انساں کی بنائی ہوئی قدریں اس وقت
کیا کہیں اس کو! یہ ہے اپنی نگاہوں کا فریب
ہے فقط وہم حقیقت کا فنا ہو جانا!

پھر بھی ہم درد سے چیخ اٹھتے ہیں جب دیکھتے ہیں
اپنی قدروں کے بکھرتے ہوئے تانے بانے
اذنِ ماتم ہمیں دیتی ہے اجل
ڈبڈبا آتے ہیں آنکھوں میں ہماری آنسو
چاک دامانی بنا کرتی ہے اپنی ہمدم
اور ہم سوچتے ہیں؛
کیا یہی طرفہ تماشا ہے مآلِ ہستی

آج بھی جب غم و اندوہ کے کالے بادل
اپنے بوسیدہ مکانوں پہ ڈھلک آئے ہیں
زندگی خاک بسر پھرتی ہے
مائل گریہ ہیں اجداد کے آثارِ کہن
اور ہر شخص کے سینہ میں ہے ہیجان بپا
سرسراتی ہو ہوا جیسے بیابانوں میں،
دل میں آتا ہے خیال
کیا اجل ہستی انساں کو مٹا سکتی ہے۔

"شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے"

کون سی شمع تھی ایوانِ زمیں کو جس نے
سالہا سال منور رکھا
اور جو جل بھی دم بھر میں شرارے کی طرح!
مادرِ گیتی، بتا کس لئے خاموش ہے تو؟
مسجدو! بہرِ خدا تم ہی زباں سے بولو،
اے کلیساؤ! کھڑے تکتے رہو گے کب تک
اپنی کھوئی ہوئی آنکھوں سے فلک کی جانب؟
مندرو! اتنا بتا دو وہ صدائے ناقوس
آج کیوں ہو گئی خاموش تمہارے اندر؟
تم نہیں بولو گے؟ اچھا، نہ سہی!
مجھے معلوم نہ تھا
شعلۂ عشق سیہ پوش بھی ہو سکتا ہے!

اے وطن، اے مرے اجداد کی عظمت کے نشاں!
آج تو سوگ میں ہے تا بہ کمر ڈوبا ہوا
اٹھ گیا تجھ سے وہ درویشِ ملوکانہ صفات
جس کا ہر لفظ تھا تیرے لئے پیغامِ حیات
اُس نے گایا تیری وسعت میں وہ نغمہ جس کو
آبشاروں نے سنا،
لہلہاتے ہوئے کھیتوں نے سنا،
آسماں بوس پہاڑوں نے سنا،
ساری دھرتی نے سنا
اور وہ سب بیک آواز یہ چلا اٹھے

یہ ہے فطرت کے دھڑکتے ہوئے دل کا نغمہ
جس کو اک آدمِ خاکی نے زباں دے دی ہے!

اُس کا یہ نغمہ محبت کا حسیں نغمہ تھا
اک جہاں گیر محبت جو نہیں ہو سکتی
فرقہ و مذہب و ملت کی حدوں میں محصور
جلوہ گر ہے یہ ہر اک شے میں، ہر اک ذرّے میں
اس کی طاقت نہیں محتاجِ سنان و شمشیر
آ نہیں سکتا زوال اس کی شہنشاہی کو

میں نے دیکھے ہیں بلکتے ہوئے غمگیں چہرے
سن کے یہ نغمہ جو ناگاہ چمک اٹھتے ہیں
میں نے دیکھا ہے گھسٹتے ہوئے انسانوں کو
شہر کی گونجتی، پُرپیچ گذرگاہوں پر،
—جن کو یہ مژدۂ امید دیا کرتا ہے
میں نے دیکھی ہیں سیہ خانۂ غم میں محبوس
عورتیں، لاتا ہے جن تک یہ مسرت کی کرن
اور ہر چند نہیں اب وہ مغنّی ہم میں
پھر بھی اس گیت سے ہیں ساری فضائیں لبریز
گونجتے ہیں اسی آواز سے یہ کون و مکاں
سُنو، قائم ہے محبت پہ نظامِ ہستی
اور دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں!

خواجہ احمد عبّاس

ایک بچے کا خت

مہاتما گاں دھی کے نام

بہ مقام جن نت یا سوَرگ پہنچ کر اﷲ میاں یا بھگ وان کی مارفت جناب مہاتما گاں دی
کو ملے۔

باپو!

میری ام ماں کہہ تی ہیں کہ آپ جن نت کو سدھارے ہیں اﷲ میاں کے پاس اور گوپال کی ماتا جی کہہ تی ہیں کہ آپ سورگ میں بھگ وان کو پیارے ہو گئے ہیں۔ ناجانے کس کا کتنا سچ ہے۔ اس لئے میں اس پتے پر آپ کو یہ خت ڈال رہا ہوں۔ اور شاید سورگ اور جن نت ایک ہی جگا کا نام ہو۔ جیسے بنارس کو کاشی بھی کہہ تے ہیں۔ اور الہ آباد کو پریاگ۔ امید ہے آپ جس جگا بھی ہوں گے یہ خت آپ کو مل جاوے گا۔

یہ خت اسل میں مَیں خُد نہیں لکھ رہا ہوں بل کہ مجھ سے لکھ وایا جا رہا ہے۔ لکھ وانے والے یہ ہیں۔ میرا چھوٹا بھائی بندو (جس کا اسل نام بندے اَلی ہے) اور اور مجھ سے بڑی بہن زَے نب اور چھوٹی سکی نا۔ گوپال۔ گوپال کی چھوٹی بہن سی تا۔ اور ہاں موہن۔ اس کو تو بھول ہی گیا۔ بات یہ ہے کہ وہ چاہ تا تو ہے کہ میں آپ کو خت لکھوں مگر یہ بات اس نے موں سے نہیں کہی ہے۔ آں کھوں سے کہی ہے۔ وہ موں سے کچھ ناہیں کہہ تا۔ جو کہہ نا ہوتا ہے آں کھوں سے ہی کہہ تا ہے۔ اس کی آں کھیں بہت کچھ کہہ تی ہیں پر اس کا ذکر میں باد میں کروں گا۔ اس وقت تو یہ کہہ نا ہے۔ کہ موہن کی آں کھیں بھی مجھ سے کہہ رہی ہیں باپو کو خت لکھو۔ سو میں لکھ رہا ہوں۔ مے ہربانی کر کے موجھے ماَف کر دے نا۔ کر دوگے نا باپو۔

آپ تو بڑے آدمی ہیں۔ سو چا تے ہوں گے کہ یہ بچہ مجھے کیوں خت لکھ وا رہے ہیں۔ پر ہم نے سنا ہے کہ آپ کو بچے بہت بھاتے تھے۔ میں نے ایک تس ویر میں دیکھا ہے آپ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بیٹھے کھیل اور ہنس رہے ہیں۔ گوپال کہہ تا ہے اس نے ایک دفا آپ کو جوہو میں سمن در کے

کنارے نکاچوں کے ساتھ کھیل تے دے کھا تھا۔ اور موہن جب آپ کی تس ویر کو دیکھتا ہے تو اس کی آں کھیں جو ویسے ہے شا دکھ اور ڈر سے بھری رہ تی ہیں خُشی سے چمک نے لگ تی ہیں اور کہ تی ہیں یہ سب نکاچوں کے باپو ہیں ان سے کیا ڈرنا اور بُرا نہ مانیں تو میں کہوں آپ ہنس تی ہوئی تس ویر میں بل کول نکاچے لگ تے ہیں۔ اِت نے چھوٹے نکاچے جس کے ابھی دانت بھی نا نک لے ہوں۔ جے سے گوپال کا سب سے چھوٹا بھائی جو سال بھر کا ہے اور آپ کی ترا بکری کا دودھ ہی پی تا ہے۔ سو ہم نے سوچا آپ کو ہم یہ خت لکھیں تو آپ بُرا نہ مانیں گے۔ اس واس تے یہ خت لکھ رہے ہیں۔

مے را نام انور ہے۔ سب مجھے انو انو کہ تے ہیں۔ ہمارا اسلی گھر پانی پت زِلا کرنال سُوبا پَن جاب میں ہے۔ مے رے ابا جن کا نام اکبر اَلی ہے دِل لی میں سرکاری دفتر میں نوکر تھے۔ میری اُمر ساڑھے چھ برس کی ہے۔ مے ری اماں کا نام تو فاطما ہے پر سب ان کو فت تو فت تو کہ تے ہیں۔ اور ایک ہماری نانی اماں ہیں۔ جو آپ کی ترا بڈھی ہیں اور مُوں میں دانت بھی ناہیں ہیں۔ سو پان کو پن کٹی میں کوٹ کر کھا تی ہیں۔ یہ سب ہمارا خان دان پانی پت میں رہ تا تھا۔ سوائے ابا کے جو نوک ری پر نئی دل لی میں رہ تے تھے ایک کوارٹر میں بابر روڈ کے پاس۔

مے رے ابا آپ کو اچھا نا سمجھ تے تھے۔ ہے شا کہ تے تھے گاں دھی تو مسلمانوں کا دش من ہے۔ اماں بھی یہی کہ تی تھیں۔ سو میں بھی آپ کو اچھا نا مان تا تھا۔ پر نانی اماں کہ تی تھیں گاں دھی اللہ والا آدمی ہے وہ سب کو بھائی بھائی سمجھتا ہے ان ہوں نے آپ کو بہت دن ہوئے دے کھا تھا۔ جب آپ پانی پت خلافت کے ٹی کے کسی کام سے آئے تھے۔ اورتوں کے جل سے میں بھی تقریر کی تھی۔ جب سے وہ کھدر اور گاڑھا ہی پہن تی ہیں۔ اور آپ کو اچھا مان تی تھیں۔ پر ابا کہتے تھے وہ تو بوڑھی بے وقوف ہیں بڑی بڑی باتوں کو کیا جانیں۔ ابا تو اَلی گڑھ کالج کے پڑھے ہوئے ہیں۔ اور اخ بار روز پڑھتے ہیں اس واس تے ہم ان کی بات ہی مان تے تھے۔ اور جب آپ کا ذکر آتا تھا آپ کو بُرا کہ تے یا مذاق اڑاتے تھے۔ کیوں کے آپ کی لن گوٹی اور ننگا بدن دیکھ کر ہنسی آتی تھی پھر ہم نے سنا کہ ہندوستان کا بٹوارا ہونے والا ہے جیسے دادا ابا کے مرنے پر ان کی جائے داد کا ہوا تھا جس میں آدھی ابا کو اور آدھی تائے ابا کو ملی تھی۔ ہم گلیوں میں پاکستان زندا باد

کے نارے لگاتے خوب پھرتے تھے۔ میں نے ایک دن اب با سے پوچھا پاکس تان کیا ہے۔ ان ہوں نے کہا یہ مسل مانوں کا اپنا الگ ملک ہوگا جہاں ہم راج کریں گے۔ اس سے ہم بہت خشش ہوئے کیوں کے میں نے اب با کے ایک رن گیں تس ویروں والے اخ بار میں ایک راجا کی تس ویر دیکھی تھی وہ سونے کا تاج پہنے اور گلے میں موت یوں کا ہار ڈالے تھا۔ سو میں نے سوچا ہم سب مسل مان اب راجا بن جائیں گے اور ہمارے سروں پر سونے کا تاج اور گلے میں موت یوں کے ہار ہوں گے۔

پانی پت میں مسل مان بوہت زیادہ رہ تے ہیں اور ہن دو تھوڑے سے ہیں۔ سو ہم ہن دوؤں کے سام نے اکڑ اکڑ کر چل تے تھے۔ اور بن یوں کے لونڈوں کے سام نے زور زور سے پاکس تان زندا باد کے نارے لگاتے اور اگر وہ کان گریس یا آپ کا یانی گاں دھی کا نام لے تے تو ان کو مار تے بھی تھے۔ پر جب پاکس تان بن گیا تو ہم نے سنا پانی پت پاکس تان میں ناہیں آیا سو یاہاں مسل مان راجا نا بنیں گے۔ پھر سنا کہ سارے ملک میں مارا ماری ہونے لگی۔ اب با جب دل لی سے پانی پت آتے وہ کہتے ہندو مسل مانوں کو مار رہے ہیں۔ سو میں ہندوؤں سے اور بھی نفرت کرنے لگا۔ پر ایک بات مےرے سمجھ میں یہ ناہیں آئی کے پاکس تان میں اور جاہاں بھی مسل مان بوہت زیادا اور ہندو کم ہیں واہاں مسل مانوں کو ہندو کے سے مار سک تے ہیں۔ پھر ہم مسل مان تو بادشاہوں کی اولاد ہیں اور مارنے دھاڑنے میں آگے آگے رہ تے ہیں پن جاب اور سوبا سرحد میں جاہاں مسل مان ہی مسل مان رہ تے ہیں ہم ہندوؤں کو خوب مار سک تے تھے۔ اور شاید مارا بھی ہوگا۔ پر مے بچ جا تھے را۔ شاید مے نے سمجھ نے میں غل تی کی ہو اور اب با پڑھے لکھے تھے اس واس تے میں چپ ہی رہا پر یہ بات دل میں کھٹ ک تی رہی۔

پھر دل لی میں مارا ماری شرو ہو گئی اور پانی پت کے مسل مان پاکس تان بھاگ نے کی تیاری کرنے لگ گئے۔ پر مےرے اب با جانے کو تیار ناہیں تھے۔ بات یہ ہے کہ مےرے اب با خدا کن جوس ہیں اور اپ نی جائے داد۔ گھربار اور کھیتوں کو چھوڑ کر نا جانا چاہ تے تھے۔ ان ہوں نے کہا آہس تا آہس تا سب چیزوں کو اچھے داموں بے بیچ کر جائیں گے۔ پر اتنے میں پانی پت میں پن جاب کے بھاگے ہوئے بہت سے ہندو اور سکھ آ گئے۔ ہزاروں لاکھوں۔ جن سب کو رہنے کے لئے مکان چاہئے تھا ان سب کے گھر مغ ربی پن جاب کے مسل مانوں نے لوٹ لئے تھے۔ اور ان کے

بال بچوں کو مارا بھی تھا۔ اور اب یہ سب مس لمانوں سے نف رت کرتے تھے۔ سو پانی پت میں مس لمانوں کا رہنا مش کل ہو گیا۔ کچھ ٹیلیس کے ہاتھوں مارے بھی گئے۔ روز انتی زار کرتے کہ پاکس تان سے موٹر لاریاں آئیں گی پر وہ نہ آئیں۔ پھر جب خت را بڑھ گیا تو امماں نے ابا کو دل لی میں لکھا اور وہ وہاں سے فوجی لاری لے کر آئے اور ہم تھوڑا تھوڑا سامان ساتھ لے کر اس لاری میں دلی آگئے۔ ١

اب میں آپ کو اپ نی بندوق کے بارے میں بتانا چاہ تا ہوں۔ یہ بندوق بڑی خوب سورت ہے۔ چمک تی ہوئی نالی۔ لک ڑی کا کندا اور چلاؤ تو کھٹاک سے آواز آتی ہے۔ یہ مے ری پانچویں سالگرہ پر ابا نے لاکر دی تھی۔ اور کہا تھا کہ ابھی سے بن دوق کا شوق کرو تو بڑے ہو کر سورما سپاہی بنوگے اور کافروں کے خلاف جی ہاد کروگے اصل میں تو یہ کھیل نے ہی کی بن دوق ہے مگر اسے کن دھے پر رکھ کر میں ساری گلی کے لونڈوں کو پریڈ کرواتا۔ یہ ہماری پاکس تانی فوج تھی۔ ١

ہاں تو جب ہم پانی پت سے چلے تو گھر کا سارا سامان چھوڑنا پڑا۔ ابا کی کتابیں امماں کے کپ ڑے برتن۔ سن دوق۔ لی ہاف۔ رزائی یاں سب رہ گیا۔ بس دو چار پہن نے کے کپ ڑے ساتھ لے سکے۔ پر میں نے یہ بن دوق چپ کے سے ساتھ لے لی۔ کیوں کے اس ہی سے تو میں کافروں سے بدلا لینے والا تھا جن ہوں نے ہمیں پانی پت سے نکالا تھا۔

دل لی میں ہم دس بارا دن ایک کمرے میں بند رہے کیوں کے وہاں مس لمانوں کو مارا جا رہا تھا۔ اور ہمارے سب کے موں پی لے پڑ گئے۔ پھر ہم نے سُنا کے آپ کل کتے سے آئے ہیں اور مس لمانوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پہ لے تو ابا کہ تے رہے یہ بھی گاں دھی کی کوئی چال ہوگی مگر باد میں مان گئے کہ آپ سچ مچ مس لمانوں کی جان بچا رہے ہیں۔ دل لی میں تھوڑا امن امان ہو گیا پر راس تے میں بھرت پور کی ریاست میں سنا ریل میں مس لمانوں کو مار رہے ہیں۔ اس واس تے جب ابا کی بدلی بم بئی کی ہو گئی تو ہم ہوائی جہاز سے یہاں آگئے۔

میں نے سنا ہے آپ ہوائی جہاز میں کبھی نہیں بیٹھے۔ واہ باپو۔ مالوم ہوتا ہے۔ آپ ڈرتے ہیں۔ میں تو بِل کول بھی نہیں ڈرا۔ سارے رس تے کھڑکی کے پاس بیٹھا رہا۔ یہاں تک کے نانی اماں بھی نہیں ڈریں اور چل تے ہوائی جہاز میں بیٹھی پن کٹی میں پان کوٹ تی رہیں۔ وہ بھی آپ کی ترا بل کول پوپ لی ہیں۔ مگر یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔

بم بئی میں ہمیں رہنے کو دو کمرے ل گئے شواجی پارک کے الاقے میں جہاں چاروں ترف ہندو ہی ہندو رہتے ہیں۔ ہم سب پہلے تو بہت ڈرے کہ کوئی مار وار نا دے۔ پر نانی اماں ذرا نہیں ڈریں۔ وہ تو بورقا اوڑھ کر سمن در کے کنارے کنارے دور تک ہو آتی تھیں اور کہتی ہندو سکھ بھی تو الآ کے بندے ہیں۔ مجھ بوڑھی کو کون مارنے لگا۔ سمن در ہمارے گھر کے پاس ہی بہتا ہے۔ میں نے سمن در کا ذکر اسکول میں پڑھا تھا۔ یہ تو بوہت بڑا نکلا۔ پانی پت کی نہر اور دل لی میں دریا جم نا اور دس جوہڑوں اور دس تالابوں کو ملاکر ان سے بھی بڑا۔ بس پانی ہی پانی ہے۔ نانی اماں کہنے لگیں کہ پانی پت تو یوں ہی کہلاتا ہے اَسل پانی پت تو یہ ہے۔

ہمارے برابر کے گھر میں ہندو رہتے ہیں۔ گوپال کے ماں باپ۔ گوپال کے چاچا بہت کٹ ٹر ہندو ہیں اور سنگھ والوں کے ساتھ پریڈ بھی کرتے ہیں۔ اِن ہوں نے اپنے گھر کے بچوں کو پڑھا رکھا تھا کہ مسل مان بوہت بُرے ہوتے ہیں۔ ان کو مارنا چاہیئے سو گوپال نے اپنے گھر میں ایک ہندو سینا بنا رکھی تھی۔ اور لک ڑی کی تل واریں، ایک ٹین کا پس تول اور بانس کے تیرکمان لے کر روز پریڈ کرتے تھے اور نارے لگاتے ہندو راج بنا دیں گے۔ مسل مان کو مار بھگا دیں گے اور ہر ہر مہادیو۔ اور بلدے جو شاید مرہٹی زبان میں تھے۔ ان کے موقابلے میں مے نے بھی اپنی پاکس تانی فوج بنا لی۔ گوپال کی فوج میں دس بارہ بچے تھے۔ ہم چار ہی تھے۔ پر ہم ڈرتے نہیں تھے۔ ایک تو جیسے ابا کہا کرتے تھے ایک مسل مان چار پانچ ہندوون کے برابر ہوتا ہے۔ اور دوسرے مےرے پاس بن دوق تھی اور اُن کے پاس لک ڑی کی تل واریں اور تیرکمان۔ سو ہم خوب موقابلا کرتے۔ جب وہ نارا لگاتے ہر ہر مہادیو تو ہم چل لاتے اَل لاہو اکبر۔ وہ کہتے ہندو راج بنا دیں گے۔ تو ہم کہتے ہنس کے لیا تھا پاکس تان لڑ کے لیں گے ہندوس تان۔ ابا منا بھی کرتے۔ اور نانی اماں نے بھی ڈان ٹا۔ مگر ہم ماننے والے تھوڑا ہی تھے۔ ایک دن نارے لگاتے لگاتے گوپال اور اس کی فوج نے ہمارے گھر پہ ہملا کر دیا۔ بندو کو چوٹ بھی لگی۔ مگر میں نے اپنی بن دوق سے ڈرا کر مار بھگایا۔

جب ہندو سینا اور پاکس تانی فوج میں گھم سان کی لڑائی ہو رہی تھی میں نے موہتا کو پہلی دفا دیکھا۔ وہ ہماری لڑائی کو ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس نے ایسی لڑائی پہلے بھی کہیں دیکھی ہو۔ وہ چل لایا نہیں۔ مگر اس

آن کھوں سے آں سو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ گوپال کی فوج کو بھگا کر میں نے موہن سے پوچھا جو ایک قمیص اور شلوار پہنے گھروں کے بیچ کی دی وار پر بے ٹھا چپ کے چپکے رو رہا تھا۔ کیوں بھائی تو کون ہے ہندو یا مسل مان کیوں کہ شل وار سے میں سمجھا تھا شاید مسل مان ہوگا۔ پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس پھٹی پھٹی آن کھوں سے دیکھتا رہا۔ اس کی آن کھوں کو دیکھنے سے ڈر سا لگتا تھا جیسے قلن در ساہب کی درگاہ میں باؤلے فقیر بیٹھے رہتے ہیں۔ میں نے سوچا یہ بھی باولا ہو چکا ہوگا یا شاید گوں گا ہو۔ پر اِتنے میں گوپال آ گیا اور کہنے لگا اس بے چارے کو کیوں مارتے ہو یہ تو پن جاب سے آیا ہے۔ اس کے ماں باپ وہاں مارے گئے ہیں اور یہ یہاں اپنے رشتے داروں کے ہاں رہتا ہے۔ یہ سن کر مو جھے بڑا ترس آیا اور بن دوق کے کھیل میں دل نا لگا۔ اور رات کو خاب میں موہن کی ڈراؤنی پھٹی پھٹی آن کھیں نزر آتی رہیں اور میں ڈر کے مارے نیند میں رونے لگا۔

اس دن سے موہن اَک سر دی وار پر بے ٹھ جاتا اور ہمارا کھیل پھٹی پھٹی آن کھوں سے دیکھتا رہتا۔ وہ خد نا ہماری ساتھ کھیلتا نا گوپال کی ساتھ۔ بس الگ چپ چاپ بے ٹھا رہتا۔ اور نا جانے کیا سوچتا رہتا۔ اور نا جانے اس کی آن کھیں کیا کہتی۔ نا جانے ان آن کھوں نے کیا دے کھا تھا جس سے اس کو چپ لگ گئی تھی۔

اور پھر ہم نے رے ڈیو پر سنا کے آپ نے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔ اور جب تک دل لی کے ہندو مسل مانوں کو مارنا بند نا کریں گے آپ کھانا نا کھائیں گے۔ یہ سن کر نانی اماں کے آن کھوں میں آن سو آ گئے اور اِن ہوں نے دو وقت کا کھانا نا کھایا۔ اور ابا بھی کہنے لگے کہ ہندوؤں میں اچھا آدمی ہے تو گاں دھی ہی ہے۔ مے نے نانی اماں کی ری س میں ایک دن صبح دود نا پیا اور نا دوپہر کا کھانا کھایا۔ پر شام ہوتے ہوتے برا ہال ہو گیا۔ نہ کھیل میں جی لگا نا پڑھائی میں بس آن کھوں کے سامنے شامی کباب اور پلاؤ اور فی رنی کی رکابیاں نزر آتی رہیں اور میں سوچتا رہا آپ کیسے بنا کھائے پیے رہتے ہیں۔

جب آپ کے فاقے کو کئی دن ہو گئے اور ہم نے سنا کے سارے مولک میں سب ہندو مسل مان کان پکڑ رہے ہیں کہ ہم اب نا لڑیں گے۔ سو ہم نے بھی ہندو سینا اور پاکستانی فوج کا کھیل بند کر دیا۔ اور ایک دن سویرے جب میں نے موہن کو دی وار پر چپ چاپ بے ٹھے دے کھا اور اس کے پاس گیا تو دوسری ترف سے

گوپال بھی آ گیا۔

گوپال کہنے لگا انو۔ میں نے کہا ہاں گوپال کیا بات ہے۔

وہ بولا۔ باپو جی۔ اور بس اتنا کہہ کر رونے لگا۔

اس دن اخبار میں چھپا تھا کہ آپ کی تبیات بڑی کمزور ہو گئی ہے۔ اور بولنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر میں بھی رو پڑا۔

گوپال میری ترف تاأجب سے دیکھ کر بولا۔ تم بھی رو رہے ہو۔

میں نے کہا ہاں وہ مسلمانوں ہی کے لئے تو یہ سب کر رہے ہیں۔

گوپال نے سوچ کر کہا۔ آج سے ہندو مسلمانوں کی لڑائی کا کھیل بند.....

میں نے کہا ہاں بلکول بند کر دیں گے۔ جب سب کان پکڑ رہے ہیں تو ہم بھی کان پکڑتے ہیں۔ پھر ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ بندوق پستول تلواریں سب توڑ کر سمندر میں پھینک دیں گے۔

نا جانے کیوں میری نزر موہن کی ترف گئی اور اتنے دنوں میں پہلی دفا میں نے اس کی آنکھوں میں تھوڑی سی خشی دیکھی۔ اور مجھے ایسا مالوم ہوا جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔

اب با بھی اگلے دن کہنے لگے دلی میں جادو ہو گیا۔ ہندو سکھ مسلمان لیڈروں نے مل کر گاندھی جی کے سامنے کان پکڑ لئے کے اب کبھی نا لڑیں گے مسلمانوں کی مسجدیں اُن کو واپس مل گئیں اور دلی کے بازاروں میں مسلمان پھر مزے سے پھرنے چلنے لگ گئے۔ اور آپ نے فاقا توڑ دیا۔ اور خاجہ قتب بدین کے مزار پر بھی اُرس میں گئے۔

ہاں تو ایک دن پہلے تو ہمارا ارادہ تھا کے میں اپنی بندوق اور گوپال اپنے تیر کمان توڑ ڈالیں گے۔ پر جب میں نے چمکتی بندوق کو دیکھا تو میرا جی نا چاہا اسے توڑنے کو میں نے سوچا کیا مالوم گوپال نے اپنے پستول اور تیر کمان توڑے ہوں۔ میں بھی بندوق کیوں نہ رکھ لوں۔ پھر میں کوئی چلا تھوڑا ہی رہا تھا بس رکھی ہوئی تھی زرورت کے واستے۔

ادھر گوپال نے بھی یہی سوچا کہ انو شاید اپنی بندوق نا توڑے میں اپنا پستول اور تیر کمان کیوں کھو دوں۔

آپ کا فاقا ختم ہو گیا اور ہم نے اِتمینان کا سانس لیا۔ نا جانے کیوں مگر

آپ کی بی ماری اور کم زوری کی خبر سے دل گھبراتا تھا جیسے اب با یا ام ماں کی تبی اَت خواب ہو۔ میرا اور گوپال کا ہی نہیں سارے محلے والوں کا جب ہی تو آپ کو سب باپو باپو کہ تے ہیں۔

پھر یہ سن کر دھک سے رہ گئے کہ آپ پہ بم پھینکا گیا۔ خدا کا شکر ہے آپ بال بال بچ گئے۔ اور بم پھینکنے والا پکڑا گیا۔

میں نے گوپال سے کہا گوپال یہ تو بوہت برا ہے۔ برے لوگ گاں دھی جی کو مارنا چاہ تے ہیں۔

گوپال بولا ہمیں گاں دھی جی کی ہفاظت کرنی چاہیئے۔

میں نے کہا۔ کیسے۔

وہ بولا ہم دل لی جا کر گاں دھی جی کے گھر پہ پہرا دیں گے۔

میں نے کہا تم کے سے پہرا دو گے۔ نا بن دوق نا تل وار۔

وہ جل دی سے بولا پس تول اور تیر کمان جو ہے۔ پھر وہ چپ ہو گیا جیسے بھول سے کہہ گیا ہو۔

میں بھی بے سوچے بول پڑا۔ پس تول کی مار تو دو چار گز ہی ہوتی ہے۔ میں بن دوق لے کے پہرا دوں گا۔

وہ مجھے گھور کے دے کھ کر کہنے لگا۔ تمہارے پاس بن دوق کہاں سے آئی۔

میں نے بھی ویسے ہی جواب دیا۔ جہاں سے تم ہارے پاس پس تول اور تیر کمان آئے۔

وہ بگڑ گیا۔ کہ نے لگا۔ تم مسل مانوں کا کوئی اے تبار نہیں۔ وادہ کیا تھا بن دوق توڑ دوں گا۔

میں بھی چپ بیٹھنے والا نہیں تھا۔ بگڑ کر بولا۔ اور تم ہندو کافروں کا کیا اے تبار۔ تم نے نہیں کہا تھا پس تول اور تیر کمان توڑ دوں گا۔

جاؤ ہم نہیں کھیل تے تم ہارے ساتھ۔ وہ بولا۔

ہم کون سے مرے جا رہے ہیں۔ اور یہ کہہ کر میں چلا آیا اور گھر آ کر اپنی بن دوق کو ساف کیا اس کے کل پرزوں میں تیل ڈالا۔ نہ جانے کب ہندو سینا سے مقابلا ہو جائے۔

ادھر گوپال اور اس کے بھائی بانس کے تیروں کو چھیل کر تیز کرتے رہے۔

اور اب کے جب میں نے موہن کو دی وار پر چپ بےٹھے دے کھا تو اس کی آں کھوں میں وہ ہی دکھ اور درد دے کھا جو پہلے تھا۔

کئی دن گزر گئے۔

شام کو ہم سمندر کے کنارے لگے ہوئے مے لے کو دےکھ رہے تھے کہ ابا دفتر سے بھاگے ہوئے آئے۔ کہنے لگے گاں دھی جی کا انتقال ہو گیا ہے کسی پاگل نے ان کو گولی مار دی۔

پہلے تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ بھلا گاں دھی جی کےسے مر سکتے ہیں۔ ہم نے سوچا۔ وہ تو بم سے بھی نہیں مرے۔ پھر خیال آیا دےکھا ان کی حفاظت نہیں کی ٹھیک سے کسی نے۔ پس تول چلانے والا وہاں تک پہنچا کےسے۔

رات کو کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ بس رےڈیو کے پاس بےٹھے خبریں سن تے رہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر سنی۔ اتنے بڑے آدمی ہو کر بھی وہ رو رہے تھے۔ بس بول تے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ یہ سن کر مجھے بھی رونا آ گیا۔ اور بڑی دیر تک روتا رہا۔ نانی اماں اور امماں تو پہلے ہی رو رہی تھیں۔ ابا کی آں کھوں میں بھی آں سو تھے۔

اس رات کو مجھے ٹھیک نیند نا آئی۔ ڈراؤنے خاب نزر آتے رہے۔ کبھی دےکھا آپ کو کوئی مارنے آ رہا ہے اور میں چلّا رہا ہوں گاں دھی جی کو بچاؤ گاں دھی جی کی جان خترے میں ہے پر کوئی نہیں سن تا۔ پر سب سے ڈراونا خاب یہ دےکھا کہ ایک آدمی آپ کی ترف گولی چلا رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں مےری ہوائی بن دوق ہے اور اس کی گولی آپ کو لگ رہی ہے۔ اور مجھے لگا آپ اسی واسطے مجھ سے خفا ہو کر چلے گئے ہیں۔

اگ لے دن ہڑتال تھی۔ سکول بند۔ پر کھیل نے کو جی نا کرتا تھا۔ اہاتے کی دی وار کے پاس گیا تو دےکھا موہن بےٹھا رو رہا ہے۔ زور زور سے چیخیں مار کر۔ اسے دےکھ کر مجھے اور بھی رونا آ گیا۔ پھر گوپال آیا وہ بھی رو رہا تھا۔

گوپال بولا باپو جی چل بسے

میں نے کہا۔ ہاں نانی اماں کہہ تی ہیں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پھر گوپال بولا۔ اور میں نے خاب میں دےکھا۔۔۔

میرا دل دھک سے ہو گیا۔ جلدی سے بولا تم نے خاب دےکھا کہ مےری بن دوق سے ......

گوپال نے بات کاٹ کر کہا نہیں۔ دےکھا میرے پس‌تول سے باپو کو کوئی مار رہا ہے۔
میں نے اسے اپنے خاب کی بات بتائی۔
پھر ہم دونوں مل کر روئے۔
اور موہن زور زور سے رونے لگا۔ اور ہم یہ دےکھ کر ہَیران رہ گئے کہ اس رونے سے اس کی آواز کھل گئی تھی۔ اب وہ بول بھی سکتا ہے۔
بارہ فروری
یہ خت کئی دن ہوئے لکھ‌کھا تھا مگر ڈالا نہیں۔ ایسا لگ‌تا تھا کوئی زروری بات لکھنی رہ گئی ہے۔ اب لکھ‌تا ہوں پھر خت ڈالوں گا۔
آج کِت‌نے ہی دریاؤں۔ سمن‌دروں میں آپ کی چِتا کی راکھ کو ڈالا گیا۔ چوپاٹی پہ ہم نے بھی اپ‌نی آن‌کھوں سے دےکھا۔ کئی لاکھ کا جلوس تھا۔ اس میں بوہت سے مسل‌مان بھی تھے۔ آپ کو مرے ہوئے تیرا دن ہو گئے ہیں۔ ان دنوں میں ہماری سرکار نے بوہت سے بُرے لوگوں کو پکڑا ہے جو ہندو مسل‌مانوں کو لڑواتے تھے اور آپ کو مارنا چاہ‌تے تھے۔ اور ہندوستان اور پاکس‌تان دونوں میں ہندو مسل‌مان توبا کر رہے ہیں اور کان پکڑ رہے ہیں کہ اب مار دھاڑ نا کریں گے۔ آپ ان کو ماف کر دیجئے اور واپس لوٹ آیئے۔
ہاں آج شام کو جب سب لوگ سمن‌در کے کنارے سے چلے گئے تو میں چپ‌کے سے اپ‌نی بن‌دوق کو توڑ کر پانی میں پھینک آیا ہوں جہاں میں نے اپ‌نی بن‌دوق کے ٹک‌ڑے پھیں‌کے وہیں میں نے دےکھا کہ گوپال کا ٹوٹا ہوا پس‌تول اور ٹوٹے ہوئے تیرکمان بھی پانی میں پڑے ہیں۔
اب میں اور گوپال اور بندو اور نرےنب اور سکی‌نا اور سی‌تا سب توبا کرتے ہیں اور کان پکڑتے ہیں کہ پھر آپس میں نہیں لڑیں گے۔ اب آپ ہمیں ماف کر دیجئے اور لوٹ آیئے۔
آپ لوٹ آئیں گے نا باپو؟

سعادت حسن منٹو

لذّتِ سنگ

"لاہور کے ایک ماہنامے عالم رسالے میں جو فحاشی و بیہودگی کی اشاعت کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے، ایک افسانہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "بُو" اور اس کے مصنف ہیں مسٹر سعادت حسن منٹو۔ اس افسانے میں لڑکی عیسائی لڑکیوں کا کیریکٹر اس درجہ گندا بتایا گیا ہے کہ کوئی شریف آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ افسانہ نگار نے اظہارِ مطلب کے لئے جو اسلوب اختیار کیا ہے اور جو الفاظ منتخب کئے ہیں۔ ان کے لئے تہذیب و شرافت کے دامن میں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی لیکن حکومت اب تک خاموش ہے۔ حالانکہ یہی حکومت جو "لذت النساء" اور "کوک شاستر" ایسی فنی؟ (یہ استفہام میرا ہے) کتابوں کو بھی قابلِ مواخذہ سمجھتی ہے لیکن ایسے افسانوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتی جو ادب جدید کے نام سے سفلی جذبات میں ہلچل ڈالنے کا موجب ہیں اور فحاشت نگار ادیبوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ وہ قانون و حکومت [illegible] سے بے نیاز ہو کر گندگی بکھیرتے رہتے ہیں۔"
(ہفتہ وار خیام لاہور)

"پریس برانچ کے انچارج چودھری محمد حسین بہت نیک خیال کے بزرگ ہیں۔ اس قسم کے افسانے پڑھ کر ان کی روح یقیناً کانپ اٹھتی ہے۔ ان کے ہاتھ میں قانون ہے اور وہ اسے نہایت سختی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ کیا ان کے لئے ممکن نہیں تھا کہ جس طرح قابلِ اعتراض مذہبی مضامین لکھنے والوں کے خلاف گورنمنٹ کی مشینری حرکت میں آئی۔ اسی طرح ان گندے افسانوں کو لکھنے والے سعادت حسن منٹو وغیرہ بیچنے والے پبلشر جو رسالے کی فروخت سے ہزاروں روپیہ کماتے ہیں اور چھاپنے والے پریس کے مالک کو فوراً گرفتار کر لیتے اور ان میں سے ایک ایک کو تین تین سال کے لئے جیلوں میں بند کر دیتے۔ ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی عدالت ان افسانوں کو قانون کی زد سے نہیں بچنے دے گی۔ یہ صاف طور سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں بداخلاقی پھیلاتے ہیں اور عوام کا مذاق بگاڑتے ہیں۔"
(روزنامہ پربھات لاہور)

"ادبِ لطیف اس نام کا ایک رسالہ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ یوں کہنے کو تو ایک ادبی ماہنامہ ہے لیکن اگر اسے حیا سوز افسانوں کا مرقع کہئے تو بجا ہے۔ اس کا سالانہ نمبر اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ جس میں ایک نہایت گندا اور فحش افسانہ از قلم فحش نگار سعادت حسن منٹو شائع ہوا ہے۔ جس کے خلاف ہم نہایت پُرزور احتجاج کرتے ہیں

نہ فقط اس کے کہ وہ کس شاعرانہ خیالات کی وجہ سے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ گورنمنٹ عالیہ کی ہنر آگزیلری کور (WAC) کی مساعی در بابِ جنگ کی راہ میں روڑا اٹکانے والا اور اس کی بدنامی کا موجب ہے حتیٰ کہ اس محکمہ کو یہ بیہودہ شخص قحبہ خانہ کا نام دیتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر تو گورنمنٹ کی مشینری فوراً حرکت میں آجاتی ہے لیکن اس خلافِ تہذیب مضمون پر اس کی اب تک نظر نہیں پڑی۔ کیا سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ اس بداخلاق اور بے ادب "ادیب" اور رسالہ مذکور کے خلاف جلد کوئی کارروائی نہ کریں گے؟ دیکھنا چاہئے! (اخوت - لاہور)

ایک مقامی ماہنامہ نے سعادت حسن منٹو کا ایک فحش افسانہ "بو" شائع کیا تھا۔ خیام میں اس اخلاق سوز حرکت کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی جو حکومت پنجاب کے کانوں تک پہنچے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ جس پرچے میں "بو" شائع ہوا تھا وہ ضبط کر لیا گیا ہے۔ یہ ضبطی ۲۹۲/۳۸ دفعہ کے ماتحت عمل میں آئی۔ ہم اس فیصلے پر حکومت پنجاب کو مستحقِ تبریک سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کی فحاشی کو مستقل طور پر روکنے کے کوئی مؤثر قدم اٹھائے گی۔ (ہفتہ وار خیام - ۱۰ اپریل ۱۹۴۴ء)

۳۱ ملک بلڈنگ، میور روڈ لاہور

بھائی جان سلام شوق

مخدوم آغا خلش صاحب کا گرامی نامہ پرسوں ملا تھا۔ آپ کی علالت کا علم ہوا۔ اللہ کرے آپ اب تک اچھے ہوں۔ جب آپ کو اپنی صحت کا اندازہ ہے تو اتنا زیادہ کام کیوں کرتے ہیں کہ دونوں صاحب فراش رہتے ہیں۔ مجھے لوٹتی ڈاک میں اپنی صحت کی حالت سے مطلع کیجئے اور للہ اتنی محنت نہ کیجئے کہ آپ الیکشن کے کانٹوں میں گھرے رہ جائیں۔ ابھی برسوں تک آپ کی ضرورت ہے۔

سنیئے۔ خیام، عالمگیر، آئینہ (بمبئی) اور دیگر مہربانوں کے دم سے ادب لطیف کا سالنامہ زیر دفعہ ۲۹۲ تعزیرات ہند اور ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رولز ۲۹ مارچ کی شام کو ضبط ہو گیا۔ پولیس نے چھاپہ مارا اور سالنامہ کے باقی ماندہ نمبر لے گئی۔ ابھی پرنٹر اور ایڈیٹروں کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی لیکن افواہ ہے کہ بہت جلد گرفتار کر لئے جائیں گے۔ یہ ضبطی آپ کے مضمون اور افسانے کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔ (احمد ندیم قاسمی اڈیٹر ادب لطیف)

مضمون جس کا ذکر مولہ صد خط میں ہے ایک تقریر ہے جو میں نے جمگیشوری کالج بمبئی میں طالبعلموں کو پڑھ کے سنائی تھی۔ اس سے پہلے چند اصحاب "ادب جدید" کے خلاف اس کالج میں تقریریں کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کالج کی مجلس ادب کی دعوت قبول کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ تقریر بعد میں "ادب جدید" کے عنوان سے ادب لطیف کے زیرِ عتاب سالنامہ ۱۹۴۴ء میں میرے افسانے "بو" کے ساتھ شائع ہوئی میں اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں:-

میرے مضمون کا عنوان ادب جدید ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میں اس کا مطلق ہی نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ زمانہ ہی کچھ ایسا ہے کہ لوگ ایسی چیز کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔ جن کا مطلب ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ —— پچھلے دنوں گاندھی جی نے آغا خاں کے محل میں مرن برت رکھا۔ جب لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح زندہ رہ سکے ہیں تو ایک نارنگی پیدا کر دی گئی۔ یہ نارنگی بھی کچھ دنوں کے بعد ناقابل فہم ہو گئی۔ بعض آدمیوں نے کہا کہ نارنگی نہیں تھی موسمی تھی۔ بعض نے کہا نہیں، موسمی، نارنگی ہرگز نہیں تھی، مالٹا تھا —— بات بڑھتی گئی، چنانچہ اس پھل کی ساری ذاتیں گنوا دی گئیں —— نارنگی، سنگترہ، موسمی، مالٹا، چکوترہ، سوئٹ لائم، کھٹا لیموں وغیرہ وغیرہ —— پھر ڈاکٹروں نے ان میں سے ہر ایک کی وٹامنز گنوائیں۔ غذائیت کو کیلوریز میں تقسیم کیا گیا —— ایک برس میں پچھتر برس کے بڈھے کو کتنی کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے، اس پر بحث کی گئی اور صاحب گاندھی جی کی یہ نارنگی یا موسمی جو کچھ بھی تھی، سعادت حسن منٹو بن گئی —— یہ میرا نام ہے۔ لیکن بعض لوگ ادب جدید المعروف نئے ادب، یعنی ترقی پسند ادب کو سعادت حسن منٹو بھی کہتے ہیں اور جنہیں صنفِ کرخت پسند نہیں وہ اسے عصمت چغتائی بھی کہہ لیتے ہیں۔

جس طرح میں یعنی سعادت حسن منٹو اپنے آپ کو نہیں سمجھتا اسی طرح ادب جدید المعروف نیا ادب یعنی ترقی پسند لٹریچر بھی میری فہم سے بالاتر ہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان لوگوں کی سمجھ سے بھی اونچا ہے جو اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند مضمونوں میں اس ادب کو جس کے کئی نام ہیں اور زیادہ نام دینے کے لئے فحش نگاری اور مزدور پرستی سے منسوب کیا گیا ہے۔

میں چیزوں کے نام رکھنے کو برا نہیں سمجھتا۔ میرا اپنا نام اگر نہ ہوتا تو وہ گالیاں کیسے دی جاتیں جو اب تک میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اپنے نقادوں سے وصول کر چکا ہوں —— نام ہو تو گالیاں اور شاباشیاں دینے اور لینے میں بہت سہولت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر ایک ہی چیز کے بہت سے نام ہوں تو الجھاؤ پیدا ہونا ضروری ہے۔

سب سے بڑا الجھاؤ اس ترقی پسند ادب کے بارے میں پیدا ہوا ہے حالانکہ پیدا نہیں ہونا چاہیئے تھا —— ادب یا تو ادب ہے ورنہ ادب نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے۔ گدھا ہے۔ مکان ہے۔ میز ہے، یا کوئی اور چیز ہے —— کہا جاتا ہے سعادت حسن منٹو ترقی پسند انسان ہے —— یہ کیا بیہودگی ہے۔ سعادت حسن منٹو انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیئے۔ ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صفت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی برائی کا ثبوت دیتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں ہیں۔ یعنی وہ ترقی نہیں چاہتے ——

میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا خواہشمند رہا ہوں میں چاہتا ہوں کہ آپ سب ترقی کریں ——
آج آپ طالب علم ہیں، ترقی کرتے کرتے آپ بھی اپنے آئیڈیل تک پہنچ جائیں ——

ہر آدمی ترقی پسند ہے۔ وہ لوگ جنہیں تخریبی یا رجعت پسند کہا جاتا ہے خود کو ترقی پسند سمجھتے
ہیں —— اور پھر ہر زمانے میں قریب قریب ہر آدمی گذشتہ ہوئی نسل کے مقابلے میں اپنے
آپ کو زیادہ ذہین طباع اور ترقی یافتہ انسان ہی سمجھتا ہے۔ یہی حال ادب کا ہے۔ شرر کے ناول اور
راشد الخیری کے قصے آجکل کے اکثر مصنفین کو بالکل بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والوں کی بھی
یہی کیفیت ہے۔ مارکیٹ میں چلے جایئے —— آج سے دس بیس برس پہلے کے لکھنے والوں
کی کتابیں اسٹالوں پر بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی عصمت چغتائی اور
سعادت حسن منٹو کی کتابیں، ایم اسلم، تیرتھ رام فیروزپوری، سید امتیاز علی تاج اور عابد علی عابد کے مقابلے
میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ کرشن چندر اور اس کے ہم عصر نوجوانوں نے زندگی کے نئے تجربے
بیان کئے۔

آج سے بیس پچیس برس پہلے ملک کی سیاسی اور مجلسی حالت بالکل مختلف تھی —— اسی طرح
آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پچاس ساٹھ برس اور پہلے کیسی ہو گی۔ اگر مغلئی حکومت کا دور دورہ ہوتا تو
بہت ممکن ہے میرے گھر میں ایک حرم سرائے ہوتی۔ حرم سرائے نہ ہوتی تو کم از کم ایک بیوی گھر میں ہوتی
اور دو تین طوائفیں میری ملازمت میں ہوتیں۔ مجھے بٹیریں لڑانے کا شوق ہوتا۔ یہ مضمون پڑھنے کے
بجائے میں پرنسپل صاحب بالقابہ کی شان میں ایک قصیدہ سناتا۔ جو خوش ہو کر یا تو میرا منہ موتیوں سے
بھر دیتے یا جو گیشوری کالج مجھے بخش دیتے تاکہ میں اسے اپنا طویلہ بنا سکوں۔ مگر جیسا کہ آپ جانتے
ہیں حالت بہت مختلف ہے۔ مجھے یہاں سے پیدل اسٹیشن جانا پڑے گا۔ اور فلمستان میں اپنے
آقاؤں کو جواب دینا پڑے گا کہ میں اتنی دیر ڈاکٹر کے پاس کیا کرتا رہا —— میں ان سے جھوٹ
بول کے آیا ہوں۔ کہ ڈاکٹر سے ٹیکہ لگوانے جا رہا ہوں۔

ہاں، تو میں عرض کر رہا تھا کہ حالات بہت مختلف ہیں اور حالات کا یہ اختلاف ہی ادب میں
مختلف رنگ پیدا کرتا ہے۔ پہلے فارغ البالی تھی۔ لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اس زمانے
کے ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آ سکتی ہیں۔ وہ غنودگی بھی آپ محسوس کر سکتے ہیں جو
اس زمانے کے ادیبوں پر طاری تھی۔ اس زمانے کا شاعر اپنے اصیل مرغ کی جوانامرگی پر مسدس نوحہ لکھتا
تھا اور بہت بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ آج کا شاعر اپنی جوانامرگی کے نوحے لکھتا ہے۔ اس کا قصہ نویس
جنوں اور پریوں کی داستانیں لکھ کر نام پیدا کرتا تھا۔ آج کا افسانہ نویس ان مردوں اور عورتوں کی
کہانیاں لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ اس دور کا ادیب طلسمی انسان تھا

آج کا ادیب ایک غیر مطمئن انسان ہے اپنے ماحول، اپنے نظام، اپنی معاشرت، اپنے ادب حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی۔ اس کی اس بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اسے ترقی پسندی کہتا ہے۔ کوئی فحش نگاری اور کوئی مزدور پرستی! یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہبوط آدم سے لیکر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے اور کیوں نہ ہے۔ مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے جب کبوتر کبوتریوں کو دیکھ کر گنگناتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھکر ایک غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں عورتیں، کبوتریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ، خوبصورت اور فکر خیز ہیں —— کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟

آج سے کچھ عرصہ پہلے شاعری میں عورت کو ایک خوبصورت لڑکا بنا دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کے شاعروں نے اس میں کوئی مصلحت دیکھی ہوگی۔ مگر آج کے شاعر اس مصلحت کے خلاف ہیں۔ وہ عورت کے چہرے پر سبزے یا خط کے آغاز کو بہت ہی مکروہ اور خلاف فطرت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اس کو اس کی اصلی شکل ہی میں دیکھیں —— خدا لگتی کہئے کیا آپ اپنی محبوبہ کے گالوں پر ڈاڑھی پسند کریں گے؟

میں عرض کر رہا تھا کہ زمانے کی کروٹوں کے ساتھ ادب بھی کروٹیں بدلتا رہتا ہے — آج اس نے جو کروٹ بدلی ہے۔ اس کے خلاف اخباروں میں مضمون لکھنا یا جلسوں میں زہر اگلنا بالکل بیکار ہے۔ وہ لوگ جو ادب جدید کا ترقی پسند ادب کا فحش ادب کا یا جو کچھ بھی یہ ہے خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں تو صحیح راستہ یہ ہے کہ ان حالات کا خاتمہ کیا جائے جو اس ادب کے محرک ہیں۔

محمود آباد کے راجہ صاحب کا، حیدر آباد کے شاعر ماہر القادری صاحب کا یا بمبئی کے دوا فروش حکیم مرزا حیدر بیگ صاحب کا اس لٹریچر کے خلاف ریزولیوشن پاس کرنا بالکل بیکار ہے۔ جب تک عورتوں اور مردوں کے جذبات کے درمیان ایک موٹی دیوار حائل رہے گی۔ عصمت چغتائی اس کے چونے کو اپنے تیز ناخنوں سے کریدتی رہے گی۔ جب تک کشمیر کے حسین دیہاتوں میں شہروں کی گندگی پھیلی رہے گی مزیب کرشن چندر چوسے ہوئے رہتا رہے گا۔ جب تک انسانوں میں اور خاص طور پر سعادت حسن منٹو میں کمزوریاں موجود ہیں وہ خوردبین سے دیکھ دیکھ کر باہر نکالتا اور دوسروں کو دکھاتا رہے گا —— راجہ صاحب محمود آباد اور ان کے ہم خیال کہتے ہیں۔ یہ سراسر بیہودگی ہے —— تم جو کچھ لکھتے ہو خرافات ہے —— میں کہتا ہوں بالکل درست ہے، اس لئے کہ میں بیہودگیوں اور خرافات ہی کے متعلق لکھتا ہوں۔ راجہ صاحب محمود آباد ایک کانفرنس کے صدر بن جائیں یا حکیم حیدر بیگ صاحب کھانسی دور کرنے کا مجرب شربت ایجاد کر دیں ——

— مجھے ان کی صدارت اور ان کی شہرت سے کوئی دلچسپی نہیں ——— البتہ جب میں ٹرین میں بیٹھا بیٹھا یا کھڑا ہوا قیمتی پن نکالتا ہوں صرف اس غرض سے کہ لوگ دیکھیں اور مرعوب ہوں تو مجھے اپنا سفلہ پن دلچسپ معلوم ہوتا ہے ——— میرے پڑوس میں اگر کوئی عورت ہر روز اپنے خاوند سے مار کھاتی ہے اور پھر اس کے جوتے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اس کے لئے ذرہ برابر ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن میرے پڑوس میں کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑ کر خودکشی کرنے کی دھمکی دے کر سینما چلی جاتی ہے اور میں خاوند کو دو گھنٹے تک سخت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے ——— کسی لڑکے کو کسی لڑکی سے عشق ہو جائے تو میں اسے زکام کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا مگر وہ لڑکا میری توجہ کو اپنی طرف ضرور کھینچے گا جو ظاہر کرے کہ اس پر سینکڑوں لڑکیاں جان دیتی ہیں لیکن در حقیقت وہ محبت کا اتنا ہی بھوکا ہو جتنا بنگال کا فاقہ زدہ باشندہ ——— اس بظاہر کامیاب عاشق کی رنگین باتوں میں جو ٹریجڈی سسکیاں بھرتی ہوگی اس کو میں اپنے دل کے کانوں سے سنوں گا اور دوسروں کو سناؤں گا ——— چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے۔ میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آرہا ہے ——— اس کے بھاری بھاری پپوٹے جن میں برسوں کی اچٹی ہوئی نیندیں منجمد ہو گئی ہیں میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اس کی غلاظت، اس کی بیماریاں، اس کا چڑچڑاپن اس کی گالیاں، یہ سب مجھے بھاتی ہیں ——— میں ان کے متعلق لکھتا ہوں اور گھریلو عورتوں کی شستہ کلامیوں، ان کی صحت اور ان کی نفاست پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ نئے لکھنے والوں نے عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ہی کو اپنا موضوع بنالیا ہے۔ میں سب کی طرف سے جواب نہیں دوں گا ——— اپنے متعلق اتنا کہوں گا کہ یہ موضوع مجھے پسند ہے ——— کیوں ہے؟ ——— بس ہے ——— سمجھ لیجئے کہ مجھ میں PERVERSION ہے اور اگر آپ عقلمند ہیں۔ چیزوں کے عواقب و عواطف بھی طرح جانچ سکتے ہیں تو سمجھ لیں گے کہ یہ بیماری مجھے کیوں لگی ہے ——— زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں۔ اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھئے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے

تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے —— مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں —— میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے —— میں ہنگامہ پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا —— میں تہذیب و تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا، جو ہے ہی ننگی —— میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا ہے —— لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں۔ لیکن میں تختۂ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا، سفید چاک استعمال کرتا ہوں کہ تختۂ سیاہ کی سیاہی اور بھی زیادہ نمایاں ہو جائے —— یہ میرا خاص انداز، میرا خاص طرز ہے جسے فحش نگاری، ترقی پسندی اور خدا معلوم کیا کیا کچھ کہا جاتا ہے —— لعنت ہو سعادت حسن منٹو پر۔ کم بخت کو گالی بھی سلیقے سے نہیں دی جاتی ——

جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو گھر والے سب بیزار تھے۔ باہر کے لوگوں کو بھی حسبِ معمول میرے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے "بھئی کوئی نوکری تلاش کرو، کب تک بیکار پڑے افسانے لکھتے رہو گے" —— آٹھ دس برس پہلے افسانہ نگاری، بیکاری کا دوسرا نام تھا آج اسے ادبِ جدید کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن نے کافی ترقی کر لی ہے —— وہ وقت بھی آجائے گا جب اس جدید ادب کا صحیح مطلب واضح ہو جائے گا۔ اور حکیم حیدر بیگ صاحب دہلوی کو اپنے شفاخانے سے اٹھ کر نئے لکھنے والوں کے روگ کی تشخیص نہیں کرنا پڑے گی۔

جب سے جنگ شروع ہوئی ہے۔ ادبِ جدید پہ ایک نئے زاویے سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ —— کہا جاتا ہے کہ جب ساری دنیا جنگ کے شعلوں میں لپٹی ہے، ہر روز ہزاروں کا خون مٹی میں مل رہا ہے۔ فنا، بادۂ ہر جام بنی ہے، دوسری اجناس کی طرح انسانوں کے گوشت پوست کی دکانیں بھی کھلی ہیں۔ یہ نئے لکھنے والے کیوں خاموش ہیں —— ؟ —— کیا ان کے قلم صرف جنسیات کی روشنائی ہی میں ڈوبتے ہیں؟ —— دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے، ہر لحظہ، ہر گھڑی ایک نئے طوفان کا پیغام لا رہی ہے مگر ان کے دل و دماغ پر ایسا جمود طاری ہے کہ دور ہی نہیں ہوتا۔

میں پھر دوسروں کی طرف سے جواب نہیں دوں گا —— اپنے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کا نقشہ واقعی بدل رہا ہے۔ لیکن اگر میں نے اس کے متعلق کچھ لکھا تو میرا حلیہ بھی بدل جائے گا —— ڈرپوک آدمی ہوں، جیل سے بہت ڈر لگتا ہے، یہ زندگی جو بسر کر رہا ہوں جیل سے کم تکلیف دہ نہیں

اگر اس جیل کے اندر ایک اور جیل پیدا ہو جائے اور مجھے اس میں ٹھونس دیا جائے تو چٹکیوں میں میرا دم گھٹ جائے گا —— زندگی سے مجھے پیار ہے۔ حرکت کا دلدادہ ہوں، چلتے پھرتے سینے میں گولی کھا سکتا ہوں لیکن جیل میں کھٹمل کی موت نہیں مرنا چاہتا —— یہاں اس پلیٹ فارم پر یہ مضمون سناتے سناتے آپ سب سے مار کھاؤں گا اور اُف تک نہیں کروں گا لیکن ہندو مسلم فساد میں اگر کوئی میرا سر پھوڑ دے تو میرے خون کی ہر بوند روتی رہے گی۔ میں آرٹسٹ ہوں اوچھے زخم اور بھدے گھاؤ مجھے پسند نہیں —— جنگ کے بارے میں کچھ لکھوں اور دل میں پستول دیکھنے اور اس کو چھونے کی حسرت لئے کسی تنگ و تاریک کوٹھری میں مر جاؤں —— ایسی موت سے ١
تو یہی بہتر ہے کہ لکھنا لکھانا چھوڑ کر ڈیری فارم کھول لوں اور پانی ملا دودھ بیچنا شروع کر دوں۔ میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا —— گولے اور تارپیڈو ایک طرف رہے۔ میں نے تو آج تک ہوائی بندوق بھی نہیں چلائی —— بچپن کی بات ہے ہمارے پڑوس میں ایک تھانیدار رہتے تھے۔ ان کے پاس ایک پستول تھا، پیٹی اتار کر جب وہ پلنگ پر رکھتے تو سب بچوں سے کہہ دیا جاتا "دیکھو اس کمرے میں مت جانا —— وہاں پستول پڑا ہے" —— کبھی کبھی ہم ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں چلے جاتے۔ دور کھڑے رہ کر اس خطرناک آلے کی طرف دیکھتے تو دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ پڑے پڑے وہ پستول داغ جائے گا۔

—— اب بتلائیے میں اور میرے دوست توپوں اور ٹینکوں کی جنگ کے بارے میں کیا لکھیں گے —— مجھے چست وردی پہننے کا شوق نہیں ہے، پیتل اور تانبے کے تمغوں اور کپڑے کے رنگین بلوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہوٹلوں میں ڈانس کر کے، کلبوں میں شراب پی کر اور ٹیکسیوں میں چونہ کسّا گوری لڑکیوں کے ساتھ گھوم کر میں WAR EFFORT کی مدد نہیں کرنا چاہتا —— اس سے کہیں زیادہ دلچسپ مشاغل مجھے میسر ہیں —— مثال کے طور پر یہ مشغلہ کیا برا ہے۔ کہ میں ہر مذہب، ملت سے کوسے گاؤں اور گوسے گاؤں سے بمبئی سنٹرل تک برقی ٹرین میں سینکڑوں وردی پوش فوجیوں کو دیکھتا ہوں جو فتح و نصرت کو اور زیادہ قریب لانے کے لئے شراب کے نشے میں مدہوش یا تو ٹانگیں پسارے سوئے ہوتے ہیں۔ یا نہایت ہی بدنما طور طریقوں سے میری موجودگی سے غافل نہایت ہی واہیات قسم کا رومانس لڑانے میں مصروف ہوتے ہیں۔

میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ لیکن جب میرے ہاتھ میں پستول ہوگا اور دل میں یہ دھڑکا نہیں رہے گا کہ یہ خود بخود چل پڑے گا۔ تو میں اسے لہراتا ہوا۔ باہر نکل جاؤں گا۔ اور اپنے اصلی دشمن کو پہچان کر یا تو ساری گولیاں اس کے سینے میں خالی کر دوں گا —— یا خود چھلنی ہو جاؤں گا —— اس موت پر جب میرا کوئی نقاد یہ کہے گا کہ پاگل تھا تو میری روح ان

مقلوں ہی کو سب سے بڑا تمغہ سمجھ کر اٹھا لے گی اور اپنے سینے پر آویزاں کر لے گی۔

اس تقریبا یا مضمون پر حکومت پنجاب نے زیر دفعہ ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رولز مقدمہ چلایا۔ الزام یہ تھا کہ اس میں حضور ملک معظم کی FORCES کے متعلق ایسی غلط باتیں موجود ہیں جن سے ان کو ضعف پہنچ سکتا ہے۔ "بو" پر جو اس کتاب کا پہلا افسانہ ہے۔ صرف فحاشی کا الزام تھا۔

مقدمہ جیسا کہ ظاہر ہے لاہور میں چوہدری برکت علی ولد محمد نتھو ساکن لاہور (مالک ادب لطیف) چوہدری نذیر احمد ولد غلام حسین قوم ارائیں ساکن لاہور (اڈیٹر) پیرزادہ احمد ندیم قاسمی ساکن لاہور (اڈیٹر) سعادت حسن منٹو ولد غلام حسن ساکن بمبئی کے خلاف مسٹر ہنواری لال کی عدالت میں پیش ہوا۔ مجھے بمبئی سے بہت سے ضروری کام چھوڑ کر حاضر ہونا پڑا۔ لاہور پہنچا تو خیال تھا کہ مجھے گرفتار کیا جائے گا۔ کیونکہ میرے وارنٹ جاری ہو چکے تھے مگر سب انسپکٹر صاحب نے جن سے اتفاقیہ مکتبہ اردو میں ملاقات ہو گئی مجھ سے کہا کہ میں صبح دوسرے ملزمین کے ساتھ عدالت میں حاضر ہو جاؤں۔

گورنمنٹ کالج کے بالکل سامنے گرد و غبار میں اٹی ہوئی اینٹوں کی دو منزلہ عمارت ہے جسے ضلع کہتے ہیں شاید جگت کے طور پر —— اس عمارت کے ایک کمرے میں ہم سب ملزم پیش ہوئے۔ پہلے میری ضمانت ہوئی اس کے بعد کارروائی شروع ہوئی۔ میں اس سے پہلے اسی عدالت میں اپنے افسانے "کالی شلوار" کے مقدمے کے سلسلے میں پیش ہو چکا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب چنانچہ میری طرف دیکھتے ہی مسکرا دیے۔ استغاثے کی گواہیاں ہوتی رہیں، میں خاموش سنتا رہا۔ اس لئے کہ سب کی سب لایعنی۔ بے ہودہ اور منطق و استدلال سے عاری تھیں۔ اسی روز میں نے اپنے وکیل مسٹر ہیرالال سیبل کی معرفت عدالت سے درخواست کی کہ میری حاضری آئندہ پیشیوں میں معاف کر دی جائے۔ عدالت نے یہ درخواست منظور کر لی۔

اتفاق سے ان دنوں میرے بڑے بھائی الحاج محمد حسن منٹو بار ایٹ لا جزائر فجی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو اپنا افسانہ "بو" اور مضمون "ادب جدید" پڑھنے کے لئے دیا۔ اور پوچھا کہ انجام کیا ہو گا۔ دونو چیزیں بغور پڑھنے کے بعد انہوں نے جواب دیا "میرا خیال ہے کہ استغاثے کے گواہ سنتے کے بعد ہی مجسٹریٹ مقدمہ خارج کر دے گا" لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں بمبئی چلا آیا تھا۔ وہاں لاہور میں فرد جرم عائد ہو گیا۔ اور دونو چوہدریوں اور احمد ندیم قاسمی کو صفائی کے گواہ پیش کرنے میں کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ اسی دوران میں مسٹر ہنواری لال تبدیل ہو گئے اور ان کی جگہ چودھری مہدی علی خان متعین ہوئے۔ چونکہ یہ مقدمے کی تفصیل سے بخوبی واقف نہیں تھے، اس لئے فیصلہ مرتب کرنے میں کافی دیر ہو گئی۔

۲ مئی ۱۹۴۵ء کو چوہدری مہدی علی خان نے بالآخر فیصلہ سنا دیا۔ صرف اتنا کہا کہ سعادت حسن منٹو

بری ہے۔ اس لئے کہ مسٹر تنواری لال اسے پہلے ہی بری کر چکے تھے۔ میں نے سوچا اگر ایسا ہی تھا تو مجھے بیہسے لاہور آنے کی زحمت کیوں دی گئی؟ —— احمد ندیم قاسمی بھی بری کردئے گئے۔ لیکن دونو چودھریوں کو ساٹھ روپے فی کس کے حساب سے جرمانہ ہوا۔ عدم ادائگی کی صورت میں ایک ایک ماہ قید با مشقت —— مشقت کا نام سنتے ہی چودھریوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جرمانہ ادا کر دیا۔

اس کے بعد چودھری مہدی علی خاں کے فیصلے کے خلاف مسٹر ایم۔ آر بھاٹیہ اڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں اپیل کی گئی —— فیصلہ ۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء کو ہوا جس کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

زیر نظر مقدمہ دفعہ ۲۹۲ تعزیرات ہند کے تحت ہے جس میں برکت علی اور نذیر احمد کو ساٹھ روپے جرمانہ اور عدم ادائگی جرمانہ کی صورت میں ایک ماہ قید با مشقت کی سزا دی گئی ہے —— اس سزا کے خلاف مجھ سے اپیل کی گئی ہے۔

ماتحت عدالت فاضلہ نے اپنے فیصلہ میں یہ ریمارک کیا ہے کہ مضمون "بو" کا مصنف سوسائٹی کی نظروں میں سخت ترین سزا کا مستحق تھا اور یہ کہ وہی صحیح آدمی تھا جسے قانونی گرفت میں لینا چاہئے تھا۔ مگر پیش رو فاضل جج مسٹر تنواری لال نے اسے بری کر دیا۔

موجودہ ملزموں میں سے ایک پبلشر ہے اور دوسرا ایڈیٹر جس نے مضمون چھاپا۔ قابل غور امر ہے کہ ایسے اشخاص ملزمین کی صفائی میں پیش ہوئے ہیں جو اردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں۔ مثال کے طور پہ خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی، مسٹر کے ایل کپور، پروفیسر ڈی اے وی کالج راجندر سنگھ (بیدی) اور ڈاکٹر آئی۔ لطیف پروفیسر ایف سی کالج جو بطور گواہان صفائی پیش ہوئے ان سب کی رائے ہے کہ مضمون "بو" میں ایسی کوئی چیز نہیں جو شہوانی حسیات پیدا کرے۔ بلکہ ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور اردو ادب کے موڈرن رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ استغاثہ کے گواہ نمبر ۴ نذیر نے بھی دوران جرح میں تسلیم کیا کہ مضمون انسان کے اخلاق پہ برا اثر نہیں ڈالتا۔

میری نظر میں مضمون ایک عشقیہ کہانی ہے۔ ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی جس میں ایسی بات چیت کا دلچسپ ذکر ہے جو عموماً ہر روز نوجوان آدمیوں میں نہیں ہوتی۔

ماتحت عدالت فاضلہ نے ہندوستانی نوجوانوں کی تعیش پسند زندگی کا ذکر کرتے ہوئے اظہار افسوس کیا ہے اور اس بات پر ماتم کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانیوں کا پرانا کیرکٹر نابود ہو رہا ہے۔ ماتحت عدالت کے فاضل جج نے وہ خوبیاں بھی یاد کرائی ہیں جن کے لئے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے۔ اور نصیحت کی ہے کہ نئے فیشنوں کو ختم کر دینا چاہئے۔

معلوم ہوتا ہے ماتحت عدالت فاضلہ کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں —— ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ

چاہتا ہے ـــــ حسین چیز ایک دائمی مسرت ہے۔ آرٹ، جہاں کہیں بھی ملے ہمیں اس کی قدر کرنی چاہئے آرٹ خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسمے کی شکل میں۔ سوسائٹی کے لئے قطعی طور پر ایک پیش کش ہے چاہے اس کا موضوع غیر مستوری ہی کیوں نہ ہو۔ یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے۔ زیر بحث مضمون ایسا مضمون نہیں کہ جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے اس لئے مجھے اپیل منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں۔ جرمانہ اگر ادا کر دیا گیا ہے تو واپس کیا جائے۔ میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔

مجھے چونکہ "شہادت" کا رتبہ حاصل نہیں کرنا ہے اس لئے میں ان تکلیفوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جو مجھے لاہور آنے جانے میں اٹھانی پڑیں۔ ایک لعنت سر سے دور ہو گئی۔ یہی کافی تھا۔ مجھے ان اخباروں کے متعلق بھی کچھ نہیں کہنا ہے جن میں ہفتوں بلکہ مہینوں حکومت اور رعایا کو اخلاقیات کے سبق دئیے جاتے رہے۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ یہ پرچے ایسے لوگوں کی ملکیت ہیں جو عضو خاص کی لاغری اور کجی دور کرنے کے اشتہار خدا اور رسول کی قسمیں کھا کھا کر شائع کرتے ہیں لیکن اپنے ایڈیٹروں کی ٹیڑھی بنگی ٹانگوں اور ان کی جھکی ہوئی کمروں کا مطلق خیال نہیں کرتے ـــــ مجھے ان قلم کے مزدوری کرنے والوں سے دلی ہمدردی ہے۔ ان میں سے اکثر شریف آدمی ہیں۔ جنہیں ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن چونکہ پرچہ چھپنا ہی چاہئے اور اس میں شروع سے لیکر آخر تک کچھ لکھا بھی ہونا چاہئے۔ اس لئے یہ مجبور انسان، سیاست، سائنس اور ادب پر جو بھی ان کے ناتربیت یافتہ دماغوں میں آئے کاغذ پر گھسیٹ دیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ صحافت جیسے معزز پیشے پر ایسے لوگوں کا اجارہ ہے جن میں سے اکثر طلا فروش ہیں۔

پنجاب کی پریس برانچ کے متعلق میں "ایں دفتر بے معنی" نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ یہ دفتر اپنے معنی وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق نکالتا رہتا ہے۔ چند برسوں سے اس کے معنی یہ ہیں کہ علامہ اقبال مرحوم کی شاعری کے بعد طلائے مقوی جل نے ادب کے تمام دروازوں میں تالے ڈال کر ساری چابیاں ایک ٹیک چند کے حوالے کر دی ہیں ـــــ کاش علامہ مرحوم زندہ ہوتے !!

پولیس کی عدالتیں تو خیر پولیس کی عدالتیں ہیں ـــــ اندھی روح اور گونگے فرشتے!

اس اندھی روح، گونگے فرشتوں، پنجاب کے طلا فروش اخباروں اور رسالوں کے مالکوں اور ان کے مریض اڈیٹروں کی بدولت ایک بار پھر مجھے لاہور کی اس عدالت میں حاضر ہونا پڑا جسے ہجت کے طور پر ضلع کہتے ہیں۔

اب کی مقدمہ ساقی بک ڈپو دہلی کی شائع کردہ کتاب "دھواں" پر تھا۔ الزام وہی فحاشی کا تھا۔ دو افسانے زیر عتاب تھے۔ کتاب کا پہلا افسانہ "دھواں" اور کالی شلوار۔ کالی شلوار پر مقدمہ ہوا تو پاکستان قائم ہو چکا

تھا اور سیشن کورٹ میں یہ فحاشی سے مبرا قرار دی جا چکی تھی۔ معلوم نہیں ایک بار پھر اس بے ضرر افسانے پر تعزیرات ہند کی دفعہ ۲۹۲ کیوں آزمائی گئی؟

اس دفعہ معاملہ کچھ زیادہ سنگین معلوم ہوا۔ کیونکہ میرے اور مسٹر شاہد احمد دہلوی (مالک ساقی بکڈپو) کے علاوہ کاتب بھی گرفتار کیا گیا جس نے "دھواں" لکھنے کے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ کتب فروش بھی گرفتار کئے گئے جن کے پاس یہ ملعون کتاب موجود تھی۔ پریس جس میں یہ چھپی تھی اس کا مالک بھی دھر لیا گیا۔

میں سلیقے کا بہت قائل ہوں۔ ناگوار سے ناگوار چیز بھی اگر سلیقے کے ساتھ پیش کی جائے تو مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔ لاہور سی، آئی، ڈی کے ایک سب انسپکٹر نے جس کا نام شاید رام سروپ تھا۔ مجھے ۵ر دسمبر ۱۹۴۴ء کو گوریگاؤں سے "ملاڈ" پولس اسٹیشن بلوایا اور بغیر وارنٹ دکھائے گرفتار کر لیا۔ میں نے وارنٹ کے متعلق استفسار کیا تو رام سروپ نے کہا "پرائیویٹ کاغذات میں تمہیں نہیں دکھا سکتا"۔ یہ حرکت مجھے بہت بری معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں نے شام کو گھر آکر اپنے سولیسٹر کو ٹیلیفون کیا جس نے مجھے بتایا کہ میری گرفتاری غیر قانونی ہے اس لئے مجھے حسب حکم لاہور کی عدالت میں حاضر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن ۶ر جنوری ۱۹۴۵ء کو مجھے میرے مکان پر رات کے دس بجے قانونی طور پر گرفتار کر لیا گیا — عصمت چغتائی (مسز شاہد لطیف) کے ساتھ بھی قریب قریب یہی سلوک ہوا۔

۴ر فروری ۱۹۴۵ء کے قومی جنگ (بمبے) میں "یہ ادب اور تہذیب پر حملہ ہے" کے عنوان سے ایک مضمون علی سردار جعفری کے قلم سے شائع ہوا جس کی ابتدائی سطور یہ ہیں:۔

اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے نام بہت مشہور ہیں۔ حال ہی میں منٹو کے افسانوں کا ایک نیا مجموعہ "دھواں" اور عصمت کے افسانوں کا ایک نیا مجموعہ "چوٹیں" دہلی سے شائع ہوا ہے۔ ان مجموعوں میں ان دونوں افسانہ نگاروں کی بعض اچھی کہانیاں شامل ہیں لیکن معلوم ہوا ہے کہ حکومت پنجاب نے عصمت اور منٹو کے بعض افسانوں کو عریاں قرار دے دیا ہے۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ عتاب کون سے افسانوں پر نازل ہوا ہے۔ لیکن دونوں کتابیں زد میں ہیں مقدمے کی سماعت ابھی تک شروع نہیں ہوئی ہے۔ اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں ۱۲ر فروری کو عصمت اور منٹو کی پیشی ہونے والی ہے۔

لیکن عدالتی کارروائی سے پہلے ہی ان دونوں پر بہت کچھ گذر گئی۔ ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۴ء کو بمبئی کی پولیس نے عصمت چغتائی کو بغیر وارنٹ کے گرفتار کر لیا اور ایک ہزار روپے کی ضمانت پر رہا کر دیا۔ ۱۶ر دسمبر کو عصمت کو دادر پولیس کورٹ میں حاضری دینی پڑی اور انہیں حکم ملا کہ ۸ر جنوری ۱۹۴۵ء کو دوبارہ حاضر ہوں جنوری میں پنجاب سے عصمت کا وارنٹ آگیا اور انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس مرتبہ دو ہزار روپے کی ضمانت دے کر گلوخلاصی کی گئی اور حکم ملا کہ عصمت ۱۲ر فروری کو لاہور کے

اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں جاکر حاضری دیں۔ تقریباً یہی حشر سعادت حسن منٹو کا ہوا۔"

سعادت حسن منٹو کا حشر کچھ زیادہ ہی قابلِ رحم تھا ——— مجھے ان دنوں اعصابی درد کی شکایت تھی۔ گھر میں رات کے دس بجے جب مجھے گرفتار کیا گیا تو میں اسی درد کے کراہ رہا تھا۔ سینے پر گرم بوتل تھی لیکن حکم حاکم مرگِ مفاجات لاہور حاضرِ عدالت ہونا ہی پڑا۔

اس دفعہ مقدمہ رائے صاحب لالہ سنت رام اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا ——— ایک لطیفہ سن لیجئے۔ عدالت میں داخل ہونے سے پہلے ایک ادھیڑ عمر کے شریف سے صاحب آئے اور مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

میں نے پوچھا "آپ کا اسم گرامی"؟

ادھیڑ عمر کے شریف سے آدمی نے جواب دیا "نانک چند ناز"

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا "معاف کیجئے، مجھے آپ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی"

لالہ نانک چند ناز، استغاثہ کے معزز ترین گواہ تھے جو میرے اور عصمت چغتائی دونوں کے خلاف بھگتے ——— آپ واقعی بھگتے ——— ایک اور لطیفہ سنئے۔ لالہ جی نے عصمت کے افسانے "لحاف" کے متعلق کہا کہ اس میں گندے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

ہمارے وکیل مسٹر ہیرالال نے پوچھا "مثلاً"

لالہ جی نے "چونیں" اٹھائی۔ کافی دیر "لحاف" کی ورق گردانی کے بعد ایک لفظ نکالا "مثلاً ——— عاشق!"

ہم سب مسکرا دیئے۔ مسٹر ہیرالال نے لالہ جی سے کہا "یہ لفظ گندہ ہے تو آپ اس کی جگہ کوئی بہتر تجویز کر دیجئے!"

لالہ جی سوچنے لگے

مسٹر ہیرالال نے پوچھا "یار کیسا رہے گا!"

اس دفعہ رائے صاحب لالہ سنت رام بھی مسکرا دیئے۔

جب تک استغاثہ کے گواہ پیش ہوتے رہے ایسی مسکراہٹیں جاری رہیں۔ لیکن عدالت برخاست ہونے سے پہلے جب ہمارے وکیل نے درخواست پیش کی کہ مجھے اور عصمت کو آئندہ پیشیوں میں حاضر ہونے سے معاف کر دیا جائے اور جب مجسٹریٹ صاحب نے اسے مسترد کر دیا تو ہم دونوں کو یہ تکلیف دہ احساس ہوا کہ ہم عدالت میں پیش تھے اور ہم پر فحاشی کا سنگین جرم عائد تھا۔ مجھے اس کا بھی شدید احساس تھا کہ سخت سردی ہے اور میں اعصابی درد میں مبتلا ہوں۔

عدالت سے باہر مسٹر ہیرالال سے مشورہ کیا گیا۔ ایک ہی صورت تھی کہ ہائیکورٹ میں اپیل کی جائے جو فوراً ہی داخل کر دی گئی۔ دوسرے روز میں اور عصمت آنریبل جسٹس اچھرو رام کی عدالت میں پیش ہوئے۔

آپ نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا اور کہا "مجھے آپ دونوں کے افسانے بہت پسند ہیں" — ہمیں بہت خوشی ہوئی لیکن انہوں نے اپیل کے کاغذات آنریبل جسٹس دین محمد کی عدالت میں منتقل کر دئے۔

اب پھر دوسرے روز حاضر ہونا تھا۔ شام کو میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ اتفاق سے میرا بھانجا میجر عبد الوحید ان دنوں لاہور کے ملٹری ہسپتال میں متعین تھا۔ اس نے میرا ایکس رے لیا اور بتایا کہ مجھے "ہائی ڈرو نیومو تھورکیس" ہے۔ یعنی میرے داہنے پھیپھڑے کے ایک حصے میں پانی اور ہوا داخل ہو گئی ہے۔

میجر وحید کے کہنے پر میں نے دوسرے روز صبح سویرے کرنل امیر چند سے بھی تشخیص کرائی۔ انہوں نے وہی مرض بتایا اور رائے دی کہ مجھے آرام کرنا چاہئے۔ میں نے ان سے سرٹیفکیٹ لے لیا کہ شاید کام آ جائے

ع داشتہ آید بکار۔

دوسرے روز آنریبل جسٹس دین محمد کی عدالت میں پیش ہوا۔ عصمت غیر حاضر تھی۔ جسٹس دین محمد صاحب نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بڑبڑائے "ان لوگوں کا وجود ننگ ادب ہے" — مجھے ایسا لگا جیسے میری قسمت پر مہر لگا دی گئی ہے۔ انہوں نے اپیل منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب میں نے اپنے وکیل سے کرنیل امیر چند کا سرٹیفکیٹ پیش کرنے کے لئے کہا تو اپیل ایک قہر آلود دستخط نے منظور کر دی — — میں بمبئی واپس چلا آیا۔

بمبئی میں بہت دیر تک ڈاکٹروں میں یہ بحث ہوتی رہی کہ میرا مرض کیا ہے۔ میجر وحید اور کرنل امیر چند کی تشخیص یہ کہتی تھی کہ مجھے "ہائی ڈرو نیومو تھورکیس" ہے۔ لیکن ڈاکٹر لیلا اور ڈاکٹر ایف ڈبلیو برجر (یا برگر) کی ایکس رے دیکھنے کے بعد یہ رائے تھی کہ صرف "نیومو تھورکیس" ہے۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر ایچ بی موڈک سے جو ریڈی آلوجی کے ماہر ہیں رجوع کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے میرا پرانا ایکس رے دیکھنے اور نیا امتحان لینے کے بعد ڈاکٹر ایف ڈبلیو برجر (یا برگر) کو خط لکھا:۔

> مریض اس وقت نورمل حالت میں ہے۔ "نیومو تھورکیس" اور "سیال مادہ" بالکل غائب ہے۔ یہ کیس جیسا کہ ظاہر ہے سپانٹنیس نیومو تھورکیس کی قبیل سے تھا۔ ایسے چند کیس بعض اوقات "کورخ" میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

اس "کورخ" کا مطلب مجھے لاہور میں میجر وحید نے بتایا جب میں اس مقدمے کا فیصلہ سننے کے لئے گیا۔ مطلب یہ تھا کہ ایسے چند کیس بعض اوقات دق میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن دق اور نزع میں اس وقت ہا حجب میں نے صفائی کے گواہوں کی فہرست تیار کی اور رائے صاحب لالہ سنت رام نے ان کی گواہی بذریعہ کمیشن لینے سے انکار کر دیا۔ کوئی گواہ حیدر آباد میں تھا۔ کوئی لکھنؤ میں اور کوئی بمبئی میں لیکن رائے صاحب مصر تھے کہ سب کے سب لاہور میں حاضر ہوں — مکرمی نیاز فتحپوری صاحب کو جب لکھنؤ میں اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے لکھا:۔

یقیناً کمیشن کے ذریعے سے شہادت قلم بند ہو سکتی تھی اور اس میں بڑی آسانی تھی۔ تعجب ہے کہ مجسٹریٹ نے اسے منظور نہیں کیا اور آپ کے مشیر قانون نے کیوں اس پر زور نہ دیا۔

مجھے معلوم نہیں مسٹر ھیرا لال نے اس پر زور دیا تھا یا نہیں، بہرحال رائے صاحب لالہ سنت رام کا فیصلہ اٹل تھا جس کا نتیجہ ہوا کہ قاضی عبدالغفار صاحب اڈیٹر پیام حیدرآباد لفٹنٹ کرنل قریشی (آئی ایم ایس بمبئی) نیاز فتحپوری صاحب اڈیٹر "نگار" لکھنو۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی (اس وقت) پرنسپل امرسنگھ کالج سرینگر۔ مسٹر ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے بمبئی، جیسے اہل الرائے صاحبان کے خیالات سے نہ صرف میں بلکہ عدالت بھی محروم رہی۔

میں نے ان کو اور دوسرے حضرات کو گواہی کی دعوت ان الفاظ میں دی تھی:-

بمبئی۔ مورخہ ۳۰ر ستمبر

مکرمی

تسلیمات۔ لاہور کی عدالت میں میرے ایک افسانے "دھواں" پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے آپ کو گواہ صفائی کے طور پر بلایا ہے۔ متذکرہ صدر افسانے کے بارے میں آپ کی جو رائے بھی ہو مجھے منظور ہوگی اس لئے کہ فحاشی اور غیر فحاشی کے اہم موضوع پر آپ جیسے اہل الرائے ادیب اور صاحب قلم کے خیالات نہ صرف میرے لئے بلکہ ملکی ادب کے لئے مفید ہوں گے۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری یہ دعوت قبول فرمائیں گے۔ شکریہ

نیازکیش

سعادت حسن منٹو

سب نے میری دعوت قبول کی جس کے لئے میں شکرگذار ہوں — ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو "ہند" نے میرے عریضے کا جواب نہ دیا۔ بہت ممکن ہے ان تک پہنچا ہی نہ ہو سردار دیوان سنگھ مفتون اڈیٹر ریاست کی طرف سے جب مجھے کوئی رسید نہ آئی تو مجھے بہت غصہ آیا۔ کیونکہ مجھے ان کی دوستی پر ناز ہے —— میں نے ان کو پھر لکھا۔ جواب آیا:-

آپ کا دوسرا خط ملا۔ میرا داخلہ پنجاب میں بند ہے۔ اس لئے شہادت کیسے دوں۔ یہی میں نے کمن پر لکھ دیا تھا۔ اگر مجسٹریٹ پنجاب گورنمنٹ سے اجازت لے لے۔ تو میں جانے کے لئے تیار ہوں۔

ایک اور لطیفہ سنئے، بمبئی سے میں نے لاہور میں پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ کو گواہی دینے کے لئے لکھا۔ سمن ان کے پاس پہلے پہنچ چکے تھے۔ میرا خط انہیں دیر کے بعد ملا، چنانچہ انہوں نے مجھے ایک کارڈ لکھا:-

حضرت سلامت۔ آپ کے وکیل سے ایک مرتبہ پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے نہ مقدمے کی وجہ بیان کی نہ یہ کہا کہ کس افسانے پر دھرے گئے ہو۔ ہم کو پیشی تھی۔ دس بجے حاضر عدالت ہوا ۱۲ بجے تک دھوپ میں سڑتا، ٹانگوں کو مسلتا اور بلغم نکالتا رہا ———— نہ جائے نشستن نہ اذن نشستن ۱۲ بجا ہوا گیا بلایا "کیوں جی۔ وہ کہانیاں تم نے پڑھی ہیں" "حضور نہیں" برخاست ———— "لنگڑاتا لنگڑاتا گھر پہنچا۔ دیکھا کہ ایک بڑے پیٹ والا لفافہ لیٹر بکس سے جھانک رہا ہے جس میں حضور کے ارشادات ہیں میرا قصور یہ ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ آپ خفا ہوں گے کہ ایک ہم پیشہ "قلم مار" نے یہ کیا حرکت کی۔ میں خفا ہوں کہ وکیل سست، موکل سست تر ———— منٹو کو سستی کی بیماری ہو، یقین نہیں آتا" اور مجھے یہ یقین نہیں آتا کہ پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ نے میری کہانیاں پڑھی ہی نہیں تھیں ———— غلطی مجھ سے بھی ہوئی کہ میں نے "بڑے پیٹ والے لفافے" میں اس وقت بھیجے جب کہ سمن جاری ہو چکے تھے۔ ان لفافوں میں میں نے اپنے اس تحریری بیان کی نقل بھیجی تھی جو میں نے عدالت میں دیا تھا۔ چونکہ اس بیان کا میری تحریروں سے گہرا تعلق ہے۔ اس لئے میں اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں:-

"میں ساقی بک ڈپو دہلی کی مطبوعہ کتاب بعنوان "دھواں" کا مصنف ہوں۔ یہ کتاب میں نے سن ۱۹۴۱ء میں جبکہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا۔ ساقی بکڈپو کے مالک میاں شاہد احمد صاحب کے پاس غالباً تین یا ساڑھے تین سو روپے میں فروخت کی تھی اس کے جملہ حقوقِ اشاعت اب ساقی بک ڈپو کے پاس ہیں

اس کتاب کے جو نسخے میں نے عدالت میں دیکھے ہیں ان کے ملاحظہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔

چوبیس افسانوں کے اس مجموعے میں سے جو انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہیں دو افسانے بعنوان "دھواں" اور "کالی شلوار" استغاثے کے نزدیک عریاں اور فحش ہیں ———— مجھے اس سے اختلاف ہے کیونکہ یہ دونو کہانیاں عریاں اور فحش نہیں ہیں۔

کسی ادب پارے کے متعلق ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر۔ ایک اشتہار فراہم کرنے والے منیجر اور ایک سرکاری مترجم کا فیصلہ صائب نہیں ہو سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ تینوں کسی خاص اثر۔ کسی خاص غرض کے ماتحت اپنی رائے قائم کر رہے ہوں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تینوں حضرات ایسی رائے دینے کے اہل ہی نہ ہوں کیونکہ کسی بڑے شاعر کسی بڑے افسانہ نگار کے افسانوں پر صرف وہی آدمی تنقید کر سکتا ہے۔ جو تنقید نگاری کے فن کے تمام عواقب و عواطف سے آگاہ ہو۔

استغاثے نے میرے ان دو افسانوں پر کوئی بصیرت افروز تنقید نہیں کی۔ صرف اتنا کہہ دینے

ہے کہ یہ دونوں افسانے فحش ہیں۔ اس آدمی کی جو روشنی کا خواہشمند ہے جو اپنے عیوب و محاسن جاننا چاہتا ہے۔ ہرگز ہرگز تسکین نہیں ہوتی — میں اگر جواب میں صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاؤں کہ یہ دونوں افسانے فحش نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ میں اندھیرے میں اور بھی اضافہ کر دوں گا۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ اور جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا۔ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کروں گا

زبان میں بہت کم لفظ فحش ہوتے ہیں۔ طریق استعمال ہی ایک ایسی چیز ہے جو پاکیزہ سے پاکیزہ الفاظ کو بھی فحش بنا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کوئی بھی چیز فحش نہیں لیکن گھر کی کرسی اور ہانڈی بھی فحش ہو سکتی ہے اگر ان کو فحش طریقے پر پیش کیا جائے۔ چیزیں فحش بنائی جاتی ہیں کسی خاص غرض کے تحت

عورت اور مرد کا رشتہ فحش نہیں۔ اس کا ذکر بھی فحش نہیں۔ لیکن جب اس رشتے کو چوراسی آسنوں یا جوڑ دار خفیہ تصویروں میں تبدیل کر دیا جائے اور لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ تخلیے میں اس رشتے کو غلط زاویے سے دیکھیں تو اس فعل کو صرف فحش ہی نہیں بلکہ نہایت گھناؤنا، مکروہ اور غیر صحت مند کہوں گا۔

فحش اور غیر فحش میں تمیز کرنے کے لئے شاید یہ مثال کام دے سکے۔ ایک آرٹ گیلری میں نمائش کے لئے ننگی عورتوں کی بہت سی تصویریں پیش ہوئیں۔ ان میں سے کسی نے بھی جیسا کہ ظاہر ہے دیکھنے والوں کا اخلاق خراب نہ کیا اور نہ ان کے شہوانی جذبات ہی کو ابھارا۔ البتہ ایک تصویر جس میں عورت کا سارا بدن کپڑوں میں مستور تھا اور ایک خاص حصہ اس ترکیب سے نیم عریاں چھوڑ دیا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کے جذبات میں گدگدی سی ہوتی تھی۔ فحش قرار دی گئی۔ کیوں؟ ——— اس لئے کہ آرٹسٹ کی نیت میں فرق تھا۔ اور اس نے جان بوجھ کر لباس کو کچھ اس طرح اوپر اٹھا دیا تھا کہ دیکھنے والوں کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ جائے اور وہ اپنے تصور سے مدد لے کر اس نیم عریاں حصے کو عریاں دیکھنے کی کوشش کریں۔

تحریر و تقریر میں، شعر و شاعری میں، سنگ سازی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لئے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہئے۔ اگر یہ ترغیب موجود ہے اگر اس کی نیت کا ایک شائبہ بھی نظر آ رہا ہے تو وہ تحریر وہ تقریر وہ شعر، وہ بت قطعی طور پر فحش ہے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ ترغیب "دھواں" میں موجود ہے یا نہیں — آیئے ہم اس افسانے کا تجزیہ کرتے ہیں۔

مسعود ایک کمسن لڑکا ہے۔ غالباً دس بارہ برس کا۔ اس کے جسم میں جنسی بیداری کی پہلی لہر کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس افسانے کا موضوع ہے۔ ایک خاص فضا، اور چند خاص چیزوں کا اثر بیان کیا گیا ہے جو مسعود کے جسم میں دھندلے دھندلے خیالات پیدا کرتا ہے۔ ایسے خیالات جن کا رجحان جنسی بیداری کی طرف ہے۔ یہ بیداری

وہ سمجھ نہیں سکتا لیکن نیم شعوری طور پر محسوس ضرور کرتا ہے ۔

بے کھال کا بکرا جس میں سے دھواں اٹھتا ہے، سردیوں کا ایک دن جب کہ بادل گھرے ہوتے ہیں اور آدمی سردی کے باوجود ایک میٹھی میٹھی حرارت محسوس کرتا ہے، ہانڈی جس میں سے بھاپ اٹھ رہی ہے، بہن جس کی وہ ٹانگیں دباتا ہے ـــ یہ سب عناصر مل کر مسعود کے بدن میں جنسی بیداری پیدا کرتے ہیں۔ جوانی کی اس پہلی انگڑائی کو وہ غریب سمجھ نہیں سکتا اور انجام کار اپنی ہاکی اسٹک توڑنے کی ناکام سعی کرتا کرتا تھک جاتا ہے ــــ یہ تھکاوٹ اس بے نام سی چنگاری کو اس "کچھ کرنے" کی تحریک کو دبا دیتی ہے

"دھواں" میں شروع سے لیکر آخر تک ایک کیفیت، ایک جذبہ، ایک تحریک کا نہایت ہی ہموار نفسیاتی بیان ہے۔ اصل موضوع سے ہٹ کر اس میں دوراز کار باتیں نہیں کی گئیں۔ اس میں ہمیں کہیں بھی ایسی ترغیب نظر نہیں آتی جو قارئین کو شہوانی لذتوں کے دائرے میں لیجائے۔ اس لئے کہ افسانے کا موضوع "شہوت" نہیں ہے۔ استغاثہ اگر ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی کم نظری ہے ـــ خشخاش کے دانے افیم کی گولی بننے تک کافی مرحلے طے کرتے ہیں۔

میں نے اس کہانی میں کوئی سبق نہیں دیا۔ اخلاقیات پر یہ کوئی لیکچر بھی نہیں کیونکہ میں خود کو نام نہاد ناصح یا معلم اخلاق نہیں سمجھتا۔ البتہ یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ اس لڑکے کو مضطرب کرنے والی چیزیں خارجی تھیں۔ انسان اپنے اندر کوئی برائی لیکر پیدا نہیں ہوتا۔ خوبیاں اور برائیاں اس کے دل و دماغ میں باہر سے داخل ہوتی ہیں۔ بعض ان کی پرورش کرتے ہیں۔ بعض نہیں کرتے۔ میرے نزدیک قصائیوں کی دکانیں فحش ہیں کیونکہ ان میں ننگے گوشت کی بہت بدنما اور کھلے طور پر نمائش کی جاتی ہے ـ ـــــ میرے نزدیک وہ ماں باپ اپنی اولاد کو جنسی بیداری کا موقعہ دیتے ہیں جو دن کو بند کمروں میں کئی کئی گھنٹے اپنی بیوی سے سر دبوانے کا بہانہ لگاکر اس سے ہم بستری کرتے ہیں۔

ہندوستان میں بچوں کے اندر بہت کم سنی ہی میں جنسی بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ کسی حد تک آپ کو میرے افسانے کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہے ـــ اتنی چھوٹی عمر میں جنسی بیداری کا پیدا ہونا میرے نزدیک بہت ہی بھونڈی چیز ہے۔ یعنی اگر میں کسی چھوٹے بچے کو جنسیات کی طرف راغب دیکھوں تو مجھے کوفت ہوگی ــــ میرے صناعانہ جذبات کو صدمہ پہنچے گا۔

افسانہ نگار اس وقت اپنا قلم اٹھاتا ہے جب اس کے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کیونکہ بہت عرصہ گذر چکا ہے لیکن "دھواں" لکھنے سے پہلے مجھے کوئی منظر، کوئی اشارہ یا کوئی واقعہ دیکھکر ضرور ایسا صدمہ پہنچا ہوگا جو افسانہ نگار کے قلم کو حرکت بخشتا ہے۔

افسانے کا مطالعہ کرنے سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ میں نے اس بے نام سی لذت میں جو

مسعود کو محسوس ہو رہی تھی خود کو یا قارئین کو کہیں شریک نہیں کیا۔ یہ ایک اچھے فن کار کے قلم کی خوبی ہے

اس افسانے میں سے میں چند سطور پیش کرتا ہوں جن سے افسانہ نگار کے غائت درجہ محتاط ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے کہیں بھی مسعود کے دماغ میں شہوانی خیالات کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا ایسی لغزش افسانے کا ستیاناس کر دیتی۔

۱۔ مسعود کے بدن تلے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہوا — جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا ٹھیک اس طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں۔ تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔

۲۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسا اس طرح پھسلتا ہو گا۔

۳۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا "کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اترنے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا — لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جس طرح وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

خط کشیدہ الفاظ اس بات کے ضامن ہیں کہ مسعود کا ذہن کہیں بھی شہوت سے ملوث نہیں ہوا۔ وہ اپنی بہن کی کمر دباتا ہے۔ جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں۔ ٹانگیں دباتا ہے تو اس کا خیال بازی گر کی طرف چلا جاتا ہے جس کا تماشہ اس نے ایک بار اپنے اسکول میں دیکھا تھا اور جب یہ سوچتا ہے کہ اگر اس کی بہن ذبح کر دی جائے تو کیا اس کے گوشت میں سے دھواں نکلے گا تو فوراً اسے بری بات سمجھ کر اپنے دماغ سے نکال دیتا ہے اور خود کو مجرم سمجھتا ہے۔

خدا جانے استغاثہ اس افسانے کو فحش کیوں کہتا ہے جس میں فحش کا شائبہ تک موجود نہیں اگر میں کسی عورت کے سینے کا ذکر کرنا چاہوں گا تو اسے عورت کا سینہ ہی کہوں گا، عورت کی چھاتیوں کو آپ مونگ پھلی۔ میز یا استرہ نہیں کہہ سکتے — یوں تو بعض حضرات کے نزدیک عورت کا وجود ہی فحش ہے مگر اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جن کو کبری کا ایک معصوم بچہ بھی بہیمیت کی طرف لے جاتا ہے — دنیا میں ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں سے شہوانی [illegible] ہیں۔ اور ایسے انسان بھی آپ کو مل جائیں گے جن کو لوہے کی مشینیں [illegible] کی حرارت پیدا کر دیتی ہیں — مگر لوہے کی ان مشینوں کا جیسا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں کوئی قصور

نہیں۔ اس طرح نہ بکرے کے معصوم بچے کا اور نہ مقدس کتابوں کا۔

ایک مریض جسم۔ ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے۔ جو لوگ روحانی۔ ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں اصل میں اُنہی کے لئے شاعر شعر کہتا ہے۔ افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصوّر تصویر بناتا ہے۔

میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لئے ہیں۔ نارمل انسانوں کے لئے جو عورت اور مرد کے رشتے کو استعجاب کی نظر سے نہیں دیکھتے —— جو کسی ادب پارے کو ایک ہی دفعہ نگل نہیں جاتے۔

روٹی کھانے کے متعلق ایک موٹا سا اصول ہے کہ ہر لقمہ اچھی طرح چبا کر کھاؤ۔ لعاب دہن میں اسے خوب حل ہونے دو تاکہ معدے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے اور اس کی غذائیت برقرار رہے —— پڑھنے کیلئے بھی یہی موٹا اصول ہے ہر لفظ کو ہر سطر کو ہر خیال کو اچھی طرح ذہن میں چباؤ۔ اس لعاب کو جو پڑھنے سے تمہارے دماغ میں پیدا ہوگا اچھی طرح حل کرو تاکہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے اچھی طرح ہضم ہو سکے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کے نتائج بُرے ہونگے۔ جس کیلئے تم لکھنے والے کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکو گے۔ وہ روٹی جو اچھی طرح چبا کر نہیں کھائی گئی تمہاری بدہضمی کی ذمہ دار کیسے ہو سکتی ہے۔

میں یہاں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں —— فرانس میں ایک بہت بڑا افسانہ نگار گائی۔ ڈی۔ موپاساں گذرا ہے۔ جنسیات اس کا محبوب موضوع تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات نے اس کے افسانوں کا اپنی علمی کتابوں میں حوالہ دیا ہے۔ اپنے ایک افسانے میں وہ ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی داستان بیان کرتا ہے جو بے حد الھڑ تھے۔ پہلی رات کے متعلق دونوں نے سنی سنائی باتوں سے ایک عجیب و غریب تصویر اپنے ذہن میں کھینچ رکھی تھی۔ دونوں اس خیال سے کپکپا رہے تھے کہ خدا معلوم کتنی بڑی لذت ان کو پہلی رات کے ملاپ سے ملے گی۔

دونوں کی شادی ہو گئی —— دولہا ماہ عسل منانے کی خاطر دلہن کو ایک ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں پہلی رات کو —— اس رات کو جس میں دونوں کے خیال کے مطابق شاید فرشتے اتر کر ان کو لوریاں دینے والے تھے۔ دولہا اور دولہن ہم بستر ہو گئے۔ دونو لیٹے تھے اور بس —— دولہن نے شامت اعمال اتنا کہہ دیا "بس —— کیا یہی ہماری پہلی رات تھی جس کے ہم دونا تنے شیریں خواب دیکھا کرتے تھے" دولہا کو یہ بات کھا گئی۔ آخر مرد ہی تو تھا۔ اس نے سوچا یہ میری مردانگی پر حملہ ہے —— چنانچہ اس کی مردانگی بالکل ہی ختم ہو گئی —— عرق ندامت میں غرق وہ حجلہ عروسی سے باہر نکل گیا۔ اس غرض سے کہ اپنی ناکام زندگی کسی دریا کے سپرد کر دے۔ عین اس وقت جب یہ نیا نویلا دولہا اس خطرناک فیصلے پر پہنچا فرانس کی ایک کسبی —— ایک طوائف پاس سے گذری جو کہ گاہک تلاش کر رہی تھی۔ اس عصمت باختہ عورت نے اس کو اشارہ کیا۔ دولہا نے محض انتقام لینے

کے لئے ــ ساری عورت ذلت سے بدلہ لینے کے لئے اس کو اس اشارے کا جواب دیا کہ ہاں میں تیار ہوں ـــ وہ ٹھکیاٗئی اسے اپنے گھر لے گئی ۔ اس کے غلیظ گھر میں دولھا وہ کام کرنے میں کامیاب ہو گیا جو وہ اپنے نفیس ہوٹل کے حجلۂ عروسی میں نہ کر سکا تھا ـــــ اب وہ اس ولیشیا کو بھول گیا ـــ دوڑا دوڑا اپنی نئی بیاہتا بیوی کے پاس پہنچا جیسے اسے اپنی کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہے ـــــ دونو پاس پاس لیٹے تھے ۔مگر اب اس کی بیوی کو وہ شیریں خواب دیکھنے کی خواہش باقی نہیں رہی تھی جس کا اس نے پہلے گلہ کیا تھا ۔

یہ افسانہ پڑھ کر اگر کوئی شخص جو پہلی رات کو ناکام رہا ہو سیدھا ویشیا کے کوٹھے کا رخ کرے تو میں سمجھتا ہوں اس جیسا چغد اور کوئی نہیں ہو گا ۔میرے ایک دوست نے یہی بیوقوفی کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے اپنا کھویا ہوا وقار تو مل گیا پر اس کے ساتھ ہی ایک مکروہ مرض چمٹ گیا جس کے علاج کے لئے اسے کافی سے زیادہ زحمت اٹھانا پڑی ۔

پچھلے دنوں میں نے آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے ایک تقریر نشر کی تھی ۔اس میں میں نے کہا تھا "ادب ایک فرد کی اپنی زندگی کی تصویر نہیں ۔ جب کوئی ادیب قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے گھریلو معاملات کا روزنامچہ پیش نہیں کرتا ۔ اپنی ذاتی خواہشوں ۔ خوشیوں ۔ رنجشوں ۔ بیماریوں اور تندرستیوں کا ذکر نہیں کرتا ۔ اس کی قلمی تصویروں میں بہت ممکن ہے آنسو اس کی دکھی بہن کے ہوں ۔ مسکراہٹیں آپ کی ہوں اور قہقہے ایک خستہ حال مزدور کے ـــــ اس لئے اپنی مسکراہٹوں ، اپنے آنسوؤں اور اپنے قہقہوں کی ترازو میں ان تصویروں کو تولنا بڑی غلطی ہے ـــ ہر ادب پارہ ایک خاص فضا ایک خاص اثر ۔ ایک خاص مقصد کے لئے پیدا ہوتا ہے ۔ اگر اس میں سے یہ خاص فضا ۔ یہ خاص اثر اور یہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو یہ ایک بے جان لاش رہ جائے گی ۔"

میں ایک زمانے سے لکھ رہا ہوں ۔گیارہ کتابوں کا مصنف و مؤلف ہوں ۔آل انڈیا ریڈیو کے تقریباً ہر اسٹیشن سے میرے ڈرامے اور فیچر براڈ کاسٹ ہوتے رہتے ہیں ۔ان کی تعداد سو سے اوپر ہے ـــــ میں تحریر و تصنیف کے جملہ آداب سے واقف ہوں ـــــ میرے قلم سے بے ادبی شاذ و نادر ہی ہو سکتی ہے ـــــ میں فحش نویس نہیں افسانہ نگار ہوں ۔

دوسرے افسانے "کالی شلوار" کے متعلق میں نے اس لئے کچھ نہیں لکھا کہ لاہور کی سیشن کورٹ میں فحاشی سے بری قرار دی جا چکی ہے ۔

میرے اس بیان کا کچھ اثر نہ ہوا ۔صفائی کے گواہوں میں ڈاکٹر سعید اللہ ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی ایس سی پروفیسر اسلامیہ کالج ، ایم اے ایل ایل بی ، ڈاکٹر آئی لطیف ایم اے پی ایچ ڈی ۔ مولانا باری علیگ ، دیوندر ستیارتھی جیسی اہل الرائے ہستیاں موجود تھیں ۔ان حضرات نے اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے سارا سارا دن عدالت میں گذار کر میرے حق

میں گواہی دی اور کہا کہ زیرِ عتاب افسانوں میں فحاشی کا شائبہ بھی موجود نہیں لیکن رائے صاحب لالہ سنت رام نے دونوں افسانے فحش قرار دئیے اور مجھے دو سو روپیہ جرمانہ ادا کرنے کی سزا دی (عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں کتنے مہینوں کی قید با مشقت تھی - تھی یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں) میں نے جب اپنی جیب سے دو سو روپے نکالے تو اسپیشل مجسٹریٹ صاحب کے ہونٹوں پر ایک اسپیشل مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ آپ نے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کیل کانٹے سے لیس ہو کر آئے تھے"

باوجود کوشش کے میرے ہونٹوں پر اسپیشل مسکراہٹ پیدا نہ ہو سکی۔

سیشن میں اپیل کی گئی۔ پیروی مسٹر ہیرالال سبل نے کی - کئی مہینے گذرنے کے بعد ایک روز ان کا تار آیا کہ مبارک ہو، سیشن کورٹ نے اپیل منظور کر لی ہے، جرمانہ واپس ہو جائے گا۔

تیسری دفعہ انجام بخیر ہوا۔

ایک اور لطیفہ سنئے۔ چند روز ہوئے - ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے نوکر سے کہا "پوچھو کون ہے؟" - جواب آیا۔ "سی آئی ڈی کا آدمی"۔۔۔ ظاہر ہے کہ لاہور سے گرفتاری کا وارنٹ تھا لیکن جب میں اس سی آئی ڈی کے آدمی سے ملا اور اس سے کہا "فرمائیے اب کی میری کس کہانی پر عتاب نازل ہوا ہے"۔ تو وہ جیسے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ کہنے لگا "ہم ادھر تپاس (پوچھ گچھ) کرنے آیا ہے - تمہارا نام ادھر کمیونسٹ پارٹی کے آفس میں چوپڑی (کتاب) میں لکھا تھا ...... بولو تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟

یہ سن کر مجھے تسلی ہوئی اور مذاق سوجھا "چوپڑی سے یا کمیونسٹ پارٹی سے؟"

"کمیونسٹ پارٹی سے"

میں نے جواب دیا: "تعلق ہے مگر ناجائز"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تمہاری حکومت یہی سمجھتی ہے، ورنہ تم یہاں تپاس کرنے کیوں آتے؟"

یہ قصہ بھی ختم ہوا۔

آخر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے لاہور کی ایسی عدالت میں جہاں شریف انسانوں کو بیٹھنے کے لئے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی بھی نہیں ملتی گھنٹوں اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے بھینس کے آگے بین بجائی۔

مسٹر اے ایس بخاری کا بھی میں ممنون و متشکر ہوں۔ مذکورہ صدر مقدمے کے فیصلے کے بعد یا اس سے کچھ دیر پہلے آپ نے بمبئی ریڈیو اسٹیشن پر مجھے بلایا اور بڑی شفقت سے بتایا کہ وہ اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر میرے اور عصمت کے عتاب زدہ افسانوں کے متعلق ہندوستان کے مشہور ادیبوں کی رائے مرتب کر رہے ہیں اور [illegible] عدالت سے بیانات وغیرہ کی نقل لینے کے لئے ایک آدمی بھی متعین کر دیا ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت [illegible] اتفاق سے میرا افسانہ "دھواں" نہیں پڑھا تھا چنانچہ ان کے ارشاد کے مطابق میں نے ایک جلد اس کتاب کی انکو دہلی روانہ کر دی۔ اس ملاقات کو تقریباً ایک برس ہو چکا ہے۔ امید ہے بخاری صاحب نے اپنا کام ختم کر لیا ہوگا

قاضی عبدالغفار

ایک جدید شاعرہ

انیسویں صدی کا نصف آخر علم و ادب اور فنون کی ترقیوں کا ایک ایسا دور تھا جب مغربی دنیا سارے عالم کے فوز و فلاح کی گویا اجارہ دار بن چکی تھی۔ وہ وقت جاگیرداری اور سامراجی نظام کا نصف النہار تھا۔ لیکن خود مغربی مفکرین کے حلقوں میں کچھ اصحاب فکر و نظر ایسے بھی تھے جو تہذیب و تمدن کی اس تعمیر کو استوار نہ سمجھتے تھے۔ اور افق پر آنیوالی آندھی کا غبار انہیں صاف نظر آرہا تھا۔ اس وقت انگریز ادیب اور شاعر اور مفکر میتھو آرنلڈ نے لکھا تھا کہ:۔

"ہم لوگ دو دنیاؤں کے درمیان کھڑے ہیں۔ ایک تو مر چکی ہے۔ اور دوسری میں ابھی اتنی قوت نہیں کہ پیدا ہوسکے"

کوئی شاعر اور مفکر ہی گزرتی ہوئی دنیا اور آنے والی دنیا کے امکانات کے متعلق اس قدر صحیح پیش قیاس کرسکتا ہے لیکن میتھو آرنلڈ کی نظر میں جو دنیا مرچکی تھی وہ اپنے کفن میں بھی اپنے کو سب سے زیادہ زندہ سمجھ رہی تھی۔ البتہ شاعر ایک دوسری دنیا کا انتظار کر رہا تھا جس میں ابھی قوت نمو پیدا نہ ہوئی تھی۔

کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا جب میتھو آرنلڈ نے آنیوالی دنیا کا ذکر کیا تھا۔ آج اس کا وہ تصور ایک انقلابی اور متحرک زندگی کے قالب میں ہمارے سامنے آچکا ہے۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے تصور کی وہ دنیا جس میں نصف صدی پہلے پیدا ہونے کی قوت نہ تھی آج پیدا ہوچکی ہے۔ اب ہم دو دنیاؤں کے درمیان کھڑے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ایک ایسی نئی دنیا کی ہیجانی کیفیت سے اپنا حصہ پا رہے ہیں جو ہر قدم پر تہذیب و تمدن کے غرور سے انتقام لے رہی ہے۔

یہ تصور ہی غلط ہے کہ کوئی شاعر اپنے وقت سے پہلے یا بعد پیدا ہوسکتا ہے۔ جس کار ادیب اور شاعر اپنے وقت اور زمانہ کی اولاد ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے آرٹ میں اپنے وقت کے صحیح نقش و نگار پیش نہ کرسکے تو وہ فن کار یا حسن کار تو ہوسکتا ہے مگر ترجمان حقیقت نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان اپنے اس انقلابی دور میں ایسے ادیب اور حسن کار پیدا کر رہا ہے جو اپنے قلوب سے نئی دنیا کے صحیح عکس کو اپنی شاعری اور اپنے ادب میں پیش کرسکتے ہیں۔ ہمارے ملک کا ادب بیسویں صدی کے آغاز تک بھی اس

سرمایہ داری اور جاگیرداری اور ساہوکاری کے قدیم دور کی گود میں پرورش پاتا رہا جو مخصوص طبقات کی بالادستی کا دور تھا۔ لیکن جب خود مغربی دنیا میں ساہوکار، اور جاگیردار اور کلیسائی اقتدار کے اجارہ دار اپنے سماجی نظام کے خلاف شاعری اور ادب کی بغاوت کو دبا نہ سکے۔ تو اس بغاوت کا اثر ایشیا کے ممالک پر بھی پڑنا شروع ہوا۔ اس دورِ جدید میں ایشیائی ادب جس قدر روسی انقلاب سے متاثر ہوا کسی دوسری تحریک سے متاثر نہ ہو سکا۔ روسی افکار کے انقلاب میں ایک ناقابلِ انکار قوت تھی جس نے کم و بیش تمام ایشیائی ممالک میں (جو جاگیرداری نظامِ زندگی کی زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے) انقلابِ افکار کی تخم ریزی کی اور محض تفریحی اور فراری ادب اور اس کی وجدانی نزاکتوں اور فنی باریکیوں کے بجائے ایک ایسے عوامی ادب کی تعمیر شروع کی جس نے عوام کی نبضِ حیات سے اپنا ایک گہرا ربط قائم کیا۔

ہندوستان میں جس طرح کم و بیش تمام دنیا کے ممالک میں عورت تہذیب و تمدن کے اس نزک سے ہمیشہ محروم رکھی گئی۔ سماج کے لئے قانون سازی کا حق مردوں نے صرف اپنے لئے مخصوص رکھا تھا۔ اس لئے عورت نے ہمیشہ ایک ایسے ماحول میں تربیت پائی کہ اس کے اندر زندگی کے بہت سے حقوق سے اپنی محرومی کا احساس بھی پیدا نہ ہو سکا۔ وہ سماج کے ایک آہنی پنجرے میں بند رکھی گئی اور مرد نے اسے نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی اعتبار سے بھی صنفِ ضعیف قرار دیا۔ ہندوستان کی طرح ان ممالک میں جو بیسویں صدی کے انقلاب کے دھارے سے دور تھے۔ عورتوں کے اس جبریہ تعطل کی تاریکی میں روشنی کی شعاعیں بہت دیر میں پہنچیں۔ لیکن بالآخر وہ دن آیا جب عمومی ادب میں ہم چند ایسی خواتین کا نام بھی نمایاں دیکھنے لگے جن کے شاعرانہ افکار کو انقلابی افکار نے مس کیا تھا۔ ہمارے ملک میں بھی ایسی خواتین کی تعداد بہت کم ہے لیکن "صنفِ ضعیف" کے حلقوں میں بھی اب چند چنگاریاں چمک رہی ہیں اور چند شمعیں روشن ہو گئی ہیں۔ خونِ جگر کے چند قطرے گرنے لگے ہیں جس سے بہت سے نئے چراغ روشن ہونے والے ہیں۔ قدیم سماج کے اجارہ داروں کے خلاف بغاوت کا وہ بے باک جذبہ بیدار ہو چکا ہے جو شعر و ادب کی دنیا میں مردوں کی قدیم جاگیرداری کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور حالی کی زبان سے (جو جدید ادب کے پہلے معمار تھے) صاف کہتا ہے ؎

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی — عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

اس مسئلہ کی حد تک شاعرِ مشرق اقبال بھی میتھو آرنلڈ کی طرح دو دنیاؤں کے درمیان کھڑا تھا وہ کبھی تو کہتا تھا کہ ع

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی — نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

کبھی سوال کرتا تھا کہ ؎

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ — آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

اور پھر خود ہی اپنے عجز کا اعتراف کرتا تھا کہ ع

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا

مجھے یقین ہے کہ اگر آج اقبالؔ زندہ ہوتے تو اس بحث کا فیصلہ انھیں کرنا ہی پڑتا۔ اور تسلیم کرنا پڑتا کہ اب ہندی عورت کی نظر میں زمرد کا گلوبند آزادیٔ نسواں کا نعم البدل نہیں ہے۔ وہ "زمرد کے گلوبند والے طبقہ کے طبقاتی تفوق کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہے۔ اور عمومیت اور انسانیت کی آزادی میں آزادیٔ نسواں کی طلب گار ہے۔

ادب اور شعر کے میدان میں جو عمومیت کے جذبات کا ایک بہت وسیع میدان ہے ـــــ ابھی تک ہندوستان کی خواتین کے صرف چند ہی نام نمایاں ہیں۔ مثلاً حیا لکھنوی۔ نوشابہ قدوائی۔ صفیہ شمیم۔ ذکیہ سلطانہ۔ اداؔ بدایونی اور شاید چند اور۔ ان میں بھی دو تین ہی ایسی خواتین ہیں جنھوں نے اپنے ادب میں ترقی پسند رجحانات کو پوری طرح ظاہر کیا ہے۔ جدید ادب اور شعر کے معماروں کی صفِ اوّل میں تسمیہ اداؔ بدایونی کا نام اور کلام نمایاں ہے۔ ایک مختصر پیش لفظ میں ان کے کلام کی تمام خصوصیات پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں لیکن جہاں تک جدید ادب سے اداؔ بدایونی کے افکار کا ربط قائم ہے" مجھے کچھ کہنا چاہیے۔

یہ واقعہ کہ جدید ادب کے تقاضوں نے ہمارے ملک کی خواتین کو اپنی طرف رجوع کر لیا ہے ہندوستان کے موجودہ دور کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ قدامت اور جمود کے خلاف عوامی افکار نے جو راستہ اختیار کیا اس کے صحیح ہونے کا ثبوت اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ خواتین جو عموماً ہر قوم میں سب سے زیادہ قدامت پسند ہوا کرتی ہیں۔ اب زمانہ کے تقاضوں سے متاثر ہو رہی ہیں۔ اور ان کا ادب اور ان کی شاعری عمومی افکار کی آئینہ دار بننے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ اداؔ بدایونی جیسی خواتین کا یہ رجحان جدید ادب کا ایک نشانِ راہ ہے جس سے ہم اس منزل کا پتہ پاتے ہیں جہاں ملک کے ذہنی انقلاب کی تمام قوتیں مجتمع ہو رہی ہیں۔ اس طرح ہماری ملّت کی عورتیں علامہ اقبال کے اس بیان کی تردید کرنا چاہتی ہیں کہ ع

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منّتِ غیر   غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

وہ بہت جلد اس حقیقت کو بے نقاب کر دینا چاہتی ہیں کہ اب کچھ زیادہ عرصہ تک عورت کے جوہر کی نمود غیر کے اختیار میں نہ رہے گی۔ بلکہ وہ اپنی صنف کے متعلق شاعرِ مشرق کے اس دعوے کی دلیل بننا چاہتی ہے کہ اس کے شعلے سے (جس طرح شرارِ فلاطوں ٹوٹا تھا (اس کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ فلاطوں) اسی طرح اور بہت سے شعلے اور شرار بھی ہیں جن کا ہندوستان کے نئے دور کی نئی عورت مقابلہ کرنے والی ہے۔

آج جدید ترکیہ کے قومی شاعر ضیا کے وہ الفاظ ہمارے قلوب کے خلوت خانوں میں بھی ایک لرزش خیالات پیدا کر رہے ہیں۔ شاعر اعظم ضیا نے کہا تھا کہ :-

"جب تک عورت کی صحیح اور مکمل حیثیت دیکھی نہ جائیگی قومی زندگی نامکمل رہے گی۔ میں نہیں جانتا کہ ہم نے عورت کو پس پشت کیوں ڈال رکھا ہے --- تو پھر کیا اسکول اپنی سوئی نیزہ میں تبدیل کر دینی چاہیے تاکہ وہ تم سے زبردستی اپنے حقوق حاصل کرے"

ترکوں کی تجدد کی آواز ہم تک بہت دیر میں پہونچی مگر بالاخر اب ہو چکی ہے۔ اور ملک کی متعدد زبانوں میں ہندوستانی خواتین ادب اور شاعری کے ذریعہ سے مطالبۂ حقوق النسائیت کا راستہ صاف کر رہی ہیں ـــ وہ سب کچھ لیکر رہیں گی جو ان کا حصہ ہے۔ مجھ جیسے بڈھے شاید ہندوستان کی نسوانیت کے اس شاندار عہد کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں لیکن ان ہی عورتوں کی گودوں میں وہ بچے پرورش پائیں گے جو اس عہد جدید کا خیر مقدم کریں گے :-

آزاد بدایونی کے کلام میں ان کانٹوں کی نوک صاف نظر آ رہی ہے جو دلوں میں کھٹک رہے ہیں۔ انھوں نے جدید ادب کی جو نمائندگی کی ہے میں اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے عام طور پر ان کی فکر سخن اور انداز بیان کے بعض گوشوں کی طرف سر راہ چند اشارے کرتا ہوں۔

فنی نقطۂ نظر سے جو زیادہ تر قدیم نقطۂ نظر ہے آزاد بدایونی کی شاعری میں اقبال، جگر اور فانی کے اسلوب بیان اور طرز فکر کے علاوہ منظر نگاری اور ترنم کا ایک پہلو بھی کافی نمایاں ہے۔ ترنم کا تو صرف ایک ہی نمونہ کافی ہے۔

ڈھلکے ڈھلکے آنسو ڈھلکے — چھلکے چھلکے ساغر چھلکے
دل کے تقاضے، ان کے اشارے — بوجھل بوجھل ہلکے، ہلکے
دیکھو دیکھو دامن الجھا — ٹھہرو ٹھہرو ساغر چھلکے
ان کی تمنا، ان کی محبت — دیکھو سنبھل کے دیکھو سنبھل کے
کتنے الجھے، کتنے سیدھے — رستے ان کے رنگ محل کے

اقبال کے اثرات کے ہلکے ہلکے نقوش ان اوراق کے بعض مقامات پر بہت پرکیف ہیں۔

کمیاب ہیں لیکن وہ جہاں سوز نگاہیں — بڑھ کر جو کمند انجم و خورشید پہ ڈالیں

تری نگاہ سے روشن رہیں دلوں کے شرار — سرود نے پہ نہیں نغمۂ حرم کا مدار
مجھے نگاہ خرد آشنا سے شکوہ ہے — کہ ہو سکی نہ شعور نگاہ سے دو چار

جگر کے تغزل کا رنگ بھی کہیں کہیں اسی طرح جھلکتا ہے :-

سامنے بے نقاب بیٹھے ہیں　　　　دفعتِ حسنِ مہر و ماہ گئی
اس نے نظریں اٹھا کے دیکھ لیا　　　　عشق کی جراٴتِ نگاہ گئی

یا پھر ادھر ادھر چند جواہر پارے فانی کی طرزِ بیان یاد دلاتے ہیں ۔ مناظر نگاری کا رنگ ان سب سے جدا ہے ۔ لیکن مناظر نگاری میں بھی کہیں کہیں لہجہ بہت غمگین ہے ۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ شاعر کو مایوس تو کبھی نہ ہونا چاہیئے ۔ مگر غمگین ہونا چاہیئے ۔ اس کے ساز کے نازک تار ٹوٹ جاتے ہیں قہقہوں کی ضرب سے ۔ صرف ہلکا تبسم ہی انھیں گوارا ہے ۔

ادا کی مناظر نگاری کے چند نمونے میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے ۔ طرب و بہار کی واردآتوں میں بھی حزن کی پرچھائیاں موجود ہیں ۔ مثلاً "بہار کا پہلا پھول" :-

ہے زیبِ شاخِ حسن گلستاں کہیں جیسے　　　　اک پھول جانِ کیفِ بہاراں کہیں جیسے
ابرِ کرم کا قطرۂ اوّل گہر بہ کف　　　　افسانۂ بہار کا عنواں کہیں جیسے
یا جستجوئے جلوۂ رنگین دوست میں　　　　وہ چشمِ انتظار کہ حیراں کہیں جیسے
یا اوّلیں سرشکِ محبت سرِ مژہ　　　　محرومیٔ نشاط کا پیماں کہیں جیسے

"ایک تصویر دیکھ کر" ادا کو شاعرِ مغرد کا ایک سجدۂ بے تاب یاد آتا ہے ۔

جو آستانِ ناز پر　　　　اس نے لٹایا تھا کبھی
اک شعرِ دل کے ساز پر　　　　بھولے سے گایا تھا کبھی

اسی طرح ادا کی نظم میں شاعر کے رنگین خواب کی بد تعبیر ہے ۔

اسی طرح "جوہی کی کلیاں" ۔ "جھیل" ۔ "صبح بنارس" ۔ "بہار کا راگ" ۔ اور ایسی متعدد نظموں میں ادا نے ساز کے اس تار کو انگلی لگائی ہے جس سے ایک غمگین نغمہ پیدا ہوتا ہے ۔ بہت مدھم "یادِ ماضی" کے عنوان سے فرماتی ہیں :-

ہاں ابرِ سایہ انجمِ رخشندہ پہ چھا جا　　　　آنکھوں تلے پھرنے لگے ماضی کے نظارے
تاروں کی طرح میرے تصور میں ہیں روشن　　　　وہ لمحے جو فردوسِ محبت میں گذارے
میرے مہِ تاباں سے ادا کون یہ پوچھے　　　　تنہا کوئی کب تک شبِ مہتاب گزارے

ایک چیز اور بھی ادا کے کلام میں کہیں کہیں نظر آتی ہے ۔ طنز کی ہلکی سی چاشنی ۔ مثلاً عنوان ہے کہ ۔

"ان کی شکایتوں کا لکھا ہم نے یہ جواب" :-

تم تو وفا شناس و محبت نواز ہو　　　　ہاں میں خطا شعار سہی بے وفا سہی
میں محفلِ نشاط میں نغمہ طرازِ شوق　　　　تم زیرِ لب تبسمِ حسرت نما سہی

تم کو خیالِ غم سببِ اضطرابِ دل　　مجھ کو بیانِ دردِ مسرت فزا سہی
میں اشتیاقِ دید و صوت سے بے نیاز　　اور تم نگار خانۂ مہر و وفا سہی
ہے اک وفا شناس کو پاسِ وفا اداؔ　　ورنہ کہاں ہم اور کہاں بخششِ خطا!

اداؔ کی شاعری کے عام انداز پر سرِ راہ ایک نظر ڈالنے کے بعد اب میں جدید ادب سے ان کے کلام کے ارتباط کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ میری نظر میں ان کے کلام کا یہی پہلو سب سے زیادہ اہم ہے۔ میں جدید ادب کو فن کے قدیم پیمانوں میں سختی کے ساتھ جانچنے کا قائل نہیں۔ جدید ادب عوام کیلئے نئی زندگی کا ایک پیغام لایا ہے۔ لہٰذا اس کی خوبیوں کے جانچنے کا سب سے زیادہ معتبر پیمانہ اس کی "اثریت" ہے۔ اگر میں دیکھوں کہ کسی شاعر نے عوامی زندگی کی نبض پر انگلی رکھی ہے اور اس نے اپنے کلام میں وہ اثر پیدا کیا ہے جس سے عوام کے قلوب میں گرمی اور ذوقِ عمل پیدا ہو سکتا ہو تو میں قطع نظر تمام دوسرے مضمرات کے اس کو بلا تکلف "استادانِ فن" کی صف سے بھی کہیں آگے بٹھا دوں گا۔

اداؔ بدایونی کے کلام میں جہاں کہیں یاس اور مایوسی کا کوئی پہلو نظر آتا ہے تو اس کے دوش بدوش ہم امید اور ایک بے محابہ جذبہ بھی کارفرما دیکھتے ہیں جو شاعرہ کے کلام کی تکمیل کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں وہ قدیم طرزِ فکر پر تنقید کرتی ہیں مثلاً:۔

نقش بر آب ہے وابستگیٔ حسن و شباب　　نکہتِ گل کی طرح عشق ہے پابند ہوا

تو اس کے ساتھ وہ یہ کہہ کر اپنے سننے والے کے خیال کا رخ بدل دیتی ہیں:۔

منزلیں اور بھی کتنی ہیں محبت کے سوا　　روحِ آزاد گرفتارِ سلاسل کیوں ہو؟

ایک مقام پر زندگی کے قدیم اسلوب سے بیزار ہو کر فرماتی ہیں:۔

سوچتی ہوں کہ کوئی حجلۂ تاریک ہے کیا
یہ گرانبارِ تسلسل
یہ حیاتِ جامد
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کوئی روزن بھی نہیں کوئی دریچہ بھی نہیں
ایک دنیا ہے کہ ہے تیرہ و محدود و اداس
نور و نکہت سے گریزاں، مہ و انجم سے نفور
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کاش پڑ جائے کہیں ایک خراش۔ ایک شگاف
غم کے ہاتھوں ہی سہی

اور بھولے سے کبھی
کوئی آوارہ سی، چنچل سی کرن آنکلے
ایک لمحہ کے لیے
میرے تاریک گھروندے میں اجالا ہو جائے۔

پھر ایک نظم میں اس بیزاری کو یوں ظاہر کرتی ہیں:۔

میں نے گلریز بہاروں کی تمنا کی تھی
مجھے افسردہ خیالوں کے سوا کچھ نہ ملا
جگمگاتے ہوئے تاروں کی تمنا کی تھی
چند سہمے ہوئے سایوں کے سوا کچھ نہ ملا

میں نے موہوم امیدوں کی پناہیں ڈھونڈیں
شدت یاس میں مبہم سا اشارا نہ ملا
ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سہارا نہ ملا
ہائے کس وحشت بلاخیز میں راہیں ڈھونڈیں

یاس اور بیزاری کے پہلو میں بھی ایک جذبۂ طلب ہے، بغاوت کی شورش ہے جس سے ایک پیغام عمل پیدا ہوتا ہے:۔

زد پہ آندھی کی دیا کانپ رہا ہو جیسے
آخری عہد وفا ہانپ رہا ہو جیسے
تھک کر افسردہ و ویران گذرگاہوں میں
اور یہ آنسو ہے کہ پلکوں سے ڈھلکتا بھی نہیں
ہائے یہ ساغر لبریز چھلکتا بھی نہیں

کوئی تعمیر بغیر تخریب کے ممکن نہیں۔ لوگ اسے بہت ہی فتنہ انگیز نظریہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ ہر روز کی زندگی میں یہ نظریہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔

کسی نظام نو کی بنیاد قدیم سے بغاوت کئے بغیر قائم نہیں ہوتی۔ لوگ اسے بھی بہت ہی شر انگیز نظریہ قرار دیتے ہیں لیکن ہر روز کی زندگی میں اس کی صداقت عیاں ہے۔ موجودہ حالات سے بیزاری اور نفرت کا جو پہلو ادا بدایونی کے کلام میں نمایاں ہے اس کی توضیح ان ہی "فتنہ انگیز" نظریات سے ہوتی ہے۔ وہ خود اپنی بیزاری اور یاس کے ہر نقش پر امید، آرزو اور ارادہ کی ضرب لگاتی ہیں۔ مثلاً فرماتی ہیں کہ:۔

راستہ ان تلووں کی معصوم لگا ہی بھی نہیں

ظلمتِ دشت میں بھٹکا ہوا راہی بھی نہیں
رات کے سینے میں ارمانِ سحر سو بھی چکا
بے وفا راہوں میں پیمانِ سفر کھو بھی چکا
وقت کے ہاتھ میں یادوں کا دیا بھی نہ رہا
ریت کے ماتھے پہ نقشِ کفِ پا بھی نہ رہا

اور خود ہی اس طلسمِ یاس کو یوں توڑتی ہیں :-

حوصلے اور نئی شمعیں جلائیں گے ابھی
نئے راہی، نئی منزل، نیا سامانِ سفر
نئے پیمان، نئے عزم، نئی شانِ سفر
ظلم پروردہ تمناؤں کی شہ پائے ہوئے
سر اٹھائے ہوئے، بپھرے ہوئے، تھرائے ہوئے
زخم کھائے ہوئے، کچلے ہوئے، ٹھکرائے ہوئے
یعنی ہر گام پہ منزل کی قسم کھائے ہوئے
قافلے اور اسی راہ سے آئیں گے ابھی!

پھر فرماتی ہیں :-

زمیں پہ شعلہ باریاں، فلک پہ گڑگڑاہٹیں
کہ سن رہے ہیں چشم و دل نظامِ نو کی آہٹیں
بہار بیت ہی چکی خزاں بھی بیت جائے گی
مگر میں ایک سوچ میں پڑی ہوئی ہوں آج بھی
وہ میری آرزو کی ناؤ کھے سکے گا یا نہیں
نظامِ نو بھی مجھ کو ساز دے سکے گا یا نہیں

لیکن نظامِ نو تو شاعرہ کو اس کا ساز دے چکا اور اسی کی آواز ہم ان اوراق میں سن رہے ہیں خود وہ تسلیم کرتی ہیں کہ :-

افق کے پار ستاروں کی خوابگاہوں میں   فسوں بدوش نظارے بلا رہے ہیں مجھے

جس طرح آدا بدایونی نے ان "فسوں بدوش نظاروں" کی دعوت قبول کر لی ہے۔ اے کاش کہ ہندوستان کی اور بھی لاتعداد خواتین "افق کے پار ستاروں کی خوابگاہوں" پر اپنے افکار کی کمند پھینک سکیں۔ اور آنے والے نظامِ نو کے جدید ادب کی صفوں میں ہم انھیں کہتے ہیں کہ :-

یہ مرے دل کو خیال آتا ہے
زندگی کیوں فقط اک آہِ مسلسل ہی رہے
کیوں نہ بیدار کروں وہ نغمے
وقت بھی سن کے جنھیں تھم جائے
ریگزاروں میں یہ بہتا ہوا خوں

موت کے سائے تلے سسکیاں بھرتی ہے حیات
اس امنڈتے ہوئے طوفاں سے کنارا کر لوں
یہ سسکتی ہوئی لاشیں یہ حیاتِ مردہ
یہ جبینیں جنھیں سجدوں سے نہیں ہے فرصت
یہ امنگیں جنھیں فاقوں نے کچل ڈالا ہے
یہ بلکتی ہوئی روحیں، یہ تڑپتے ہوئے دل
یہ ترستی ہوئی نظریں، یہ ڈھلکتے ہوئے اشک

ان ڈھلکتے ہوئے اشکوں کو چرا کر میں بھی
اپنے ایوانِ تصور میں چراغاں کر لوں

شاعرہ نے اس رنگ میں جو کچھ بھی کہا ہے اس میں قدیم اور فرسودہ نظامِ زندگی کے خلاف بغاوت کا ایک بے پناہ جذبہ کارفرما ہے ــــ ان کی آواز سراپا طلب اور احتجاج ہے۔ ان کے اندازِ بیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی مترشح ہے جس کے بغیر ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہو سکتا۔

عہدِ جدید کی گود میں ہر اس معمار کے لئے ایک جگہ موجود ہے جو شعر و سخن کو محض فن کاری کے دائرے سے باہر لے جا کر عوام کی زندگی کے وسیع تر میدانوں میں حقوقِ انسانیت کے مطالبہ کی آواز بنا دے۔ ہم اب اس منزل سے بہت دور نکل چکے ہیں جہاں اس موضوع پر بحث ہوا کرتی تھی کہ آیا صحیح نظریہ ادب برائے ادب ہے یا ادب برائے زندگی۔ شاعری حسن کاری اب بھی اپنا مقام رکھتی ہے اور کمالِ فن کا اب بھی ایک معیار قائم ہے۔ لیکن زمانہ کے تقاضوں نے جن شعراء کو جدید ادب کی طرف مائل کر دیا ہے۔ وہی ان تقاضوں کی صحیح تعمیل کر رہے ہیں۔ اس عہدِ حیات میں حُسن کاری اور آرٹ کا جو صحیح مقام ہے اسے خود علامہ اقبالؔ نے اپنے صرف ایک ہی مصرع میں بیان کر دیا تھا ؎

شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر!

اقوامِ عالم کی زندگی میں "شمشیر و سناں" اور "طاؤس و رباب" کی تقسیم زندگی کے ہر شعبہ میں ایک لازوال قانون ہے۔ ہمارا جدید ادب "طاؤس و رباب" کی منزل کو پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ اور رزمِ زندگی کے دائرے میں وہ قدیم

فن اور حسن کاری کے نقطۂ نظر سے گذر کر پھر زندگی کے ان واجبات کو پکار رہا ہے جن کو اقبال کی اشاریت نے "شمشیر و سناں" کے نام سے موسوم کیا تھا۔ جدید ادب کے اس چھوٹے سے مگر تیز گام قافلہ میں جب کسی نئے مسافر کا اضافہ ہوتا ہے تو میں اس مسافر کو فن اور قواعد کی ترازو میں تولنے کی بجائے اس طرح اس کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ یہ ایک اور بلاکوش اور بلاکش محفلِ رنداں میں آیا جو زندگی کے نئے ساز پر نئے گیت گاتا ہے۔

محترمہ ادا بدایونی کے کلام پر میں جو ان چند سطروں کے لکھنے پر آمادہ ہوا تو اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ میری ڈھلکی ہوئی عمر ابھی اتنی نہیں ڈھلکی ہے کہ جدید ادب کی شورش انگیزی کا خیر مقدم بھی نہ کر سکے!!

بقیہ صفحہ ۴۸

بقیہ صفحہ ۴۸

مقام کے کئی اور نقطوں سے اس منظر کو دیکھیے تو وہی منظر ہر بار نیا معلوم ہوگا، جو چیزیں پہلے مقام سے نظر نہیں آتیں اب نظر آنے لگیں گی۔ احتشام حسین صاحب مادی جدلیت کے اس قدر قائل ہیں مگر عملاً ان کی تنقید میں وہ تقابل موجود نہیں جس کے بغیر ترکیب اور امتزاج حاصل نہیں ہو سکتے۔ اندرونی طور پر، یعنی بیانی طور پر نہیں بلکہ ارادی شعوری طور پر ان کے یہاں مثبت اور منفی کا وہ سلسلہ نہیں جو فراق کی تنقیدوں میں ہے لیکن اس امر سے انکار کرنا بڑی ہی بے انصافی ہوگی کہ ان کی تحریر میں بڑا سلجھاؤ ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ ایک ہی نقطۂ نظر کے پابند ہیں، مگر اس نقطۂ نظر سے پرکھتے ہر چیز کو ہیں، کسی پہلو کو وہ تشنہ نہیں چھوڑتے۔ اُن کی تحریر کی ایک بڑی خصوصیت اختصار ہے۔ تفصیلی، تصریحی جملے، مثالیں، جملہ ہائے معترضہ ان کے یہاں کم ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آئندہ وہ اردو کے اعلیٰ ترین نقادوں میں اپنی جگہ بنا لیں گے۔

لیکن اس ساری جدید تنقید میں خامیاں بھی بہت سی ہیں۔ یہ تنقید خواہ کسی مکتب کی ہو، ادب کی ہر صنف کی طرح یورپ اس کے بھی اعصاب پر سوار ہے۔ اس کی بدترین مثال محمد حسن عسکری کی تحریریں ہیں۔ یہ ذہنی قوت ہاضمہ کی کمزوری ہے۔ تقابل کی حد تک اگر یورپ کے تنقیدی نظریوں کو اردو تنقید میں جذب کر لیا جائے تو یہ بڑی کامیابی ہوگی۔ مگر سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ جدید تنقید میں یورپی اثر ابھی طرح جذب نہیں ہو سکا۔ جدید اردو تنقید کے خوشنما صفحے پر جا بجا یورپی تنقید کی نقل بدنما دھبے ہیں۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ہمارے نقادوں نے شاید ان بنیادی یونانی تنقیدی نظریوں کا محنت سے مطالعہ نہیں کیا جن سے مشرق اور مغرب دونوں کے تمدنوں میں ادبی تنقید کی دیواریں اٹھتی ہیں۔ مارکسی نظریۂ تاریخ کی روشنی میں بھی، اور اس کی روشنی کے بغیر بھی اپنی جمالیاتی تنقیدی قدروں کو جانچنا ضروری ہے اور جدید اردو تنقید کے لئے سب سے اہم مسئلہ اور سب سے زیادہ ضرورت ترکیب اور امتزاج کی ہے ✦

ممتاز حسین

شہوانیات اور لاشعور

کے لکھنے والوں کے نام

اگر ہم وقتی طور پر یہ تسلیم کر لیں کہ لاشعور کا دبا ہوا خزانہ اور جنسیات کی پر اسرار گلیاں حقیقت کا ایک جزو ہیں جن کا انکشاف زندگی کے دوسرے جذبات سے کم اہم نہیں تو صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے وہ ہمیں کیا بتانا چاہتے ہیں۔ ان خزانوں کا مصرف کیا ہے۔ پر اسرار گلیوں سے نکلنے کا راستہ کونسا ہے؟ یہ سوال کچھ زیادہ ہوشیاری سے نہیں کیا گیا کیونکہ اس کا جواب بہت ہی آسان ہے۔ فن کار کا کام حقیقتوں کو صرف بے نقاب کرنا ہے۔ جرائم کو پیش کرتے رہنا ہے، اور انھیں جرائم کہنے سے پرہیز کرنا ہے۔ کبھی کبھی آزادیٔ فن کی سرحدوں پہ پہنچ کر میں اس نظریہ سے بہت قریب ہو جاتا ہوں لیکن جو چیز اس وقت بھی میرے ذہن کو چونکاتی ہے وہ تاثرات کا وہ اجتماعی اثر ہے جو فن کار نے پڑھنے والوں کے ذہن و دماغ پر چھوڑا ہے۔ کیا حقیقت اس قدر مختلف رخ کی چیز نہیں کہ اسے کئی ایک پہلو سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا ہر پہلو میں خود فن کار کے خیالات اور تعصبات کی تصویر نہیں جھلکتی ہے؟ یہ ایک ایسی منزل ہے جہاں مجھے کچھ عقائد، ادراک حقیقت کے ایک مخصوص نظریے اور اس کے ماتحت مرتب کئے ہوئے فلسفۂ زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ شاید یہی سمجھوتہ مجھے یہ بات ماننے پر بھی مجبور کرتا ہے کہ ادب انسانیت کی تعلیم کا ایک غیر شعوری آلہ کار ہے۔ اور اسی معنی میں ایک فن کار اس کی روح کا معمار ہے۔ پھر نوع انسانی نفسیات کی تاریخ بھی ایک بدلتی ہوئی سی چیز نظر آتی ہے جس کے تغیر و تبدل میں سماجی اداروں اور ان کی مشینوں کے ڈھالے ہوئے عقائد کو بہت بڑا دخل رہا ہے۔ ادب اسی بدلتی ہوئی نفسیات کی کشمکش، عمل، رد عمل، جراحتوں کے انبار اور تبسم خیال کا آئینہ ہے۔ اگر انسان ہزاروں سال کی پیہم جنگ، مختلف نظام حکومت اور عقائد کے رد و قبول میں اپنے کو اس حد تک نہیں بدل رہا ہے کہ اس کی روح کے تاریک گوشوں میں اجالا ہو جائے۔ اس کی تنہائی اور اداسی کے داغ دھل سکیں۔ اور جنس کے الجھاؤ سے کوئی مستقل قدر اختیار کر لیں تو میں تھوڑی دیر کے لئے سوچنے لگتا ہوں کہ کیا انسان کی چند حیوانی قدریں ایسی بھی ہیں جو ابدالآباد تک قائم رہیں گی۔ اور جب میں ان ازلی قدروں کا قائل ہونے لگتا ہوں تو ادب

اپنا آئینہ اٹھاتا ہے اور ان تقاضوں کی بدلتی ہوئی شکلوں اور ان سے وابستہ جذبات کو مختلف دَور میں مختلف صورتوں میں پیش کرتا ہے۔ یہ صرف تہذیب ہی کی برکت رہی ہے کہ ہم نے معتیں روح کی سرگوشیاں سنائیں۔ محبت کے حسین خوابوں میں بھی انسانیت کی ترنگ کو پیش کیا۔ انسان حیوان سے مختلف بھی ہے۔ وہ نہ سماج کے باہر پیدا ہوا ہے۔ اور نہ سماج سے الگ رہ کر زندہ رہ سکتا ہے۔ زندگی کی تنظیم کا آدرش اس کا پہلا حیاتیاتی فعل ہے۔ اس وقت مجھے اس نراج، واہمہ پرستی، عقل دشمنی، جذبات پرستی، خودکشی، انسانیت پر قہقہہ زنی کے راز بھی سمجھ میں آتے ہیں۔ ایک مخالف سماج کی گود میں پل کر اکثر و بیشتر ہم میں وہ تنظیم اور صبر وضبط کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں جو اسی سماج کو بدلنے کے لئے ضروری ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ اس کے انتشار اور اس کی تخریبی اچھل کود سے ایک گونہ ہمدردی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ کم از کم انفرادیت کی پہنائیوں کا اندازہ تو ہوتا ہے۔ اور اس کرب کی ایک تصویر تو ملتی ہے جو خارجی ٹکراؤ سے داخلی تاثرات میں منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس فراخ دلی کے موقع پر بھی میرا ذہن اس الزام سے خالی نہیں ہوتا ہے کہ وہ علم اور عقل سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ کیونکہ سماجی نظام خارجی طاقتوں کا مظہر ہے۔ اس کا عمل اور اس کا قانون سب خارجی ہیں۔ اور اگر ہم اپنی پوری تنظیم کے ساتھ بالکل شعوری طور پر ان پر اثر انداز نہ ہوئے تو وہ نظام نہ صرف اپنی جگہ پر اٹکا رہے گا بلکہ ہمیں پیچھے بھی لے جا سکتا ہے جو شاید اس سے بھی زیادہ تاریک ہو۔ پھر تو دو ہی راستے ہیں۔ یا تو آگے بڑھئے یا پیچھے لوٹ جانے کی کوشش کیجئے۔ چونکہ ارتقا کے راستے پیچ و خم ہیں اور تاریکی کا دور واپس لایا جا سکتا ہے۔ اس لئے ان پر یہ الزام عاید ہوتا ہے کہ وہ اپنی عقل دشمنی جبلت پرستی اور شکست خوردہ ذہنیت سے آگے بڑھنے والی طاقتوں کو صدمہ پہنچا رہے ہیں۔ یہ بات یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ وہ اپنی شدید قسم کی انفرادیت اور سماج دشمنی کے پروپیگنڈے سے ترقی کے شعور ہی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ سماجی زندگی کی طاقتوں کا وجود قطعی خارجی ہے جو ہماری نیت اور داخلی پیچ و تاب سے بے پروا ہیں۔ اگر ہم اپنے کلیجے سے خون بھی اگل دیں گے اور ان کو بدلنے کی کوشش نہیں کریں گے تو وہ آہنی دیواروں کی طرح مسکراتی رہیں گی۔ لیکن اگر ہم ان طاقتوں کا ساتھ دیں جن کی مدد سے ان پر قابو پایا جا سکتا ہے تو انھیں موم کی طرح اپنی خواہش کے مطابق ڈھال بھی سکتے ہیں۔ حقیقت انہی قوتوں کے استار راگ کا نام ہے جو اپنے باہمی روابط کے ساتھ ہماری نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور ادب میں حقیقت نگاری کا مفہوم صرف اسی قدر ہے کہ ہمارے تجربات اور تاثرات کی تنظیم اسی ادراک حقیقت کے آئینے میں ہوتی رہے

حقیقت نگاری کا تذکرہ یوں چھیڑ دیا کہ مجھے کوتو سبھی افسانہ نگار اپنے کو حقیقت نگار کہتے

ہیں۔ خواہ وہ مسز حجاب امتیاز علی ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ آپ بادام کے درخت اور مہکی ہوئی فضا کو جھٹلا تو سکتے نہیں ہیں۔ پھر ان پر یہ الزام کیوں ہے کہ وہ رومانٹک ہیں۔ شاید اس لئے کہ زندگی کی حقیقتوں کا کوئی مکمل شعور نہیں ہے۔ اور نہ ان باتوں کا تعلق تاریخی قوتوں سے ہے اسی طرح ہمارے وہ افسانہ نگار حضرات جنھوں نے جنسیات کے ابوالہول کو اپنا موضوع بنا لیا ہے انھیں بھی اس بات پر غور کرنا ہے کہ ان حقیقتوں کا تعلق زندگی کی وسیع تر حقیقتوں سے کیا ہے وہ دونوں ایک دوسرے پر کیونکر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور جس اسکول کی وہ پیروی کرتے ہیں اس کا تعلق دنیا کے اور دوسرے علوم سے کیا ہے۔ ان میں کس حد تک صداقت ہے اور ان کی کونسی باتیں قابلِ تردید ہیں۔ یہ علم کی بات ہے۔ اور باوجود اس امر کے کہ علم کا کوئی منتہا نہیں ہے۔ اور اس کی مفروض کلیت قائم نہیں ہو سکی ہے۔ تاہم جس حد تک انسان نے ترقی کی ہے اس نے اپنے تجربوں کے پرکھنے کا ایک خارجی معیار بھی قائم کیا ہے۔ ہمیں اپنے تجربوں کو اسی کی روشنی میں پرکھنا پڑے گا۔ خواہ ہمیں اپنا داخلی انداز نظر کتنا ہی حسین نہ معلوم ہو۔ اس سلسلہ میں جناب فرائڈ کا ذکر کروں گا۔ کیونکہ ابھی ہندوستان میں انھیں کا چرچا ہے۔ اسی کیمیاگر نے اس اعصاب زدہ قوم کو بہت سے مرکبات دے رکھے ہیں۔ جنھیں اٹھتے بیٹھتے ہمارے چند فن کار ناکوں سے سونگھتے اور ہاتھوں سے ٹٹولتے رہتے ہیں۔ یہاں اس کا تو موقع نہیں کہ فرائڈ کے فلسفے کا مکمل تجزیہ کیا جائے اور نہ یہ اثر ہی قائم کرنا مقصود ہے کہ اس کا پورا نظریہ علم النفس غلط ہے۔ اس نے انسانی نفسیات کی بہت سی گتھیوں کے سلجھانے میں مدد کی ہے، مذاہب کے توہمات کی بیخ کنی کی ہے۔ اور شخصیت کے بہت سے امراض کا پتہ چلایا ہے۔ ہم ان چیزوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی نفسیات کے تجزیہ میں مدد لے سکتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس کے بہت سے کلیے غلط ہیں جن کی حیثیت مفروضات سے زیادہ نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ اس نے سماجی طاقتوں کے ان روابط اور عوامل کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جو ہماری نفسیات پر مبہم اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی نظر اس سلسلہ میں بہت ہی محدود تھی کیونکہ جس قسم کے مریضوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ وہ سب کے سب متوسط طبقے کے "اعصاب برباد" مریض تھے۔ جن کے سماجی شعور کو پہلی جنگ عظیم کے حادثات اور اس کے بعد کے اثرات نے بالکل تباہ کر دیا تھا۔ سماجی شعور کے برباد ہو جانے اور تمام اخلاقی قدروں کے متزلزل ہو جانے سے ان میں جنسی لذت کے حاصل کرنے کا ایک شدید جذبہ ابھر آیا تھا۔ کیونکہ جب ماضی برباد ہو چکا ہو اور مستقبل مبہم نظر آئے تو صرف جسم کی لذت کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ روح خود اپنی پراگندگی سے گھبرا کر انھیں لذتوں کا ایک ہیولیٰ بناتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک مریض اس قسم کے اعصابی

تشنج میں مبتلا ہوگا۔ تو اس کے ہذیان و نسیان میں انھیں چیزوں کا اعادہ بھی ہوگا۔ فرائڈ نے ایک مخصوص طبقے کے ذہنی انتشار میں جس طرح Libido کا ہوا کھڑا کیا ہے۔ وہ حیاتیاتی اور سائنٹیفک نظریے سے بالکل غلط ہے اور اس بات کو اب تقریباً پورا یورپ قبول کرچکا ہے۔ فرائڈ کا Libido دراصل بورژوا نظام کے انحطاطی دور کا وہ فرد ہے جو اب رہنمی کردار ہونے کے بجائے صرف بے Phobias ہونے پر اکتفا کرنا چاہتا ہے۔ تین سو سال کی انتھک کوشش، لوٹ اور غارت گری سے وہ اس قدر تھک گیا ہے کہ اسے ہر وہ چیز ناقص، بے معنی اور بے اثر معلوم ہوتی ہے جو ہیجان نفس میں اس [illegible] اور جب وہ اپنے کو اس احساس کے مقابل میں بھی کمزور پاتا ہے تو وہ ایسی تمام حرکتیں کرتا ہے جو رحم میں لوٹ جانے کے مترادف ہوں۔ یہ ایک نفسیاتی منزل ہے جو ایک تاریخی دور کے ایک انحطاطی طبقے کے عطیات ہیں۔ ان کی بنا پر انسانی نفسیات کے جیسے بنا، جبلیات کو زندگی کے تمام محرکات [illegible] نفسیات کو صرف چند امراض اور الجھاؤں میں مقید کر دینا تنگ نظری کا ثبوت ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ فرائڈ کے ساتھیوں اور شاگردوں میں سخت اختلاف رہا۔ اور ابھی تک بورژوا طبقے میں نفسیات کا کوئی ایک نظریہ مرتب نہیں ہو سکا ہے۔ اس کا بنیادی راز یہ ہے کہ [illegible] قطعی داخلی ہے جہاں وہ دماغ کو ایک پراسرار شے سمجھتے ہیں یا پھر اٹھارویں صدی کے مادیین کی طرح اس کا تجزیہ کیمیاوی تحلیل سے کرنا چاہتے ہیں۔ ان مفکرین میں سے کچھ نے یہ حقیقت تو تسلیم کر لی ہے کہ ہم ادراک، جذبات اور عمل کو خانوں میں تقسیم نہیں کر سکتے ہیں۔ بلکہ ان کا عمل ایک کل کی صورت میں ہوتا ہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی ابھی تک دماغ کا مطالعہ سماجی روابط کے توصیفی عمل میں نہیں کیا ہے۔ خارجی حقیقت جس طرح ہمارے دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے اس کے مظاہر میں ایک توصیفی تبدیلی پیدا کرتی رہتی ہے جس کا ادراک بغیر سماجی تجزیہ کے ناممکن ہے۔ اور اگر ہم نے دماغ کو تصویر کے اس چوکھٹے میں رکھ کر اس کا تجزیہ کیا تو ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ فردی نفسیات کے وضع کے ساتھ ایک طبقاتی نفسیات کی بھی وضع ہے جو ایک وسیع دائرے میں اس طبقے کے افراد کے عمل اور تخیل دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ علم النفس کا یہ ایک اہم جزو نہ صرف فرائڈ بلکہ بیشتر مفکرین کے احاطۂ فکر سے باہر ہے۔ کیونکہ وہ صرف افراد کے تصور میں سوچتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ کوتاہی نظر اس قدر مہلک نہیں ہے جس قدر فرائڈ کا یہ کہنا کہ شہوانی طاقت یعنی Libido زندگی کا محرک اول ہے۔ اس نے اپنے اس نظریے کو مضبوط کرنے کے لئے جنگ و جدل کے اسباب کو بھی اسی جذبے کے ماتحت ایذا رسانی کی خواہش تحت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے متعلق مجھے بہت ہی کم کہنا ہے کیونکہ گذشتہ جنگ کے اسباب کا مطالعہ ہم نے بخوبی کیا ہے۔ فرائڈ کو اس سے انکار نہیں ہے کہ انسان نے علم و

ادب میں کافی ترقی کی ہے۔ لیکن اس ترقی کی حیثیت بالکل مکافات کی سی ہے۔ یہ ترغیب جنسی کے نئے پر و بال ہیں۔ جن سے وہ جنسی فتوحات کی کوشش کرتا ہے۔ فرائڈ اس نقطے پر کچھ خاموش سا ہے۔ کہ جب جنسی جذبہ رکاوٹوں سے دوچار ہو کر علمی ادبی کارناموں یا سماجی خدمت میں اپنے کو ارتفع کر لیتا ہے تو اس سے ایک صحت مند شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے یا صرف ایک ثانوی شکل میں شخصیت کی دہری بہتر صورت ہوتی ہے۔ پھر بھی جو چیز بلا واسطہ اس نظریہ کے رو سے ابھرتی ہے وہ جبلتوں کا استیلا ہے۔ جو نا قابل تعبیر ہے کیونکہ تہذیب مکافاتی ادبی صنعتی پیکر ہے۔ ہر انسانی ضمیر اسی مصنوعی تمدن کا ایک پہریدار ہے۔ یہ چیز بھی دریافت کرنے کی ہے۔ آخر وہ پہرے کا فرض اپنی زندگی کی ضرورتوں کے منافی انجام دیتا ہے۔ یا صرف ایک جبری نظام کی بیگار کے طور پر فرائڈ کے نقطۂ نظر سے غالباً وہ بیگار ہی ہے اور یہ ایک ایسی بیگار ہے جس سے بہت سے نفسیاتی امراض بھی پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا نتیجہ کے طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ کامل صحت اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ خواہشات کو بے لاگ تسکین کے مواقع نہ پہنچائے جائیں۔ یا کم از کم اسے اپنی راہ چلنے کی مکمل آزادی نہ ہو۔ اس سلسلہ میں ایک فرد کی آزادی کیونکر دوسرے کی دل آزاری ہو سکتی ہے۔ اس سے اسے واسطہ نہیں کیونکہ یہ ایک انفرادی نظریہ ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک انسان اخلاقیات کو مذاہب اور ٹیبو سب کو توڑتے ہوئے دورِ جبلیت کی طرف لوٹ جانا چاہیئے۔ علم الانسان کے تمام مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کی تاریخ میں کوئی ایسا دور گزرا ہی نہیں ہے اور یہ سوچا جا سکتا ہے جبکہ وہ قبیلہ یا گروہ کی تنظیم سے آزاد رہا ہو اس میں شبہ نہیں کہ جنسیات اور معاش کے مسائل اکثر اس قدر قریب رہے ہیں کہ ایک تہذیب دونوں پر حاوی تھا۔ لیکن اس سے یہ فرض کرنا کہ ان چیزوں کے پیچھے صرف جنسی جذبہ کارفرما تھا بالکل غلط ہے۔ بہرحال فرائڈ نے اپنے اس نظریہ سے یورپ کے بہت سے ادیبوں کو متاثر کیا۔ بالخصوص ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور Gauguin اس سے بہت ہی متاثر ہوئے۔ اور ان دونوں فن کاروں نے اپنی جبلتوں کی بھرپور زندگی حاصل کرنے کے لئے تمدن کی بستیوں سے نکل کر میکسیکو اور تاہائی جزیروں میں سکونت اختیار کر لی۔ ایک بڑی حد تک سومرسٹ بھی فرائڈ ہی کے فلسفے سے متاثر ہے لیکن اس نے رجعت قہقری کے بجائے ترک دنیا کی راہ اختیار کر لی ہے۔ یہ کچھ کم حسنِ اتفاق نہیں ہے کہ اردو کے وہ افسانہ نگار جن کا موضوع کسی نہ کسی شکل میں شہوانیات ہے وہ انہیں دو ادیبوں سے زیادہ متاثر ہیں۔

یہ تو فرائڈ کے فلسفے کا صرف ایک حصہ تھا۔ ابھی اس کا دوسرا جزو باقی ہے۔ جو لاشعور کی دنیا ہے۔ یہ ایک ایسے تودۂ برف کے مانند ہے جو سمندر کی گود میں تہ آب رہتا ہے۔ یہ شعور سے اپنا رشتہ ناطہ توڑ لیتا ہے۔ اور خود اپنی آزاد زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ دراصل ایک دفینہ ہے ان واقعات اور

اور سانحات کا مجموعہ [illegible] نے اپنی زندگی میں جمع کیا ہے۔ اور جس طرح خواب کی دنیا میں [illegible]
[illegible] نئے روپ میں اپنی شکلیں بدل کر آتا ہے اسی طرح اس کی گنجلک بستی میں خواہ مظاہر کتنے ہی
مختلف کیوں نہ ہوں لیکن ان کی تہہ میں صرف ایک ہی قوت کارفرما ہے۔ وہ قوت جنس لاشعور کی
ہے۔ [illegible] کی ہے۔ اور جس طرح خواب کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے بہت سے رموز،
اسمائے اعظم اور ریاضت باطنی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح اس کی مصوری کے سمجھنے میں آپ کو
اتنی ہی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ یہ ایک قسم کا تصوف ہے جس نے سرریلزم کی بنا ڈالی ہے۔ ہربرڈ
ریڈ نے اس کی تعریف حیرت کے نشاۃ ثانیہ سے کی ہے۔ اور فرانسیسی ادیبوں نے محیرالعقول انتشار
کا نام دیا ہے۔ ادب میں اس کا اظہار ایک ایسی بغاوت کی شکل میں رونما ہوتا ہے جہاں ادیب خارجی
دنیا کی یومیہ زندگی سے گھبرا کر لاشعور کے تہہ خانہ میں ڈوب کر شعوری زندگی کو بالکل ہی بھلا دینا چاہتا ہے
اور اس دنیا سے اس حد تک بے نیاز ہو جانا چاہتا ہے کہ وہ اپنے کو بحیثیت معلم، بحیثیت طبیب
بحیثیت سماجی انسان کے بالکل ہی مٹا دینا چاہتا ہے۔ آندرے برٹین نے تو اس کی حمایت میں یہاں
تک کہا ہے کہ ہمارا سب سے پہلا فرض روحانی ورثے کو ختم کر دینا ہے۔ یہ اسی آواز کی صدائے بازگشت
ہے کہ ہماری جبلتوں پر تمدنی اور روحانی ورثے کا بوجھ ہے۔ اور جب تک ہم انھیں ختم نہ کریں گے۔ ہم
اپنی جبلتوں کے حکم کے مطابق زندہ نہیں رہ سکتے۔ فرائیڈ کے کچھ مریدوں نے طبقاتی اور اقتصادی
جنگ کے جواز میں بیماری اور صحت کا نظریہ پیش کرنا چاہا تھا۔ اس نظریہ میں تو زندگی کی کچھ رمق باقی
بھی تھی لیکن سرریلسٹوں نے تو اس واہمے کو بھی ختم کر دینا چاہا ہے۔ ان کی کوئی بھی تصویر مکمل نہیں
ہوتی ہے۔ بلکہ اشیاء کے صرف حصے دکھلائے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت کو مجروح کر کے پیش کرنے کا
نظریہ ہے۔ تاکہ حقیقت سے ہمنوا ہونے کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہو۔ اگر آپ نے [illegible] اجسام
کا یقین کر لیا تو ممکن ہے آپ کا ذہن چارہ جوئی اور علاج کی طرف بھی منعطف ہو۔ اس لئے مکمل انتشار
پیدا کرنے کے لئے ایک کا سر دوسرے کا پاؤں، باورچی خانہ کا جھاڑو، چاند کے سرہانے کچھ اس
طرح رکھا رہتا ہے کہ آپ صرف سیرت کا [illegible]۔ اجسام کی حقیقت اور منطق کو بالائے
طاق رکھ کر، یہ ایک قصاب خانہ کی تصویر ہے جہاں نہ صرف کھال اتار لی جاتی ہے بلکہ مختلف حصول
کو کاٹ کر اس طرح لٹکا دیا جاتا ہے کہ آپ کے دل سے ترحم اور تاسف کا جذبہ بالکل ہی ختم ہو جاتا
ہے۔ اگر آپ کو ضرورت ہے تو اسے خرید یئے ورنہ صرف تماشا دیکھئے۔ یہ ایک شعوری کوشش
ہے حقیقت کو مسمار اور مجروح کر دینے کی تاکہ تنظیم اور انضباط کے تمام تصور ختم ہو جائیں۔ اور چونکہ
اس نے خارجی دنیا سے اپنے تمام روابط ختم کر لئے ہیں اس لئے وہ اس کے زمان و مکان سے
بھی گریز کر کے اپنے کو اس چھوٹی سی اکائی میں بند کر لینا چاہتا ہے جہاں وہ اپنے اس انتشار

کا رشتہ کسی ایسے زمان و مکان سے جوڑنا چاہتا ہے جو "لامکاں وقت" کے تصور سے بہت ہی قریب ہو۔ یہ لامکاں وقت اجرام فلکی کی تخریب و تخلیق کا وہ پیہم سلسلہ ہے جو بالآخر تخریب مسلسل بن کر رہ جاتا ہے۔ اور جس طرح اجزائے عالم کے انتشار میں ایک حیرت کا جذبہ ملتا ہے۔ اسی طرح اس انتشار باطنی کے ساحل پر کھڑے ہو کر آپ جلوۂ حیرت اور حیرتِ جلوہ سے محظوظ ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ قدیم مسئلہ فنا فی البقا سے صرف اس قدر مختلف ہے کہ اسے فنا فی الفنا کہا جا سکتا ہے ؎

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اس نظریے کے کائناتی انتشار سے کسی قدر ماورائی حقیقت کا دھوکہ ہوتا ہے لیکن یہ اس سے بالکل ہی مختلف ہے۔ ماورائی حقیقت نگاری شعور کی سرحدوں سے بلندیوں کی طرف پرواز کرتی ہے۔ یہ ایک نئے حسِ باطنی بلکہ حسِ ششم کی دنیا ہے۔ جہاں انسان کو تمام خارجی تجزیے جھوٹے اور غیر یقینی معلوم ہوتے ہیں۔ یوں تو لاشعور کی دُنیا بھی خارجی دُنیا سے آزاد ہے لیکن اس کا تعلق کسی ماورائی دنیا سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ خارجی دنیا کو فراموش کرنے کے لئے پیہم جنگ کرتی رہتی ہے یہ ایک گمبھیر قسم کی انفرادیت کی دنیا ہے۔ جس کی پہلی اور آخری جنگ سماجی شعور کو ڈھا دینے کی ہے یہاں پر ہر فرد بذاتِ خود ایک ڈوبا ہوا جزیرہ ہے جس کی ہر چیز انجانی ہے۔ اور جس کو پہچاننے کا کوئی خارجی معیار قرار ہی نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا تمام حسن انتشار اور پراگندگی کو حیرت انگیز اشتباہ میں ڈھال دینے میں ہے۔ فن کار کی تمام صلاحیتیں اس جانب مبذول ہوتی ہیں کہ تصورات اور احساسات کو گنجلک کر کے اس طرح پیش کیا جائے کہ پڑھنے والے پر صرف حیرت اور اسرار کا اثر باقی رہ جائے اس قسم کی تمام ادبی تحریکیں خواہ وہ (رمزیت) *Symbolism* ہو، ابہامیت *Obscurantism* ہو، *Existentalism* ہو یا *Surrealism* ہو۔ اپنا فلسفیانہ ناطہ اس اسکول سے رکھتی ہیں جو نہ مادے کو آزاد بالذات تصور کرتا ہے اور نہ سماجی قوتوں کے عمل کو ایک خارجی پیکر دینا چاہتا ہے۔ وہ صرف اپنے ہی احساسات کے ترسلات کی بنا پر مادے کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ یہ لوگ دماغ کو مادے کی تخلیق شدہ چیز نہیں سمجھتے۔ اور نہ یہ تصور ہی کرتے ہیں کہ دماغ کے وجود سے پہلے بھی کائنات رقص کر رہی تھی۔ اور جب تک ہم دماغ کو مادے کا آلہ کار نہیں سمجھیں گے ہم یہ سمجھنے سے قاصر رہیں گے کہ لکھوکھا سال کی انسانی ترقی اور اس کے علم کا ہماری زندگی میں کیا مصرف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر رہیں گے کہ جسے وہ لاشعور کہتے ہیں وہ در اصل ان کے شعور کا ایک حصہ ہے۔ ایک ایسی خارجی حقیقت کا عکس ہے جہاں وہ عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت طبقاتی مراعات کی گرتی ہوئی دیواروں، نئی زندگی کی نئی تنظیم سے بھاگنے کی خواہش، علم کی روشنی میں اپنے جذبات کو مرصع کرنے کی ضرورت سے نہ صرف دست و گریباں ہیں بلکہ دشمنی پر کمربستہ ہیں۔ یہ ایک

شعوری انتشار کی ترتیب شدہ تصویر ہے تاکہ حقیقت کو توڑ مروڑ کے پیش کر کے ارتقا کے راستے میں روڑے اٹکائیں۔ یا اگر ممکن ہو سکے تو اسے دورِ جبلیت میں لے جائیں۔ اردو ادب میں یہ رجحان ابھی اس منزل کو نہیں پہنچا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے بھی ایک گونہ علم اور سر کھپانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اگر فرائیڈ سے دلچسپی بغیر کسی نقد و تمیز کے اسی طرح باقی رہی تو اس رجحان کا سماجی طاقتوں کی صف آرائی میں پیدا ہو جانا بالکل منطقی ہے۔ میں اس سلسلے میں نام لینا بالکل غیر ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کے تجربے ایک نئی چیز کو آزمانے کی صورت میں ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ نے حقیقت کا جائزہ لینا شروع کر دیا ہے۔ کیونکہ زندگی اور موت کے مقابل میں Neurosis اسی طرح ختم ہو جاتی ہے۔ جس طرح ایک پاگل بھی موت کے وقت زندہ رہنے کی تدبیریں سوچنے لگتا ہے آج اردو ادب کے سامنے قدیم اور جدید کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ غزل میں تو ممکن بھی ہے لیکن اردو نثر تو تمام تر ایک نئی سی چیز ہے۔ آج نہ تو کوئی پنڈت رتن ناتھ سرشار اور شرر کی ایسی چیزیں لکھتا ہے اور نہ لکھنا ہی چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں نظریوں کو کھنگالنا اور زندگی اور ادب کے چند بنیادی قدروں پر متفق ہونا ہے۔ ہم دورِ جبلیت میں لوٹنا نہیں چاہتے ہیں۔ ہم ایک بہتر زندگی کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ ہم علم اور سائنس سے منحرف ہو کر صرف اپنے ہی اعصاب پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے مشاہدہ کو صرف جنسیات تک محدود کرنا نہیں چاہتے اور نہ اسے زندگی کی دوسری حقیقتوں سے جدا کر کے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم لاشعور کو اسی خارجی دنیا کا عکس سمجھتے ہیں۔ جس میں زندگی کی تمام ضربتوں کے چرکے ہیں۔ جن کے اسباب خالص مادی ہیں۔ یہ مطالبات بہت زیادہ ہیں تو آئیے صرف ایک ہی نقطے پر متفق ہو جیسے لوئی اراگان نے پیش کیا ہے۔ ادب کا کام اقلیمِ انسانیت کی سرحدوں کو وسیع کرنا ہے کم از کم متفقہ طور پر اسی کو ایک ایسا آلہ بنائیے جس سے ہم حقیقت نگاری کی مختلف راہوں کو ناپ سکیں۔ اور اگر آپ اس سے بھی انکار کریں گے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ کو انسانیت کی بہبودی اور اس کی بقا سے کوئی سروکار نہیں۔ آپ کو خود اپنی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں صرف ایک دلچسپی ہے کہ سوشلسٹ نظام نہ قائم ہو سکے۔ اودھم مچاؤ، انتشار پیدا کرو اور تمام ترقی پسند ادب کو پروپیگنڈا بناؤ۔ یہاں سے یہ خطاب بھی ختم ہو جاتا ہے۔

نہ تو لاشعور اور نہ لاشعور نگاری ان دونوں میں سے کوئی بھی نئی چیز نہیں ہے۔ دنیا کا ہر بڑا ادیب اسے اپنے ادب میں جگہ دیتا رہا ہے۔ مارلو، شیکسپیئر، گوئٹے، داستووسکی، غالب اور پریم چند سب کی نگارشات میں اس کی کارفرمائیاں موجود ہیں۔ لاشعور نہ تو شعوریات

Shock observer کی تاریخ ہے اور نہ تاراج کا فلسفہ ہے یہ صرف خارجی دنیا کا ہو، یہ اس سے زیادہ بھی ہے، یہ نئی امنگوں اور نئے ولولوں کی خواب گاہ بھی ہے۔ یہ صرف ماضی کا دفینہ ہی نہیں بلکہ مستقبل کی کروٹ سے ہمکنار بھی ہے۔ یہ ہمارے شعور کا ایک حصہ بھی ہے۔ جو اپنے امراض کو دوائی اور پربت دونوں ہی میں بدل سکتا ہے۔ یہ جہاں شکست کھا کر زمان و مکان کی سرحدوں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا ہے وہاں یہ خارجی دنیا میں انقلاب برپا کرنے کی تدبیریں بھی سوچتا ہے۔ یہ کیونکر اور کیوں اپنے گرد تانا بنتا ہے۔ اس کا دارومدار صرف ہمارے شعور پر ہے۔ اگر ہم سماج دشمن اور انسان بیزار ہیں تو یہ خودکشی اور نراج کی حیرت میں کھو یا رہے گا۔ اگر اس زندگی میں صرف عورتوں کی ضرورت ہے یا عورتوں کو مردوں کی تو یہ صرف انہی رشتوں کو تازہ کرتا رہے گا۔ لیکن اگر زندگی کی اور حقیقتیں بھی ہمارے شعور کا جزو ہیں تو وہ لاشعور میں پلتی رہیں گی۔

ادب میں لاشعور کا درجہ صرف اسی حد تک ہے کہ یہ انسان کی روح میں اترنے کا ایک زینہ ہے۔ اور دماغ کی ان رگوں کے ٹٹولنے کا ہتھیار ہے جو مخالف ماحول کے تصادم سے مردہ اور بے جان ہو چکی ہیں۔ اس کی تنہائی اداسی، آرزوئے موت اور اعصابی امراض میں ایک ظالم سماج کا صدیوں سے ہاتھ رہا ہے۔ جس کے تخلیقی امکانات بالکل ہی ختم ہو چکے ہیں۔ سرمایہ داری نے فرد کا تصور تو ضرور عطا کیا لیکن اس سے تخلیقی قوتوں کے امکانات سلب کر لئے۔ یہ مردہ دلی یہ انتشار ماورائی نہیں اور نہ کائناتی انتشار کے سبب سے ہے بلکہ سرمایہ داری کے عطیات ہیں جن کے خلاف آج ہمارے لاشعور میں قہر و جلال کی چنگاری سلگ رہی ہے۔ اس چنگاری کو شعلے کی طرح بھڑکانا اسی لاشعور کا کام ہے۔ وہ تمام خارجی تصادم جن سے ہماری شخصیت میں صد ہزار رکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں۔ ان سے نہ صرف شکست زیست کا جذبہ پیدا ہوا ہے بلکہ انقلاب کا شعور بھی جاگا ہے۔ گورکی نے اسی لاشعور کا پتہ چلایا ہے۔ اس حقیقت کا شعور اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس حقیقت کو اپنے سینے میں جگہ نہ دی جائے۔ کہ ہم میں سے کسی ایک فرد کی شخصیت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی ہے جبکہ دنیا میں کوئی ایک فرد بھی آواز اٹھاتا رہے گا کہ مجھ سے میرے تخلیقی امکانات چھین لئے گئے ہیں۔ یہ ایک آدرش ضرور ہے لیکن کسی بھی ادیب کا سینہ اس وقت ہلکا نہیں ہو سکتا جب تک یہ آدرش پورا نہ ہو جائے۔ یہ آدرش کوئی مجرد تصور نہیں بلکہ ایک اضافی شے ہے جس کی سرحدیں بڑھتی اور گھٹتی رہیں گی۔ آنے والی نسلوں کے لئے ہماری بے اتفاقی یا غیر شعوری جنبہ داری چھپی نہ رہے گی۔ آج ہر لکھنے والا لاشعور

اور شہوانیات کے لکھنے والوں سے پوچھتا ہے "میرے ننھے ادیب بتا تو مجھے کیا سنانا چاہتا ہے"

لکھنے والا جواب دیتا ہے "یہ زندگی پُراسرار ہے، شہوانی جذبات کا جنجال ہے ہر فرد اکیلا اور نراش ہے۔ موت کا خوف ابدی ہے اس لئے زندگی سے بھی خوف معلوم ہوتا ہے"

"میرے ننھے ادیب اس سے تو زندگی کی خوفناکی اور بھی بڑھتی ہے، میں نے کسی بھی انسانی جسم میں تیرے ہاتھوں کو سرخ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مجھے خطرہ ہے کہیں تو انسانی سرحدوں سے باہر کا رہنے والا تو نہیں"

"میرے حقیر انسان، یہ انسان کا تمدن، اس کا ادب، اس کی کوششیں سب بیکار ہیں۔ مجھے ہر چیز سے نفرت ہے۔ میں تو صرف رحم مادر میں لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ تو میری یہ خواہش اور انتشار تو دیکھ، اس کی عظمت اور حیثیت کا اندازہ کر، نادیدہ ستاروں کا یہ اڑتا ہوا جال ہے۔ کہکشاں کی ڈالیوں کا ایک منجمد فوارہ ہے، یہ پہلے انسان کا ان سنا ہوا افسانہ ہے"

"اچھا میں سمجھا تم تصور کو آسمانوں سے اتار لائے ہو جس کی منطق کا جادو سالہا سال سے ہمیں اپنے جال میں گھیرے ہوئے تھا۔ لیکن تمہارے اس تصوف میں تو کوئی منطقی نظام بھی نہیں ہے۔ تم ہندوستان کے قحط، خونریزی اور غلامی کے کیا اسباب بتاتے ہو؟"

"[illegible] کی داستان ہے پیارے۔ ابھی یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی ہے کیونکہ ہمارا پیچیدہ علم نہیں ہوا ہے۔ یہ تمام چیزیں حتیٰ کہ دنیا کے بڑے انقلابات بھی صرف نفسیاتی امراض کے مظاہر تھے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے خول میں گھس جاتا ہے اور زور زور سے چلاتا ہے "مجھ میں صحت کے انجکشن نہ دو میں نفسیاتی امراض کا شکار ہوں۔ یہی امراض میرے حصار کی دیواریں ہیں۔ جہاں سے میں ترقی کرنے والی قوتوں کے خلاف جنگ کرتا ہوں۔ مارکس اور اینگلز پمفلٹ باز تھے سیاسی اخبارات پڑھنے کی بجائے ننگی تصویریں دیکھو۔ اور ایک فاشسٹ اخبار کے کالم نگار بن جاؤ۔

ظہیر کاشمیری

ادب اور فسادات

فسادات کا پس منظر برلن پر سرخ پرچم لہرایا، اور دوسری عالمگیر جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔ اس وقت ملک ملک میں عوامی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ فاشی محور ٹوٹ چکا تھا۔ فرانس میں جمہوریت پسند آگے بڑھ رہے تھے۔ انڈونیشیا، اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے عوامی طاقتیں بروئے کار لا رہا تھا۔ ہندوستان میں ملک گیر ہڑتالیں، جہازیوں کی مسلح بغاوت اور اسی قسم کے سینکڑوں دیگر مظاہرے وجود میں آرہے تھے ...... امریکہ اور برطانیہ جن کی بنیادیں ہی سیاسی بے انصافی اور اقتصادی اجارہ داری پر استوار تھیں۔ اس عالمگیر عوامی طوفان سے بچنے کی تدبیریں سوچنے لگے، امریکہ نے جنگ کے مارے قلاش ملکوں میں روپیہ لگا کر جنگی اور سیاسی نوعیت کے اڈوں کا اجارہ دار بننا شروع کر دیا۔ اور رجعت پسندانہ نعرے دیکر ملکوں اور قوموں میں نفاق پھیلا دیا۔ برطانیہ میں اگرچہ لیبر گورنمنٹ برسرِ اقتدار آچکی تھی۔ اس کے باوجود اس کی خارجی پالیسی میں کوئی انقلابی تبدیلی رونما نہ ہوسکی۔ اس کی خارجی پالیسی امریکہ کی خارجی پالیسی کے عین مطابق تھی۔ دونوں نے مصر سے سیاسی اقتدار کے لئے اقتصادی اور اعصابی جنگ چھیڑ دی۔ صیہونی آبادکاروں کے مسئلہ پر شرقِ وسطیٰ کو جنگ کا اکھاڑا بنانا چاہا۔ چین میں چیانگ کی سرگرمیاں کمیونسٹوں کے خلاف تیز تر ہوگئیں۔ اقتصادی طور پر دیوالیہ ہونے کے باعث برطانیہ مجبور تھا کہ ہندوستان کو آزاد کر دے۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے اس نے یہاں کے باشندوں میں مذہبی تشدد اور باہمی خونریزی کی تحریکوں کو فروغ دیا۔ تاکہ پاکستان اور انڈین یونین سالہا سال تک اسی خون خرابے میں منہمک رہیں۔ انہیں تعمیری اور دفاعی کاموں کا موقعہ ہی نہ مل سکے۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے نیویارک اور لندن کے تاجروں کی سیاست کا آلۂ کار بن کر رہ جائیں۔

کلکتہ، نواکھالی، بہار، پنجاب اور یوپی کے فسادات اسی طے شدہ پالیسی کا نتیجہ تھے کشمیر اور جوناگڑھ کی گتھیاں آرام سے سلجھائی جاسکتی تھیں۔ لیکن برطانوی اور امریکی اثرات جو آج بھی انڈین یونین اور پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں ایسا نہیں چاہتے تھے ان کا منشا تھا کہ یہ برعظیم چین بن جائے بلقان بن جائے ہمارے معصوم بچوں کی لاشیں ہنڈیوں سے ہماری بہو بیٹیوں کی کٹی ہوئی چھاتیوں سے ہمارے باپوں اور ماؤں کی ادھ جلی لاشوں سے

استعمار پرست ملک اپنی سیاست اور تجارت کو فروغ دے رہے ہیں۔

فسادات اور ادب دکنی ریاستوں کے زمانۂ عروج سے انیسویں صدی کے نصف تک اردو ادب اگرچہ جاگیری کیرکٹر کا حامل رہا، اس کے باوجود میر سودا، مومن اور غالب جیسے عظیم فن کاروں نے ایسے شاہکار بھی پیش کئے، جو غیر عملی فکر کی بجائے زندگی کی صداقتوں کا اظہار کرتے تھے۔ جن سے انسان کے عمومی احساس کی ترجمانی ہوتی تھی اور جو پس ماندہ لوگوں کی آسوں اور پیاسوں کے متعلق تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہمارا ادب یکسر تعمیری ہو گیا۔ مغربی تعلیم کے نظریئے ناولوں شعروں اور افسانوں پر چھا گئے پہلی عالمگیر جنگ کے بعد ہمارے ادب میں بین الاقوامی رجحان پیدا ہوئے مخالف سامراجی جذبہ شدید تر ہوتا گیا اور انسانیت پرستی کی قدریں عام ہو گئیں ۱۹۳۵ء سے دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمہ تک ہمارے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دیگر فن کاروں نے اعلانیہ عوامی تحریکوں کی حمایت کی، کسانوں اور مزدوروں سے رشتہ جوڑا۔ اپنے ملک کی داخلی پیچیدگیوں کو آفاق گیر زاویوں سے دیکھا۔ اور جمہوریت پرستی اور انسان دوستی کا پرچار کیا ——— مختصر یہ کہ اردو ادب کے صانع اور نقیب، آج تک عظیم آدرشوں کی تعمیر کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے کٹھن سے کٹھن موقعوں پر بھی تعاق مذہبی تشدد، بدنی اور ذہنی غلامی کے خلاف جہاد جاری رکھا اور عالمگیر احساسات کا تذکرہ کیا ——— لیکن فسادات نے ہمارے گذشتہ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے مرتب کردہ دستور و قانون کو یکسر توڑ ڈالا ہے۔ فسادات اور تشدد کی بڑھتی ہوئی روز بروز انڈین یونین اور پاکستان میں ایسی فضا کو جنم دے رہی ہے، جس میں فرقہ پرست، تنگ نظر اور انسانیت دشمن، رجحانات ترقی کر سکیں، جمہوریت پسند، اخبار و رسائل بھی، کچھ حالات سے فائدہ اٹھانے کے لئے اور کچھ بامر مجبوری ایسا انداز اختیار کرنے لگ گئے۔ جس سے اشتعال پسندی اور مذہبی و نسلی عصبیت کو فروغ ملے۔ انڈین یونین اور پاکستان کے وہ نووارد شاعر اور ادیب جن کا فکر اور اسلوب ابھی ناپختہ تھا۔ اس جمہوریت کش، اندھے ریلے میں بہنے لگ گئے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات نے قاری اور ادیب دونوں کے ذہنوں پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ دونوں یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ انڈین یونین اور پاکستان بن جانے پر ادب کے ثقافتی سرمائے کا بٹوارا بھی کیا جا سکتا ہے، انھیں یہ بھول گیا ہے۔ کہ کسی دو ریاستوں میں کوئی پہلو مشترک بھی ہو سکتا ہے۔ جس طرح عربوں اور جاپانیوں میں جغرافیائی تمدنی، لسانی اور نسلی اختلافات ہونے کے باوجود مساوی [illegible] کا پہلو مشترک ہے۔ اسی طرح پاکستان اور انڈین یونین میں ہزاروں اختلافی پہلوؤں کے باوجود کوئی سانجھا کیرکٹر بھی ہو سکتا ہے۔ اور لہٰذا اردو زبان کی گذشتہ روایتیں، زمین، ریڈیو ٹرانسمیشن اور فوجی طاقت کی طرح تقسیم نہیں کی جا سکتیں۔ آج دہلی میں اقبال کی تصویر پہ پھول نہیں چڑھائے جاتے

اور لاہور میں پریم چند اجنبی بنا ہوا ہے۔ اقبال، پیکن سے پیرو تک کے مسائل سوچنے والا شخص پاکستان کی ملکیت نہیں۔ وہ سب انسانوں کا ہے۔ کیونکہ اس کا انداز فکر علاقائی نہیں بلکہ آفاقی ہے۔ پریم چند انڈین یونین کا نہیں۔ وہ راس کماری سے لیکر گلگت کی برفانی چوٹیوں تک کے ان تمام پس ماندہ عوام کا ہے۔ جن کے حقوق کی حفاظت کے لئے وہ تمام عمر جہاد کرتا رہا —— میر، غالب، سرشار پریم چند۔ وغیرہم، یہ انڈین یونین اور پاکستان دونوں کے ہیرو ہیں۔ انہیں کی روایتوں پر آج ہم دو عظیم الشان ریاستیں تعمیر کر رہے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات نے زبان کے تشکیلی عمل کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ وہ زبان جسے ہندوستان کے تمام فرقوں، گروہوں، مذہبوں اور جماعتوں نے صدہا سال کی مسلسل محنت سے مل کر تعمیر کیا تھا آج خود اس کی تخریب کر رہے ہیں۔ انڈین یونین میں زبان کو شدھ کرنے کی تحریکیں جاری ہیں سلیس برجستہ اور فصیح محاروں کی جگہ پراچین بھارت کی مردہ بانیوں کو زندہ کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں زبان کے ڈانڈے عرب سے ملائے جا رہے ہیں۔ آسان اور ستھرے ستھرے جملوں کی جگہ کھردرے اور ثقیل جملے استعمال ہونے لگے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات نے ادب کے ساتھ تعلیمی اداروں کو بھی مفلوج کر دیا ہے۔ جو اقلیتیں بنوکِ شمشیر ایک مملکت سے دوسری مملکت میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوئیں۔ ان کے تعلیمی ادارے عملی طور تباہ ہو گئے ہیں، یو پی، دہلی اور مشرقی پنجاب کے اسلامی ادارے قریباً قریباً ختم ہو چکے ہیں۔ اور مغربی پنجاب کے غیر مسلم تعلیمی اداروں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ درسگاہیں جہاں آج سے کچھ عرصہ پہلے بلند فکری، امن پسندی اور تعمیری کاموں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہاں اب زخمی تباہ حال اور بے یار و مددگار مہاجرین کے خیمے نصب ہیں۔ یہ بدنصیب ان درسگاہوں کی بلند بالکونیوں اور عریض محرابوں کو خندۂ حقارت سے دیکھ کر جی میں کہتے ہوں گے، یہی وہ تربیت گاہیں ہیں۔ جنہوں نے انسانوں کی بجائے قاتل پیدا کئے۔ جنہوں نے معاشرت اور کلچر کو تباہ کرنے کی تعلیم دی، جنہوں نے تشدد اور لاقانونی کا پرچار کرنے والے انارکسٹ پیدا کئے۔

اس خونی خلفشار نے انڈین یونین اور پاکستان کے پوسٹل سسٹم، ٹیلیگراف سسٹم اور ریلوے کو کافی حد تک ناکارہ بنا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے چوٹی کے اخبار و رسائل یا تو بالکل بند ہو گئے ہیں یا ان کی اشاعت برائے نام رہ گئی ہے۔ وہ کتابیں جو آج سے کچھ عرصہ پہلے سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں بک جاتی تھیں۔ یا تو الماریوں میں بند پڑی ہیں۔ اور یا تنبولیوں، پنساریوں کے ہاں ورق ورق ہو چکی ہیں...... آج لاہور کے بازاروں میں ایڈگر سنو کی کتاب RED STAR OVER CHINA کا مجلد ایڈیشن ۱۰ر میں مل سکتا ہے۔ اور دہلی میں شولوخوف کا ناول AND QUIET

THE DON FLOWS ندی کے بہاؤ .... اس ادبی کساد بازاری نے اشاعتی اداروں اور قلمکاروں دونوں پر بڑا ناگوار اثر ڈالا ہے۔ دونوں اقتصادی بدحالی کا شکار ہو رہے ہیں اور اس طرح رفتار ادب دن بدن مدھم ہوتی جا رہی ہے — جس ادیب کو لذیذ ناشتہ نہ ملے وہ قند و نبات فقرے نہیں لکھ سکتا۔

فسادات کے باعث دس لاکھ سے زائد انسان موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ قریباً ایک کروڑ انسان، اپنا گھر، اپنا وطن، اپنے ہل، اپنے کھیت، کارخانے دکانیں —— اپنی اپنی زندگی کا سارا اثاثہ گنوا کر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اس ناقابل تلافی نقصان اور عظیم ہجرت نے معاش کی بنیادیں ہلا دیں اور سینکڑوں نئے سماجی مسائل پیدا کر دئے ہیں ان نئے مسائل سے نپٹنے کیلئے ہر ادیب، شاعر اور صحافی کو نئی سوجھ بوجھ، صلاحیت اور نئے تجزیے سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ آج ہر مصنف کے لئے ایسے ایسے عجیب موضوع پیدا ہو چکے ہیں جن کا اسے کبھی خیال تک نہ گزرا تھا۔ مثلاً کسی اقلیت کی لڑکی اغوا کر لی جاتی ہے۔ بے آبرو ہو جانے کے بعد اسے واپس لایا جاتا ہے۔ تو اس ضمن میں ہر ایک ادیب اور شاعر کا فرض ہے کہ وہ اپنے ادب و شعر کی وساطت سے اس کے حقوق کی حفاظت کے لئے جنگ کرے۔ اس کی آبرو کی حمایت پر معاشرے کو آمادہ کرے اور اس کا کھویا ہوا معاشرتی درجہ اسے واپس دلوائے۔

اس انسانی قطع و برید نے ہزاروں نوجوانوں کو بدنی طور پر ناکارہ کر دیا ہے اور کئی بوڑھے باپوں کے جوان بیٹے ان کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دئے ہیں۔ ادیبوں، شاعروں اور دیگر انشاء پردازوں کا فرض ہے۔ کہ وہ ان بے سہارا اور ناکارہ انسانوں کی مدد کے لئے اپنی متعلقہ ریاستوں سے مستقل پنشنوں کا انتظام کروائیں۔

سینکڑوں نئی دلہنیں جن کے سہاگ کے پھول ابھی تک مرجھائے نہ تھے۔ ناگہانی طور پہ بیوہ ہو گئی ہیں۔ اصحاب قلم کا فرض ہے کہ وہ انھیں سماج کا ایک ناگزیر حصہ بنانے کے لئے جدوجہد کریں۔ انڈین یونین کے ادیبوں کو خاص طور پر اس موضوع کو اپنانا چاہئے۔ کیونکہ وہاں کئی طبقے ابھی تک ودھوا بیاہ کے مخالف ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کا قطعی حل ڈھونڈھنے کے بعد بھی عوام سے اگر بھوک بیماری اور مصیبت دور نہ ہو سکے تو انڈین یونین اور پاکستان کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا فرض ہے کہ وہ پامردی اور جگرداری سے ذاتی جاگیروں اور ذاتی صنعتی اداروں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں کیونکہ یہی ایک آخری طریقہ ہے جس سے ڈومینیوں کے عوام، امن اور خوشحالی کی دولتوں سے مالا مال ہو سکتے ہیں پاکستان اور انڈین یونین کے بعض چھوٹے دماغ اس مذہبی پاگل پن کو انقلاب کے نام سے تعبیر کر رہے

ہیں۔ تمام باشعور ادیبوں اور شاعروں کو چاہیے کہ وہ شعروں، افسانوں اور ڈراموں کے ذریعے انہیں سمجھائیں کہ یہ انقلاب نہیں، عکس انقلاب ہے۔ منزل نہیں فریب منزل ہے ——— انقلاب کی تہ میں مبسوط لائحہ عمل ہوتا ہے۔ انقلاب کا طوفان حکومتی جماعتوں کے خلاف اٹھتا ہے، لاقانونی مذہبی دیوانگی، ہمسایہ دشمنی اور وحشیانہ قتل عام کو انقلاب نہیں کہا جا سکتا۔

فسادات کی وجہ سے انڈین یونین اور پاکستان کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے فرائض بہت بڑھ گئے ہیں۔ آج انہیں۔ تاریکی، تشدد اور رجعت پسندی کے بڑھتے ہوئے ریلے کا پوری تندی سے مقابلہ کرنا ہے۔ کتابوں، رسالوں، میگزینوں کے ذریعے اپنی اپنی مملکت میں جمہوری رجحان کو تقویت بخشنا ہے۔ اپنی اپنی ریاستوں میں بلند اور صالح فکر کا پرچار کرنا ہے۔ قلم اور سنان کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے، عوام دشمنوں کو فیصلہ کن شکست دینا ہے۔

حال ہی میں روس کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے دخضوسکی، ایونو، کے۔ فیڈن، اور ایلیا اہرن برگ کے دستخطوں سے ایک کھلی چٹھی امریکہ کے ادیبوں اور فنکاروں کے نام بھیجی ہے۔ یہ چٹھی معنوی اعتبار سے صرف امریکہ کے قلم کاروں کے لئے ہی مخصوص نہیں بلکہ دنیا کے تمام ترقی پسند انشاء پردازوں، شاعروں اور صحافیوں کے نام ہے اس میں درج ہے :-

"ادیب اور شاعر تہذیب کے خالق ہیں، قوم کا ضمیر ہیں۔ وہ ایسے نازک موقع پر کیسے خاموش رہ سکتے ہیں جبکہ دوسری عالمگیر جنگ کو ختم ہوئے بظاہر دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن کسی دوسرے رنگ میں جنگ پھر بھی جاری ہے دو سال ادھر، سب طاقتوں نے جنگ اور خونریزی بند کرنے کے عہد ناموں پر دستخط کئے تھے لیکن اس کے باوجود دنیا کے مختلف کونوں میں آج بھی جوانوں، بچوں اور عورتوں کا خون بہایا جا رہا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ بدنصیب، یونان، انڈونیشیا یا چین میں پیدا ہوئے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس قتل و غارتگری کی زیادہ ذمہ داری ان طاقتوں پر عائد ہوتی ہے جو عوام کے نام کا غلط استعمال کر کے اپنے فاشی مقاصد کی تکمیل میں لگی ہوئی ہیں۔ ادیب اور آرٹسٹ تہذیب کے نامحرم ہیں پولیس کی سختیاں، کوڑے، دولت اور اس قسم کی کوئی چیز بھی انہیں سچ کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ دنیا بھر کے عوام کتابوں، رسالوں میگزینوں، تھیٹروں اور سنیماؤں کے ذریعے ان صحیح انسانوں کی آواز سننے کے لئے بیتاب ہیں جنہوں نے دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں ترقی پسند طاقتوں کی حمایت میں آواز اٹھائی اور جنہوں نے جنگ سے پہلے جبکہ تمام دنیا فاشیوں اور انسان دشمن، رہنماؤں کے اعلانوں اور نعروں سے گونج رہی تھی، گورکی کے سوال — "تہذیب کے خالقو تم کس کے ساتھ ہو؟" — کا جواب دیا۔ اور تمام عارضی جغرافیائی سرحدیں توڑتے ہوئے اس کی طرف اپنے بازو پھیلا دیئے۔

"دنیا کے بہترین لکھنے والوں نے ہمیشہ اس تحریک کے خلاف آواز اٹھائی۔ جو انسانی خوشحالی اور عوامی زندگی کے خلاف ہو۔ انہوں نے اپنے ملک یا دوسرے ملکوں کی رجعت پسندی کو ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھا۔ ایمل زولا نے "میں تمہیں مجرم قرار دیتا ہوں" کے عنوان سے فرانس کے رجعت پسند فوجی عناصر کی تکذیب کی۔ اسی طرح ٹالسٹائی نے "میں خاموش نہیں رہ سکتا" کے عنوان سے روسی رجعت پسندوں کی شدید مذمت کی" ———

عزیز احمد

جدید اردو تنقید

یوں دیکھئے تو ایک لحاظ سے جدید اردو تنقید ایسی زیادہ جدید بھی نہیں ۔ جن کو حالی اور شبلی کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا تھا ، وہ ابھی تک زندہ ہیں اور لکھ رہے ہیں ۔ تنقید میں سب سے زیادہ واجب احترام نام آج بھی مولوی عبد الحق ، سید سلیمان ندوی اور عبد السلام ندوی کے ہیں ۔

بالکل جدید تنقید اور ان بزرگوں کی تنقید نگاری میں بڑا فرق یہ ہے کہ ان بزرگوں کی تنقید میں تبصرے کا تعلق تحقیق سے زیادہ اور قدروں سے کم ہے اور اس کی اس زمانہ میں ضرورت بھی تھی ۔ تاریخی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے اس زمانہ میں تنقید میں "صحت" کی بڑی ضرورت تھی ، اور یہ ایک قدرتی بات تھی کہ تبصرہ کا رخ معروضی ہو ۔

یہی روش سالہا سال باقی رہی ، محمود شیرانی ، محی الدین قادری زور ، عبد القادر سروری ، محمد یحییٰ تنہا ، حامد حسن قادری ، مسعود حسن رضوی ادیب اور اسی طرح اکثر یونیورسٹیوں کے پروفیسر تحقیقی تنقید لکھتے رہے ۔ تحقیقی تنقید کا تعلق زندگی کے مقابل ، ادب سے اور ادبی تاریخ سے زیادہ ہوتا ہے ۔ اس لحاظ سے ان سب اساتذہ نے تاریخ ادب اردو کی بڑی بیش قیمت خدمت انجام دی اور تنقید کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں ان سب کا بڑا حصہ ہے لیکن تاریخی پس منظر پر ان سب کی اتنی نظر تھی کہ ادب اور روزمرہ زندگی میں جو اہم رشتہ ہے وہ بھی ساتھ ہی ساتھ نمایاں نہ رہ سکا ۔ یہ سب تنقید نگار اس نقطۂ نظر سے مورد الزام بھی نہیں قرار دئے جا سکتے کیونکہ تحقیق کے اعتبار سے تنقید نگاری ، قدروں کے لحاظ سے تنقید نگاری سے ایک بالکل مختلف چیز ہے اور دنیا کے ہر ادب میں تنقید نگار دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں ۔

جدید اردو تنقید نگاروں کا وہ گروہ جس نے قدروں کی اہمیت پر زور دیا ۔ دراصل اسی پہلے گروہ ۔ تحقیقی تنقید نگاروں کے گروہ ۔ ہی سے نکل کر الگ ہوا ہے ۔ اگر ایک طرف اردو ۔ ہندوستانی اور معارف اعلیٰ ترین تنقیدی رسالے تھے تو ساتھ ہی ساتھ "نگار" نے بھی تنقید کی طرف قدم بڑھایا ۔ نگار کے مدیر نیاز فتحپوری کا ذہن تنقید میں بھی اسی قدر الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے ، جتنا عام تحریریں ۔ قدر بیشک ان کی تنقیدوں کا بنیادی اصول ہے ، لیکن قدر ۔ جمالی قدر ۔ نیاز کی تحریروں میں عقلانہ فیر فلمانہ ہے

جمالی قدر شناز کی تحریروں میں یونانی علم الاصنام اور انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کی نقل ہے لیکن "نگار" کے مضمون نگاروں میں کم سے کم دو میں بڑی ناقدانہ صلاحیت تھی - یہ دونوں گورکھپور کے رہنے والے ہیں - دونوں شاعر ہیں، ایک اچھا دوسرا معمولی، دونوں ادبیات کے استاد ہیں - اُن کے نام اب کافی مشہور ہو چکے ہیں فراق گورکھپوری اور مجنوں گورکھپوری -

فراق اور مجنوں گورکھپوری دونوں کی عملی تنقید، اس پہلے گروہ کی تنقید سے بادی النظر میں مختلف نہیں معلوم ہوتی - دونوں کو پرانی اردو شاعری سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی عبد السلام ندوی یا مسعود حسن رضوی کو - ان دونوں نے مصحفی اور میر کے ایک ایک شعر کا الگ الگ ذائقہ چکھا ہے - لیکن اسی ذائقے میں ایک ایسی کیفیت بھی ہے، جو ان کو ہم عصر تنقید نگاروں کے اس پہلے گروہ سے ممتاز کرتی ہے - یہ کیفیت ایک طرح کی تربیت یافتہ انفرادیت کی ہے - انفرادیت کی تربیت یورپ کے جدید ترین تنقیدی نظریوں نے کی ہے - کہیں کہیں اور خصوصیت سے مجنوں گورکھپوری کے یہاں یہ نظریے اچھی طرح ہضم بھی نہیں ہوئے ہیں، لیکن انفرادیت بہرحال موجود ہے - مجنوں گورکھپوری کی عملی تنقید میں کم، فراق گورکھپوری کی عملی تنقید میں زیادہ، فراق گورکھپوری کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ادبی تنقید میں بجلی کے تار سے پرانی موم بتیاں جلاتے ہیں مصحفی پر انھوں نے ایک بڑا دلچسپ مضمون لکھا ہے جس کی ابتدا ایک ایسے اہم اور لطیف تنقیدی نکتے سے کی ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے -

"میرے ایک نوجوان دوست ہیں ...... باتوں باتوں میں ان سے ذکر آیا کہ مصحفی؟ ...... سچ پوچھئے تو "مصحفی اور مصحفن" کے فقرے میں اس دور کا بھید چھپا ہے جہاں سے دلی کی غزلگوئی لکھنؤ کی غزلگوئی کی طرف پھر جاتی ہے - یہ فقرہ دلی اور لکھنؤ اسکول کے سنگم کو ظاہر کرتا ہے - یہ کیسے؟ سنئے :- دلی اسکول میں قریب قریب تمام تر ذکر عاشق کا ہوتا ہے اور لکھنؤ اسکول میں معشوق کا - دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ دلی والے داخلی شاعری پر جان دیتے تھے اور لکھنؤ والے خارجی شاعری پر مٹے ہوئے تھے - مصحفی اور مصحفن کو یکجا کر دینا دونوں اسکولوں کے میل کا شگون ہے -

فراق اور مجنوں گورکھپوری دونوں اگر عملی تنقید میں پہلے گروہ سے قریب ہیں تو نظری تنقید میں ان سے بالکل مختلف - نظری تنقید میں دونوں کی قدریں جمالیاتی کم ہیں اور مارکسی زیادہ - جدید نظری تنقید میں مجنوں گورکھپوری کی شخصیت بہت زیادہ نمایاں ہے - قدم قدم پر انھیں مغربی تنقید کی اصطلاحوں، مغربی نقادوں کے ناموں اور مارکسی تنقید ادب کے عام اور معمولی اصول کی تشریحوں کا سہارا لینا پڑتا ہے - قدم قدم پر وہ ٹھوکر کھاتے ہیں اور سب سے بڑی ٹھوکر انھوں نے اس مضمون میں کھائی ہے جو اقبال کے متعلق لکھا ہے - اقبال کے کلام میں زندگی کی ساری حرکی اشتراکی قدریں ان کی نظروں سے پوشیدہ رہیں جن کے وہ اس قدر مداح ہیں اور اس کی

وجہ یہ ہے کہ ہر بڑے شاعر یا ادیب کی طرح اقبال کے کلام میں بظاہر اگر کچھ تضاد ہے تو وہ ان کے پیچھے نظامِ حرکت کی ترکیب کے صحیح مطالعے کے بعد باقی نہیں رہتا۔ یہاں مجنوں کے سوا اکثر نقادوں نے ٹھوکر کھائی ہے جس میں فراق، احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری بھی شامل ہیں۔

لیکن فراق کی نظری تنقید بڑے اعلیٰ پائے کی ہے۔ اور جدید ترین نقادوں یعنی "ترقی پسند" نقادوں میں شاید ہی کوئی ان سے ٹکر لے سکے۔ فراق کی تنقیدی خصوصیت انفرادی ہے اور ان کی انفرادیت نے جمالیات اور مارکسی نظریۂ ادب کو ایک ایسی ترکیب میں حل کر لیا ہے جس سے ایک بڑا ہی لطیف اور زندگی بخش نظامِ تنقید پیدا ہوتا ہے۔ اسی نئے انفرادی نظامِ تنقید سے وہ عام ادب اور خصوصاً اردو ادب کو جانچتے ہیں۔ "اردو کی عشقیہ شاعری" کے عنوان سے انہوں نے ایک بڑی دلچسپ کتاب لکھی ہے۔ فراق کی طرح ان کی تنقید بھی خالص جمالی قدروں اور خالص افادی قدروں کے تصادم کو روک کے تضاد کو رفع کر کے ان دو طرح کی قدروں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ مثلاً غزل اور عام عشقیہ شاعری میں حرکت اور سکون پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

"پُرعظمت عشقیہ شاعری کا افادی پہلو بھی ہے۔ ایسی شاعری ایک تو ہمارے ادراک، جذبات میں بڑی قوتیں اور لطافتیں پیدا کر دیتی ہے، دوسرے ایسی شاعری اس وقت جنم لیتی ہے جب عشق کی شدتیں تو صحیح سلامت رہ جائیں لیکن اس کی کثافتیں اور آلودگیاں شعور میں اپنی ارتقائی صورت حاصل کر لیں۔ اس وقت محبت کا طوفان بھرپور ہوتا ہے لیکن اس میں سکون بھی آ جاتا ہے شاعری اس ہیجان کا نام ہے جس میں سکون کے صفات پائے جائیں۔"

فراق اور مجنوں کی تنقیدیں ایک طرح کا حرکی خط ہیں جو حالی کی روایتی تنقید سے جدید ترقی پسند نظریات کی طرف کھینچا جا رہا ہے۔ اور بھی متوازی خطوط جدید تنقید میں کھینچ رہے ہیں۔ کلیم الدین احمد نے ایک بے مثل کتاب "فن داستان گوئی" پر لکھی ہے۔ ان کے تنقیدی اوزار بالکل نئے ہیں، اور کوئی ایسا ہی نقاد جو مغربی داستانوں اور ان پر تبصروں سے خوب واقف ہو، اردو داستان کا اس فاضلانہ کمال اور تجزیے کی اس خوبی کے ساتھ جائزہ لے سکتا تھا۔ فراق کی طرح کلیم الدین احمد کی تنقید کی بڑی خوبی ایک طرح کا تاریخی ربط ہے، جو اس فن کے دو زاویوں، دو سلسلوں کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے۔

خالص ترقی پسند تحریک سے ذرا ہٹ کے ایک اور صنف اردو تنقید میں گذشتہ دو تین سال کے اندر بہت پھیل گئی ہے۔ یہ صنف "اقبالیات" ہے۔ ہر ادب میں کوئی ایک شاعر ایسا ہوتا ہے جس پر بے تحاشا اور بے انتہا کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اردو میں غالب کی شرحیں زیادہ لکھی گئیں۔ لیکن کتابیں اقبال پر بہت لکھی گئیں، اور اقبال کی شاعری اور ان کی فکر کے ہر پہلو پر۔ بڑے اطمینان اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ملک کے قابل ترین ادیبوں اور عالموں نے اقبالیات پر قلم اٹھایا اور ہر ایک نے یہ کوشش کی کہ اقبال کے اس پہلو پر زیادہ روشنی ڈالے جس سے وہ خوب اچھی طرح واقف ہے۔ [illegible] نیازی صاحب کی

کتاب "اقبال کا مطالعہ" اقبال کی ذات اور اس کے فلسفے کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے، کیونکہ یہ ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو اقبال سے ذاتی طور پر عقیدت رکھتا تھا اور جس پر خود اقبال کو بڑا اعتماد تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس فلسفے کے طالب علم نے اقبال کے فلسفے کی تشریحیں ان ہی کی زبانی سنی تھیں۔ علیگڑھ اور پنجاب کے بعض پروفیسروں نے اقبال پر بصیرت افروز مقالے لکھے ہیں لیکن سب سے زیادہ قابل قدر کام حیدرآباد کے علما اور خصوصاً جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ نے کیا ہے اور ہر ایک نے اپنے خاص علمی نساوے سے اقبال کے پیغام یا شاعری کے کسی خاص مسئلے کو پرکھا ہے ڈاکٹر رضی الدین کا مقالہ "اقبال کا تصور زمان ومکاں" اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس میں زمان ومکاں کے تمام مغربی اور مشرقی نظریوں کا خاکہ ہے جس سے زمان ومکاں کے متعلق اقبال نے اپنے خطبات اور کلام میں جہاں جہاں بہت اختصار سے یا محض رمزاً اشارے کئے ہیں ان پر روشنی پڑتی ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے جو رومی اور نٹشے دونوں پر تحقیق کر چکے ہیں۔ اقبال کے ان مشرقی اور مغربی استادوں کے اثر کو بڑی خوبی سے پرکھا ہے۔ ڈاکٹر ولی الدین نے اقبال کے تصور خودی اور دوسرے الٰہیاتی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن اقبالیات میں سب سے نمایاں کارنامہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب "روح اقبال" ہے، اور کسی خاص شاعر یا مصنف پر عملی تنقید کی حد تک ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کے "محاسن کلام غالب" کے بعد سے اب تک اس جدت، ندرت اور قابلیت سے کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔ یوسف حسین خاں صاحب کی کتاب میں بعض بڑے لطیف اور صحیح تنقیدی نکات ہیں۔ مثلاً قلندر کے متعلق ان کی توضیح کہ یہ ایک روحانی تصور ہے، یا تھیٹر اور سینما کے متعلق اقبال کے خیالات کا تجزیہ۔

جس طرح ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کے ہر شعبے کو قریب قریب تسخیر کر لیا ہے، اسی طرح جدید ترین تنقید پر بھی اسی تحریک کا راج ہے۔ فراق اور مجنوں کا میں ذکر کر ہی چکا ہوں گزشتہ دس سال میں ترقی پسند تحریک نے بعض بڑے اچھے تنقیدی مضامین لکھوائے ہیں جنہوں نے اردو ادب کو ذہنی طور پر نئی قدروں سے روشناس کرایا۔ سیاسیات کا داخلہ تنقید میں حالی اور شبلی کے ساتھ ساتھ ہو چکا تھا گو یہ سیاسیات زیادہ تر "مدح یوروپ" کی قسم کی تھی اور عبدالرحمان بجنوری کے یہاں مدح یوروپ تو کم تھی، مگر یوروپ تنقید میں اچھی طرح جذب نہ ہو سکا تھا۔ نئی ترقی پسند تنقید بھی بڑی حد تک یوروپ کی اشتراکی تنقید کی پیداوار ہے مگر اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اشتراکیت اس میں ایک حد تک جذب ہو چکی ہے۔ یہ نئی تنقید خالص نقل نہیں معلوم ہوتی۔ مادی جدلیت اور مارکسی نظریۂ تاریخ یہاں نئی تنقید کی بنیاد ہے لیکن شروع شروع میں ان نئی تنقید کی اشتراکیت کو زیادہ تر محض "انسانیت" کے رنگ میں پیش کیا گیا۔ ہمارے پرانے ادیب زندگی

کوفن کا پابند بناتے آئے تھے۔ اس کی مثال اگر دیکھنا ہو تو روآنی کی وہ مشہور اور بڑی ہی جمیل غزل پڑھئے ؎

تیرا مکھ مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے ۔۔۔ نین جامی، جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے
نگہ میں فیضی و قدسی، سرشت طالب و شیدا ۔۔۔ کمالِ بدر، دل وہمی و انکھیاں سوغزالی ہے

نئی تنقید کے علمبرداروں نے زندگی اور ادب کے اس تعلق کو الٹ دیا۔ ادب کا معیار، ادیب کا ذہن اور اس کی تحریر کی خاص قدر اس حقیقت کو قرار دیا کہ ادب اگر زندگی کا جائزہ نہیں تو کچھ نہیں۔ قریب قریب یہی بات کئی ہزار سال پہلے ارسطو نے کہی تھی۔ "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی لڑائی دراصل ارسطو اور آسکر وائلڈ کی لڑائی ہے کہ ادب زندگی کی نقل کرے یا زندگی ادب کی۔ زندگی ادب کی نقل اس وقت کرتی ہے جب انحطاط اور جمود کا زمانہ ہو، اور ادب زندگی کی نہ صرف نقل بلکہ اس کی تنقید اس وقت کرتا ہے جب زمانہ ہیجان اور حرکت کی طرف مائل ہو، اور زندگی کی تنقید ساتھ ہی ساتھ انسانی قدریں خود بخود اجاگر ہونے لگتی ہیں۔

ترقی پسند تنقید میں اختر حسین رائے پوری کا مضمون "ادب اور زندگی" بہت دلچسپ ہے، بڑی خوبی سے اختر حسین صاحب نے اشتراکی ادبی تنقید کو پہلے نظریاتی طور پر پیش کیا ہے کہ تخلیق ادب معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور پھر ہندوستانی تاریخ کے اعتبار سے ہندوستانی کی ادبی تاریخ کی بھی انھوں نے معاشی توجیہہ کی ہے۔ مضمون داغوں سے خالی نہیں اور سب سے بڑا داغ یہ ہے کہ اردو ادب سے اپنی ناواقفیت کو انھوں نے بڑے عام اعتراضوں اور الزاموں کے ذریعے چھپایا ہے۔

احمد علی کا بھی ایک دلچسپ مضمون "ادب کا ترقی پسند نظریہ" قریب قریب اسی زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کی بڑی خوبی اس کی ہیئت اور تکنیک ہے اور اگرچہ کہیں کہیں مضمون کو جبر و مقابلہ کا سوال بنا کے پیچیدہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اس کے مصنف کی ذہانت نے ادب میں تضاد اور یکسانیت کے کے مطالعے، اور ادب اور دیگر فنون لطیفہ کے مسائل کی مشابہت ظاہر کرنے میں بڑی جدت دکھائی ہے احمد علی کے بعد کی تنقیدیں اس معیار سے گرتی ہی گئیں اور حال حال میں انھوں نے "آرٹ سیاست اور زندگی" کے نام سے جو مضمون لکھا ہے اس میں زوال زیادہ ہے، احساس جمال کم، جلال اور کمال بالکل نہیں۔ ترقی پسندی سے اب وہ ذہنی طور پر بہت غیر مطمئن اور بیزار ہیں۔

احتشام حسین بہت عرصے سے ترقی پسند تنقید کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ان کے قریب قریب ہر مضمون میں مادیت یا مادی جدلیت کا ذکر ناگزیر ہے۔ ظاہر ہے کہ خالص ترین ادبی نقطۂ نظر سے بھی اس ذکر میں ہرج نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ تنقید نگار اگر ایک ہی زاویۂ نگاہ کا پابند ہو جائے تو اس کی مثال ایک ایسے مسافر کی سی ہوگی جو ایک ہی مقام سے ایک منظر کو عمر بھر دیکھتا رہے۔ مسافر اگر بجائے اس ایک

(باقی صفحہ ۲۶۴ پر)

سیّد مطلبی فرید آبادی

جدائی

بنجارہ وہ دوسرے مذہب کا فرد ہے جو جبر سے اپنے گھر سے نکالا جا رہا ہے کسان دوسرے مذہب کے ہیں وہ متحیر ہیں رنگا چار دیہاتی سوانگوں میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو کومن ٹیٹر (Comantator) کی ہوتی ہے

رنگا چار

ٹانڈا چھوڑ چلا بنجارہ کت بستی کو چلی سواری
دیس اجڑ پردیس کو دھایا، لٹ گئی باغ بہاری
لٹ گئی باغ بہاری سجنو لٹ گئی باغ بہاری
ٹولٹ گئے، طائر چھن گئے چھن گئی سندر ناری
مات پتا کے ہار بھی چھوڑے چھوٹی بھومی پیاری
چھٹ گئی بھومی پیاری سجنو چھوٹی بھومی پیاری

کسان

مت پردیس کو جا نردوشی کب جانا ترا چاہیں
کیسے تو دھرتی تیری جوتیں بھیت پہ چھپر چھپائیں
بھیت پہ چھپر چھائیں رے پیارے بھیت پہ چھپر چھائیں
تو دیکھیں ٹائر ڈھونڈیں دو جا نیرا بیاہ رچائیں
گام جو اجڑا پھر بس جاتے ایسی راہ چلائیں
ایسی راہ چلائیں رے پیارے، ایسی راہ چلائیں

رنگا چار اور کسان

ہاتھ جوڑ بنجارہ کہوے سن لو دیس بستیا
دیس سے کارن ہارے دوجے تم سب اپنے بھیا
تم سب اپنے بھیا رے سجنو تم سب اپنے بھیا
ناؤ بلائی بندر بانٹ پر وہ ہی اپنے ناؤ کھویا
جب جمنا میں دھارا اچھلے کس سے کریں دھمیتا
کس سے کریں دھمیتا رے سجنو کس سے کریں دھمیتا
بوہرشے بھاگے پاکستان سے اِت کے بوہرے آت کو جائیں
جس بھومیا پر پیر ٹکا دیں داہی میں آگ لگائیں
داہی میں آگ لگائیں رے سجنو داہی میں آگ لگائیں
اُن کے واڑی سب رے جاڑے اُن کے واڑی پولیس سپاہی
تم ترادکا، وہ میرے کاڑھا تم میں سکت نہیں ہے بھائی
تم میں سکت نہیں ہے سجنو تم میں سکت نہیں ہے بھائی

رنگا چار

تا کہہ بنجارہ چل دیا روتے رہ گئے دیس کسان
بچھڑے کب ملتے ہیں ہردے میں یہ ہی ارمان
ہردے میں یہ ہی ارمان ہے سجنو ہردے میں یہ ہی ارمان

قتیل شفائی

دلہن

باج رہی شہنائی آئی دلہن نئی نویلی
دلہن نئی نویلی

سوامی سمجھے گھونگٹ پیچھے ہوگا چاند کا ٹکڑا
گھونگٹ کے پٹ کھلے تو نکلا مرجھایا سا مکھڑا
ڈھانپ کے روئے مرجھائے سے مکھڑے کو البیلی
دلہن نئی نویلی

نئی نویلی کا یہ سواگت؟ نند نہ ساس نہ دیور
میکے سے بھی کیا لائی ہے کھوٹ کے پیلے زیور
اب کیا کسی سے آنکھ ملائے؟ سوچے پڑی اکیلی
دلہن نئی نویلی

بین کرے یا چین سے سوئے؟ روئے یا مسکائے؟
آج تو گذرا کل کیا ہوگا؟ سوچ سوچ گھبرائے
جیون کے اس الجھاوے میں بن گئی ایک پہیلی
دلہن نئی نویلی

باج رہی شہنائی ــــ آئی دلہن نئی نویلی

عبدالمجید بھٹی

راج محل

میں البیلی نئی نویلی جیون جوبن رس میں
چنچل چتون، نین کٹیلے، راجہ کا من بس میں

راج پاٹ ہے میرا۔ ہاں ہاں راج پاٹ ہے میرا

تینن جوت کبھی نہیں اب تک پھر سے بان چلاؤں
راجہ کے چنچل من میں پھر اپنی پریت جگاؤں

راج پاٹ ہے میرا۔ ہاں ہاں راج پاٹ ہے میرا

کل ناری کل ونتی ہوں میں راج محل کی لاج
کل کا سورج کل کا راجہ ہے میرا یوراج

راج پاٹ ہے میرا ہاں ہاں راج پاٹ ہے میرا

یہ کیسے پائل کے چھنا کے بھاگیں سب گھبرا کے
ناچ ناچ کر ایک نرتکی کہتی تھی لہرا کے

راج پاٹ ہے میرا ہاں ہاں راج پاٹ ہے میرا

تنویر نقوی

بنجارہ

بن بن جا بنجارے ۔ جا رے ۔ بن بن —

نگر نگر ہے نگری تیری　　ڈگر ڈگر ہے گاؤں
دیکھ دیکھ تھک جائیں انکھیں　　تھکیں نہ تیرے پاؤں　　اپنے کو سمجھا رے ۔ جا رے
بن بن جا بنجارے

ہر اک آن ہے تیرے آگے　　نئی نویلی دنیا،
تو دنیا کا ساتھی پھر بھی　　تیری اکیلی دنیا　　دنیا نئی بسا رے ۔ جا رے
بن بن جا بنجارے

بھیگی مست ہوائیں تجھ کو　　گہری نیند سلائیں
بھور بھئے آزاد پرندے　　گائیں تجھے جگائیں　　اٹھ جا رے متوالے جا رے
بن بن جا بنجارے

آگے بڑھنا کام ہے تیرا　　چلنا تیری ریت
آندھی، ریت، بگولے، طوفاں　　سب ہی تیرے میت　　ان سے من بہلا رے جا رے
بن بن جا بنجارے

پلٹ پلٹ کر کیا تکتی ہیں　　تیری بھٹکی نگاہیں
دور کھڑی ہے منزل تیری　　کھولے اپنی باہیں　　جا رے گلے لگ جا رے جا رے
بن بن جا بنجارے

اپنا آپ سہارا لے کر　　سارے توڑ سہارے
تیری ندیا وہ ندیا ہے　　جس کے نہیں کنارے　　بہہ جا کھیون ہارے ۔ جا رے
بن بن جا بنجارے

پطرس

دوراہہ

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے مجھ کو
ترا ہی در مری آوارگی کا محور ہے
تجھی سے رات کی مستی تجھی سے دن کا خمار
تجھی سے میری رگ و پے میں زہر احمر ہے
تجھی کو میں نے دیا اختیار گریے پر
یہ چشم خشک اگر ہے۔ یہ چشم اگر تر ہے
ترا ہی جسم چمن ہے ترا ہی جسم بہار
تری ہی زلف سے ہر آرزو معطر ہے
ترا ہی حسن ہے فطرت کا آخری شہکار
کہ جو ادا ہے وہ تیری ادا سے کمتر ہے

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے لیکن
مرے بیان میں اک لرزش خفی بھی ہے

تو میرے دعویٰ الفت کی آن پر مت جا
کہ اس میں ایک ندامت دبی دبی بھی ہے
وفا طلب ہے ترا عشق اور مرے دل میں
تری لگن کے سوا اور بے کلی بھی ہے
تجھی سے دل کا تلاطم ہے اور نگہ کا قرار
اسی قرار و تلاطم سے زندگی بھی ہے
مگر ہیں اور بھی طوفان اس زمانے میں
کہ جن میں عشق کی ناؤ شکستنی بھی ہے
مری نگاہ کے ایسے بھی ہونگے چند انداز
کہ تو کہے کہ یہ محرم ہے اجنبی بھی ہے
شبِ وصال کے اس مخملیں اندھیرے میں
مری تلاش میں فردا کی روشنی بھی ہے
مجھے تو آ کے ملی وقت کے دوراہے پر
کہ صبحِ زیست بھی ہے موت کی گھڑی بھی ہے

احمد ندیم قاسمی

آزادی کے بعد

منتشر پتیاں خیالوں کی   پیچ کھاتی ہیں یوں ہواؤں میں
جس طرح چرخ کے تمام نجوم   یک بیک اڑ چلیں خلاؤں میں

کونپلوں سے اُگے ہیں انگارے   جن کی حدت سے تپ رہے ہیں چمن
بُن رہے ہیں گلے سڑے پتے   کتنی جامد حقیقتوں کے کفن

دٹیاں بوٹیوں سے تلتی ہیں،   عصمتوں کی سجی دکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے   خون کا ذائقہ زبانوں پر

آدمیت پلٹ کے تکتی ہے   اپنے بچپن کے رہگذاروں کو
جیسے معزول شہریار تکیں   اپنی عظمت کی یادگاروں کو

زندگی، عزمِ زندگی سے تہی   کارواں کے غبار میں گم ہے
زاہدِ کہنہ سال کی مانند   مقبروں کے شمار میں گم ہے

ایک آفاق گیر سناٹا "زندگی! زندگی!" پکارتا ہے
سٹپٹاتا ہے، اپنے ہونٹوں سے خون کی پپڑیاں اتارتا ہے

زندگی کو سنبھالنے کی مہم کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمیں — یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے

★

اختر الایمان

جب اور اب

کہاں تو یہ تھا کہ میری چاہت میں گدگدی سی تھی لوریوں کی
نئی نئی کونپلوں کی سرخی نئے شگوفوں کی تازگی تھی
کہاں تو یہ تھا کہ میری چاہت تھی گیت اٹھتی جوانیوں کا
کہاں یہ دن ہے کہ تیری آواز بن گئی ہے صدائے صحرا
نہ جانے کس گوشۂ زمیں سے رکی رکی سی تھمی تھمی سی
گھٹی گھٹی سی ہزار پردوں سے آج چھن چھن کے آرہی ہے

سردار جعفری

خون کی لکیر

(ہندوستان کے شرنارتھیوں اور پاکستان کے مہاجرین کے نام)

میں سن رہا ہوں
وہ سسکیاں جو زمیں کے سینے میں داغ غم بن کے سو گئی ہیں
وہ ہچکیاں جن کے سخت پھندے
رباب و بربط کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں
وہ آہیں جو ظالموں کے ڈر سے
دلوں میں محبوس ہو گئی ہیں
وہ چیخیں جو مادرِ وطن کی
جراحتوں کے ہجوم میں جا کے کھو گئی ہیں
وہ گیت جو نوحہ و فغاں کے
سیاہ خانوں میں چھپ گئے ہیں
وہ قہقہے جو فریب کاری کے سبز باغوں میں سو گئے ہیں
وہ سازشیں جن کا زہر کام و دہن کو بیکار کر چکا ہے
وہ وعدے جن کا نکیلا نشتر رگوں کے اندر اتر چکا ہے
وہ عہد و پیماں
کہ جن کے حرفوں سے وقت و تاریخ کی جبیں پر
سیاہ دھبے پڑے ہوئے ہیں

(۲)

یہ کون ظالم ہے جس نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
وطن کے سینے پہ خونِ ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
یہ کیا ہوا ایک دم سے محفل میں سارے سازوں کے رنگ بدلے
قدامتوں کے کھنڈر میں ماضی کے بھوت دیوانہ وار ناچے
بہار کے سرخ آنچلوں سے خزاں کے بیمار رنگ برسے

سحر کی رنگین وادیوں میں سیہ بگولے مچل رہے ہیں
ہزاروں سورج نکل نکل کر گہن کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں
ہرے بھرے کھیت گرم شعلوں کے پیرہن میں دہک رہے ہیں
شگوفے لپٹے ہوئے دھوئیں کے سیہ کفن میں سلگ رہے ہیں
کٹے ہوئے ہاتھ اپنی باہوں سے راہ رو کے کھڑے ہوئے ہیں
جلے ہوئے گاؤں کے جنازے قدم قدم پر پڑے ہوئے ہیں
پھٹے ہوئے آنچلوں کے ٹکڑوں میں عصمتوں کی جوان لاشیں
چھدی ہوئی دھرم اور مذہب کے خنجروں میں دلوں کی قاشیں
کٹی ہوئی چھاتیوں کی نس نس سے دودھ خوں بن کے بہہ رہا ہے۔

(۳)

یہ رات ہے کس قدر بھیانک
یہ خواب ہے کس قدر پریشاں
ہزاروں سہمی ہوئی نگاہیں
بلکتی آنکھیں، سسکتی پلکیں
اندھیری شب میں
کروڑوں اشکوں کے جھلملاتے چراغ لے کر
ہجوم میں قاتلوں کے انصاف کے فرشتے کو ڈھونڈھتی ہیں۔

مگر میں یہ پوچھتا ہوں تم سے
شریف بہنو
غیور ماؤ
تمہاری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک کے بدلے
یہ آنسوؤں کا وفور کیوں ہے ؟

میں جانتا ہوں۔
تمہارے سینے میں، دل میں، زخموں میں کتنے آنسو بھرے ہوئے ہیں
تم ان کی بوندوں سے آسمان و زمین کا دامن بھگو چکی ہو
گلاب کے ساغروں ستاروں کی ننھی منی کٹوریوں کو
نمک کے پانی سے بھر چکی ہو
تم اس تلاطم میں وندھیا اور ہمالیہ کو ڈبو چکی ہو
مگر یہ خونابہ بار آنکھوں کی بہتی گنگا
زمیں پہ پھیلے ہوئے لہو کے سیاہ دھبے نہ دھو سکے گی
یہ جھلملاتے ہوئے دیئے ہیں
جو ظلم کے جھکڑوں مصیبت کی آندھیوں میں نہ جل سکیں گے
تم ان کی مدھم سی روشنی میں
حسین انصاف کے فرشتے کو کب تلک ڈھونڈھتی رہو گی
کہ وہ بھی اس مقتل وطن میں
تمہاری ہی طرح زخم خوردہ ہے اور آوارہ پھر رہا ہے

(۴)

یہ کس سے فریاد کر رہی ہو
یہ کس کو آواز دے رہی ہو
تم اپنے زخموں کی راکھیاں لے کے کس کی محفل میں جا رہی ہو

تمہارے یہ راہبر نہیں ہیں
تمہارے یہ دادگر نہیں ہیں
یہ کاٹھ کی پتلیاں ہیں جن کو
سیاسی پردوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے مداری
سفید ریشم کی ڈوریوں پر نچا رہے ہیں
یہ سامراجی بساطِ شطرنج کے پیادے ہیں جن کو شاطر
ہزاروں چالوں سے شاہ و فرزیں بنا بنا کر چلا رہے ہیں

یہی تو ہیں وہ جنھوں نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
تمہارے سینے پہ خونِ ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
انہیں نے محفل کے ساز بدلے
انہیں نے سازوں کے راگ بدلے
یہی تو ہیں جو تمہارے اشکوں سے اپنے موتی بنا رہے ہیں
تمہاری عصمت، تمہاری عزت، تمہاری غیرت چرا رہے ہیں

یہ قصر وہ ہے
کہ جس کے دیوار و در میں صدیوں کی لعنتیں بس کے رہ گئی ہیں
یہ تاج وہ ہے کہ جس کی ضو میں
وطن کے چہرے کا رنگ تحلیل ہو گیا ہے
یہ تخت وہ ہے کہ جس کے پائے
ہمارے دل میں گڑے ہوئے ہیں
یہ فرش وہ ہے
جہاں فرنگی کے بھوت دن رات چل رہے ہیں

یہاں شہیدوں کا خون چھلکتا ہے موج و رنگ و شراب بن کر
یہاں بلکتا ہے درد دل کا سرود چنگ و رباب بن کر
یہاں امیدوں کے پھول اور آرزو کے غنچے نہ کھل سکیں گے
یہاں تمہیں عدل اور انصاف کے فرشتے نہ مل سکیں گے
یہ ظالموں کا محل ہے، یہ قاتلوں کا مسکن ہے، یہ لٹیروں کی انجمن ہے

(۵)

شریف بہنو، غیور ماؤ
تمہارے بھائی
تمہارے بیٹے
تمہاری فریاد سن رہے ہیں
ملوں سے کھیتوں سے اور کانوں سے تم کو آواز دے رہے ہیں
وہ دیکھو ان کے جوان سینوں میں عدل و انصاف کی جوالا بھڑک رہی ہے
نگہ میں بجلی چمک رہی ہے
جو ظالموں کے محل کی جانب لپک رہی ہے
اندھیری شب سے پرے شفق کی سنہری مینا چمک رہی ہے

وہ اپنے سینے کا سوز لائیں
میں اپنے نغموں کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنی روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے
کہ جس کے منحوس دامنوں میں
گناہ پروان چڑھ رہے ہیں

قیوم نظر

پناہ گزین

زمستاں کی ٹھٹھرتی شام کا یہ پھیلتا جادو
سیہ پیڑوں کے اوپر دور تک وہ ناچتے طاؤس
افق پر اتنی رنگ آمیزیوں کی تاب ہے کس کو

یہ آوارہ ہوا کے دم بدم بڑھتے ہوئے جھونکے
تمہاری یاد سے لپٹے ہوئے لمحوں کو لائے ہیں
یہ تم ہو جنگلوں، کھیتوں، گذرگاہوں سراؤں میں
کہیں بے گھر کہیں بے سر کہیں بے دست و بے بازو
برہنہ، خونچکاں، خاک آشنائے آبرو، بے جاں
تمہیں لوٹا گیا، روندا گیا، پھینکا گیا ہر سو
تمہاری ہڈیوں کو بھی چبا ڈالا درندوں نے
مگر تم ہو کہ جیسے بے بسی پر مسکراتے ہو

یہ سنگیں رات جس کی تیرگی آنکھیں دکھاتی ہے
تمہارے مرتعش معصوم چہروں پر حوادث کا
کوئی بہلانے والا ضوفشاں پردہ نہ ڈالے گی
تمہاری ان سنی آواز میں لپکا ہوا شعلہ
فضا کے منجمد سینے میں طوفانوں کی دنیا کو
جگائے گا تمہاری یاد کو آفت بنائے گا

یہ آوارہ ہوا کے دم بدم بڑھتے ہوئے جھونکے
بکھرتے جائیں گے ہر سمت شعلوں کی زباں بن کر
اٹھائیں گے نئے فتنے جفا کی داستاں بن کر

ظہیر کاشمیری

شاہدہ

کسی سنولائی ہوئی شام کی تنہائی میں
دو سرکتے ہوئے سایوں میں ہوئی سرگوشی
بات چھوٹی تھی — مگر پھیل کے افسانہ بنی

میں نے اکثر یہی سوچا، تیرا ہموار بدن
نقرۂ ناب کا ترشا ہوا ٹکڑا ہوگا
دودیا، سرد — حرارت سے تہی،
جس پہ طاری ہو خود اپنے ہی تصور کا جمود
کوئی اعجازِ پرستش جسے چونکا نہ سکے

تو مگر — پھول کی پتی سے سبک تر نکلی،
اس کے لمس سے جو آپ ہی جھک جاتی ہو
اک ہلورہ بھی جسے چوٹ لگا سکتا ہو
تو مگر — خوابِ محبت تھی فرشتوں نے جسے
بیٹھ کر چاند ستاروں میں بُنا صدیوں تک
اپنے بلور کے ایوان سجانے کے لئے

دمِ گفتار — تیرے ہونٹوں سے رستی ہوئی بات
جیسے یاقوت کی سِل چیر کے جھرنا پھوٹے
اور گیتوں کے بہاؤ میں مخاطب کو لئے
چھوڑ آئے کسی رُومان بھری وادی میں
تیری شب تاب جوانی کی ضیا نے اکثر
ہالۂ نور مرے گرد کیا ہے تعمیر
اور میں حجلۂ تنویر میں پہروں بیٹھا
تیرے مانوس تنفس کی صدا سنتا رہا

ابھی کچھ اور بھی راتیں ہیں پسِ پردۂ غیب
ابھی کچھ اور بھی نغمے ہیں پسِ پردۂ ساز
کئی راتوں، کئی نغموں سے گزرنا ہوگا
دیکھ! وہ چاند کی چوٹی کا چمکتا مینار
اُسی مینار پہ دونوں کو پہنچنا ہوگا

کیفی اعظمی

مصالحت

کبھی جسے منہ پہ مل کے نکلے کبھی جسے خوب اُچھالا
وہ خوں شہیدوں کا آخر کار رہنماؤں نے بیچ ڈالا
منا چکے جشنِ کامرانی تو یہ حقیقت ہوئی نمایاں
فریبِ دیگر نجات کا لے لیا غلامی نے اک سنبھالا
اسے گدائی کہوں کہ شاہی نہ یہ گدائی ہے اور نہ شاہی
جبیں پہ کانٹوں کا تاج دستِ طلب میں سونے کا ہے پیالہ
ہزار سکوں میں تھی انابت مگر بڑھایا جو ہاتھ ہم نے
سب اک تجوری میں جا چھپے ان میں کوئی گورا رہا نہ کالا
سحر کا مژدہ سنانے والو، طلوع بے شک سحر ہوئی ہے
مگر وہ کس کام کی سحر جس [illegible] لے کے [illegible] کا اجالا

مصالحت کے سکوت میں ہم بغاوت کے ڈھل چکے ہیں
بدلنے اٹھے تھے جو مقدر وہ رہنما خود بدل چکے ہیں
کہاں مفاداتِ حکمرانی، کہاں تقاضائے رہنمائی
بڑھیں گے ٹھکرا کے رہبروں کو وہ قافلے اب جو چل چکے ہیں
خود اپنے چکر میں پھنس گیا ہے نظام سکے کی گردشوں کا
خود اپنی حدت سے طوقِ زر کے تمام حلقے پگھل چکے ہیں
دہائی حبِ وطن کی دیکر انہیں بچانا ہے غیر ممکن
یہ قحط و افلاس کے بھنور جو حکومتوں کو نگل چکے ہیں
ہٹے نہ پیچھے نشاں دلیرو کہ اب محافظ ہو تم نشاں کے
رکے نہ پائے طلب جوانوں کہ سارے کانٹے نکل چکے ہیں

قتیل شفائی

ایکٹرس

تھرتھراتی رہی چراغ کی لو   اشک پلکوں پہ کانپ کانپ گئے
کوئی آنسو نہ بن سکا تارا   شب کے سائے نظر کو ڈھانپ گئے

کٹ گیا وقت مسکراہٹ میں   قہقہے روح کو پسند نہ تھے
وہ بھی آنکھیں چرا گئے آخر   دل کے دروازے جن پہ بند نہ تھے
سونپ جاتا ہے مجھ کو تنہائی
جس پہ دل اعتبار کرتا ہے
بنتی جاتی ہوں نخلِ صحرائی
تو نے چاہا تو میں نے مان لیا   گھر کو بازار کر دیا میں نے
بیچ کر اپنی ایک ایک امنگ   تجھ کو زردار کر دیا میں نے

اپنی بیچارگی پہ رو رو کر   دل تجھے یاد کرتا رہتا ہے
قہقہوں کے سیہ اجالے میں   جسم فریاد کرتا رہتا ہے

سیف الدین سیف

بادۂ نیم رس

کس قیامت کا تبسم ہے ترے ہونٹوں پر
استعاروں میں بھٹکتے ہیں خیالات مرے
میں کہ ہر سانس کو اک شعر بنا سکتا ہوں
نظم ہونے کو پریشان ہیں جذبات مرے

آنکھ جمتی نہیں لہراتے ہوئے قدموں پہ
کسی نغمے کا تلاطم ہے کہ رفتار تری
رقص انگڑائیاں لیتا ہے تری باہنوں میں
حیرت آثار ہے کیوں چشمِ فسوں بار تری

بے خیالی میں نشیبوں سے گذرنے والی
فرشِ ہموار سے الجھیں گے قدم رہ رہ کر
لب تھرک جائیں گے الفاظ کی موسیقی پر
اپنی رفتار سے الجھیں گے قدم رہ رہ کر

دیکھتے دیکھتے بھرپور جوانی کی حیا
تیری بے باک نگاہوں میں سما جائے گی
پردۂ چشم سے نکلیں گی جھجک کر نظریں
زلف ڈرتی ہوئی رخسار پہ لہرائے گی

جسم ہر گام پہ لغزش کا اشارہ پاکر
جام لبریز کی مانند چھلک جائیگا
ریشمی ریشمی زلفوں سے پھسلتا آنچل
کبھی شانوں سے کبھی سر سے ڈھلک جائیگا

تیرے چہرے پہ ترے جسم کے ہر گوشے پر
ابھی اک اور جلا اور تراش آئے گی
اپنے اعضا کے تناسب پہ تعجب ہوگا
پیش آئینہ گذرتی ہوئی شرمائے گی

یوں تری چال میں آئے گا جوانی کا وقار
جیسے مرطوب فضاؤں میں گھٹا جھومتی ہے
جس طرح شام کو صندل کے گھنے جنگل میں
اپنی خوشبو سے گرانبار ہوا جھومتی ہے

ضیا جالندھری

خود فریب

نہیں، نہیں، مجھے نورِ سحر قبول نہیں
کوئی مجھے وہ مری تیرگی عطا کر دے
کہ میں نے جس کے سہارے بُنے تھے خواب پہ خواب
ہزار رنگ مرے موقلم میں تھے جن سے،
بنا بنا کے بُتِ آرزو کی تصویریں
سیاہ پردۂ شب پر بکھیر دیں میں نے
رواں تھے میرے رگ و پے میں ان گنت نغمے
وہ دکھ کے گیت جو لب آشنا نہیں اب تک
میں تیرہ بخت تھا اس تیرگی کے دامن میں
سکوں نصیب تھا ناکام آرزوؤں کو
میں اپنے خوابوں سے، تاریک رات سے خوش تھا

نجانے کیوں پلٹ آئی ہو سیلِ نور کے ساتھ
میں جی رہا تھا تمہارے بغیر بھی لیکن
تمہاری یاد میں میں نے وہ بت بنائے ہیں
جو آج تم سے بھی بڑھ کر عزیز ہیں مجھ کو
وہ بُت مرے ہیں مجھے چھوڑ کر نہ جائیں گے
میں اپنے آپ سے بے حس بتوں سے خوش تھا مگر
تم آگئی ہو مری تیرگی پہ ہنسنے کو
تمہارے ساتھ کئی غم بھی لوٹ آئے ہیں
نہیں، نہیں، مجھے اب سوزِ غم کی تاب نہیں
نہیں، سحر نہیں تعبیر میرے خوابوں کی
نہیں مجھے نہ جگاؤ کہ میرے خوابوں میں
تمہارا عکس ہے مجھے اب بھی پیار کرتا ہے،

احمد راہی

وابستگی

تیری اور میری آرزوؤں کا مدفن —— یہ افسردہ لمحے
جو اک جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں تیری اور میری زندگی سے
تیرے اور میرے خوں سے شاداب ہونے پہ بھی جو شگفتہ نہیں ہیں
تیرا اور میرا خوں اکارت گیا ہے!

زمانہ ہوا ہم کبھی کھل کے روئے نہ ہنسنے ہی پائے
تجھے اس کا احساس ہے یا نہیں کون جانے، مگر میرے دن رات کٹتے ہیں،
یہ سوچنے میں
زمانہ ہوا ہم کبھی کھل کے روئے نہ ہنسنے ہی پائے
ہمارے لئے اِس جہاں میں نہ غم ہے نہ کوئی خوشی ہے
اور اِس پہ بھی ہم زندہ ہیں کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے

مری جان تو اس قدر دور ہونے پہ بھی مجھ سے شرما رہی ہے
قریب آ —— کہ میں جانتا ہوں یہ رخسار، یہ لب، یہ آنکھیں، یہ بازو
یہ میرے نہیں اب کسی اور کے ہیں
ہم اک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں
مگر اس پہ بھی ایک شے مشترک ہے تیری اور میری زندگی میں
یہ افسردہ لمحے —— جو اک جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں تیری اور میری زندگی سے
تیرے اور میرے خوں سے شاداب ہونے پہ بھی جو شگفتہ نہیں ہیں

حامد عزیز مدنی

دیوارِ چین کے اس پار

مجھے گلہ ہے ابھی انقلابِ دوراں سے
سحر پہ یوں تو مرا کوئی اختیار نہ تھا
افق کی بجھتی ہوئی ضو کا انتظار نہ تھا
وہ آفتاب جو راتوں کو ہیں نے ڈھالے تھے
خیال و خواب کی دنیا نے جو سنبھالے تھے
ہوائے بزمِ سلاطیں سے بجھنے والے تھے
یہ میری دیدہ وری پر بھی آشکار نہ تھا
سمجھ رہا تھا کہ اب میرے وحشتِ ویراں
شعاعِ مہر اگر آئینہ اٹھائے گی،
افق سے تا بہ افق اس کی چھوٹ جائیگی
اندھیرے ڈستے ہیں جن کو وہ بستیاں اک دن
نگاہ و دل کی یہ حسرت پرستیاں اک دن
مجھے یقیں سے محروم بستیاں اک دن
پکار اٹھیں گی تو منزل قریب آئیگی
چھڑا چکا ہوں میں من کو دستِ زنداں سے
شکستِ طوق و سلاسل کے گیت گاؤں گا
بجھا ہوا سا چراغِ وفا جلاؤں گا
یہ زلف تا بہ کمر ابروؤں کی یہ محراب
یہ اک تبسمِ زیرِ لبی کا طرزِ خطاب
یہ میرا جامِ لبِ سفالیں یہ خانہ سازِ شراب

یہ کم نہیں ہے کہ میں جامِ جم اٹھاؤں گا
یہ میں نے آنکھ اٹھالی تھی کیوں نگہباں سے
فضا میں تھی یہ اداسی نہ یہ تحیر تھا
یہ کس کا ہاتھ پسِ پردۂ تغیر تھا
ابھی تو رشحِ دو عالم کھڑی تھی میرے حضور
چمک اٹھے تھے وہ صدیوں کے تشنہ کام شعور
زمیں کے سینے سے لَو دے اٹھے ہیں کیوں ناسور
مرا سبو ابھی میرے لہو سے خود پُر تھا
ورق ورق تھی سحر یا سحر کے ایواں سے
فقط سکوتِ شبِ سوگوار ٹوٹا تھا،
سمجھ گیا ہوں کہ منزل کا خواب جھوٹا تھا
ابھی کرن نے اندھیرے میں راہ پائی تھی
ہوا میں شوخیِ نبضِ جواں نہ آئی تھی
متاعِ نور بہ یک کاسۂ گدائی تھی
یہ قافلے کو سرِ راہ کس نے لوٹا تھا
مگر امید ہے اک موجِ گرم جولاں سے
مرا وطن کہ ہے اس سرزمین کے اس پار
نظامِ عالمِ کہنہ ترین کے اس پار
ہزار صدیوں کے افکار خود ہیں محوِ خیال
سرشتِ خاک کو پائے ہوئے سے ہیں مہ و سال
تڑپ رہے ہیں زمانے کے دلکشا خد و خال
فسردہ رسم کی دیوارِ چین کے اس پار

ساحر لدھیانوی

نیا سفر ہے پرانے چراغ گُل کر دو

فریبِ جنّتِ فردا کے جال ٹوٹ گئے
حیات اپنی امیدوں پہ شرمساری ہے
چمن میں جشنِ ورودِ بہار ہو بھی چکا
مگر نگاہِ گل و لالہ سوگواری ہے

فضا میں گرم بگولوں کا رقص جاری ہے
اُفق پہ خون کی مینا چھلک رہی ہے ابھی
کہاں کا مہرِ منوّر، کہاں کی تنویریں
کہ بام و در پہ سیاہی جھلک رہی ہے ابھی

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابنِ آدم نے
خرد گنوا کے، جنوں آزما کے کیا پایا؟
وہی شکستِ تمنا، وہی غمِ ایام
نگارِ زیست نے سب کچھ لٹا کے کیا پایا!؟

بھٹک کے رہ گئیں نظریں خلا کی وسعت میں
حریمِ شاہدِ رعنا کا کچھ پتہ نہ ملا،
طویل راہگذر ختم ہو گئی — لیکن
ہنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا

سفر نصیب رفیقو! قدم بڑھائے چلو
پرانے راہنما لوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوعِ صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے
شبوں کے راج دلارے اِدھر نہ دیکھیں گے

حفیظؔ ہوشیارپوری

غزلیں •

سرمایۂ راحتِ دل تو کجا سامانِ عیشِ نظر بھی نہیں
اب خلوتِ حسن کا ذکر ہی کیا اب جلوۂ راہگزر بھی نہیں

یہ شام و سحر کی یک رنگی، بے کیف ہوئے یوں شام و سحر
جس طرح نظامِ فطرت میں پابندیٔ شام و سحر بھی نہیں

غم کی تدبیر بھی نادانی، غم کی تقدیر ہے ویرانی
ممنونِ دلِ سوزاں بھی نہیں شرمندۂ چشمِ تر بھی نہیں

احساس کی حد سے جو گذرے اس درد کا درماں کون کرے
نس نس میں وہ اب شعلے بھی نہیں رگ رگ میں وہ اب نشتر بھی نہیں

اب ہم کو وہ دولت حاصل ہے کہتے ہیں سکونِ غم جس کو
اب دل کا یہ عالم ہے پیارے مضطر بھی ہے اور مضطر بھی نہیں

تاکیدِ وفا کرنے والو، خوئے تسلیم و رضا دیکھو
تائیدِ وفا ہے جیتے جی، امیدِ سکوں مر کر بھی نہیں

آغاز تمہیں، انجام تمہیں تم پر ہی رہی ہر وقت نظر
آغازِ محبت پر بھی نہ تھی، انجامِ محبت پر بھی نہیں

عدم

●

یا زہرہ جبینوں کی مناجات کریں گے
یا بندگیٔ پیرِ خرابات کریں گے

یہ عقل کے سہمے ہوئے بیمار ارادے
کیا چارۂ ناسازیٔ حالات کریں گے

آ اے غمِ دوراں، درِ میخانہ ہے نزدیک
آرام سے بیٹھیں گے ذرا بات کریں گے

کیا لطفِ ملاقات سرِ جادۂ ہستی
ہم آپ سے محشر میں ملاقات کریں گے

جنت میں نہ مے ہے، نہ محبت، نہ جوانی
کس چیز پہ انساں بسر اوقات کریں گے

کہہ دو یہ عدم سے کہ خرابات میں کل رات
کچھ لوگ فقیروں کی مدارات کریں گے

مجید امجد

●

کیا روپ دوستی کا؟ کیا رنگ دشمنی کا
کوئی نہیں۔ جہاں میں کوئی نہیں کسی کا!
اک تنکا آشیانہ! اک راگنی اثاثہ!
اک موسمِ بہاراں مہمان دو گھڑی کا!
آخر کوئی کنارا اس سیلِ بے کراں کا؟
آخر کوئی مداوا اس دردِ زندگی کا؟
میری سیہ شبی نے اک عمر آرزو کی!
لرزے کبھی افق پر تاگا سا روشنی کا!
شاید ادھر سے گذرے پھر بھی مرا سفینہ،
بیٹھا ہوا ہوں ساحل پر نے بلب کبھی کا!
اب میری زندگی میں آنسو ہیں اور نہ آہیں،
لیکن — یہ ایک میٹھا میٹھا سا روگ جی کا
او مسکراتے تارو! او کھلکھلاتے پھولو،
کوئی علاج میری افسردہ خاطری کا

قیوم نظر

●

کیوں بیٹھ گئے غبار سے ہم
کچھ کہہ نہ سکے بہار سے ہم

طوفاں تھا، ہجوم تھا، کیا تھا
گزرے ہیں یہ کس دیار سے ہم

یہ زندگی، عمر بھر کا رونا
گھبرا گئے انتظار سے ہم

وہ جبر کی لذتوں کا عالم
باز آئے اس اختیار سے ہم

ہنستے ہیں کہ ہنس سکے زمانہ
خوش ہیں تو اس اعتبار سے ہم

یوں بھی تو سکوں ملا ہے برسوں
پھرتے رہے بے قرار سے ہم

وہ لمحہ ہے آج تک گریزاں
جب تم سے تھے، ہمکنار سے ہم

اب آخرِ شب نظرؔ ہے شائد
پھر جیسے ہیں ہوشیار سے ہم!

احمد ندیم قاسمی

●

میں کب سے گوشِ برآواز ہوں، پکارو بھی
زمیں پر یہ ستارے کبھی اتارو بھی

مرے جوان ارادو، شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی

سفینہ محوِ سفر ہو تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں، تم سدھارو بھی

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اداس نقش گرو اب مجھے نکھارو بھی

بھٹک رہے ہیں شبِ تیرہ میں زمین و زماں
بس اب خدا کے لئے کاکلیں سنوارو بھی

مری تلاش کی معراج ہو تمہیں لیکن
نقاب اتارو، نشانِ سفر ابھارو بھی

یہ کائنات ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیم تم اس بوجھ کو سہارو بھی

قتیل شفائی

●

صدمے جھیلوں جان پہ کھیلوں اس سے مجھے انکار نہیں ہے
لیکن تیرے پاس وفا کا کوئی بھی معیار نہیں ہے

یہ بھی کوئی بات ہے آخر دور ہی دور رہیں متوالے
ہرجائی ہے چاند کا جوبن یا پنچھی کو پیار نہیں ہے

ایک ذرا سا دل ہے جس کو توڑ کے بھی تم جا سکتے ہو
یہ سونے کا طوق نہیں یہ چاندی کی دیوار نہیں ہے

ملاحوں نے ساحل ساحل موجوں کی توہین تو کر دی
لیکن پھر بھی کوئی بھنور تک جانے کو تیار نہیں ہے

پھر سے وہی سیلاب حوادث جانے دو اے ساحل والو
یا اس بار سفینہ ڈوبا یا اب کے منجدھار نہیں ہے

قیدِ قفس کے بعد کرے گا قیدِ گلستاں کون گوارا
اب بھی وہی زنجیریں ہیں گو پہلی سی جھنکار نہیں ہے

مجروح سلطان پوری

●

چمن میں آتشِ نو پھر سے بھڑکانے بھی آئیں گے
خزاں آئی تو اب صحرا سے دیوانے بھی آئیں گے

الگ بیٹھے تھے لیکن چشمِ ساقی خود اٹھی ہم پر
اگر ہے تشنگی کامل تو پیمانے بھی آئیں گے

یہ دنیا میری رودادِ محبت سے نہ اکتائے
اسی روداد میں دنیا کے افسانے بھی آئیں گے

یہ انجامِ محبت دیکھ کر بھی وائے مجبوری
جلے گی شمع بھی محفل میں پروانے بھی آئیں گے

کسے معلوم تھے یہ دن کہ خالق گلستانوں کے
ہنسی کی اوٹ دل میں لے کے ویرانے بھی آئیں گے

چلا چل عشق سے باندھے ہوئے شرطِ عمل اے دل
کہ اس رستے میں وہ تو وہ ہیں بیگانے بھی آئیں گے

تجھے مجروح چھوڑا ہے جنہوں نے تشنہ لب کر کے
وہ پلکوں میں چھپائے لاکھ میخانے بھی آئیں گے

شکیل بدایونی

●

نقشِ فطرت نے جو ابھارے ہیں
کچھ کنائے ہیں کچھ اشارے ہیں

ہم سے پوچھو بہارِ جلوۂ دوست
ہم نے فرقت کے دن گذارے ہیں

رونقِ حسنِ رخ دیکھنے والو
کچھ زمیں پر بھی چاند تارے ہیں

تم زمانے کے ہو ہمارے سوا
ہم کسی کے نہیں تمہارے ہیں

ہم سے زندہ تھی زندگی کل تک
آج ہم زندگی کے مارے ہیں

جب نظارے نہ تھے نگاہیں تھیں
اب نگاہیں نہیں نظارے ہیں

دیکھ کر ہاتھ ڈالنے گلچیں،
اب یہ غنچے نہیں شرارے ہیں

جن کو آنسو سمجھ رہے ہو شکیل
دل نے ٹوٹے ہوئے سہارے ہیں

سیف الدین سیفؔ

●

در پردہ جفاؤں کو اگر جان گئے ہم
تم یہ نہ سمجھنا کہ برا مان گئے ہم
اب اور ہی عالم ہے جہاں کا دلِ ناداں
اب ہوش میں آئے تو مری جان گئے ہم
پلکوں پہ لرزتے ہوئے تارے سے یہ آنسو
اے حسنِ پشیماں ترے قربان گئے ہم
بدلا ہے مگر بھیس غمِ عشق کا تو نے
بس اے غمِ دوراں تجھے پہچان گئے ہم
ہم اور ترے حسنِ تغافل سے بگڑتے
جب تو نے کہا مان گئے مان گئے ہم
ہے سیفؔ بس اتنا ہی تو افسانۂ ہستی
آئے تھے پریشان، پریشان گئے ہم

ظہیر کاشمیری

●

ہم اپنی تخریب کر رہے ہیں، ہماری وحشت کا کیا ٹھکانہ
فضا میں بجلی نہو تو خود ہی اجاڑ دیتے ہیں آشیانہ
غمِ محبت تلاش کرنے چلے تھے لیکن یہ کیفیت ہے،
جھکی جھکی مضمحل نظر سے جھلک رہا ہے غمِ زمانہ
سحر ہو یا آمدِ سحر ہو، میری خلش مٹ سکے تو جانوں
مرے لبوں پہ لرز رہا ہے ابھی وہی نالۂ شبانہ
اگرچہ حسنِ قدیم اپنے پرانے تیور بدل چکا ہے،
مگر وہی دل گرفتگی ہے، مگر وہی عشق کا فسانہ
خبر نہ تھی صحنِ گلستاں میں یہ حال ہوگا کلی کلی کا،
گلوں نے گلچیں سے بھول کر بات کی باندازِ محرمانہ
اگرچہ ذوقِ تلاش ہر ایک راستے سے گزر چکا ہے
مگر ابھی تک جبینِ سجدہ سے دور ہے سنگِ آستانہ

کرشن چندر

کالو بھنگی

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا ہے۔ لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رک گیا ہے کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے پرکھنے سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہو سکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو درکنار کوئی سیدھا سادا افسانہ بے کیف، بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں بن سکتا۔ کالو بھنگی کے متعلق، پھر نجانے کیا بات ہے ہر افسانے کے شروع میں میرے ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے کہتا ہے "چھوٹے صاحب مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟ کتنے سال ہو گئے تمہیں لکھتے ہوئے؟"

"آٹھ سال۔"

"کتنی کہانیاں لکھیں تم نے"؟

"ساٹھ اور دو باسٹھ"

"مجھ میں کیا برائی ہے۔ چھوٹے صاحب تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب۔ میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں، کالو بھنگی۔ آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟"

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے کالو بھنگی کی۔ کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا۔ اس کے متعلق، یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا۔ دراصل میں کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدت سے کر رہا ہوں۔ لیکن کبھی لکھ نہیں سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اسی لئے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لئے۔ اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لئے، اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدصورت پاؤں لئے، اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری وریدیں لئے، اپنے کولہوں کی ابھری ابھری ہڈیاں لئے

اپنے ہوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لئے - اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں لئے ، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں ، پھیلے پھیلے نتھنوں، جھریوں والے گالوں اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے اُوپر ننگی چندیا ابھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے - اب تک کئی کردار آئے اور اپنی زندگی کو بتاکر، اپنی اہمیت جتاکر، اپنی ڈرامیت ذہن نشین کرا کے چلے گئے ، حسین عورتیں ، خوبصورت تخیلی ہیولے، شیطان کے چربے ، اس ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے ، اس کی چار دیواری میں اپنے دئے جلاکر چلے گئے لیکن کالو بھنگی بدستور جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے -اس نے اس گھر کے ہر کردار کو دیکھا ہے - اسے روتے ہوئے گڑگڑاتے ہوئے ، محبت کرتے ہوئے ، نفرت کرتے ہوئے - سوتے ہوئے جاگتے ہوئے ، ہنستے گاتے ہوئے - تقریر کرتے ہوئے - زندگی کے ہر رنگ میں ہر نہج سے ہر منزل میں دیکھا ہے - بچپن سے بڑھاپے سے موت تک - اس نے ہر اجنبی کو اس گھر کے دروازے کے اندر جھانکتے دیکھا ہے - اور اسے اندر آتے ہوئے دیکھکر اس کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے - وہ خود پرے ہٹ گیا ہے - ایک بھنگی کی طرح الگ ہٹ کے کھڑا ہو گیا ہے - حتّٰی کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے - حتّٰی کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں - لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے - اب صرف ایک قدم اس نے اور آگے بڑھالیا - اور ذہن کے مرکز میں آگیا ہے - تاکہ میں اسے اچھی طرح دیکھ لوں اور اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر اک خاموش سوال ہے - ایک عرصے سے میں اسے دیکھ رہا ہوں - سمجھ میں نہیں آتا - کیا لکھوں گا اس کے بارے میں ، لیکن آج یہ بھوت ایسے ٹلنے کا نہیں ، اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے - آج اسے بھی ، الوداع کہدیں .... ؟

میں سات برس کا تھا جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا -اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا جس میں اسے پہلی بار دیکھا تھا - کہیں کوئی فرق نہ تھا وہی گھٹنے ، وہی پاؤں ، وہی رنگت ، وہی چہرہ ، وہی چندیا ، وہی ٹوٹے ہوئے دانت ، وہی جھاڑو جو ایسا معلوم ہوتا تھا ماں کے پیٹ ہی سے اٹھائے چلا آرہا ہے - کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ہی ایک حصہ معلوم ہوتی تھی ، وہ ہر روز ہسپتال میں مریضوں کے بول و براز صاف کرتا تھا - ڈسپنسری میں فینائل چھڑکتا تھا - پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا - کمپونڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کے لئے جنگل میں لے جاتا - اور دن ڈھلتے ہی انہیں واپس ہسپتال میں لے آتا - اور مویشی خانے میں باندھ

کے اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کے سو جاتا۔ بیس سال سے اسے میں یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر روز بلاناغہ، اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی بیمار نہیں پڑا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لئے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اسے ٹالتا آیا ہوں۔ لیکن یہ شخص نہیں مانا۔ زبردستی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اس لئے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے اور آپ پر اس لئے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ درحالیکہ اس میں کوئی ایسی بات نئی نہیں۔ جس کے لئے اس کے متعلق اتنی سردردی مول لی جائے۔ مگر کیا کیا جائے۔ کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھنچی کھنچی سی ملتجیانہ کاوش ہے۔ اک ایسی مجبور بے زبانی ہے۔ ایک ایسی محبوس گہرائی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو۔ کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو۔ کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو۔ ہاں آٹھ سال سے متواتر یہ بھنگی میرے ذہن میں کھڑا ہے۔ نجانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا جب میں نے آنگی کے افسانے میں چاندنی کے کھلیان سجائے تھے، اور ریرقانیت کے رومانی نظرئے سے دنیا کو دیکھا تھا۔ اس وقت بھی یہ وہیں کھڑا تھا۔ جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حسن اور حیوان کی بوقلموں کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا۔ اس وقت بھی یہ وہیں تھا۔ جب میں نے بالکونی سے جھانک کے ان داتاؤں کی غربت دیکھی اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا گم سم مگر اب یہ جائے گا ضرور۔ اب کے اسے جانا ہی پڑے گا۔ اب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ للہ اس کی بے کیف بے رنگ پھیکی سیٹھی کہانی بھی سن لیجئے۔ تاکہ یہ یہاں سے دور دفان ہو جائے اور مجھے اس کے غلیظ قرب سے نجات ملے اور اگر آج بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا اور نہ آپ نے اسے پڑھا۔ تو یہ آٹھ سال بعد بھی یہیں جما رہے گا۔ اور ممکن ہے زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جا سکتا ہے۔

کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آباؤ اجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آئے تھے، اسی طرح اس حالت میں، پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی، اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا۔ اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کے پھر

اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آرہا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ننگی چندیا پر کسی جانور مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے۔ سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت کی مینڈھ پر بیٹھا ہے۔ اور گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے بار بار اور وہ وہیں اپنا سر چٹواتا چٹواتا اونگھ اونگھ کر سو گیا ہے۔ اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس اجاگر ہونے لگتا تھا۔ اور کائنات کے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گمان ہونے لگتا تھا۔ میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دنیا کی حسین ترین عورتیں پھولوں کے تازہ ترین غنچے، کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں۔ لیکن نجانے کیوں ایسی معصومیت ایسا حسن، ایسا سکون، کسی نظر میں نہیں دیکھا۔ جتنا اس نظر میں کہ جب میں سات برس کا تھا۔ اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا۔ اور آسمان بہت نیلا اور صاف اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی اسے گویا سہلاتی ہوئی کھرکھر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں اور اونگھتا اونگھتا سو جاؤں۔ ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی، تو والد نے مجھے پیٹا اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا۔ کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا۔ دوسرے روز بدستور جھاڑو دینے کے لئے ہمارے بنگلے میں ․․ موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی اور کچھ نذر صاحب کی بکری بھی حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے۔ عورت سے بھی بڑھ کے۔ لیکن کالو بھنگی کی با ․․․ ۔ ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی، چارہ کھلائے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی، وہ اس کے ایک ایک اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے۔ میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں۔ جنگل میں۔ راستے میں وہ انہیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن پھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے۔ گویا تین دوست سیر کرنے کے لئے نکلے ہیں۔ راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کے منہ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگی اور کالو بھنگی ہے کہ پھلو توڑ توڑ کے کھا رہا ہے

اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے اور خود بھی کھا رہا ہے۔ اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے۔ اور ان سے بھی برابر باتیں کئے جا رہا ہے اور وہ دونوں جانور بھی کبھی غرا کر کبھی کان پھٹپھٹا کر کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دم دبا کر، کبھی ناچ کر کبھی گا کر۔ ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہوتے ہیں۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا۔ کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے۔ پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا۔ تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا ننھا چشمہ تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا۔ اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے۔ کیونکہ بیچارے انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے۔ اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کے دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز سے اس کے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ میں اک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لئے سوزن کاری میں مصروف ہے اور کالو بھنگی کے لئے سوئیٹر بن رہی ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا بھی تھا جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لئے دوسرے کتوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا۔ اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا اور بھوکا رہتا اور زخمی رہتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر تواضع میں لگا رہتا۔ کبھی تو صابن سے اسے نہلاتا کبھی اس کی چچڑیاں دور کرتا اس کے زخموں پر مرہم لگاتا۔ اسے مکی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا۔ لیکن یہ کتا بڑا خود غرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ کالو بھنگی سے آکے ملتا تھا۔ دوپہر کو اور شام کو اور کھانا کھا کے اور اپنے زخموں پر مرہم لگوا کے پھر گھومنے کے لئے چلا جاتا۔ کالو بھنگی اور اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی اور بڑی دلچسپ۔ مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ لیکن کالو بھنگی اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔ اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور چرند اور پرندے سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آ جاتا تو اسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا۔ کہیں سنبولا بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا۔ تیتر، بٹیر، گل کناری۔ لال چڑا۔ سبزہ۔ مسکی ہر پرند کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ راہل سنکرتائن سے بھی کہیں بڑا مہا پنڈت تھا۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچے کو تو وہ اپنے

ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اور بیہودہ مکی کا بھٹا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا اور آگ پر اسے اس طرح مدھم آنچ میں بھونتا تھا۔ کہ مکی کا ہر دانہ کندن بن جاتا اور ذائقے میں شہد کا مزا دیتا اور خوشبو بھی ایسی سوندھی سوندھی میٹھی میٹھی، جیسے دھرتی کی سانس! نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشاقی سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کے ایسے بھونتا تھا۔ جیسے وہ برسوں سے اس بھٹے کو جانتا ہے۔ اک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا۔ اتنی نرمی مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا۔ گویا وہ اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا۔ اور لوگ بھی بھٹے بھونتے تھے مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کچے بدذائقہ اور معمولی سے بھٹے وہ ہوتے تھے۔ کہ انہیں بس مکی کا بھٹا ہی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کے وہی بھٹا کچھ کا کچھ ہو جاتا۔ اور جب وہ آگ پر سنک کر بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل ایک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا تھا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا۔ کہ کالو اس سے کتنی محبت کرتا ہے ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی مجھے کالو بھنگی کے اس کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا اور میں انہیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی میری طرح بیچارہ کالو بھنگی بھی خوب خوب پٹا۔ مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے پر جھاڑو لئے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق مجھے اور کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آرہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا۔ میرے لئے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعے کے لئے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لئے فونٹین پن اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

"کالو بھنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے"

"کیسی چھوٹے صاحب!"

"کوئی خاص بات۔ عجیب انوکھی۔ نئی"

"نہیں چھوٹے صاحب" (یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا۔ اب آگے چلئے ممکن ہے.....!)

"اچھا یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟" میں نے دوسرا سوال پوچھا۔

"تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں"۔ وہ سوچنے لگتا۔ "آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے۔" پھر وہ انگلیوں پہ گننے لگتا "چار روپے کا آٹا لاتا ہوں۔ ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو۔ آٹھ آنے کی چائے۔ چار آنے کا گڑ۔ چار آنے کا مصالحہ۔ کتنے روپے ہو گئے چھوٹے صاحب؟"

"سات روپے"

"ہاں سات روپے، ہر مہینے ایک روپیہ بنئے کو دیتا ہوں۔ اس سے کپڑے سلوانے کے لئے روپے قرض لیتا ہوں نا۔ سال میں دو جوڑے تو چاہئیں۔ کمبل تو میرے پاس ہے۔ خیر لیکن دو جوڑے تو چاہئیں۔ اور چھوٹے صاحب کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ بڑھا دیں تو مجا آجائے!"

"وہ کیسے؟"

"گھی لاؤں گا ایک روپے کا۔ اور مکی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے!"

اب بولئے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہو گئی۔ جب راتیں جوان اور چمکدار ہونے لگیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں سی کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا سیال لیے کانپنے لگتے۔ اس وقت بھی میں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کا غذ لے کے اس کے پاس جاتا۔

"کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟"

"نہیں چھوٹے صاحب"

"کیوں؟"

"اس علاقے میں میں ہی ایک بھنگی ہوں۔ اور جدھر دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے۔ چھوٹے صاحب پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے!" (لیجئے یہ راستہ بھی بند ہوا)

"تمہارا جی نہیں چاہتا، کالو بھنگی؟" میں نے دوبارہ کوشش کر کے کچھ کریدنا چاہا۔

"کیا صاحب؟"

"عشق کرنے کے لئے جی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے۔ جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی؟"

"عشق کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحب؟"

"عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ"

"عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟ شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ۔ بڑے لوگ عشق بھی کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب۔ مگر ہم نے نہیں سنا۔ وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں سچ

شادی کی بات وہ میں نے آپ کو بتادی۔ شادی کیوں نہیں کی میں نے۔ کیسے ہوتی شادی میری۔ آپ ہی بتائیے؟ ......" (ہم کیا بتائیں خاک)

"تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟"

"کس بات کا افسوس؟ چھوٹے صاحب!"

میں نے ہار کر اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔ وہ جو کبھی بھی بیمار نہیں ہوا تھا۔ اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا۔ اسے ہسپتال میں مریض رکھوا لیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دوا انڈیل دیتا اور ایک چپڑاسی اس کے لئے کھانا رکھ آتا۔ وہ اپنے برتن خود صاف کرتا۔ اپنا بستر خود کرتا۔ اپنا بول و براز خود صاف کرتا۔ اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا۔ کیونکہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا۔ لیکن ہم کوئی اس کے رشتے دار تھوڑی تھے۔ اس لئے اس کی آخری تنخواہ مبلغ آٹھ روپے بھی بحق سرکار ضبط ہو گئی کیونکہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ اور جب وہ مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھلا۔ ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے۔ کمپونڈر نے تیار کئے۔ مریضوں نے دوائی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بند بھی ہوا۔ اور گھر آن کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا۔ ریڈیو سنا۔ اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے از راہ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ اور وارڈ کے باہر کھڑی کھڑی بے کار چلاتی رہیں۔ جانور کی ذات ہے نا آخر۔

ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟ بتا رے۔

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔

کیوں بھئی اب تو میں نے سب کچھ لکھ دیا۔ وہ سب کچھ جو میں تمہاری بابت جانتا ہوں اب بھی یہیں کھڑے ہو۔ پریشان کر رہے ہو۔ للہ چلے جاؤ۔ کیا کہیں مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے کوئی بھول

ہوگئی ہے؟ تمہارا نام۔ کالو بھنگی، کام، بھنگی، اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے۔ شادی نہیں کی۔ عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی۔ کوئی اچنبھا، معجزہ نہیں ہوا جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے۔ اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے۔ غالب کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا، تمہاری زندگی میں۔ پھر میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے، چار روپے کا آٹا۔ ایک روپے کا نمک۔ ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے۔ چار آنے کا مصالحہ، چار آنے کا گڑ، سات روپے اور ایک روپیہ بنئے کا، آٹھ روپے ہوگئے۔ مگر آٹھ روپے میں تو کہانی نہیں ہوتی۔ آجکل تو پچیس، پچاس، سو میں نہیں ہوتی مگر آٹھ روپے میں تو شرطیہ کوئی کہانی نہیں ہو سکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اب خلجی ہی کو لو ہسپتال میں کمپونڈر ہے۔ بتیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے جنہوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر خلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کر لیا۔ وہ جوان ہے۔ اس کے چہرے پر رنگت ہے۔ یہ جوانی، یہ رنگت کچھ چاہتی ہے۔ وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیص پر کلف لگا سکتا ہے۔ بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر سکتا ہے۔ سرکار نے اسے رہنے کے لئے ایک چھوٹا بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے۔ ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے۔ اور خوبصورت مریضاؤں سے عشق بھی کر لیتا ہے۔ وہ نوراں اور خلجی کا واقعہ تمہیں یاد ہوگا۔ نوراں بھتیا سے آئی تھی۔ سولہ سترہ برس کی الھڑ جوانی چار کوس سے کسی سینما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آجاتی تھی، بڑی بے وقوف تھی وہ۔ اپنے گاؤں کے دو نوجوانوں کا عشق قبول کئے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے آجاتا تو اس کی ہو جاتی اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا۔ اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ ایک بالکل واضح قاطع یقینی امر سمجھتے ہیں۔ درحالیکہ یہ عشق اکثر بڑا متذبذب، غیر یقینی، گومگو حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اس سے بھی ہے۔ اس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں نہیں ہے اور ہے بھی تو اس قدر وقتی، گرگٹی، ہنگامی کہ ادھر نظر چوکی ادھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے۔ اسی لئے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اس کا دل نمبردار کے بیٹے کے لئے بھی دھڑکتا تھا۔ اور پٹواری کے پوت کے لئے بھی، اس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لئے بے تاب ہو اٹھتے۔ اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو —— لہریں ہوں اور ایک اکیلی کشتی ہو۔ اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو۔ اور کشتی ڈولنے لگے ہولے ہولے ڈولتی جائے۔ اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے ہلتی ہلتی تھم جائے۔ اور سانس رکتے رکتے رک سی جائے اور آنکھیں جھپکتی جھپکتی جھک سی جائیں۔ اور زلفیں بکھرتی بکھرتی

سی جائیں اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم ہوں اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے رہ جائے اور کوئی اپنی بانہوں میں بھینچ لے۔ ہائے۔ پٹواری کے بیٹے کو دیکھتے ہی ایسی ہی حالت ہوتی تھی نوراں کی اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی۔ نمبردار کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا، ——— پٹواری کا بیٹا، نمبردار کا بیٹا، وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی۔ دونوں سے شادی کرنے کا اقرار کر چکی تھی، دونوں پر مر مٹی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے۔ اور جب جوانی کا بھت سالہا گھوں سے نکل گیا تو انہیں اپنی بے وقوفی پہ بڑا غصہ آیا۔ اور پہلے نمبردار کا بیٹا نوراں کے پاس پہنچا اور اپنی چھری سے اسے ہلاک کرنا چاہا۔ اور نوراں کے بازو پر زخم آگئے اور پھر پٹواری کا پوت آیا۔ اور اس نے اس کی جان لینی چاہی اور نوراں کے پاؤں پر زخم آئے۔ مگر وہ بچ گئی۔ کیونکہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی۔ اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں۔ خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے۔ انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے کسی پہ کم کسی پہ زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کمپونڈر پہ زیادہ۔ نوراں کی تیمارداری میں غلی دل و جان سے لگا رہا۔ نوراں سے پہلے بیگماں اور بیگماں سے پہلے ریشماں اور ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر وہ غلی کے ناکام عاشقی تھے۔ کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں۔ ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا۔ بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے، اور خاوند تھے۔ اور فاؤنڈس کی تیز نگاہیں تھیں جو گویا غلی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہشوں کے آخری کونے تک سیدھی پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ غلی کیا کر سکتا تھا۔ مجبور ہو کے رہ جاتا۔ اس نے بیگماں سے عشق کیا۔ ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا۔ ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا۔ جانکی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہر روز صبح اٹھ کر منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور خوبصورت لال کے گچھے توڑ کر اس کے لئے لاتا۔ بہترین دوائیں۔ بہترین غذائیں بہترین تیمارداری لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے چلی گئی اور جانکی اچھی ہوئی تو چلتے وقت اس نے غلی کے دئے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگا لئے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر اس نے اپنے خاوند کا ہات تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کے اس نے مڑ کر غلی کی طرف دیکھا اور غلی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کر رونے لگا۔ ریشماں کے رخصت ہونے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی اسی شدت، اسی خلوص، اسی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا۔ لیکن غلی کے لئے نہ ریشماں رکی نہ

بیگماں نہ جانگی۔ اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا۔ اور یہ دھڑکن روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ شروع شروع میں تو نوراں کی حالت غیر تھی اس کا بچنا محال تھا۔ مگر خلیجی کی انتھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی۔ سڑانڈ دور ہوتی گئی۔ سوجن غائب ہوتی گئی۔ نوراں کی آنکھوں میں چمک۔ اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آتی گئی۔ اور جس روز خلیجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراں بے اختیار اک اظہار تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اتری اور اس نے اپنے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتوں پر اور آنکھوں میں کاجل لگایا۔ اور زلفیں سنواریں تو خلیجی کا دل مسرت سے چوکڑیاں بھرنے لگا۔ نوراں خلیجی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے خلیجی سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لئے اس سے معافی مانگنے کے لئے۔ اس سے شادی کا پیمان کرنے کے لئے ہسپتال آئے تھے۔ اور نوراں انہیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی۔ کانپنے لگتی۔ مڑ مڑ کر دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا۔ جب تک وہ لوگ چلے نہ جاتے اور خلیجی اس کے ہات کو اپنے ہات میں نہ لے لیتا۔ اور جب وہ بالکل اچھی ہوگئی تو سارا گاؤں۔ اس کا اپنا گاؤں اسے دیکھنے کے لئے امڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے۔ اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا۔ اور پٹواری بھی اور وہ دونوں خرد ماغ لڑکے بھی جو اب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کئے پر پشیمان ہو رہے تھے اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلیجی کی طرف دیکھا۔ اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی۔ سارا گاؤں اسے لینے کے لئے آیا تھا۔ اور اس کے قدموں کے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم اور دوسرے قدم اور سینکڑوں قدم جو نوراں کے ساتھ چل رہے تھے۔ خلیجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گذرتے گئے۔ اور پیچھے اک دھندلی گرد و غبار سے اٹی رہگزر چھوڑ گئے۔ اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت اور رومانی زندگی تھی خلیجی کی۔ خلیجی جو مڈل پاس تھا۔ بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا خلیجی جو جوان تھا جو محبت کرتا تھا۔ جو اک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا۔ اور عشق میں روتا تھا۔ کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پر کیف زندگی تھی خلیجی کی۔ لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ :-

(۱) کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

(۲) کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

(۳) کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

(۴) کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں اور ہر روز اس کے کمرے میں فنائل چھڑکتا رہا اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا اور آتشدان میں لکڑیاں جلاتا رہا۔ تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے

(۵) کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو کئی کے بھٹے کھلاتا رہا۔

(۶) کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اٹھاتا رہا۔ تین ماہ دس روز تک

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بیگماں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے جانکی کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لئے حیران ہو جاتا۔ پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا۔ اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے پیچھے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چندیا چٹوانے لگتا۔ لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں۔ پھر اور کیا لکھوں تمہارے بارے میں کالو بھنگی۔ سب کچھ تو لکھ دیا۔ جو کچھ کہنا تھا۔ جو کچھ تم ہو۔ جو تم رہے ہو۔ تمہاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی۔ تم مڈل پاس ہوتے تمہیں وراثت میں کچھ کلچر۔ تہذیب کچھ تھوڑی سی انسانی مسرت اور اس مسرت کی بلندی ملی ہوتی تو میں تمہارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمہارے آٹھ روپوں میں کیا کہانی لکھوں۔ ہر بار ان آٹھ روپوں کو الٹ پلٹ کے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا۔ ایک روپے کا نمک۔ ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے۔ چار آنے کا گڑ۔ چار آنے کا مصالحہ۔ سات روپے۔ اور ایک روپیہ بنئے کا، آٹھ روپے ہو گئے۔ کیسے کہانی بنے گی تمہاری، کالو بھنگی تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائیگا۔ چلے جاؤ۔ دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی جھوٹی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا۔ اچھا بھئی اب میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں۔ شاید تیرے لئے کوئی چنگاری نکل آئے۔ شاید اب تیرے لئے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا اور بختیار چپڑاسی کا آسرا لینا پڑے گا۔ بختیار چپڑاسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا کسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا

پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے ۔ اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے جس کے تین طرف چیل کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے جو اس کی بیوی نے لگایا ہے ۔ اس میں اس نے کرم کا ساگ بویا ہے ۔ اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کدو جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مر جاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں ۔ بختیار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے بختیار کے تین بچے ہیں ۔ اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے ۔ ایک دفعہ بختیار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی ۔ اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا اور سردی کے مارے دانت بج رہے تھے ۔ اور گھر سے بختیار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بختیار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لئے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا ۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے ۔ وہ اور کالو بھنگی اور بختیار کی بیوی ۔ جو اب اپنے کئے پر پشیمان تھی اور اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی ۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے تھے اور پاؤں بتے چیل کے خشک جھومر پھسلے جاتے تھے ۔ پھر بارش شروع ہو گئی ۔ پھر کریری پڑنے لگی اور چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی ۔ اور جیسے اک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دئے ہوں اور برف کی پریوں کو قطار اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو ۔ برف کے گالے زمین پر گرتے گئے ساکن ۔ خاموش ۔ بے آواز ۔ سپید مخمل گھاٹیوں وادیوں، چوٹیوں پر پھیل گئی ۔

"اماں" بختیار کی بیوی زور سے چلائی ۔

"اماں" بختیار چلایا ۔

"اماں" کالو بھنگی نے آواز دی

جنگل گونج گونج کے خاموش ہو گیا ۔

کالو بھنگی نے کہا ۔ میرا خیال ہے وہ نکر گئی ہوگی ۔ تمہارے ماموں کے پاس ۔

نکر کے دو کوس ادھر انہیں بختیار کی اماں ملی ۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی ۔ گرتی پڑتی لڑھکتی تھی ۔ پتی کانپتی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور جب بختیار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لئے مزاحمت کی پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہو گئی اور بختیار کی بیوی نے اسے تھام لیا اور راستے بھر وہ اسے باری باری سے اٹھاتے چلے آئے ۔ بختیار اور کالو بھنگی ۔ اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چکا تھا اور انہیں واپس آتے دیکھ کر بچے رونے لگے ۔ اور کالو بھنگی نے بتیاں جلائیں اور بختیار کی بیوی نے اماں کو سونٹھ بھون کے کھلائی اور بختیار کی ماں اور اس کی بیوی دونوں گلے مل کے رونے لگیں

اور بختیار بھی رونے لگا اور بچے بھی رونے لگے اور کالو بھنگی بھی ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھجانے لگا۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بختیار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے۔ مگر کالو بھنگی میں تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں۔ میں ہسپتال کے ہر شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ سکتا ہوں۔ لیکن تمہارے متعلق اتنا کچھ کر دینے کے بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا کیا جائے۔ خدا کے لئے اب تو چلے جاؤ۔ بہت ستالیا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح میرے ذہن پر سوار رہے گا۔ اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لئے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا ہے۔ تو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں۔ سن تو چاہتا ہے تاکہ کوئی تیرے گندے کھردرے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کر ان سے غلاظت دور کرے ان کی بیوائیوں پر مرہم لگائے۔ تو چاہتا ہے تیرے گھٹنوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں۔ تیری رانوں میں طاقت اور سختی آجائے تیرے پیٹ کی مرجھائی سلوٹیں غائب ہو جائیں - - - - - تیرے اُگے ہوئے بال غائب ہو جائیں تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے انہیں گویائی بخش دے تیری آنکھوں میں چمک پیدا کر دے۔ تیرے گالوں میں لہو بھر دے۔ تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کر دے۔ تجھے اک صاف لباس دیدے۔ تیرے ارد گرد اک چھوٹی سی چار دیواری کھڑی کر دے حسین، صاف، پاکیزہ۔ اس میں تیری بیوی راج کرے۔ تیرے بچے قہقہے لگاتے پھریں۔ یہ کچھ تو چاہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔ میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں جب تو گائے سے اپنا سر چھڑاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے۔ حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ تیرا سر جھک جاتا ہے۔ اور تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے۔ اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لئے مکی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے محبت اور شفقت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے، تو اپنے ذہن کی بینائی میں اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے۔ جو ابھی نہیں آیا جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن جس سے تو نے اک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اسے گود کھلایا ہے۔ اس کا منہ چوما ہے۔ اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر سارے جہان میں گھمایا ہے۔

دیکھ لو۔ یہ ہے میرا بیٹا۔ یہ ہے میرا بیٹا۔ اور جب یہ سب کچھ تجھے نہیں ملا۔ تو تو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اور حیرت سے اپنا سر کھجانے لگا۔ اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ، بارہ ... میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی۔ لیکن ہو نہ سکی۔ کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں۔ میں اک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں۔ اک نیا انسان نہیں گھڑ سکتا۔ اس کے لئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں۔ اس کے لئے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا اور ڈاکٹر اور کمپونڈر اور تحصیلدار اور گاؤں کے پٹواری اور نمبردار اور بنئے اور دکاندار اور حاکم اور سیاست داں اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہر شخص کی لاکھوں کروڑوں اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہئے۔ میں اکیلا مجبور ہوں کچھ نہیں کر سکوں گا جب تک ہم سب مل کے ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے۔ یہ کام نہ ہو گا۔ اور تو اسی طرح اپنی جھاڑو لئے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے۔ اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے گا۔ جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی سربلندیاں چھوئے اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت چھلک چھلک جائے۔ یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا ہے!

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آجائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا لے۔ اور تیرے ہاتوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے!

سعادت حسن منٹو

حلفی بیان

پڑھیئے کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ آپ مسلمان ہیں یقین کریں، میں جو کچھ کہوں گا بالکل سچ کہوں گا۔ پاکستان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ قائدِ اعظم جناح صاحب کے لیے میں جان دینے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں اس معاملے سے پاکستان کا کوئی تعلق نہیں — آپ اتنی جلدی نہ کیجئے۔ مانتا ہوں، ان دنوں ہلڑ کے زمانے میں آپ کو فرصت نہیں، لیکن آپ خدا کے لئے میری پوری بات تو سن لیجئے... میں نے تکا رام کو ضرور مارا ہے اور جیسا کہ آپ کہتے ہیں. تیز چھری سے اس کا پیٹ چاک کیا ہے۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہ ہندو تھا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ تم نے اس لئے نہیں مارا تو پھر کس لئے مارا.... لیجئے میں ساری داستان ہی آپ کو سنا دیتا ہوں۔

پڑھیئے کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ کس کافر کو معلوم تھا کہ میں اس لفڑے میں پھنس جاؤں گا۔ پچھلے ہندو مسلم فسادوں میں میں نے تین ہندو مارے تھے لیکن آپ یقین مانئے وہ مارنا کچھ اور ہے یہ مارنا بالکل کچھ اور ہے۔ خیر آپ سنئے کہ ہوا کیا میں نے اس تکارام کو مارا کیوں؟

کیوں صاحب عورت ذات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ ..... میں تو سمجھتا ہوں بزرگوں نے ٹھیک کہا ہے کہ اس کے چلتروں سے خدا ہی بچائے ... پھانسی سے بچ گیا تو دیکھئے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں پھر کبھی کسی عورت کے نزدیک نہیں جاؤں گا ... لیکن صاحب، عورت بھی اکیلی سزاوار نہیں. مرد سالے بھی کم نہیں ہوتے بس کسی عورت کو دیکھا اور رال ٹپکی ہو گئے۔ خدا کو جان دینی ہے انسپکٹر صاحب، رُکما کو دیکھ کر میرا بھی یہی حال ہوا تھا۔

اب کوئی مجھ سے پوچھے، بندہ خدا تو ایک تینتیس روپے کا ملازم۔ تجھے بھلا عشق سے کیا کام. کرایہ وصول کر اور چلتا بن. لیکن آفت یہ ہوئی صاحب کہ ایک دن جب میں سولہ نمبر کی کھولی کا کرایہ وصول کرنے گیا۔ اور دروازہ ٹھوکا تو اندر سے رکما بائی نکلی .... یوں تو میں رکما بائی کو کئی دفعہ دیکھ چکا تھا، لیکن اس دن کم بخت نے بدن پر تیل ملا ہوا تھا اور ایک پتلی دھوتی لپیٹ رکھی تھی۔ جانے کیا ہوا مجھے، جی چاہا اس کی دھوتی اتار کر زور زور سے مالش شروع کر دوں — بس صاحب اسی روز سے اس بندۂ نابکار نے اپنا دل دماغ، سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔

کیا عورت تھی!۔۔۔۔ بدن تھا پتھر کی طرح سخت۔ مالش کرتے کرتے اپنے تھک گیا تھا مگر وہ اپنے باپ کی بیٹی ہی کہتی رہی: "تھوڑی دیر اور"

شادی شدہ؟ — جی ہاں شادی شدہ تھی اور دھان بوکیدار نے کہا تھا کہ اس کا ایک یار بھی ہے ۔۔۔ لیکن آپ سارا قصہ ہی سن لیجئے۔۔۔ یار وار سب ہی اس میں آجائیں گے۔

جی ہاں، بس اس روز سے عشق کا بھوت میرے سر پر سوار ہو گیا۔ وہ بھی کچھ کچھ سمجھ گئی تھی، کیونکہ کبھی کبھی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی۔ لیکن خدا گواہ ہے جب بھی وہ مسکرائی، میرے بدن میں خون کی ایک تھرتھری سی دوڑ گئی۔ پہلے میں سمجھتا تھا پیر معشوق کو پاس دیکھنے کا "وہ" ہے ۔۔۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا ۔۔۔۔۔ لیکن آپ شروع ہی سے سنئے ۔۔۔۔۔ وہ تو میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ رکما بائی سے میری آنکھ لڑ گئی تھی۔ اب دن رات میں سوچتا تھا کہ اُسے پٹائے کیسا جائے، کم بخت اس کا خاوند ہر وقت کھولی میں بیٹھا لکڑی کے کھلونے بناتا رہتا تھا، کوئی چانس ملتا ہی نہیں تھا۔

ایک دن بازار میں میں نے اس کے خاوند کو جس کا نام ۔۔۔۔ خدا آپ کا بھلا کرے کیا تھا۔؟

جی ہاں — گردھاری — لکڑی کے کھلونے چادر میں باندھے لے جاتے دیکھا تو میں نے جھٹ سے سولہ نمبر کی کھولی کا رُخ کیا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے میں نے دروازے پر دستک دی — دروازہ کھلا۔ رکما بائی نے میری طرف گھور کے دیکھا ۔۔۔۔ خدا کی قسم میری روح لرز گئی۔ بھاگ گیا ہوتا وہاں سے لیکن اس نے مسکراتے ہوئے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

جب اندر گیا تو اس نے کھولی کا دروازہ بند کر کے مجھ سے کہا "بیٹھ جاؤ" میں بیٹھ گیا تو اس نے میرے پاس آکر کہا: "دیکھو ۔۔۔۔ میں جانتی ہوں، تم کیا چاہتے ہو۔ لیکن جب تک گردھاری زندہ ہے تمہاری مراد پوری نہیں ہو سکتی:"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے بالکل پاس دیکھ کر میرا خون گرم ہو گیا تھا۔ کنپٹیاں ٹھک ٹھک کر رہی تھیں کم بخت نے آج بھی بدن پر تیل ملا ہوا تھا۔ اور وہی پتلی دھوتی لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اور دبا کر کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں، تم کیا کہہ رہی ہو" ۔۔۔ اُف اس کے بازوؤں کے پٹھے کس قدر سخت تھے۔ سچ عرض کرتا ہوں، میں بیان نہیں کر سکتا وہ کس قسم کی عورت تھی ۔۔۔ خیر آپ داستان سنئے۔

میں اور زیادہ گرم ہو گیا اور اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ "گردھاری جائے جہنم میں ۔۔۔ تمہیں میری بننا ہو گا" رکما بائی نے مجھے اپنے جسم سے الگ کیا اور کہا "دیکھو تیل لگ جائے گا" ۔۔۔ میں نے کہا "لگنے دو" اور پھر اسے اپنے سینے کے ساتھ کھینچ لیا۔ یقین مانئے اگر اس وقت آپ مارنے کو کوڑوں سے میری پیٹھ کی چمڑی ادھیڑ دیتے، تب بھی میں اسے علیحدہ نہ کرتا۔ لیکن کم بخت نے کچھ ایسا بچکارا کہ

جہاں اُس نے مجھے پہلے بٹھایا تھا، خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا وہ سوچ کیا رہی ہے — "گردھاری سالا باہر ہے۔ ڈر کس بات کا ہے...." تھوڑی دیر کے بعد جب مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے اس سے کہا۔ "رکما — ایسا اچھا موقعہ پھر کبھی نہیں ملے گا"۔ اُس نے بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر کہا "اس سے بھی اچھا موقعہ ملے گا..... لیکن تم یہ بتاؤ جو کچھ میں کہوں گی کرو گے"...... صاحب میرے سر پر تو بھوت سوار تھا۔ میں نے جوش میں آ کر جواب دیا "تمہارے لئے میں پندرہ آدمی قتل کرنے کو تیار ہوں"۔ یہ سُن کر وہ مسکرائی "مجھے وشواس ہے"۔ خدا کی قسم ایک بار پھر میری روح لرز گئی، لیکن میں نے سوچا، شاید زیادہ جوش آنے پر ایسا ہوا ہے۔

بس وہاں میں تھوڑی دیر اور بیٹھا۔ محبت پیار کی باتیں کیں۔ اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے بھجئے کھائے اور چپکے سے باہر نکل آیا۔ گو وہ سلسلہ نہ ہوا لیکن صاحب ایسے سلسلے پہلے ہی دن تھوڑے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا پھر سہی۔

دس دن گذر گئے۔ ٹھیک گیارھویں دن رات کے دو بجے..... جی ہاں دو ہی کا عمل تھا کسی نے مجھے آہستہ سے جگایا۔ میں نیچے سیڑھیوں کے پاس جو جگہ ہے نا وہاں سوتا ہوں۔ آنکھیں کھول کر میں نے دیکھا۔ ارے، رکما بائی! میرا دل دھڑکنے لگا..... میں نے آہستہ سے پوچھا "کیا ہے"۔ اس نے ہولے سے کہا "آؤ، میرے ساتھ"۔ میں ننگے پاؤں، اس کے ساتھ ہو لیا اس نے کھولی کا دروازہ کھولا۔ ہم دونو اندر داخل ہوئے۔ بالکل اندھیرا تھا۔ میں نے اور کچھ نہ سوچا اور وہیں کھڑے کھڑے اس کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اُس نے میرے کان میں کہا "ابھی ٹھیرو" پھر بتی روشن کی۔ میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ سامنے چٹائی پر کوئی سو رہا ہے۔ منہ پر کپڑا ہے۔ میں نے اشارے سے پوچھا "یہ کیا؟" — رکما نے کہا "بیٹھ جاؤ" میں الّوؤں کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آئی اور بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر اس نے ایسی بات کہی جس کو سُن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بالکل برف ہو گیا صاحب..... کاٹو تو لہو نہیں بدن میں..... جانتے ہیں رکما نے مجھ سے کیا کہا۔

پڑھئے کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ — میں نے اپنی زندگی میں ایسی عورت نہیں دیکھی...... کم بخت نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا "میں نے گردھاری کو مار ڈالا ہے"...... آپ یقین کیجئے اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک ہٹے کٹے آدمی کو قتل کیا تھا..... کیا عورت تھی صاحب — مجھے جب بھی وہ رات یاد آتی ہے قسم خداوند پاک کی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُس نے مجھے وہ چیز دکھائی جس سے اُس ظالم نے گردھاری کا گلا گھونٹا تھا۔ بجلی کے تاروں کی گندھی ہوئی ایک مضبوط رسّی سی تھی۔ لکڑی پھنسا کر اُس نے زور سے کچھ ایسے پیچ دئے تھے کہ بے چارے کی زبان

اور آنکھیں باہر نکل آئی تھیں کہتی تھی بس یوں چٹکیوں میں کام تمام ہو گیا۔

کپڑا اٹھا کر جب اس نے گردھاری کی شکل دکھائی تو میری ہڈیاں تک برف ہو گئیں لیکن وہ عورت جانے کیا تھی۔ وہیں لاش کے سامنے اس نے مجھے اپنے ساتھ لٹا لیا۔ آپ کے سر کی قسم، میرا خیال تھا کہ ساری عمر کے لئے نامرد ہو گیا ہوں، مگر صاحب جب اس کا گرم گرم پنڈا میرے بدن کے ساتھ لگا اور اس نے ایک عجیب و غریب قسم کا پیار کیا تو اللہ جانتا ہے چودہ طبق روشن ہو گئے..... زندگی بھر مجھے وہ رات یاد رہے گی۔ سامنے لاش پڑی تھی لیکن رُکما اور میں دونوں اُس سے غافل ایک دوسرے کے اندر دھنسے ہوئے تھے۔

صبح ہوئی تو ہم دونوں نے مل کر گردھاری کی لاش کے تین ٹکڑے کئے۔ اوزار اُسی کے موجود تھے اس لئے زیادہ تکلیف نہ ہوئی۔ ٹھک ٹھک کافی ہوئی تھی پر لوگوں نے سمجھا ہوگا گردھاری کھلونے بنا رہا ہے۔ آپ پوچھیں گے بندۂ خدا تم نے ایسے گھناؤنے کام میں کیوں حصہ لیا۔ پولس میں رپٹ کیوں نہ لکھوائی..... صاحب عرض یہ ہے کہ اُس کمبخت نے مجھے ایک ہی رات میں اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اگر وہ مجھ سے کہتی تو شاید میں نے پندرہ آدمیوں کا خون بھی کر ہی دیا ہوتا۔ یاد ہے نا میں نے ایک دفعہ اُس سے جوش میں آ کر کیا کہا تھا؟......

اب مصیبت یہ تھی کہ لاش کو ٹھکانے کیسے لگایا جائے۔ رُکما کچھ بھی ہو آخر عورت ذات تھی۔ میں نے اس سے کہا جانِ من تم کچھ فکر نہ کرو، فی الحال ان ٹکڑوں کو ٹرنک میں بند کر دیتے ہیں جب رات آئے گی تو میں اُٹھا کر لے جاؤں گا۔ اب خدا کا کرنا ایسا ہوا صاحب کہ اُس روز بلوا ہوا۔ پانچ چھ علاقوں میں بہت مارا ماری ہوئی۔ گورنمنٹ نے چھتیس گھنٹے کا کرفیو لگا دیا۔ میں نے کہا عبدالکریم کچھ بھی ہو، لاش آج ہی رات ٹھکانے لگا دو.....

چنانچہ دو بجے اُٹھا، اوپر سے ٹرنک لیا..... خدا کی پناہ، کتنا وزنی تھا، مجھے ڈر تھا رستے میں کوئی پیلی پگڑی والا ضرور ملے گا اور کرفیو آرڈر کی خلاف ورزی میں دھر لے گا، مگر صاحب جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ جس بازار سے گزرا، اُس میں سناٹا تھا۔ ایک جگہ بازار کے پاس مجھے ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ میں نے ٹرنک کھولا اور لاش کے ٹکڑے نکال کر اندر ڈیوڑھی میں ڈال دئے اور واپس چلا آیا۔

قربان اس کی قدرت کے، صبح پتا چلا کہ ہندوؤں نے اس مسجد کو آگ لگا دی۔ میرا خیال ہے گردھاری اس کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو گیا ہوگا کیونکہ اخباروں میں کسی لاش کا ذکر نہیں تھا۔ اب صاحب بقول شخصے میدان خالی تھا، میں نے رُکما سے کہا چالی میں مشہور کر دو کہ گردھاری باہر کام گیا ہے، میں رات کو دو ڈھائی بجے آ جایا کروں گا اور عیش کیا کریں گے۔ مگر اُس نے کہا نہیں عبدل، اتنی جلدی نہیں۔ ابھی ہم کو کم از کم پندرہ بیس روز تک نہیں ملنا چاہئے۔ بات معقول تھی اس لئے میں خاموش رہا۔

سترہ روز گزر گئے۔ کئی بار ڈراؤنے خوابوں میں گردھاری آیا لیکن میں نے کہا سالے مر کھپ چکا ہے، اب میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اٹھارویں روز، صاحب میں اُسی طرح سیٹھ صاحب کے پاس چارپائی پر سو رہا تھا کہ رُکما رات کے بارہ ساڑھے بارہ نہیں تو ایک ہوگا، آئی اور مجھے دبانے لگی۔

چٹائی پر ننگی لیٹ کر اس نے مجھ سے کہا "عبدل میاں، بدن ٹوٹ رہا ہے۔ ذرا چمپی کر دو" میں نے فوراً تعمیل کی اور مالش کرنے لگا لیکن آدھے گھنٹے ہی میں چت ہو گیا۔ میرے پسینے کی گرم بوندیں اُس کے چکنے بدن پر گریں لیکن اس نے یہ نہ کہا "بس کرو عبدل، تم تھک گئے ہو۔" آخر مجھ ہی کو کہنا پڑا "رُکما بھئی اب خلاص" ۔۔۔ وہ مسکرائی ۔۔۔ میرے خدا! کیا مسکراہٹ تھی!۔۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اُٹھ کر بتی بجھائی اور میرے ساتھ لیٹ گئی۔ چمپی کر کے میں اس قدر تھک گیا تھا کہ اور کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ رُکما کے سینے پر ہاتھ رکھا اور سو گیا۔

جانے کیا بجا تھا۔ میں ایک دم ہڑبڑا کے اُٹھا۔ گردن میں کوئی سخت سی چیز دھنس رہی تھی۔ فوراً مجھے اس تاروں والی رسّی کا خیال آیا، لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر سکوں، رُکما میری چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ ایک دو ایسے مروڑے دیئے کہ میری گردن کڑکڑ بول اُٹھی۔ میں نے شور مچانا چاہا لیکن آواز میرے پیٹ ہی میں رہی۔ اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔

میرا خیال ہے چار بجے ہوں گے، آہستہ آہستہ مجھے ہوش آنا شروع ہوا۔ گردن میں بہت زور کا درد تھا۔ میں ویسے ہی دم سادھے پڑا رہا اور ہولے ہولے رسّی کے مروڑے کھولنا شروع کئے ..... ایک دم آوازیں آنے لگیں۔ میں نے سانس روک لیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی پر کچھ نظر نہ آیا۔ جو آوازیں آ رہی تھیں اُن سے یہ معلوم ہوتا تھا دو آدمی کشتی لڑ رہے ہیں۔ رُکما ہانپ رہی تھی ..... ہانپتے ہانپتے اُس نے کہا "تکارام ۔۔۔ بتی جلا دو"۔ تکارام نے ڈرتے ہوئے لہجے میں کہا "نہیں نہیں" رُکما بولی "بڑے ڈرپوک ہو ..... صبح اس کے تین ٹکڑے کر کے لے جاؤ گے کیسے؟" ۔۔۔ میرا بدن بالکل ٹھنڈا ہو گیا ۔۔۔ تکارام نے کیا جواب دیا، رُکما نے پھر کیا کیا، اس کا مجھے کچھ ہوش نہیں۔ پتا نہیں کب ایک دم روشنی ہوئی اور میں آنکھیں جھپکتا اُٹھ بیٹھا ۔۔۔ تکارام کے منہ سے زور کی چیخ نکلی اور وہ دروازہ کھول کر بھاگ گیا۔ رُکما نے جلدی سے کواڑ بند کئے اور کنڈی چڑھا دی ۔۔۔ صاحب، میں آپ سے کیا بیان کروں میری کیا حالت تھی۔ آنکھیں کھلی تھیں، دیکھ رہا تھا، سن رہا تھا، لیکن ہلنے جلنے کی بالکل سکت نہیں تھی۔

یہ تکارام میرے لئے کوئی نیا آدمی نہیں تھا۔ ہماری چالی میں اکثر آم بیچنے آیا کرتا تھا۔ رُکما نے اس کو کیسے پھنسایا، اس کا مجھے علم نہیں۔

رُکما میری طرف گھور گھور کے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں۔ وہ مجھے مار چکی تھی لیکن میں اس کے سامنے زندہ بیٹھا تھا۔ وہ مجھ پر جھپٹنے کو تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور بہت سے آدمیوں کی آوازیں آئیں۔ رُکما نے جھٹ سے میرا بازو پکڑا اور گھسیٹ کر مجھے غسل خانے کے اندر ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھولا۔ پڑوس کے آدمی تھے۔ انہوں نے رُکما سے پوچھا "خیریت ہے۔ ابھی ابھی ہم نے یہ چیخ کی آواز سنی تھی؟" رُکما نے جواب دیا "میری تھی ..... مجھے سوتے میں چلنے کی عادت ہے ..... دروازہ کھول کر باہر نکلی تو دیوار کے ساتھ ٹکرا گئی اور ڈر کے منہ سے چیخ

نکل گئی ـــــ پڑوس کے آدمی یہ سن کر چلے گئے۔ رُکما نے کواڑ بند کئے اور کنڈی چڑھا دی ـــــ اب مجھے اپنی جان کی فکر ہوئی ـــــ آپ یقین مانئے یہ سوچ کر کہ وہ ظالم مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ ایک دم میرے اندر مقابلے کی بے پناہ طاقت آگئی، بلکہ میں نے ارادہ کر لیا کہ رُکما کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ غسل خانے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ بڑی کھڑکی کے پٹ کھولے باہر جھانک رہی ہے۔ میں ایک دم لپکا۔ چوتڑوں پر سے اوپر اٹھایا اور باہر دھکیل دیا۔ یہ سب یوں چٹکیوں میں ہوا۔ دھب سی آواز آئی اور میں دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ ساری رات میں چارپائی پر لیٹا اپنی گردن پر جو بہت بُری طرح زخمی ہو رہی تھی ۔۔۔۔ آپ نشان دیکھ سکتے ہیں ۔۔۔۔ تیل مل مل کر سوچتا رہا کہ کسی کو پتہ تو نہیں چلے گا۔ اس نے پڑوسیوں سے کہا تھا کہ اسے سوتے میں چلنے کی عادت ہے۔ مکان کے اس طرف جہاں میں نے اُسے گرایا تھا جب اس کی لاش دیکھی جائے گی تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ سوتے میں چلی ہے اور کھڑکی سے باہر گر پڑی ہے۔۔۔۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ گردن پر میں نے رومال باندھ لیا تھا کہ زخم دکھائی نہ دیں۔ نو بج گئے۔ دس بج گئے۔ بارہ ہو گئے۔ مگر رکما کی لاش کی کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ جدھر میں نے اس کو گرایا تھا وہ ایک تنگ گلی ہے، دو بلڈنگوں کے درمیان۔ دونوں طرف دروازے ہیں تاکہ لوگ اندر داخل ہو کر پیشاب پخانہ نہ کریں۔ پھر بھی دونوں بلڈنگوں کی کھڑکیوں میں سے پھینکا ہوا کچرا کافی جمع ہو جاتا ہے جو ہر روز صبح سویرے بھنگن اٹھا کر لے جاتی ہے ـــــ میں نے سوچا شاید بھنگن نہیں آئی۔ آئی ہوتی تو اس نے دروازہ کھولتے ہی رُکما کی لاش دیکھی ہوتی اور شور برپا کر دیا ہوتا ۔۔۔۔ قصہ کیا تھا، میں چاہتا تھا لوگوں کو جلدی اس بات کا پتہ چلے ـــــ دو بج گئے تو میں نے جی کڑا کر کے خود ہی دروازہ کھولا ـــــ لاش تھی نہ کچرا ۔۔۔۔ یا مظہر العجائب رُکما گئی کہاں ۔۔۔۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں، مجھے اُس پھانسی کے پھندے سے بچ نکلنے کا اتنا تعجب نہیں۔ جتنا رکما کے غائب ہونے کا ہے ۔۔۔۔ تیسری منزل سے میں نے اُسے نیچے گرایا تھا ـــــ پتھروں کے فرش پر ۔۔۔۔ بچی کیسے ہو گی؟ ۔۔۔۔ لیکن پھر سوال ہے کہ اس کی لاش کون اُٹھا کر لے گیا ۔۔۔۔ عقل مانتی تو نہیں لیکن صاحب کچھ پتہ نہیں وہ ڈائن زندہ ہی ہو ۔۔۔۔ چالی میں تو یہی مشہور ہے کہ یا تو کسی مسلمان نے گھر ڈال لیا ہے یا مار ڈالا ہے ۔۔۔۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مار ڈالا ہے تو اچھا کیا ہے، گھر ڈال لیا ہے تو جو حشر اُس غریب کا ہو گا آپ جانتے ہی ہیں۔ خدا بچائے صاحب!

اب محمد رام کی بابت سُنئے۔ اس واقع کے ٹھیک بیس روز بعد مجھ سے ملا اور پوچھنے لگا: "بتاؤ رُکما کہاں ہے؟" ـــــ میں نے کہا مجھے کچھ علم نہیں ـــــ کہنے لگا: "نہیں، تم جانتے ہو۔" میں نے جواب دیا "بھائی قرآن مجید کی قسم مجھے کچھ معلوم نہیں" ـــــ بولا "نہیں تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے اسے مار ڈالا ہے۔ میں پولس میں رپٹ لکھوانے والا ہوں کہ پہلے تم نے گردھاری کو مارا۔ پھر رُکما کو" یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا لیکن صاحب میرے پسینے چھوٹ گئے۔ بہت دیر تک کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ ایک ہی

بات سوجھی کہ اس کو ٹھکانے لگا دوں ..... آپ ہی سوچئے اس کے علاوہ اور علاج بھی کیا تھا۔ چنانچہ صاحب میں نے اسی وقت چھپ کر چھری تیز کی اور نتھا رام کو ڈھونڈنے نکل پڑا ___ اتفاق کی بات ہے شام کے چھ بجے وہ مجھے ___ اسٹریٹ کے ناکے پر موتری کے پاس مل گیا۔ موسمبیوں کی خالی ٹوکری باہر رکھ کر وہ پیشاب کرنے کے لئے اندر گیا۔ میں بھی لپک کر اس کے پیچھے، دھوتی کھول ہی رہا تھا کہ میں زور سے پکارا "نتھا رام"، پلٹ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ چھری میرے ہاتھ ہی میں تھی ___ ایک دم اس کے پیٹ میں بھونک دی ___ اس نے دونوں ہاتھوں سے باہر نکلتی ہوئی انتڑیاں تھامیں اور دوہرا ہو کر گر پڑا ___ چاہئے تو یہ تھا کہ باہر نکل کر نو دو گیارہ ہو جاتا مگر میری بیوقوفی دیکھئے بیٹھ کر اس کی نبض دیکھنے لگا۔ کہ آیا مرا ہے یا نہیں۔ میں نے اتنا سنا تھا کہ نبض ہوتی ہے۔ انگوٹھے کی طرف یا دوسری طرف یہ مجھے معلوم نہیں تھا، چنانچہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیر لگ گئی۔ اتنے میں ایک کنسٹیبل پتلون کے بٹن کھولتا اندر آیا اور میں دھر لیا گیا ___ بس صاحب، یہ ہے پوری داستان ..... پڑھئے کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، جو میں نے رتی بھر بھی جھوٹ بولا ہو۔

جاوید اقبال

بحران

"یہ..... یہ... آہ ــــ س .... سردی بڑھ رہی ہے ــــ یہ کون کاف ــــ میں کہاں ایک ــــ کیا ابھی تک وہ چیل منڈیر پر بیٹھی ہے جو کل ــــ" (وہی سکوت، یہ دن کے لوگ کیا ہوئے؟! اس شدت کے بخار میں میرے قریب کوئی بھی تو نہ تھا۔ لحاف اور پٹیاں یوں معلوم ہوتا گویا کسی نے برف کی سل رکھ دی ہو ــــ)
"تاریک، کسقدر تاریک ــــ تبہ!! دور ــــ"

کل تین اشخاص ہلاک ہوئے

...کی اطلاع مظہر ہے کہ شام کے سات بجے تک شہر کے مختلف حصوں میں پانچ اشخاص
...لے چھرے گھونپے گئے ان میں سے تین ہلاک ہو گئے
...سلامیہ کالج کے نزدیک ریلوے روڈ پر ایک شخص کے چھرا گھونپا گیا۔ سٹی واٹر ورکس
...نزدیک موتی بازار میں ایک شخص ہلاک کر دیا گیا
ابھی تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں لائی گئی۔

(ــــ دور ــــ کبھی کبھار سڑک پر رینگتی ہوئی فوجی لاریوں کی آوازیں سنائی دے جاتیں جیسے کوئی پتھر کی کھولی سطح کو اپنے ناخنوں سے لگاتار کریدتا چلا جائے ــــ ایک ٹانگہ، اکیلا ــــ گھوڑے کی ٹاپوں کی سست آواز، گویا ہتھوڑے کی مسلسل چوٹوں سے کسی آہنی دیوار میں میخیں گاڑی جا رہی ہوں ــــ) ــــ "لحاف کے اندر بلا کا اندھیرا ہے ــــ "سیاہی، سیاہی.... ہر طرف ــــ ڈوب رہا ہوں خدایا ــــ" (میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا، میری آنکھیں کھلی تھیں مگر اس کے باوجود میں کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔ بسا اوقات مختلف رنگوں کے چمکتے ہوئے دائرے میری نگاہوں کے سامنے تھرکتے ــــ زرد، سبز، نیلے، سرخ سے دائرے ــــ لیکن جب میں ان پر اپنی نظریں جماتا تو غائب ہو جاتے اور پھر وہی تیرگی ایک بل کھائے ہوئے اژدہا کی مانند مجھے نگل جاتی) ــــ

ہ) جیاج سواوراں

و میں آتشزدگی کی پانچ وارداتیں ہوئیں

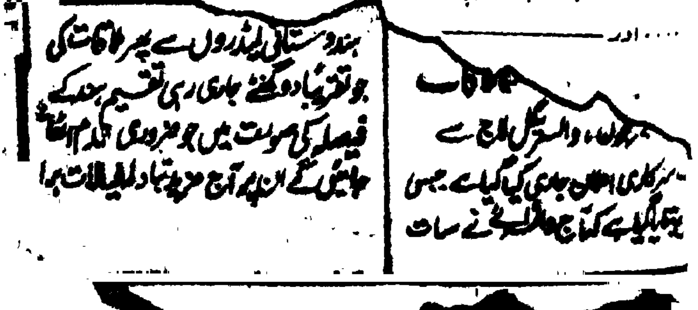
ایک شخص کو چھرا گھونپ دیا گیا۔ ماڈل پارک میں لاکھوں روپے کا نقصان

ہور۔ ۹ جون۔ لاہور میں آج صبح اسمبلی چیمبر کے نزدیک ایجرٹن روڈ پر ایک شخص کو چھرا گھونپ دیا گیا۔ زخمی کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ مگر حملہ آور فرار ہو گیا۔ باغبانپورہ اور مصری شاہ

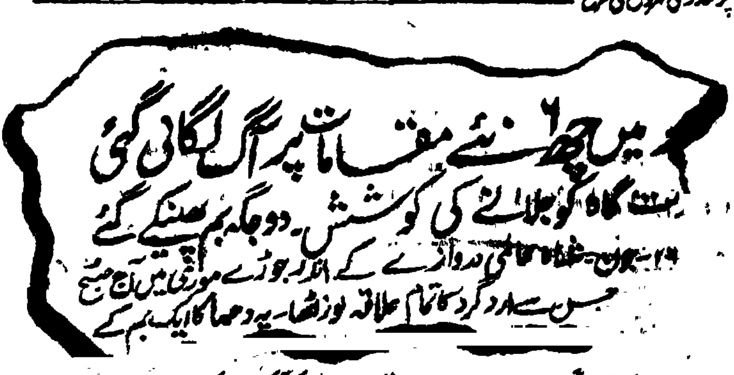
"ہر ہر دیو ..... ہر ہر دیو" (بجلی کوندی۔ ہجوم ایک متلاطم سیلاب کی طرح دھواں میری آنکھوں کے پپوٹوں سے نکلا جیسے عیدالفطر کے روز مسلمانوں کا جم غفیر شاہی مسجد کے جنوبی دروازے ——) "حیدری .... حیدری ——" (پھر ایک دھماکا ہوا۔ کسی طرف سے چیخوں کی آواز گونجی، لہو کی چھینٹیں اڑ کر میرے ماتھے پر پڑیں اور خون آلود چہرے، تیرچھے سے —— پھٹی پھٹی لاتعداد نگاہیں، خوف سے کپکپاتے ہوئے ان گنت ہونٹ، کٹے ہوئے سر، چیرے ہوئے پیٹوں سے باہر نکلی ہوئی سڑی ہوئی انتڑیوں کے ڈھیر، خاک و خون میں لتھڑی اوندھے منہ پڑی ہوئی بےشمار لاشیں، جلے ہوئے مکان، روتے ہوئے بچے، اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر واویلا کرتی ہوئی عورتیں —— مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میری آنکھوں میں پگھلی ہوئی مرچیں جھونک دی ہیں، چہرے پر تیزاب چھڑک دیا ہے —— پھر وہی خاموشی —— کچھ بھی تو نہیں —— وہی میری نگاہوں کے سامنے تھرکتے ہوئے دائرے —— زرد، سبز، نیلے، سرخ، تیرگی، ایک بل کھایا ہوا اژدہا ——) —— (تاریکی میں نہ جانے کون سے سوراخ سے ایک چمگادڑ گھس آیا اور کمرے کی فضا میں چکر کاٹنے لگا) "چکر، چکر —— ایک، دو، تین ——" (میں نے اسے کئی بار دھتکارا ——) "چکر، چکر ——" (مگر اسے نکلنے کی راہ نہ ملی۔ وہ بجلی ایسی سرعت سے غوطے لگاتا اور بعض اوقات تو میرے اس قدر قریب سے گزرتا کہ میں اچھل کر دور جا گرتا ——) "چکر، چکر، چکر

چاکی متی کے قریب کوچہ ٹھٹھیاراں میں دیسی ساخت کے ایک بم کے پھٹنے سے خوفناک دھماکا ہوا۔ پولیس فی الفور موقع پر پہنچ گئی مگر کوئی گرفتاری نہیں ہوئی کرشن بورہ بیان ہے ڈاکٹر کو کل چھرا رسید ہوا تھا۔ وہ آج ہسپتال میں مر گیا۔

—————— (تو یہ کیا مصیبت ہے ۔ میری آنکھوں کی پتلیاں اس کے
تعاقب میں گھوم رہی تھیں ——) "گھوم، گھوم، گھوم ——" (لگاتار گھوم رہی تھیں ——)
"شش!!" (وہ میرے بازو سے چھو کر نکل گیا) —— "آہ، آہ ——" (وہ پھر آیا) "وہ، وہ
وہ آہ —— " (میرے سر کے بالوں سے چھو گیا —— مجھ میں اسے باہر نکالنے کی سکت نہ تھی اور وہ کمرے
کی تاریک مگر محدود فضا میں لگاتار چکر کاٹ رہا تھا ——) چکر، چکر ——" (ابتدا میں تو اس کی رفتار تیز تھی
مگر رفتہ رفتہ —— اب وہ فرش کے کونوں میں کوئی نکلنے کی راہ ڈھونڈ رہا تھا ——" وہ، وہ
—— (وہ میری طرف پھر بڑھا —— میرے منہ پر جھپٹا ——) "ہا... ہا... ہا...
..." (اس نے اپنے سیاہ پنجے میرے رخساروں میں گاڑ دیے اور میرے چہرے سے چمٹ کر پر پھڑپھڑانے
لگا —— میرے لرزتے ہوئے ہاتھ خود بخود اٹھے، اس کے پھڑپھڑاتے پروں کو اپنی گرفت میں لے کر پورے
زور سے پیچھے کی طرف کھینچا —— مگر اس کے مڑے ہوئے پنجے میرے گالوں میں گہرے گڑے تھے ——
"ہا..... ہا..... ہا..... " (میں پھر چیخا اور پھڑپھڑاتا ہوا چمگادڑ میرے ہاتھوں میں تھا —— میرے
پھٹے ہوئے رخساروں سے خون کے دھارے بہ نکلے —— میں نے اپنے ہاتھوں میں پھڑپھڑاتے چمگادڑ کو فرش
پر پٹخ دیا مگر وہ پھر اٹھا اور اسی طرح کمرے میں ——) "چکر، چکر، چکر ——" (میری آنکھوں کی
پتلیاں پھر اس کے تعاقب میں گھومنے لگیں —— وہ ایک بار پھر منہ پر جھپٹا ——) "ہا..... ہا...
(شدتِ خوف سے لحاف میرے چہرے سے سرک گیا ——) "کوئی بھی تو نہیں ——" (کمرے میں
کھڑکیوں کے رستے آفتاب کی چند شعاعیں داخل ہو رہی تھیں۔ ہر طرف ایک ویرانی سی چھائی تھی جیسے
یہ کسی انسان کا گھر نہیں بلکہ یہ کوئی تاریخی کھنڈر ہے۔ وہی گرد آلود دیواریں، فرش پر بچھے ہوئے قالین میں
سے کئی بار اتنا گزرتے وقت دھول کے بادل سے اُٹھنے لگیں۔ بوسیدہ پردے جن پر کھانا کھا کر ہاتھ
پونچھنے کی وجہ سے ابھی تک لگے ہوئے سالن کے نشان، میلا سا تکیہ کا غلاف، غلیظ سی بستر کی چادر، صوفوں
کے چیتھڑے نکلے ہوئے، پرانا میز پوش جسے اس کی غریبی کے روز سے بدلا نہیں گیا، پان کے دھبے —— اور



——— یہ مکڑیوں کے جالے، نجانے ان کا میری زندگی کے ساتھ کیا تعلق ہے، کھڑکیوں میں، دروازوں میں، روشندانوں میں، دیواروں کے کونوں میں، جدھر بھی دیکھتا ہوں یہی نظر آتے ہیں ——— ساتھ کا کمرہ، وہی نیم وا کھڑکیاں، کھلے ہوئے منتظر دروازے، بانہیں پھیلائے کرسیاں ——— گویا ان کی قسمت میں روز ازل سے انتظار لکھا ہے ——— انتظار، انتظار، پیہم ——— کوئی آجائے، کوئی ——— بھولا بسرا دوست، کوئی رشتہ دار ——— بھٹکا ہوا کوئی، پل بھر کے لئے آکر بیٹھ جائے۔ صبح سویرے ان دروازوں کو کھول دیا جاتا ہے۔ جیسے انہیں حکم ہو" ادھر سڑک پر نظریں جمائے دیکھتے رہو، شاید کوئی ———" اور رات گئے تک کسی جھلسی ہوئی لاش کی بیکار آنکھوں کی طرح کھلے رہتے ہیں مگر کوئی نہیں آتا ——— کوئی ———) ——— (یہ شادی شدہ لوگ بھی کسقدر عجیب ہوتے ہیں، خود ایک جھمیلے میں پھنستے ہیں تو دوسروں کو بھی ———) "ٹن .... ٹن ..... !!" (گھڑیال نے دو بجائے ——— یہ میرے دوائی پینے کا وقت ہے مگر کوئی پلانے والا نہیں ———) "چھا ہے، چھے .... کڑی ہے" "کن پیئے ....." (میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ دوائی کو نہ چھوؤں گا) ——— (ہاں تو یہ شادی شدہ لوگ بھی کسقدر عجیب ہوتے ہیں، خود ایک جھمیلے میں پھنستے ہیں تو ———) "مرشعب گھر میں دھل کو نہیں اڑتی ؟" گھر کو کر صفتر سے رہتے ہیں، انگبستر بیدر، تکیا غلف کوں ———" ——— آہ .... آندھی...." (آندھی) ——— (ہوا کے جھکڑ چلنے شروع ہوئے۔ دور، کمروں کے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے ———) "کون ؟! - ایکن ایا ہے ؟! کون ؟ اج . . . ." (آناً فاناً ان جھکڑوں نے طوفان کی صورت اختیار کر لی - طویل درخت سائیں سائیں کرتے زمین بوس ہونے لگے ——— گرد و غبار آسمان پر سمندر کی لہروں کی طرح ———


میں چھ نئے مقامات پر آگ لگائی گئی
عبادت گاہ کو جلانے کی کوشش۔ دو جگہ بم پھینکے گئے
۲۹ جون ... دروازے کے اندر جوڑے موری میں آج صبح
جس سے ارد گرد کا تمام علاقہ لرز اٹھا۔ یہ دھماکا ایک بم کے

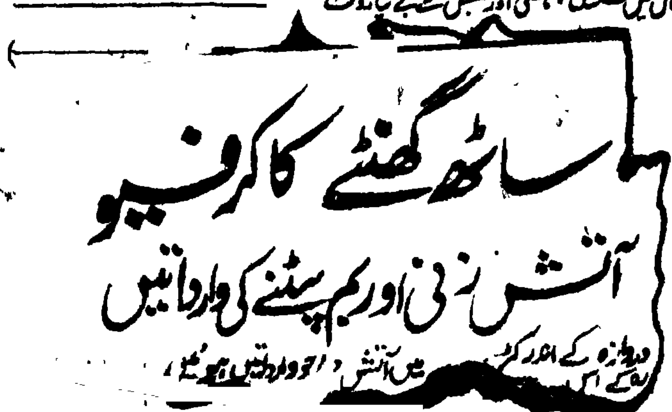
سنسان سڑک کدھر گئی ———) "من نے خدا کیا گھومن خاک ——— ہمارا گھومن خاک ——— دیا سلائی دو ——— ہم کو نہیں دکھڑا ———

(یہ کن کی آوازیں تھیں ؟!) "بھگو ، اپنی کپڑے سمیٹو ، ٹرنیل بنیا آکو سیپر مینا ہو ۔۔۔۔ بھگو ۔۔۔۔
آگ ۔۔۔۔ یہ تماگھر ہے ۔۔۔۔ ؟!" (میں بستر پر ماہیٔ بے آب کی مانند لوٹنے لگا' میری نگاہیں تاریک
ہوگئیں ، ذہن کسی مہلک بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کی مانند چکر کاٹنے لگا۔) "چکر' چکر' چکر ۔۔۔۔ تپ
۔۔۔۔ بڑی شدید تکان درد ہے ۔۔۔۔ ! . . . . ا . . . . . ا . . . . . ن . . .
. . . نہیں ۔۔۔۔ ابھی نہیں ، یکلخت . . . یک ۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔" (درد و کرب نے مجھے
اوندھا کر دیا ۔۔۔۔) "دوا پی لیجئے ۔۔۔۔!" (ساون کی ڈھلی ہوئی رات ۔۔۔۔ شبنم
کی آوارہ بوند ۔۔۔۔ پھول کی پنکھڑی ۔۔۔۔ یہ کون تھا ۔۔۔۔ ؟) ۔۔۔۔ (میں نے
اپنا سر اٹھایا ۔۔۔۔ تاریکی ، گرد و غبار ہوا اڑا لے گئی تھی ۔ کمرے میں کھڑکیوں کے رستے آفتاب کی چند شعاعیں
داخل ہو رہی تھیں ۔۔۔۔ میں نے دیکھا لانبی لانبی مرمریں انگلیوں کے جھروکوں میں پیالی ۔۔۔۔ سیاہ
زلفوں میں لپٹا ہوا کوئی نیم عریاں جسم گلابی' بل کھایا ہوا ۔) "ت . . . . تم کہاں تھیں ۔۔۔۔ ؟" (میں نے
مرتعش لہجے میں کہا) "تمہیں میرا خیال نہ آیا ۔۔۔۔ جاؤ نہیں ، دیکھو میں تنہا ہوں ، میرے قریب کوئی
بھی تو نہیں ۔۔۔۔" (وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور خاموشی سے مجھے ۔۔۔۔) "بولو ، کچھ تو بولو ۔۔۔۔
۔۔۔۔ کہو ، میں فکر زیادہ کرتا ہوں ، معمولی بخار ہے ۔ بہت جلد اچھا ہو جاؤں گا ۔۔۔۔ کہو بھی ۔۔۔۔ ؟!"
(اس نے حسرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا ، دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اس کی سیاہ پلکوں سے
نکل کر گالوں پر ڈھلک آئے) "ارے ۔۔۔۔ ؟!" (پھیکی سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آئی) "ادھر
دیکھو ، تمہیں یوں رونا نہیں چاہئے ۔۔۔۔ اپنے بازو میری گردن میں ڈالو ، کھلی ہوئی پریشان زلفوں کو
میرے شانے پر بکھیر دو ۔۔۔۔ میرے دہکتے ہوئے رخسار پر اپنا نیم بستہ گال رکھ دو ' اور جب میں تمہارے
آنسو پونچھنے لگوں تو میری انگلیاں پکڑ کر چوم لو ۔۔۔۔ پھر ، میری نگاہوں میں نگاہیں ڈال ، میری ٹھوڑی
کو اپنی انگلیوں کا سہارا دے ، اپنے لب میرے لبوں کے بے حد قریب لا کر مجھے آہستہ سے کہو ۔۔۔۔
"غمگین نہ ہو ' میں نے کائنات کا راز پا لیا ہے ۔۔۔۔ خدا سے بڑھ کر بھی ایک طاقت ہے ۔ اس سے
بہت افضل ۔۔۔۔ اس طاقت کا نام تقدیر ہے ۔۔۔۔ اس کے سامنے سبھی عاجز ہیں ۔۔۔۔ اسی تقدیر
کے محور پر یہ جہاں گھومتا ہے ۔۔۔۔ بے گناہوں کے خون ہوتے ہیں ، بچوں کی ٹانگوں کو پکڑ کر چیر دیا جاتا ہے '
اور عورتوں سے ۔۔۔۔ اب میں کبھی نہ روؤں گی ۔۔۔۔ شاکر ۔۔۔۔ ؟!" "جانے کب موت
آجائے ' اور موت کے بعد ۔۔۔۔ موت کے بعد عذاب ہے ۔۔۔۔ مسلسل ' آؤ ۔۔۔۔ یہ چند
لمحے ہنس کھیل کر گزار دیں ۔۔۔۔" آؤ بھی ، کہو ۔۔۔۔ تم اس قدر خاموش کیوں ہو ؟ مجھ سے خوفزدہ
ہو ؟! ہے نا ۔۔۔۔ ؟!! اس لئے کہ میری صورت گھناؤنی ہے ۔۔۔۔ میرے گال پچک گئے ہیں ۔۔۔۔
آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں ۔۔۔۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں ۔۔۔۔ اسی لئے نا ۔۔۔۔؟!!

(اس نے یکدم میرے ہاتھ تھام لئے اور سسکیاں بھرتے ہوئے اپنے سر کو یوں جنبش دی جیسے کہہ رہی ہو — "نہیں نہیں شہریار رکو —" — میری آواز بھرا گئی —) "پھر تم کیوں نہیں ملتی ؟! مجھے ڈر لگتا ہے، دیکھو — مجھے اس تنہائی سے — " (مگر وہ اٹھی اور یہ کہتی ہوئی بھاگ گئی" میں ابھی آئی، میں ابھی آئی —" تمام کمرے اس کی آواز سے گونج اٹھے —) "سنو !" (میں نے کہا) "ایں — ؟!" (میں نے تعجب سے اپنی چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں کھڑکیوں کے رستے آفتاب کی چند شعاعیں داخل ہو رہی تھیں) "مگر —" (میں نے تکیہ پر ہاتھ رکھا — تکیہ کا غلاف اجلا، بستر کی چادر نئی — کھڑکیوں پر آویزاں لٹکتے ریشمی پردے بے داغ — میز پوش صاف — صوفے اور قالین نئے — مکڑیوں کے جالے غائب — دیواریں — گویا اس کمرے سے بہار گزر گئی ہے — میں حیران تھا یکایک یہ تبدیلی کیوں ؟!) "میں ابھی آئی، میں ابھی آئی —" (فضا ابھی تک اس کی آواز کو اپنے پروں پر اٹھائے ہوئے تھی۔ انگیٹھی پر دھرے خوشبو دانوں سے ہلکا ہلکا دھواں بلند ہو رہا تھا —) "ہم ہیں تمہارے خیالات —" (دھوئیں میں سے چند سائے بولے —) "جو تمہارے ذہن کی انگنائی پر ناچا کرتے ہیں۔ کیا تم ہمیں پہچانتے ہو ؟!!" (میں خوف سے کانپ اٹھا۔ کس قدر تاریک تھے میرے خیالات — کبڑے، مفلوج، بیمار —) "تم بھٹک گئے ہو چلو!" "نہیں —" یہاں سے بہت پرے ایک آبشار کے کنارے (جس سے ڈھلی ہوئی چاندنی بہتی ہے) نیند کا مسکن ہے۔ پھولوں کی مہک اور جھینگروں کی راگنی اس کی محافظ ہے — قریب ہی خوابوں کی چراگاہ ہے جہاں بھٹکی ہوئی بھیڑیں آ کر چرتی ہیں۔ اس ٹکڑے کو جنسریوں کی دھن نے مسحور کر رکھا ہے —" (میں نے جمائی لی اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ میرے ساتھی مجھ سے رستہ میں ایک ایک کرکے جدا ہو گئے — اور میں نے محسوس کیا کہ میں نیند کی رانوں پر اپنا سر رکھے، اس کے مسکن کی دہلیز پر پھولوں کے درمیان لیٹا ہوں — جھینگروں کی مدھم سی آواز (جیسے کوئی کنگھی کے دانتوں کو انگوٹھے سے بجائے) رہ رہ کر — پیہم گرتی ہوئی آبشار میں گھلتی پھسلتی کانوں تک پہنچ رہی ہے اور — دور — کسی گڈریے کی جنسری کی دھن میری نگاہوں کے سامنے بدقسمتی کی ایک خاموش لکیر کی طرح ٹھہرتی ہے اور نکل جاتی ہے، ٹھہرتی ہے اور نکل — کسی کا ہاتھ میرے ماتھے پر دھرا تھا (وہی ماتھا جس پر خون کی چھینٹیں پڑی تھیں) کتنا سرد تھا وہ ہاتھ (غافل برباد بیکسوں کی آہوں کی طرح) — میں نے لاتعداد بھیڑیں چرتی دیکھیں — کوئی اپنی اگلی ٹانگوں کو دہرا کے جھکی ندی کا ٹھنڈا پانی پی رہی تھی، کوئی گھاس پر بیٹھی — میں نے انھیں گننا شروع کیا —) "ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، سات، سات، سا — " — "مبارک —" (— میں چونکا) —

"مبارک، مبارک، مبارک —" (مجھے محسوس ہوا، زخمی ہرن کو چاروں طرف سے شکاریوں نے گھیر لیا ہے۔ پیشتر اس کے کہ میں سنبھلوں، مجھے اپنے خیالات کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیے۔

(میں کمرے میں کیسے پہنچ گیا؟!) ان میں سے ایک نے بالکل بچہ اٹھا رکھا تھا ———) " یہ کس کا بچہ اٹھا لائے ہو؟!" (میں چیخا) " تمہارا ہے ———" (وہ ہنسے) " میرا؟!" (مجھے یقین نہ آتا تھا) " لاؤ مجھے دو، یہاں ——— میرے ہاتھوں پہ رکھو نا!" (ایک بھولا بھالا گول سنجیدہ سا چہرہ، موٹی موٹی اپنے ارد گرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں، فراخ پیشانی، باریک سنہری تاروں ایسے بال ——— اس نے میری طرف دیکھا ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آگئی ——— ایسی مسکراہٹ جس کے معنے شاید وہ خود بھی نہ سمجھتا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے میری گردن سے لپٹنے کی کوشش کی ———) " دیکھو، دیکھو ———" (میں مسرت سے چلایا) " خود بخود مانوس ہو رہا ہے، شیطان کہیں کا ———" (پھر اس سے مخاطب ہو کر بولا) " ارے باپ کی گردن پر ہاتھ ڈالتا ہے ——— بول، بولتا کیوں نہیں ——— ؟!" (میں نے اسے جوش الفت سے اپنے سینے سے لگا لیا ———) " اس کا نام کیا رکھنا ہے؟!" (کسی نے پوچھا) " وہی، جو میرا نام ہے" (میں نے کہا) " ہائیں ؟!" (انھوں نے دانتوں تلے اپنی انگلیاں دبا لیں) " باپ بیٹے کا ایک ہی نام ؟! ——— " تو کیا ہوا ؟!" (میں ہنسا) ——— (نہ جانے کیوں بچہ یہ سن کر کچھ گھبرا سا گیا، اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف گھورا، خوف سے اپنے اوپر کے ہونٹ کو سکیڑا گویا ابھی رو پڑے گا۔ کسی نے اسے میرے ہاتھوں پر سے اٹھا لیا ———) " کہاں لے چلے ؟!" (میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا) " ڈر گیا ہے" ——— " بچہ ڈر کیوں گیا ہے، بچہ ———" (میں اپنی خوابگاہ میں تنہا تھا) " بچہ ڈر کیوں ———" (کوئی بھی نہ لوٹا ——— جانے ایک لمحہ گذرا یا صدی ———) بچہ ڈر کیوں ———" (ممکن ہے لمحہ گذرا ہو، ممکن ہے صدی گزر گئی ہو ——— ممکن ہے وقت ٹھہر گیا ہو ——— کسی مستقل حال میں ساکت، ماضی اور مستقبل سے بے نیاز وقت ——— ———)



" بچہ ڈر کیوں گیا ———" (میں تو بیمار تھا، میرے قدموں میں چلنے کی سکت کہاں ——— بڑی مشکل سے اٹھا ———) " آخر وہ کہاں لے گئے اسے ؟!" (ان کی تلاش میں دیوانوں کا سا حال لیتا خالی خالی،

ساتھ کے کمرے میں جا پہنچا ـــــــ) "بچھڑ کیوں ـــ" (کوئی بھی نہیں ـــــ سارے کمرے دیکھ ڈالے
ـــــ کوئی بھی نہیں ـــــ) "آخر وہ ـــ" (خدا جانے کیوں مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔
ـــــ میں چیختا چلاتا اپنے ویران گھر کے احاطے سے باہر نکل گیا ـــــــ سڑکیں سنسان، مکانوں
کی کھڑکیاں، کوٹھیوں کے پھاٹک بند ـــــ دور کہیں سے دھواں اٹھ رہا تھا ـــ کتے کبھی کبھار بھونک
تو معلوم ہوتا کہ شہر ـــــــ) "یہ گولی کہاں چلی ـــــ؟!" (میں چیخا) "خموش ـ" (میری اپنی آواز کی
بازگشت مجھے سنائی دی) "آج اس شہر پہ بھوتوں کا تسلط ہے، ہر چوراہے میں بلائیں کھڑی ہیں ـــ"
(کتے رو رہے تھے) "بڑھو" میں کہتا ہوں بڑھو ـــــ تھوڑے فاصلہ پر شاید تمہارے بچے کی نعش تمہیں مل
جائے ـــــ" (میں نے درختوں سے پوچھا، وہی سیدھی سڑک کے کناروں پر کھڑے مانوس سے درخت
جنہیں میں روز دیکھتا ہوں، خاموش، مگر جن سے بات کرنے کا موقع مجھے نہیں ملا) "کیا تم نے مجھے کہیں دیکھا
ہے؟!" (کسی نے جواب نہ دیا) "میں اپنے آپ کی تلاش کر رہا ہوں ـــ" (کسی نے سر کو جنبش تک نہ دی)
"آہ ستارے ـــ!!" (میں نے سیاہ آسمان پر نگاہ ڈالی ـــ بہت سے ستارے زمین کی طرف گھور رہے
تھے، متجسس، ان بڑھے گنواروں کی طرح انھیں خوف نہ آتا تھا کہ مبادا اس غلطی سے کسی گولی کا نشانہ بن جائیں)
"شاید مریخ میں ہوں !!" (قطب مینار کی سات منزلیں تھیں، التمش کے زمانہ میں دو بادو باراں سے گر پڑیں
ـــــ اب پانچ ہیں ـــــ قطب مینار کی پانچویں منزل پر اگر کوئی لمبی سیڑھی ـــــ ایک، دو، تین،
چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ **لمبی** نو، دس، گیارہ ـــــــ چوبیس
پچیس، چھبیس، ستائیس **لمبی** اٹھائیس، انتیس، تیس، اکتیس، بتیس
ـــــــ تینتیس، چونتیس، پینتیس ـــــ
اکتالیس، بیالیس ـــــــ پچاس، اکیاون، باون
ترپن، چونتن، پچپن، چھپن ـــــــ اٹھاون ـــ
لمبی
ـــــــــــــــــــ
اکیاسی، بیاسی، ترپاسی، چوراسی، پچاسی ـ **لمبی** نوے اکیانویں، بانویں
ـــــ ایک سو نو، ایک سو دس، ایک سو گیارہ
ایک سو بارہ، ایک سو تیرہ، ایک سو چودہ، ایک سو پندرہ ـــــ میں ایک سو پندرھویں سیڑھی پر
چڑھ گیا ـــ ناگاہ میری نگاہ نیچے پڑی ـــــــــــــــ)
"..... .... | .... | .... | ...... "
(میں **دھڑام** سے زمین پر آ رہا ـ مجھے یقین تھا، میں مر چکا ہوں گا ـــــ میں نے ڈرتے ڈرتے
آنکھیں کھولیں ـــــ) "کوئی بھی نہیں ـــ" (کمرے میں کھڑکیوں کے رستے آفتاب کی چند شعاعیں

داخل ہو رہی تھیں، انگیٹھی پہ دھرے خوشبو دانوں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا، اور میں اپنے نرم بستر پہ دراز ———) "میرا بچہ کہاں ہے؟!" (میں ان سایوں سے مخاطب ہوا جو ایکبار پھر مجھے دھوئیں میں متحرک نظر آئے — یہ وہی تھے جن کی مجھے تلاش تھی — اب کہاں سے آ ٹپکے یوں اچانک ———) "میرا بچہ کہاں ہے؟!" (میں چلایا) "ہم اسے لے آئے ہیں" (کسی نے ہنس کر کہا) ——— (بچہ میرے قریب کھڑا تھا) "اتنا بڑا ہو گیا ہے کیا؟!" (میں نے تعجب سے پوچھا) "بڑا کہاں ہوا ہے، ابھی چار سال ہی کا تو ہے با!" ——— "چار سال ———؟!" (میں گھبرا گیا) "کیا مجھے بیمار پڑے چار سال گذر گئے ہیں؟!" (کوئی نہ بولا، سب خاموشی سے میرا منہ تکنے لگے ——— صرف ایک عورت خاکستری ساٹنی دوپٹہ اوڑھے میرے قریب آکر بیٹھ گئی اور میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھدیا) ——— (میرے چہرے کا رنگ بدلا، میرے ابرو تن گئے (میں نہیں جانتا مجھے کیا ہوا) میں نے غصے سے اپنے ہاتھوں کو بھینچا ——— مگر غالباً میرے خیالات نے میری اس کیفیت کو بھانپ لیا، ان کے خدوخال پر خوف کے آثار نمودار ہوئے۔) "نکل جاؤ یہاں سے تم سب کے سب ———" (میں زخمی شیر کی طرح چنگھاڑا ——— وہ ساکت کھڑے رہے ———) "سنا نہیں تم نے؟! میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ ——— مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے ———" (میں نے انھیں دھکے مار مار کر باہر نکال دیا) "ہمیں نہ نکالو، ہم کہاں جائیں گے؟! ہم فضا میں منتشر نہیں رہ سکتے، ہمارا مسکن تمہارا ذہن ہے، صرف تمہارا ذہن، ہم کسی اور کے ———" (میری ٹھوکر سے کئی لڑکھڑا کر گر پڑے، اٹھے اور اپنے سر اور چہروں کو بازوؤں میں چھپاتے نکل گئے ———) (اب پھر وہی ننھا سا خاندان، مختصر سی دنیا ——— میں نے اپنے بچے کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھا وہ مسکرا دیا ———) "ابا میاں!!" (اس نے بھولے انداز میں کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا کسی نے میرے دل کے انتہائی تاریک گوشوں میں شمع جلا دی ہے ———) "ایکبار پھر کہو ———" (میں نے اسے گود میں اٹھا لیا، اس کی ماں ابھی تک خاموش بیٹھی تھی) "اف ———" (نجانے مجھے کیا ہوا) "جاؤ ———!" (میں نے پیار سے اس کی ماں کو کہا) "اسے دوسرے کمرے میں لیجاؤ، کھلونوں سے بہلاؤ، میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں ———" (وہ اٹھی، بچے کو میری گود سے لیا اور چلدی) "سنو!" (وہ ذرا رکی) "اس کی قمیص کا بٹن کیوں رکھ چھوڑا ہے، اگر اسے سردی لگ گئی تو ———؟!" (وہ ہنس پڑی) "سردی تو کوئی نہیں، میں نے بٹن اس لئے کھلا چھوڑا ہے کہ کہیں اس کی گردن کو تکلیف نہ ہو، بچے کی گردن بہت نازک ہوتی ہے ——— لیکن تمہیں اس کا کتنا خیال ہے۔" (اس کی آنکھوں میں ایک چمک آئی۔ وہ چلی گئی) ——— (میں تنہا تھا، پہلے کی طرح ———) "بچے کی گردن بہت ———" (مگر اس تنہائی میں قریب کے کمرے سے میرے بچے کے ہنسنے اور اپنی ماں کے ساتھ باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی اور مجھے تسکین تھی ———) "ہاں تو میں کیا سوچنا چاہتا ہوں؟!" (میرے ذہن کی اداس فضا میں میرے اپنے الفاظ گونجے ——— مشورہ

دینے والے جا چکے تھے ——) "بچے کی گردن بہت ——" (عجیب بات ہے) "مجھے بیار پڑے چار سال گزر چکے ہیں ؟!" (ٹھیک ہی تو ہے، اصل میں میری بیاری پرانی ہو چکی ہے۔ اب صرف موت ہی ——) "موت —— تب —— کتنا بھیانک تصور ہے —— سعد ——" (چاندنی رات گرمیوں کی، ڈھلے ہوئے بستر پر سیدھے لیٹ کر سفید چادر سے بدن ڈھانپے —— جیسے مردہ پڑا ہو —— لاش ——) "کہتے ہیں مرتے وقت ہمیشہ شام کا سماں آنکھوں کے سامنے آتا ہے —— تھکی تھکی کوئی طویل افسردہ سی شام، جب دو وقت آپس میں مل رہے ہوتے ہیں ——" (ہاں تو کوئی لاش، کسی جھلسے ہوئے بازار میں پڑی، سوگوار کھنڈروں کے قریب ——) میں کتنا خوش نصیب ہوں ——" (میں مسکرا پڑا ——) مجھے ایک کھلونا مل گیا ہے، کیا اسے میں نے پیدا نہیں کیا ؟!" (ایک پودا، آٹا سا —— جسے میں جس رخ چاہوں موڑ سکتا ہوں، توڑ سکتا ہوں ——) —————— (ان دبلے دبلے لوگوں سے مجھے کتنی نفرت ہے —— سڑکوں پر خزاں رسیدہ پتوں کی طرح —— پژمردہ سے، دفتروں میں بیٹھنے والے —— ہر ایک کے ہونٹوں پر کوئی نہ کوئی شکایت ہے ——) "چھری کی معمولی خراش سے انہیں ڈھیر کیا جا سکتا ہے —— موت سے کتنا ڈرتے ہیں —— "مگر زندہ وہی رہتا ہے جو ہر لمحہ مرنے کو تیار ہو اور جو ——

کوئی شخص موجود نہیں ... پنجاب میل پونے نو بجے لاہور پہنچی تھی۔ اس میں چھ تھیں جن پر برچھوں کے زخم تھے اس ٹرین میں ۳۰۰ اشخاص ایسے تھے جو لاہور اتر رہیں۔ ۲ بچے ایسے ہیں جن کے ساتھ ان کے والدین نہیں ان میں سے ایک کی عمر نو ماہ ہونے دو سال کی ہے۔ شام کے چھ بجے نکلا اپ پٹھانکوٹ سے آئی۔ اس میں ۷۰ زخمی تھے پہنچا دیا گیا ہے

—— آنسو پونچھ ڈالو —— آج کوئی نہ روئے ——)

ن کی مثال نہ مل سکے گی

... پانچ آدمی برچھے سے ہلاک کئے۔ اس نے مغرور ... انہیں بتلایا کہ اس رات ایک سو پچاس افراد قتل کئے گئے۔ وزیر اعظم پنجاب بیان فرماتے ہیں۔ ... سے دیکھ ... چشم خود دیکھتے آئے ہیں ... مہاجرین قافلہ در قافلہ نامعلوم

... کی طرف چلے جا رہے تھے۔ بیاس اور کرتار پور کے درمیان موصوف نے مہاجرین کا ایک قافلہ دیکھا۔ جو ایک میل لمبا تھا۔ ... ترین تاریخ کی تفصیل ہے ہجرت کر کے ... ہم تین گھنٹے کے سفر کے بعد جب جالندھر ... مشرقی ...

"میں اس کی تعمیر کروں گا، ویرانوں میں ـــــ سب کی نگاہوں سے چھپا کر ـــــ سب سے مختلف ـ سب سے ـــــ اسے مرنا سکھاؤں گا ـــــ" (واہیات ہے، میں ان ہونی باتیں کر رہا ہوں) "اس کے لئے بہت سی دولت چھوڑ جاؤں گا اور اسے کہوں گا ـــــ" "بیٹا، جی بھر کر ظلم کرو، ستم ڈھاؤ ـــــ جب تک تم ستم نہ ڈھاؤ گے، خدا کی معصوم مخلوق کو بے دریغ قتل نہ کرو گے، تمہاری موجودگی کا اس جہان میں کسی کو احساس نہ ہوگا ـــــ" (خرافات ہیں، میں فطرتاً مختلف ہوں، اسے یہ نہ سکھا سکوں گا) اس نے سدا دنیا میں نہیں رہنا ـــــ ایک دن مرنا بھی ہے اور پھر خدا کے سامنے کھڑے ہو کر ـــــ نہیں، نہیں میں اس کی عاقبت کسی قیمت پر بھی تاریک نہ ہونے دوں گا ـــــ" (اس جہان کا قیام عارضی ہے، یہاں اپنی موجودگی کا احساس پتھروں اور دیواروں کو دلانا ہے ـــــ یہاں رہ کر وہ ہر طرح سے انسان بنے گا ـ) "انسان کی کیا وقعت ہے ـــــ سڑکوں پر اوندھے منہ پڑے سڑتے ہوئے کتے ـــــ" (میں اسے انسان نہ بننے دوں گا ـــــ ابھی وہ بچہ ہے مگر کچھ عرصہ کے بعد ـــــ) "میں بھی کسقدر عجیب باپ ہوں ـــــ اپنے بچے کی بہتری کے بارے میں نہیں سوچ سکتا ـــــ وہ میرا ہے، مجھے اس سے الفت ہے ـــــ لیکن اسے الفت کرنے کے باوجود بھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا ـــــ میں کسقدر بیوقوف ہوں، میری محبت سرتاپا مجازی ہے ـــــ" (مگر کیا طریقہ ہو ـــــ ؟!) "میں تو غروب ہوتا ہوا آفتاب ہوں ـــــ شفق نے خیرباد کہا اور میرا جنازہ اٹھا، گناہوں کی یہ تعداد کر فرشتے لکھتے لکھتے عاجز آ گئے ـــــ ایک آدھ اور کر لوں تو کونسا فرق پڑ جائیگا، یہی نا ایک اور جنبش قلم ـــــ" (لیکن کونسا گناہ؟ اپنے بچے کیلئے ذریعہ ڈھونڈنا کیا گناہ ہے؟!) "وہ ابھی فرشتہ صورت ہے، فرشتہ سیرت ہے ـــــ میں اسے گناہوں سے پاک رکھ سکتا ہوں، ایک فرشتہ کی طرح ـــــ" (میں اسے انسان نہ بننے دوں گا، دیکھتا ہوں خدا کیونکر میرے رستہ میں حائل ہوتا ہے) "تم کیا لینے آئی ہو؟!" ـــــ "جرابیں" ـــــ "ننھا کہاں ہے؟!" ـــــ "سو رہا ہے" ـــــ "اسے جگا دو، خدا کے لئے اسے جگا دو" ـــــ "کیوں، کیا ہوا؟!" (میں اپنے جذبات کی شدت پر خود حیران تھا ـ ہنس پڑا) "کچھ نہیں ـــــ یونہی ڈر سا لگا کہ کہیں آج کا سویا پھر کبھی نہ اٹھے" ـــــ "کیا خرافات بک رہے ہو" (اس نے توجہ نہ دی) "سنو" (میں نے کہا) "ننھے کو میرے ساتھ لٹا دو" ـــــ "کیوں؟!" ـــــ "مجھے پیار آ رہا ہے" (وہ مسکرا کر نکل گئی) ـــــ

مجھے روشندانوں میں سے اپنے گناہوں کی گٹھریاں لٹکتی نظر آ رہی تھیں ——) "نجانے کتنے دن اور زندہ رہوں" (یہی میرا زادِ سفر ہوگا ——) "سلو ——" (وہ ننھے کو لے آئی اور میرے پہلو میں لٹا دیا —— ننھا مدہوش سو رہا تھا، اسے علم نہ تھا کہ میرے پاس لیٹا ہے، ورنہ جاگ اٹھتا (اسے مجھ سے محبت ہے) اور باتیں کرتا —— ضرور پوچھتا —— "سڑکیں خاموش کیوں ہیں؟! یہ گھر کون جلاتا ہے؟ یہ کون لوگ آئے ہیں ہمارے شہر میں، مہمان؟! یہ روتے کیوں ہیں؟! انہوں نے کہاں جانا ہے؟ لاش کیا ہوتی ہے؟ کس طرح کی ہوتی —— مگر وہ سو رہا تھا، اس کی باداموں ایسی آنکھیں بند تھیں، بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے، گردن کا بٹن اسی طرح کھلا تھا —— میرا ہاتھ اس کی گردن کی طرف بڑھا۔ میں نے بٹن —— قمیص قدرے تنگ تھی ——) "کتنی بیوقوف ہے اس کی ماں، ساری مائیں بیوقوف ہوتی ہیں، اپنے لاڈلوں کو بگاڑ دیتی ہیں —— کیسی پیاری ہے اس کی صورت، فرشتہ ——" (نہ جانے میرا ہاتھ کیوں واپس نہ آیا —— اس کا سانس اکھڑنے لگا —— اس نے ابرو تلنے جیسے کسی شدید کرب کا طوق گلے سے اتار پھینکنا چاہتا ہے —— اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ غیر ارادی طور پر اٹھائے اور میری انگلیوں کو پکڑنا چاہا، جو یوں معلوم ہوتا تھا۔ اس گردن پر جم گئی ہیں —— اس نے گھبرائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا —— لرزا۔ (اب اس کے سانس اٹک رہے تھے) چیخنے کی کوشش کی —— چیخا اور ——) "میں نے ننھے کی چیخ سنی ہے؟! —— کوئی بھی تو نہیں ——" (اس نے ننھے پر نگاہ ڈالی —— ننھے کی گردن کا بٹن بند تھا، منہ سے خون کی باریک سی لکیر بل کھاتی ہوئی ایک طرف کو لڑھک گئی تھی، آنکھیں کھلی تھیں، مٹھیوں میں چادر بھینچی ہوئی تھی، ٹانگیں ——) "تم . . . . تم . . . . تم . . . . خونو، تم ——" (اس نے جھپٹ کر بچہ اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا) "تم نیں معصوم کا خون —— الٰہی —— تم نے —— باپ نے —— آہ، آہ، آہ ——" (وہ دروازے کی طرف چلاتی ہوئی لپکی —— ننھے کے بازو چھپا ہوا اس کے کندھوں سے کسی سوکھے ہوئے درخت کی ٹوٹی شاخوں کی طرح لٹک رہے تھے) "واپس آ جاؤ، میں کہتا ہوں —— سنو تو سہی —— میں نے جہنم قبول کیا ہے —— میں کہتا ہوں میں نے اپنے بچے کی آخرت کی خاطر —— یہ میری محبت کا سودا ہے —— مجھے اس سے محبت ہے، سچ مجھے اس سے —— یہاں آؤ، تم کہاں ہو —— آؤ ہم دونوں مل کر روئیں گے —— تم اپنے ننھے کے لئے رونا اور میں —— مجھ سا شفیق باپ کوئی نہیں —— کون ہے جو میری طرح اپنی اولاد کی خاطر —— یہ دنیا بڑی مطلبی ہے —— مجھ سا شفیق باپ —— آؤ بھی، میں تمہیں —— بلا رہا

ہوں ——— (ٹن ——— کمرے میں دھواں بھر
چکا تھا ——— میرا دم گھٹنے لگا ——— ٹ ——— میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں)
"کوئی بھی تو نہیں ——— (میں سر سے پاؤں ٹن تک پسینے سے شرابور تھا، میرے ہاتھ کانپ
رہے تھے، دل دھڑک رہا ——— تھا ———
)
"ارے، گھڑیال نے تو اب دو بجائے ہیں؟" ——— (پہلے غالباً
میرے ذہن میں ——— یا ممکن ہے آج گھڑیال کی سوئیاں دوپہر کئی گھنٹوں بلکہ ———) "دھواں
کدھر ———" (میں نے اپنی چاروں طرف دیکھا ——— کمرے میں کھڑکیوں کے رستے آفتاب کی
چند شعاعیں داخل ہو رہی تھیں۔ ہر طرف ایک ویرانی سی چھائی تھی، جیسے یہ کسی انسان کا گھر نہیں بلکہ کوئی
تاریخی کھنڈر ہے۔ وہی گرد آلود دیواریں، فرش پر بچھے ہوئے قالین میں مٹی کی یہ انتہا کہ گذرتے وقت
دھول کے بادل اٹھنے لگیں۔ بوسیدہ پردے جن پر کھانا کھا کر ہاتھ پونچھنے کی وجہ سے ابھی تک لگے ہوئے
سالن کے زرد نشان، میلا سا تکیہ کا غلاف، غلیظ سی بستر کی چادر، صوفوں کے جیتھڑے نکلے ہوئے
پرانا میز پوش جسے اس کی خرید کے روز سے بدلا نہیں گیا، پان کے دھبے ——— اور .... اور یہ مکڑیوں
کے جالے، نجانے ان کا میری زندگی کے ساتھ کیا تعلق ہے، کھڑکیوں میں، دروازوں میں، روشندانوں
میں، دیواروں کے کونوں میں، جدھر بھی دیکھتا ہوں یہی نظر آتے ہیں ——— ساتھ کا کمرہ،
وہی نیم وا کھڑکیاں، کھلے ہوئے منتظر دروازے، بازو پھیلائے کرسیاں ——— گویا ان کی قسمت
میں روز ازل سے انتظار لکھا ہے ——— انتظار، انتظار، پیہم ——— کوئی آ جائے،
کوئی ——— بھولا بسرا دوست، کوئی رشتہ دار ——— بھٹکا ہوا کوئی، پل بھر کے لئے
آ کر بیٹھ جائے۔ صبح سویرے ان دروازوں کو کھول دیا جاتا ہے۔ جیسے انھیں حکم ہو "ادھر سڑک
پر نظریں جمائے دیکھتے رہو، شاید کوئی ———" اور رات گئے تک کسی جھلسی ہوئی لاش
کی بیکار آنکھوں کی طرح کھلے رہتے ہیں مگر کوئی نہیں آتا ——— کوئی ———
)
——— (کہیں دور، سڑک پر آگ بجھانے والا انجن اڑتا چلا جا رہا تھا ———

شفیق الرحمٰن

سراب

اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ پھیل چکی تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے تکیے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ دریچوں سے سرو اور چنار کے درختوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ نیلگوں چمکیلے آسمان میں ایک بادل بھی نہیں تھا۔ خنک ہوا کا جھونکا آیا اور خوشبوئیں بکھیر گیا۔ اس نے اپنے چہرے پر تازگی اور نور کا لمس محسوس کیا۔

چاروں طرف ایک جیسے پہاڑ تھے۔ بالکل خشک اور بنجر۔ کہیں سبزے کا نام تک نہ تھا۔ اس کے باوجود اسے وہ پہاڑ اچھے معلوم ہوئے۔ شاید اس لئے کہ یہ پہاڑ اجنبی تھے۔ یہ خطہ اجنبی تھا۔ آسمان کا یہ حصہ اجنبی تھا۔ یہاں وہ پہلی مرتبہ آیا تھا۔

گھنٹی بجا کر اس نے چائے منگوائی اور سگریٹ سلگا کر دھوپ میں جا بیٹھا۔ رات اسے وہ خواب پھر نظر آیا تھا۔ وہی خواب جسے وہ مدتوں دیکھ رہا تھا جو اصل سے بے معنی تھا — بے معنی اور عجیب سا۔ نہ جانے یہ خواب اسے بار بار کیوں نظر آتا تھا۔ کبھی مکمل اور کبھی حصوں میں۔ لیکن ہر بار بلا کسی تبدیلی کے جوں کا توں ہوتا۔

خواب یوں شروع ہوتا جیسے ایک ویرانہ ہے۔ لامتناہی اور ہیبت ناک ویرانہ — جس میں نہ کہیں نشیب نہ فراز۔ نہ کوئی نشانِ راہ ہے نہ نشانِ منزل۔ ایک مبہم سی پگڈنڈی پر وہ چلا جا رہا ہے — پگڈنڈی جو شاید اس کے اپنے وہم کی تخلیق ہے۔ آسمان پر پورا چاند ہے تارے بھی ہیں۔ لیکن پھر بھی چاروں طرف تاریکی۔ چاند کی تابانی بے نور ہے۔ تاروں کی دمک معدوم ہے۔ زمین و آسمان بالکل تاریک ہیں۔ چلتے چلتے جیسے [illegible] گذر جاتی ہیں۔ پھر ایک دھندلی سی پگڈنڈی نظر آنے لگتی ہے اور ایک موہوم سی شبیہہ — جو قریب تر ہو جاتی ہے۔ پگڈنڈی آ ملتی ہے اور وہ شبیہہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے — وہ اسے دیکھتا ہے۔ ایک [illegible] حسینہ — جس کے خدوخال اجنبی ہیں جس کا لباس اجنبی ہے جس کے ہونٹ خاموش ہیں۔ وہ اس کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ اپنا بازو اس کے گرد حائل کر دیتا ہے۔ وہ اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیتی ہے۔ دونوں خاموشی سے چلتے جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے چاند تاروں کا نور لوٹ آتا ہے۔ زمین و آسمان جگمگا اٹھتے ہیں۔ پھر ایک جگہ پگڈنڈی جدا ہوتی ہے اور وہ بغیر ایک لفظ کہے جدا ہو جاتی ہے۔ جدا ہوتے وقت وہ ایسی نگاہ سے دیکھتی ہے جیسے ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہی ہو۔ ظلمتیں عود کر آتی ہیں، نور چھپ جاتا ہے۔ وہ اسے دیر تک ویرانے میں گم ہوتے دیکھتا ہے اور اپنے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ اس آسمان تلے جس میں بے نور چاند

تارے ہیں۔ اس زمین پر جہاں نہ کوئی نشانِ راہ ہے نہ نشانِ منزل ——— اس پگڈنڈی پر جو شاید اس کے وہم کی تخلیق ہے۔

اس کے بعد خواب کا دوسرا حصہ نظر آتا ہے جیسے چاروں طرف بادل ہی بادل ہیں۔ اُجلے بادل، بھورے بادل، اودے رنگ کے بادل، مختلف شکلوں کے، طرح طرح کے بادل۔ کائنات میں بادل ہی بادل ہیں۔ سامنے اُفق پر بادلوں کے اوپر سنگِ مرمر کا ایک قصر ہے۔ جس کے نوکدار برج آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ خوشنما مینارے اونچے چلے گئے ہیں۔ فصیلیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بادلوں میں یہ شفاف قصر نہایت خوشنما معلوم ہو رہا ہے۔ قصر کے بڑے دروازے تک راستہ جاتا ہے۔ بل کھاتا، مڑتا ہوا ——— پُر پیچ راستہ۔ جو کبھی بادلوں کے کنارے کو چھوتا ہے تو کبھی ان کے حاشیوں کو، کبھی بادلوں میں سے گذرتا ہے۔ کہیں کہیں دھند نے راستے کو چھپا رکھا ہے ایک دریچے میں کوئی کھڑا ہے ——— شاید وہی اجنبی حسینہ جس کے خد و خال اتنی دور سے اچھی طرح پہچانے نہیں جاتے جیسے وہ کسی کی منتظر ہے۔ بڑے انہماک کے ساتھ وہ اس بل کھاتے ہوئے راستے کو طے کر رہا ہے۔ ہر طویل وقفے کے بعد اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ راستہ اتنے کا اتنا باقی ہے اور وہ اجنبی حسین چہرہ اتنا ہی دور ہے۔

پھر جیسے وہ چہرہ غائب ہو جاتا ہے اور دیکھتے دیکھتے قصر میں شگاف آ جاتے ہیں۔ برج منہدم ہو جاتے ہیں، مینارے مسمار ہو جاتے ہیں ——— آناً فاناً سب کچھ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس کے پاؤں تلے راستہ شق ہو جاتا ہے اور وہ گرتا چلا جاتا ہے ——— ایسی فضاؤں میں جہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ جہاں صرف دلدوز تاریکی ہے۔ وہ عمیق گہرائیوں میں، ظلمتوں میں، گرتا چلا جاتا ہے ——— جہاں خلا ہے، نہ ختم ہونے والا خلا۔ . . .

. . . . یہاں اس کی آنکھ کھل جاتی۔

•

وہ رات کی گاڑی سے وہاں پہنچا تھا۔ پورے دو سال کے بعد بھی سیاحت پر نکلا تھا۔ اتنے دنوں اسے اس طویل چھٹی کا انتظار رہا اور اس نے ایک دن کی بھی چھٹی نہ لی۔ اس مرتبہ وہ ایسے ملکوں کی طرف جا رہا تھا جن کے متعلق بچپن سے اتنی باتیں سنتا آیا تھا۔ جنہیں دیکھنے کا اسے بے حد اشتیاق تھا۔ سگریٹ ختم ہو چکا تھا۔ دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اس بے معنی خواب پر غور کیا ——— کاش کہ ایسے اداس کر دینے والے خواب اسے نظر نہ آیا کریں۔ وہ اداس نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ مسرور رہنا چاہتا ہے۔ آزاد، بے فکر اور مسرور۔ تبھی تو اسے سیاحت اس قدر مرغوب تھی۔ اس کی محبوب ترین یادیں سیاحت سے وابستہ تھیں اس نے اجنبی آسمانوں تلے طرح طرح کے نظارے دیکھے تھے ——— نظارے جو دل و دماغ سے چسپاں ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ یادیں کیسی دلفریب تھیں اور یہ تو اسی دنیا کی یادیں تھیں۔ اس کا بس چلتا تو کائنات کے ایک ایک سیارے کو دیکھتا ——— تاریکیوں کے اس بے کراں سمندر کی دوسری طرف ——— جہاں ننھے منے تاروں میں لاتعداد دنیائیں آباد ہیں۔ جہاں چاند ہیں، سورج ہیں، کہکشاں ہیں ——— جہاں لوگ بستے ہیں۔ وہ سب کچھ دیکھنا چاہتا

تھا۔ وہ زندگی کا ہر نیا دن کسی نئی جگہ گذارنا چاہتا تھا۔

یہ جہاں گردی کی عادت اُسے شروع سے تھی ـــ شاید بچپن سے ۔ اُسے وہ دن یاد تھے۔ جب اُسے گھر سے دور سکول بھیجا جاتا۔ اتنی دور کہ سال میں صرف ایک مرتبہ گھر آسکتا۔ اس کے ابا ایسے علاقے میں تعینات تھے۔ جہاں جنگل ہی جنگل تھے۔ دُور دور تک کوئی سکول نہ تھا۔ امی سے جُدا ہوتے وقت وہ کتنا رویا کرتا۔ روانگی سے کئی دن پہلے وہ امی کو دلاسے دینے شروع کر دیتا ـــ امی میں کی چھت پر میں سفید سفید پتھر پھینک رہا ہوں انہیں دیکھ کر مجھے یاد کر لیا کرنا۔ امی میں یہاں دو گیندے کے پودے لگا رہا ہوں۔ ان میں پھول آئیں گے تو میں بھی یاد آیا کروں گا۔ اس گیلے فرش پر میں نے اپنے قدموں کے نشان چھوڑ دیئے ہیں خشک ہونے پر نشان پختہ ہو جائیں گے ـــ اور امی کس قدر مغموم ہو جاتیں۔ ان کی آنکھیں نمناک رہتیں۔ چھٹیوں میں لمحے بھر کےلئے وہ اسے جدا نہ ہونے دیتیں۔ صبح صبح سب سے پہلے وہ اس کا چہرہ چومتیں اور دیر تک دیکھتی رہتیں۔ جدا ہوتے وقت ابا تو سر پہ ہاتھ پھیر کر بازو کو ذرا سا تھپتھپا دیتے۔ لیکن امی دور تک ساتھ جاتیں۔ ساتھ ننھی بہن بھی ہوتی جو امی کو غمگین دیکھ کر رونے لگتی۔ سکول پہنچ کر وہ امی کو طرح طرح کی چیزیں بھیجتا، ہر تیسرے روز خط لکھتا۔ امی شام کو جو مغرب سے چمکیلا تارا طلوع ہوتا ہے۔ اسے میں دیر تک دیکھتا رہتا ہوں۔ آپ بھی اُسے اُٹھ کر دیکھا کیجئے۔ صبح صبح اٹھ کر دعا مانگتا ہوں پچھلی رات کا پھیکا سا چاند نکلتا ہے تو اُسے دیکھتا ہوں کہ شاید آپ بھی نماز پڑھ کر اُسے دیکھ رہی ہوں سکول کے اور بچے اپنے والدین کا ذکر کرتے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے کیسا کیسا جی چاہتا کہ وہ بھی اپنے گھر میں رہے۔ جہاں والدین کا پیار میسر ہو۔ کھیلنے کے لئے ننھی بہن ہو۔

سکول بدلتے رہے۔ اُسے نئی نئی جگہوں پر بھیجا گیا۔ وہ والدین کے پیار اور عزیزوں کی شفقت سے سدا محروم رہا۔ اسے کبھی اندازہ نہ ہو سکا کہ گھر کی چار دیواری میں کیسی زندگی ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ اُسے تنہا جینے کی عادت پڑ گئی اور ساتھ ہی سیاحت کی بھی۔

شہر میں گھومتے ہوئے اس نے ہر چیز میں غیر ملکی اثر محسوس کیا۔ مکانوں کی طرزِ تعمیر مختلف تھی۔ لوگ اور طرح کے تھے۔ ان کے لباس، خد و خال ـــ زبان ـــ سب مختلف تھے۔ اسے یہ سب کچھ بے حد پُر اسرار اور نیا معلوم ہو رہا تھا۔

ایک دکان کے سامنے اس نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو کچھ گنگنا رہا تھا۔ اس کی بغل میں کتابیں تھیں عمر ساٹھ سے اوپر تھی۔ بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں اور آنکھوں پر موٹے شیشوں کی ٹوٹی ہوئی عینک۔ پھٹے ہوئے پرانے لباس کے باوجود اس کے چہرے پر وہ وجاہت تھی جو عمر کے ساتھ آجاتی ہے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے کبھی اچھے دن بھی دیکھے ہیں۔ وہ ایک عشقیہ غزل گا رہا تھا۔ نہایت ادنیٰ مضمون کی جیسے عموماً تیسرا طبقہ گایا کرتا ہے۔ جب وہ آواز اونچی اٹھاتا تو گردن کی رگیں پھول جاتیں گلا

بھر اجاتا، اور کبھی کبھی سانس بھی رُک جاتا۔ جلدی سے سانس لے کر وہ پھر گانے لگتا۔ جب غزل ختم کر چکا تو اس نے بلند آواز سے بتایا کہ یہ غزل اس کتاب کی تھی۔ کتاب میں ایسی اور بہت سی غزلیں ہیں۔ کتاب کی قیمت بھی بتائی — لیکن کوئی خریدار نہ آیا — کچھ انتظار کے بعد اس نے ایک اور غزل شروع کر دی۔ چند لڑکوں نے فقرہ کسا۔ بڈھے میاں اس عمر میں عشق و محبت کی باتیں — آرام سے بیٹھ کر اللہ اللہ کیوں نہیں کرتے بوڑھے نے گرفتہ چشم سے ان کی طرف دیکھا آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور ایسی نگاہوں سے زمین کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ بیحد تھکا ہوا ہو۔

اس نے ایک کتاب خریدی اور روانستہ دو پر کچھ دام زائد دے دیئے۔ بڑھا ابھی گن ہی رہا تھا کہ وہ جلدی سے چل دیا۔ اسے بوڑھے کی آواز سنائی دی جس نے بلا کر زائد دام لوٹا دیئے۔ اس نے دیکھا کہ بوڑھے کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔

وہ شہر کی سب سے پُر رونق سڑک پر چل رہا تھا جہاں دکانیں طرح طرح کی چیزوں سے سجی ہوئی تھیں موتیوں دار کوٹ، بالوں والے ملائم جوتے، خوشنما قالین — ہاتھی دانت کے دستے کے خنجر — وہ ہر دکان کے سامنے کچھ دیر ٹھہرتا — اسے ایک مانوس چہرہ دکھائی دیا۔ نزدیک جا کر دیکھا تو ایک پرانا دوست نکلا۔ دونوں بڑی گرمجوشی سے ملے۔ زمانۂ طالب علمی میں دونوں بڑے گہرے دوست تھے۔ عرصے تک ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے۔ بڑے اشتیاق سے دونوں نے ایک دوسرے کے متعلق سوال پوچھے۔ بیتے ہوئے دنوں کی باتیں کرنے لگے۔ پرانی باتیں، پرانے واقعات، پرانے قصے — لیکن یہ باتیں بہت جلد ختم ہو گئیں۔ انہی چیزوں کو دہرا دہرا کر اکتا گئے۔ اسے کچھ مایوسی سی ہوئی۔ دونوں کے خیالات بہت بدل چکے تھے۔ اب کوئی نیا موضوع ہی نہیں ملتا تھا۔ رفاقت کا وہ احساس جو چند لمحے پہلے اس شدت کے ساتھ محسوس ہوا تھا غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ اجنبیت نے لے لی۔ شاید وہ خود بدل گیا تھا۔ شاید یہ بدلنا فطری تھا۔ پرانے دنوں کے بعد دونوں زندگیوں کے موڑ مختلف رہے تھے۔ اسے بڑا تعجب ہوا — فاصلہ اور وقت انسان کو کس طرح بدل دیتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پہلے کبھی نہیں ملے۔ اس کا دوست دوپہر کی گاڑی سے جا رہا تھا۔ یہ اسے چھوڑنے گیا۔ جب وہ وقت گذارنے کے لئے بے معنی سی گفتگو کر رہے تھے تو اسے ایک ضعیف انسان کی باتوں نے متوجہ کر لیا۔ وہ اپنے بیٹے سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کا بیٹا کہیں دور جا رہا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے آیا تھا۔ وہ اسے نصیحتیں کر رہا تھا۔ اپنا دل پتھر کا بنا لو، قسمت پر کبھی بھروسہ مت کرنا۔ قسمت ہمیشہ دغا دیتی ہے۔ دلیری، صبر اور تحمل میں نے زندگی بھر انہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اب تم جوان ہو۔ تمہیں دلیر اور سخت دل ہونا چاہئے — اپنی زندگی اپنے ہاتھوں ترتیب دینی چاہئے۔ یہ یاد رکھو کہ تمہارے باپ نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ اس کے سامنے تقدیر اور تدبیر دونوں کانپتی تھیں۔

گاڑی کی روانگی کا وقت قریب آیا تو اس کا اندازِ گفتگو بدل گیا۔ وہی معمر تجربہ کار بزرگ جو اپنے بیٹے

کو سبق دے رہا تھا۔ بالکل بچوں کی سی باتیں کرنے لگا۔ اس کے عمر رسیدہ چہرے پر کرب کی لہر دوڑ گئی۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ بمشکل آنسو ضبط کر سکا۔

"اسی طرح لکھا ہے بیٹا کہ میری اس عمر میں تم مجھ سے اتنی دور رہو۔ اگر تمہاری والدہ زندہ ہوتی تو شاید مجھے تمہاری جدائی اس قدر محسوس نہ ہوتی۔ لیکن اب مجھ سے تنہائی برداشت نہیں ہوتی۔"

گاڑی نے سیٹی دی۔ بوڑھا آنسو نہ روک سکا۔

"جانِ پدر، معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری ملاقات ہے — لاؤ میں تمہاری پیشانی پہ بوسہ دوں۔ جب تم ننھے سے تھے تو تمہیں رخصت کرتے وقت میں ہمیشہ تمہاری پیشانی چوما کرتا تھا۔"

"آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟" نوجوان لاپرواہی سے بولا۔

"میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ آخری ملاقات ہے — تم نہیں جانتے۔ اس عمر میں ایک ایک لمحہ گنا گنایا ہے۔" بوڑھے نے بیٹے کی پیشانی کو یوں چوما جیسے وہ ایک ننھے سے بچے کو پیار کر رہا ہو۔ گاڑی نے جنبش کی۔ بوڑھے نے جلدی سے کچھ نوٹ نکالے اور بیٹے کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

"یہ لو میں تو بھول ہی گیا تھا۔"

"نہیں ابا — میری تنخواہ بہت ہے۔ مجھے اب ضرورت نہیں۔"

"تمہیں ضرورت نہ ہو۔ لیکن میرے لئے تم وہی ننھے سے بچے ہو — یہ لو۔"

بوڑھا لڑکھڑاتے قدموں سے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ حتیٰ کہ گاڑی تیز ہو گئی اور وہ ساتھ نہ دے سکا

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جنہیں اس نے خشک نہیں کیا

وہ دیر تک کھڑا گاڑی کے دھوئیں کو دیکھتا رہا۔

سہ پہر کو وہ وہاں کی مشہور جھیل دیکھنے گیا جو پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔ خشک سنگلاخ چٹانوں میں اتنی بڑی جھیل نہایت خوشنما معلوم ہوتی تھی۔ سورج چمک رہا تھا۔ فضا ساکن تھی، پانی کی سطح آئینے کی طرح شفاف تھی۔ کناروں پر چھوٹے چھوٹے کنج تھے۔ جہاں لوگ سیر کو آئے ہوئے تھے۔ وہ پہاڑ پر چڑھتا گیا اور اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ جھیل چھوٹی سی معلوم ہونے لگی۔ سامنے شہر تھا جو وسیع وادی میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ دھوپ پیلی پڑ چکی تھی۔ پہاڑوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ایک اور راستے سے اترا جو مقابلتاً آسان تھا۔ یہ راستہ اسے دوسری طرف لے گیا — پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر وہ سستانے بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ہجوم کو دیکھا جو اس کی طرف آ رہا تھا۔ آگے آگے ایک شخص تھا۔ جس نے کپڑوں میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھام رکھی تھی۔ ایک جگہ وہ سب رک گئے۔ یہ کسی بچے کا جنازہ تھا۔ بچے کا باپ ایک کم عمر لڑکا تھا جسے لوگ چھیڑ رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے کہ اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ بچہ مر گیا۔ ورنہ اس چھوٹی سی عمر میں اس پر اتنا بڑا بوجھ آن پڑتا۔ بھلا اس عمر میں باپ بننے میں تک کیا تھا

واقعی خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اسے چاہئے کہ نفل پڑھے مٹھائی بانٹے کہ بچہ مر گیا۔
وہ مسکرا مسکرا کر ہر ایک کی بات کا جواب دیتا تھا۔

وہاں بچپن کی شادی عام تھی۔ اس نے بچے کے باپ کو دوبارہ دیکھا۔ بالکل چھوٹی سی عمر کا ہنس مکھ لڑکا، جو خوب کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ غالباً اسے احساس نہیں تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے

جب بچہ دفن ہو چکا تو لوگ آہستہ آہستہ جانے لگے۔ لڑکا کچھ دور ان کے ساتھ گیا پھر لوٹ آیا جب وہاں کوئی نہ رہا تو وہ قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا — اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ دیر تک اس کے آنسو نہ تھمے۔ یہ کسی چھوٹے سے لڑکے کا گریہ نہیں تھا۔ یہ ایک پختہ عمر باپ کا گریہ تھا — اپنی اولاد کے لئے ایک باپ ماتم کر رہا تھا۔

جب وہ لوٹا تو وہ اداس تھا۔ دن میں دیکھی ہوئی تصویریں سامنے پھر رہی تھیں یعنی محبت، شادی اولاد — وہ ان سب جھنجھٹوں سے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ وہ کنوارا تھا اور عمر بھر کنوارا رہنا چاہتا تھا۔ وہ دنیا اور دنیا کے ہنگاموں کو بطور ایک تماشائی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ دنیا کی ہر چیز کو دیکھے گا — مگر دور سے۔ وہ تمام عمر تماشائی رہنا چاہتا تھا — زندگی کی سب سے بڑی مصیبت بڑھاپا ہے۔ مگر وہ بڑھاپے کی آمد تک زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا — وہ اس سے پہلے ہی مر جانا چاہتا تھا۔

اس نے خیالات کے سلسلے کو یکلخت منقطع کر دیا اور بڑے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں رقص کی تیاریاں ہو رہی تھیں — کچھ دیر کے بعد جب موسیقی شروع ہوئی تو وہ سب کچھ بھول گیا۔

اگلے روز وہ سرحد کی طرف روانہ ہوا۔ پہلے باغ آئے۔ پھر اکے دکے درخت اور خاردار جھاڑیاں پھر خشک اور بنجر ویرانہ۔ میلوں تک ایک جیسی پتھریلی زمین اور چٹانیں۔ چٹانیں جو دور سے اودی معلوم ہوتیں نزدیک آنے پر سیاہ اور بھورے رنگ نمایاں ہو جاتے۔

پھر بلند پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ پہاڑ بڑے ڈراؤنے تھے۔ یہاں چٹانیں سورج کی تپش سے جھلس کر رہ گئی تھیں اور ان میں شگاف آ گئے تھے۔ بڑے بڑے پتھر سنگریزوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ فضا میں ایک عجیب سی اداسی تھی۔ ہولناک تنہائی تھی کہ چاروں طرف چھائی ہوئی تھی — ویرانیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ یہی ویرانیاں زندگی میں سنگ میل بنتی ہیں۔ ویرانیاں جو روح کی ظلمتوں کو ایک نئے نور سے معمور کرتی ہیں۔ تب دل کا اندھیرا ہولے ہولے غائب ہو جاتا ہے جیسی ہوتی چٹانوں میں ننھے پھول کھلتے ہیں۔ تپتی ہوئی فضا میں خنک عطر بیز جھونکے آتے ہیں اور بے شمار خوشیاں نت نئی رنگینیوں سے گونج اٹھتی ہیں۔ تب انسان اپنے آپ سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اس کے دل کے نہاں خانے سے وہ راز نکلتے ہیں جو مدتوں سے مدفون ہیں۔ تب روح ایک نئی جلا سے آشنا ہوتی ہے۔ تب روح تخلیق کرتی ہے۔

ان وسیع وادیوں میں سے گذرتے ہوئے اسے یاد آیا کہ یہ علاقہ کبھی قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ یہاں شہر آباد تھا۔ عالیشان عمارتیں تھیں۔ پُر رونق شاہراہیں تھیں۔ انسان کی بنائی ہوئی چیزیں کتنی آسانی سے مٹ جاتی ہیں۔ اس کے چھوڑے ہوئے سارے نشان نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور پھر یہی سنگلاخ چٹانیں اور پتی ہوئی زمین رہ جاتی ہے۔

سڑک بل کھاتی ہوئی چڑھ رہی تھی حتےٰ کہ چوٹی آگئی اور وہ درہ بھی آگیا جس کے متعلق اس نے تاریخ میں پڑھا تھا۔ موٹر رکی۔ ایک اونچے پتھر پر کھڑے ہو کر اس نے نظر دوڑائی۔ سامنے نیا ملک نظر آرہا تھا۔ وہاں سے نئی دنیا شروع ہوتی تھی۔ تاحدِ نگاہ پہاڑوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ آسمان پر گرد کی تہہ چھائی ہوئی تھی۔ دھوپ پھیکی تھی۔ سب کچھ زرد اور مٹیالا دکھائی دے رہا تھا۔ دور افق پر دھند پھیلی ہوئی تھی پھر بھی اسے یہ نظارہ دلفریب معلوم ہوا۔

اس کی زندگی کے اتنے سال گذر گئے اور اسے کبھی خیال تک نہ آیا کہ محض چند دنوں کی مسافت پر ایک نیا ملک آباد ہے۔ جہاں کی ہر چیز نئی ہے۔ وہ یہاں پہلے کیوں نہ آیا۔

یہاں سے کئی فاتح گذرے تھے۔ تب بھی یہ درہ یونہی ہوگا۔ یہ چٹانیں، یہ پھیلی ہوئی دھند۔ یہ مٹیالا آسمان — سب یونہی ہوں گے۔ وہ کون سا جذبہ تھا جو اجنبیوں کو کھینچ لایا۔ مال و دولت کا لالچ، ملک گیری کی خواہش — یا شاید ان سے بالاتر کشش — وہ جذبہ جو انسانوں کو چاند تاروں کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتا ہے جذبۂ تجسس — ان دیکھے نظاروں کی جاذبیت، نامعلوم راہوں کی کشش۔

موٹر نیچے اُتر رہی تھی۔ یہ علاقہ بھی ویسا ہی تھا۔ پہاڑیاں ختم ہوئیں اور چٹیل میدان نظر آیا۔ اسے دو دیہاتی نظر آئے جو ہاتھ کے اشارے سے موٹر ٹھہرانا چاہتے تھے۔ اس نے موٹر روک لی۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے کھڑکیوں سے اندر کود آئے۔ اسے ان کی یہ بدتمیزی بری لگی۔ لیکن ان کے چہروں کی طفلانہ مسکراہٹ دیکھ کر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اپنے گاؤں جانا چاہتے تھے جو راستے میں تھا۔

اس نے غور سے انہیں دیکھا۔ تانبے جیسا دمکتا ہوا رنگ، خیرہ روشن آنکھیں، گھنے ابرو، اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں، وجیہہ چہرے، لمبے قد اور تندرست جسم، میلے کچیلے لباس میں بھی جچ رہے تھے۔

ایک دیہاتی گانے لگا —

دوستو! مرد زندگی بھر موت سے کھیلتے ہیں —
مرد گرتی ہوئی بجلیوں کو للکار کر تھام لیتے ہیں۔
ہمیشہ یاد رکھو کہ جو مصیبت کل آنے والی ہے وہ مصیبت ہی نہیں
کیونکہ ابھی اتنی لمبی رات باقی ہے —

دوسرے نے اس کا ساتھ دیا —

دوستو! میں اپنے وطن کا اتہ پتہ بتاؤں
میرا وطن کہاں ہے —؟
ہر وہ جگہ جہاں قدموں تلے خدا کی زمین ہے
اور سر پر خدا کا آسمان ہے

ان کی آواز میں کرختگی تھی، وہ بغیر کسی سُر کے گا رہے تھے، مگر ان کے گانے میں بلا کا لوچ تھا۔

دوستو! میں اپنے محبوب کا اتہ پتہ بتاؤں
مجھے زندگی میں صرف ایک ہستی سے محبت ہوئی
جس نے میرا سر بلند رکھا جس نے مجھ سے کبھی بے وفائی نہیں کی
میری بندوق! جس سے اگر چاہوں تو آسمان کے تارے گرا لوں —

وہ گاتے رہے حتیٰ کہ ان کا گاؤں آ گیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ وہ جلد شہر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لیکن دیہاتیوں نے نہ جانے دیا۔ وہ ان کا مہمان تھا۔ اس لئے اسے وہیں قیام کرنا تھا۔ وہ تینوں کچی دیواروں کے ایک وسیع احاطے میں داخل ہوئے۔ بڑا پرتپاک استقبال ہوا۔ فرش پر قالین بچھا دئے گئے۔ باتیں شروع ہو گئیں۔

کھانے کا وقت آیا۔ دسترخوان بچھایا گیا۔ دسترخوان پر دو قیدی بھی تھے جو اسی شام کو گرفتار کر کے لائے گئے تھے جنہیں ابھی تک مقامی عدالت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ کچھ دیر کے لئے ان کی ہتھکڑیاں اتار دی گئیں، ہاتھ دھلوائے گئے اور انہیں برابر بٹھایا گیا۔ پہلے بڑے بڑے پیالوں میں شوربہ آیا۔ پھر چوڑی چوڑی روٹیاں اور طرح طرح کے کبابوں کی قابیں۔ اس کے بعد سردے کی قاشیں، سرخ پیلے شفتالو، خوبانیاں اور سیاہ انگور۔ آخر میں سبز چائے۔

کھانا ختم ہو چکا تو نوجوانوں نے آگ کے گرد حلقہ بنا لیا اور رقص کی تیاریاں ہونے لگیں۔
موسیقی شروع ہوئی۔ سادہ سازوں سے نکلی ہوئی سادہ لے پر وہ نہایت خوبصورتی سے رقص کرنے لگے تال پر ایک ساتھ جنبش کرتے۔ تال پر ایک ساتھ گھومتے۔ دیواروں پر ان کے لمبے لمبے سائے تھرک رہے تھے
لے تیز ہوتی گئی۔ موسیقی میں حدت آ گئی۔ رقص میں حدت آ گئی۔

اس نے پہلے بھی موسیقی سنی تھی — اس نے صبح صبح جوگیوں کو گاتے سنا تھا۔ طلوع آفتاب کے وقت جب پھیلتے ہوئے نور اور رنگوں کے باوجود ایک عجیب سی اداسی روح میں اترتی چلی جاتی ہے — جوگیوں کے گانے میں اس اداسی کا اعتراف تھا۔ اس نے عیاشوں کی محفلوں میں شوخ و چنچل موسیقی سنی تھی۔ ایسی محفلوں میں جہاں بے فکری تھی اور حسین چہرے تھے۔ جہاں زندگی منزل پا کر تھم گئی تھی۔ جہاں ماضی اور مستقبل دونوں بے معنی تھے — اس نے پیانو پر اداس نغمے سنے تھے۔ جب سفید و نازک انگلیاں متحرک تھیں اور حسین نگاہوں میں پیام تھا۔ پیغام میں درد تھا۔ جاگی ہوئی راتوں کی بے قراری تھی۔ ان گنت شکوے تھے — اس نے بدنگاہوں کی

نشہ آور موسیقی سنی تھی جو ملاحوں کے لئے تھی جو شراب کی بوتلوں سے نکلتی تھی جس میں غضب کا خمار تھا۔ اس نے غریبوں کی جھونپڑیوں میں زمین پر بیٹھ کر وہ گیت بھی سنے تھے جن میں غم اور خلوص گھلے ہوئے تھے جن کو سن کر ان کے پژمردہ چہرے طمانیت اور وقتی مسکراہٹوں سے روشن ہو جاتے تھے۔ اس نے رات کی تاریکیوں میں بانسری پر دردناک نغمے بھی سنے تھے جو کسی محزوں روح کی پکار تھی۔

لیکن یہ موسیقی ان سب سے مختلف تھی۔ اس میں نرالی تپش تھی۔ گونج تھی۔ اس میں طوفانوں کی سی جدوجہد تھی۔ یہ موسیقی اور یہ رقص ان وسیع وادیوں اور سنگلاخ چٹانوں کی تخلیق تھے۔ یہ نغمہ آزاد دلوں کا نغمہ تھا — وہ نغمہ جو زمین و آسمان کی قید سے آزاد ہے جو حیات و موت کی قید سے آزاد ہے۔ نغمہ جو زندگی کا نغمہ ہے۔ جو لافانی ہے۔

چند دنوں کے بعد وہ سرحد عبور کر رہا تھا۔ شام کو وہ راستہ بھول گیا اور اسے ایک گاؤں میں ٹھہرنا پڑا ایک خستہ سرائے میں قیام ہوا۔ وہاں ایک اور سیاح بھی مقیم تھا جو ایک دوسرے ملک سے آیا تھا۔ وہ بیحد مغموم معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ لباس بے ترتیب تھا۔ وہ پی رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو باہر چلنے کے لئے کہا۔ لیکن وہ پینے میں بری طرح مشغول تھا۔ اکیلا ہی وہ باہر نکلا۔

گاؤں کے چاروں طرف بادام اور خوبانیوں کے درخت تھے۔ انگور کی بیلیں تھیں۔ پہاڑوں سے ایک چشمہ شور مچاتا ہوا آتا تھا جس کے کناروں پر لمبی لمبی گھاس میں جنگلی گلاب کھلا ہوا تھا۔ جب آفتاب غروب ہوا اور ہوا کے جھونکے تیز ہو گئے تو نئی نئی نکلی ہوئی کونپلوں کی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ شفق پھولی، اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں سرخ ہو گئیں۔ پھر تاریکی گہری ہوتی گئی۔ سرو اور سفیدے کے درخت مہیب معلوم ہونے لگے۔ جب وہ واپس لوٹا تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ دفعتاً اسے شعلے بلند ہوتے ہوئے نظر آئے۔ گولیوں کی آواز سنائی دی۔ اس کے سامنے ایک شخص چلتے چلتے بھاگنے لگا۔ اسے گولی لگی۔ حملہ آور جو شاید کسی دوسرے گاؤں کے تھے۔ بندوقوں کے دستوں سے دروازے توڑ رہے تھے۔ گلیوں کے دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں۔ بھاگنا یا چھپنا بے سود تھا۔ سنسناتی ہوئی گولیاں بالکل اسے چھوتی ہوئی نکل رہی تھیں۔ چاروں طرف شدید لڑائی ہو رہی تھی جس کی وجہ کوئی دیرینہ دشمنی معلوم ہوتی تھی۔ وہ محض تماشائی تھا لیکن اس وقت اس ہنگامے میں برابر کا شریک تھا۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی چند لمحوں میں زندگی ختم ہوا چاہتی ہے اسے موت بے حد قریب معلوم ہوئی۔ اس نے موت کا ساحس اپنے ماتھے پر محسوس کیا۔ وہ سرائے میں پہنچا تو اس نے اپنے ساتھی کو پیتے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ بال پریشان تھے۔ وہ بہت پی گیا تھا۔ اس کے روکنے پر وہ نہ مانا۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے — دونوں ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ پھر نہ جانے کیونکر ذراسی دیر میں دوست بن گئے شاید یہ اس شدید خطرے کا احساس تھا یا موت کا خوف — خوف جو مشترکہ تھا۔ وہ کشمکش لمحے دونوں کے لئے یکساں تھے

بہت جلد وہ بے تکلف ہو گئے۔ وہ اپنی زندگی کی داستان سنانے لگا۔ اس نے بتایا کہ وہ پکا شرابی ہے شراب کے علاوہ ہر قسم کی منشیات استعمال کرتا ہے۔ جب اس نے پینا شروع کیا تھا تو اس کا دل اسے ملامت کیا کرتا۔ لیکن اب کبھی ایسا خیال نہیں آتا۔ اب وہ ہر وقت نشے میں رہتا ہے۔ ہر وقت اس پر نیند سی طاری رہتی ہے۔ جب کبھی اس کیفیت سے چونکتا ہے تو آس پاس کی چیزوں اور ماحول سے بہت گھبراتا ہے۔ چنانچہ اس کی یہی کوشش رہتی ہے کہ یہ خمار ہر وقت رہے۔ لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ دنیا میں کوئی اس کا دوست نہیں۔ پھر بھی اس کے اوقات بڑے مزے میں گذرتے ہیں۔ اس کی پیدائش فطرت کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اسے ایسے گھرانے میں پیدا کیا۔ جہاں پہلے ہی بے شمار اولاد تھی۔ جب وہ پیدا ہوا تو سب نے افسوس کا اظہار کیا۔ اس کی پرورش بہت بری طرح ہوئی۔ کوئی اس کے وجود کو نہیں چاہتا تھا۔ ہوش سنبھالا تو ناکامیوں نے آن دبوچا۔ وہ جو کچھ بننا چاہتا تھا نہ بن سکا۔ اس کی ایک خواہش بھی پوری نہیں ہوئی۔ اسے ایک ایسی عشوہ طراز حسینہ سے محبت ہو گئی جس کے چاہنے والے لاتعداد تھے جو سنگدل تھی، ہرجائی تھی۔ ہزارہا کوششوں کے باوجود وہ اس کا خیال دل سے نہ نکال سکا۔ اسے نہ بھلا سکا۔ سارا خلوص اور پیار بیکار گیا۔ اس کی زندگی اس کے غمزوں کے گرد گھومتی رہی۔ پھر اتفاق سے اسے کہیں سے دولت مل گئی۔ بہت سے لوگ ملتفت ہو گئے۔ وہ بھی ملتفت ہوئی — دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کی شام کو وہ اپنے کسی عاشق سے ملنے گئی۔ شادی کے بعد اس نے کھلم کھلا اپنے مداحوں سے ملنا شروع کر دیا۔ کئی سال اکٹھے رہنے کے باوجود بھی وہ اجنبی رہی لیکن اس کی محبت کم نہ ہو سکی۔ وہ اس سے نفرت نہ کر سکا۔ آخر ایک روز وہ اسے چھوڑ کر کسی کے ساتھ چلی گئی۔

اس کے بعد اس نے مذہب کی طرف رجوع کیا۔ کوشش کی کہ کسی طرح عبادت میں یہ غم بھلا سکے بڑے عجز سے دعائیں مانگیں۔ لیکن خدا نے کوئی مدد نہ کی۔ پھر اس نے گناہ کرنے چاہے۔ گناہ کی زندگی بسر کرنی چاہی۔ لیکن ناکامیاب رہا۔ کیونکہ وہ بزدل تھا۔ جذباتی تھا۔ گناہ کرنے کے لئے ہمت چاہئے۔ اس نے دوستوں کے خلوص پر زندہ رہنا چاہا۔ لیکن دوستوں نے ایک ایک کر کے دغا دی۔ دنیا میں اس کا کوئی نہ رہا — پھر چاروں طرف سے ظلمتیں عود کر آئیں۔ تنہائیاں چھا گئیں۔

سَن سے ایک گولی بالکل قریب سے گذر گئی۔ شور و غل نزدیک آ گیا۔ لڑائی بہت قریب ہو رہی تھی۔

— میں کیونکر بتاؤں کہ میں نے کیسے کیسے عذاب برداشت کئے ہیں۔ کیسے کیسے جہنموں میں جلایا گیا ہوں۔ الفاظ صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتے۔ کسی زبان میں اس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ میں ہمیشہ پیاسا رہا ہوں۔ ایسا پیاسا جسے دور پانی بھی نظر آتا ہو۔ میں نہایت کمزور ہوں، ڈرپوک ہوں — ایک دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اب غم نہیں سہار سکتا۔ اب میں زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اب میں مسرور رہا کروں گا۔ مجھے شراب سے نفرت تھی۔ شرابیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ لیکن میں پینے لگا۔ خوب پینے لگا۔ اب میں ہر وقت مخمور رہتا ہوں۔ ہر وقت خواب دیکھتا رہتا ہوں اور پھر خواب اور حقیقت میں فرق ہی کیا ہے۔ خواب دیکھتے وقت سب

کچھ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کبھی بیدار ہونے پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب تو خواب تھا۔ میں خوابوں سے بیدار بہت کم ہوتا ہوں۔ کیا بتاؤں کہ میں کیسی کیسی دنیاؤں میں رہتا ہوں۔ کیسی کیسی فضاؤں میں پرواز کرتا ہوں۔ ساری بلندیاں اور پستیاں میرے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ میں کائنات پر حکمرانی کرتا ہوں۔ میں نے کیسے کیسے نظارے دیکھے ہیں۔ میں نے چاندنی راتوں میں قلوپطرہ کے ساتھ نیل میں کشتی کی سیر کی ہے۔ ایک مصور قلعے کی فصیل پر میں نے جیکن کو چوما ہے۔ میں نے دنیا کی خوبصورت ترین عورتوں سے محبت کی ہے۔ مجھے ان کے لبوں کا ایک ایک بوسہ یاد ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ میں نے جنگیں جیتی ہیں۔ میں تیروں کی بوچھاڑ میں گیا اور دشمن کا جھنڈا چھین لایا۔ جب مفتوح شہر میں داخل ہوا تو لوگ سجدے میں جھک گئے۔ کئی مرتبہ مجھے ایسی پیاری موت نصیب ہوئی کہ دنیا کی حسین ترین آنکھیں میرے لئے سوگوار رہیں۔ میں فرشتوں کے ساتھ آسمانوں میں اڑا ہوں اور زمین پر رینگتے حقیر انسانوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرایا ہوں ——— ایک جھلسے ہوئے پہاڑ کی بلند چوٹی پر کھڑے ہو کر میں خدا سے ہمکلام ہوا ہوں۔ میں نے چرواہوں کے ساتھ صحراؤں میں وہ تارے چمکتے دیکھے ہیں جو حضرت عیسیٰ کی آمد کا مژدہ سناتے تھے جو اتنی تیزی سے چمکتے تھے کہ آنکھیں چندھیا جاتی تھیں ——— کون کہتا ہے کہ یہ خواب ہیں ——— یہ سب حقیقت ہے ——— یہ ایک نئی زندگی مجھے ملی ہے۔ اب میں واپس ان ظلمتوں میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ اب میں سدا امر رہوں گا ———"

رات بھر گولیوں کی آواز آتی رہی، شعلے تھرکتے رہے، شور و غل مچا رہا۔ جب رات ختم ہوئی تو یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ سورج طلوع ہوا اور زندگی کی روشنی پھیل گئی۔ ایک کیف آور ان جانی خوشبو کہیں سے آ کر فضا میں بسا گئی۔ اس لطیف ہوا میں سانس لیتے وقت اس نے زندگی کے لمس کو محسوس کیا۔ اسے زندگی جاگتی ہوئی دکھائی دی۔ باہر نکل کر دیکھا تو رات کے تاریک سائے اور ڈراؤنے ہیولے غائب ہو چکے تھے۔ گلیوں میں لوگ اس طرح چل پھر رہے تھے جیسے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ پڑوس کے بڑے میدان میں جو رات بھر کشت و خون کا مرکز رہا۔ برات آ کر ٹھہری تھی۔ سازوں پر نہایت مسرور دھن بج رہی تھی۔ رنگ برنگے لباس دکھائی دے رہے تھے، بلند قہقہے سنائی دے رہے تھے۔

وہ سوچنے لگا کہ زندگی اور موت ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں، ہر صبح زندگی جاگتی ہے۔ نور کے سیلاب کو ساتھ لاتی ہے۔ رات کی تاریکی میں موت کا تسلط چھا جاتا ہے۔ زندگی سو جاتی ہے۔

رات اسے کیسا عجیب تجربہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس نے موت کا نام سنا تھا۔ رات اس نے موت کو متحرک دیکھا تھا۔ رات اس نے ایک انسان کو قریب سے دیکھا تھا۔ رات اس نے ایک انسان کو فرشتوں سے بھی عظیم پایا تھا۔

اس کی نگاہیں سامنے شہ نشین پر چلی گئیں۔ پردے کی اوٹ سے کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ لبے مسکراہٹیں ابھر رہی تھیں۔ جواب میں وہ بھی مسکرایا۔ ایک سفید ہاتھ چند شوخ پھول لئے باہر نکلا۔ پھول اس کے

قدموں میں آگرے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اس نے پھول اٹھا کر سونگھے۔ تب اسے زندگی کا خمار محسوس ہوا اور زندہ رہنے کا نشہ۔

اس نے سوچا کہ جب تک دنیا میں حسین چہرے ہیں، معطر پھول ہیں، دلآویز مسکراہٹیں ہیں — وہ زندہ رہے گا۔

اب وہ نئے ملک میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک دن اور دو راتیں اس نے ریل میں گذاریں۔ آگے موٹر کا راستہ تھا۔ ہوائی جہاز بھی جاتا تھا۔ ہوائی جہاز کو صبح روانہ ہونا تھا۔ لیکن موسم کی وجہ سے رکا رہا۔ دن بھر انتظار کر کے شام کو روانہ ہوا۔ جب جہاز اٹھا تو فضاؤں میں غروبِ آفتاب کی ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ تارے ابھی ابھی نکلے تھے۔ نیچے پہاڑوں کی چوٹیاں تھیں اور مبہم سی تاریکیاں۔

چند بادل چمکنے لگے اور تانبے کی دہکتی ہوئی گیند جھانکنے لگی۔ بادلوں نے آسمان کے نیلے سمندر میں جزیرے بنا رکھے تھے۔ جب چاند کی چمک بڑھی تو سب کچھ سفید ہو گیا۔ بادلوں سے نور منعکس ہونے لگا۔ اور اجالا پھیل گیا۔

ایک بہت بڑے بادل میں سے گذرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ چاند کی کرنیں طرح طرح کے رنگوں میں بکھری ہوئی ہیں اور بے شمار رنگین لہریئے مچل رہے ہیں۔ چاندنی چھلکی تو زمین نظر آنے لگی۔ جب آبادی آتی تو ننھی ننھی روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی گذر جاتیں۔ پہاڑوں کے ایک بلند سلسلے کو عبور کرنے جہاز بلند ہو رہا تھا اس نے دوربین نکالی اور چاند دیکھنے لگا — چاند بے حد [illegible] معلوم ہوا۔ وہاں مدھم سی روشنی تھی۔ بکھرے ہوئے تاریک سائے تھے۔ چاند کے داغ اور دھبے اور بھی نمایاں معلوم ہوئے۔

اس نے زمین کی طرف دیکھا — بالکل وہی داغ اور دھبے — وہی پھیکا پھیکا نور — فضا میں اڑتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے زمین بہت دور ہے۔ وہ کائنات میں معلق ہے اور ایک سیارے سے دوسرے سیارے کو سفر کر رہا ہے۔

اب جہاز ایک نیلی لکیر کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ یہ کوئی دریا تھا۔ پھر ایک نیلا سا شیشہ جھلمل جھلمل کرتا دکھائی دیا۔ اوپر سے گذرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ ایک وسیع علاقے میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ پانی کے بند اور نشانوں سے سیاہ لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بہت بڑا آئینہ گر کر چکنا چور ہو گیا ہے۔ جہاز بلندیوں سے اترنے لگا۔ [illegible] لیلے کا ایک نظارہ سامنے آ گیا۔ نیچے نیلے بلور کا بنا ہوا شہر خوابیدہ تھا۔ نیلے گنبد، نیلے برج، نیلی محرابیں، نیلی عمارتیں — سب کچھ نیلا تھا — نیلے بلور پر نیلی چاندنی چھائی ہوئی تھی۔

بادل [illegible] گئے۔ زمین اوجھل ہو گئی۔ سیاہ گھٹا [illegible] نے چاند کو چھپا لیا۔ [illegible] ایک بادل میں بجلی کوندی

مہیب آواز آئی اور بارش شروع ہو گئی بجلیاں چمکنے لگیں۔ بادل گرجنے لگے، طوفان آگیا۔ زور کا دھکا ہوتا تو جہاز تھرا اٹھتا۔ طوفان بڑھتا چلا گیا۔ یوں معلوم ہونے لگا جیسے وہ چند انسان نہ زمین سے تعلق رکھتے ہیں نہ آسمان سے نہ کسی سیارے سے۔ وہ فضاؤں میں یونہی بھٹکتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ بجلیاں اور طوفان انہیں پیس ڈالیں گے۔ بہت دیر کے بعد جب جہاز نیچے اترا تو فضا پرسکون تھی ــــ دور پہاڑیوں میں بجلیاں چمک رہی تھیں ــــ یقین نہ آتا تھا کہ یہی پہاڑ اور بجلیاں ہیں۔ جن میں سے وہ ابھی ابھی گذر کر آئے ہیں۔

دن بھر وہ تاریخی عمارتیں دیکھتا رہا۔ عمارتوں پر ان گنت نام لکھے ہوئے تھے۔ چند نام مانوس معلوم ہوئے۔ یہ اس کے ملک کے لوگوں کے نام تھے۔ اس نے ہر جگہ تاریخی مقامات پر ناموں کی بھرمار دیکھی تھی۔ لوگ پرانی عمارتوں پر نام کیوں لکھتے ہیں۔ شاید اس امید پر کہ ان کے نام بار بار پڑھے جائیں اور سالہا سال تک محفوظ رہیں۔ یہ غیر فانی بننے کا وہ مادہ ہے جو انسان کے دل میں ازل سے موجود ہے۔ تب سے جب اسے موت سے شکست کھا جانے کا احساس ہوا۔ انسان غیر فانی بننے کے لئے ملک فتح کرتا ہے۔ عظیم الشان عمارتیں بنواتا ہے۔ نیک کاموں میں حصہ لیتا ہے۔ ایجادیں کرتا ہے۔ اپنے آپ کو کسی بڑی ہستی کے ساتھ منسوب کر کے عباسی، عثمانی، چنگیزی کہلاتا ہے اور جب کچھ نہیں کر سکتا تو کسی عمارت پر اپنا نام لکھ کر خوش ہو لیتا ہے

اس نے پہلی مرتبہ باغوں میں سرخ گھاس دیکھی۔ باغ ایسے تھے جیسے خوشنما قالین بچھے ہوئے ہوں۔ خوشنما روشیں، پھولوں کے تختے، گھاس کے رنگین قطعے، درختوں کی قطاریں ــــ ہر چیز بڑی فن کاری سے ترتیب دی گئی تھی۔ اس کے پاس چند تعارفی خطوط تھے۔ ایک صاحب سے ملا۔ شام ہوئی تو انہوں نے رقص پر چلنے کو کہا اور بتایا کہ شہر کا اونچا طبقہ آئے گا۔ بڑی رونق ہو گی۔ وہ دونوں گئے۔ رقص گاہ کی سجاوٹ، بیش قیمت آرائشی سامان، بھڑکیلے معطر ملبوس اور مغرور چہروں نے اسے مرعوب کر دیا۔ وہاں ہر شخص ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ ہر حسینہ کے متعلق داستانیں سنی جا سکتی تھیں۔ ماحول نے اسے بے حد شرمیلا بنا دیا۔ وہ ایک کونے میں جا بیٹھا۔ اس کے نئے دوست نے ذرا سا عرق چکھنے کی دعوت دی ــ "تم یہاں شرمانے کے لئے نہیں آئے ہو۔ لطف اندوز ہونے آئے ہو۔ ذرا سے عرق سے یہ جھجک دور ہو جائے گی۔"

اس نے بتایا کہ اس نے پہلے کبھی نہیں پی۔ لیکن وہ مُصر رہا۔

پہلے بھی کئی مرتبہ اسے پینے کے لئے مجبور کیا گیا تھا۔ ایسے لمحات میں جب وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ ایسے لمحات میں بھی جب مسرور دل خوشیوں کو طرح طرح سے محسوس کرنا چاہتا تھا ــ لیکن اس نے غم میں بھی شراب سے اجتناب کیا تھا اور مسرت میں بھی۔

وہ کشمکش میں پڑ گیا۔ زندگی کا یہ تجربہ باقی تھا ــــ وہ اس تجربے سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس کے دوست کا اصرار بڑھا تو اس نے چند گھونٹ بھر لئے ــــ ذائقہ کسیلا اور بدمزہ تھا۔

پھر اس کا دوست اسے وہ افواہیں اور لطیفے سیدھے قصے سنانے لگا جو وہاں آئی ہوئی خواتین کے متعلق مشہور تھے۔ سب سے زیادہ افواہیں مادام کے بارے میں تھیں۔ اس نے غور سے دیکھا۔ مادام پختہ عمر کی عورت تھی۔ تندرست اور طویل قامت اس کے سُرخ رنگ پر سیاہ لباس خوب معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے بہت سے قیمتی زیور پہن رکھے تھے۔ اس میں کوئی خاص جاذبیت نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ تندرست تھی۔ اس کا لباس ضرورت سے زیادہ چست تھا اور وہ جوانہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے دوست نے ایک گلاس اور بھر کر دیا جسے وہ دوائے تلخ کی طرح منہ بنا کر پی گیا۔

جب سرور آیا تو آس پاس کی ہر چیز پر جادو چھا گیا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے وہ بے حد لطیف ہے۔ وہ چاہے تو ہوا میں دور تک اڑتا چلا جائے اور یہاں جتنے لوگ ہیں۔ سب اسے جانتے ہیں۔ سب سے پرانی دوستی ہے۔ مادام کے چہرے کے نقوش دھندلے ہوتے گئے اور اس کا اپنا تخیلی حسن مادام کے چہرے پر منتقل ہو گیا۔ لمحے کے بعد وہ جاذب نگاہ ہو گئی۔ اس میں اتنی کشش آ گئی کہ وہ نہ رہ سکا۔ اس کے سامنے جا کر اس نے سر کی ہلکی جنبش کے ساتھ اس نے تعارف خود کرایا۔ مادام اپنے متعلق بتانے لگی تو اس نے بات کاٹ دی "آپ کا حسین چہرہ خود اپنا تعارف ہے۔"

مادام نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ موسیقی شروع ہونے والی تھی۔ اس نے رقص کے لئے کہا۔ وہ بڑی سرد مہری سے بولی "جاؤ اپنی ہم عمر ڈھونڈو۔"

"ہم عمر بھی تو ڈھونڈی ہے۔ آؤ تمہیں آئینے کے پاس لے چلوں۔"

وہ خاموش ہو گئی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"میں نے اس ملک کے حسن کی بڑی تعریفیں سنی تھیں۔ آج آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

اس نے ایسی نگاہوں سے اسے دیکھا جن میں غصہ اور حیرت ملے ہوئے تھے جیسے وہ ایسی بیباک گفتگو کی عادی نہیں تھی اور ایک اجنبی کی یہ جسارت اسے ناگوار معلوم ہوئی ہے۔

موسیقی شروع ہوئی۔ اور اس نے آگے بڑھ کر مادام کے بازو تھام لئے۔ وہ اس کی تعریفیں کر رہا تھا اس کے حسن کی، زیوروں کی، لباس کی، اداؤں کی ۔۔۔ وہ اسے شعر سنا رہا تھا۔

دوسرا رقص ۔۔ تیسرا رقص ۔۔ مادام کا رویہ بدل گیا۔ اب وہ اس کی باتیں ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ سن رہی تھی۔ اس نے اسے اپنا خاوند دکھایا جو مشہور سیاست دان تھا۔ اس کے گول مٹول چہرے پر بغیر فریم کی عینک تھی۔ وہ زرق برق لباس پہنے کسی غیر ملکی سفیر سے بڑی سنجیدہ بحث کر رہا تھا۔

پھر دفعتاً اس نے دیکھا کہ مادام کے چہرے پر جھریاں ہیں جنہیں رنگ و روغن سے چھپایا گیا ہے۔ مادام کی دو ٹھوڑیاں ہیں ۔۔۔ وہ ضرورت سے زیادہ فربہ ہے۔ اس نے جلدی سے عرق کے چند گھونٹ پیے اور مادام کے چہرے کی جھریاں غائب ہو گئیں اور ایک نئی شگفتگی اور تازگی آ گئی جو پہلے نہیں تھی۔

رقص کرتے کرتے وہ پردوں کی طرف چلے گئے۔ ستونوں کے عقب سے ہوتا ہوا وہ مادام کو باہر لے آیا۔ برآمدے میں بڑی تیز روشنی تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ بولی "سامنے بڑا اندھیرا ہے۔"

"تمہارے چہرے کی جگمگاہٹ سے سب کچھ منور ہو جائے گا۔"

"تم بھی اچھے اجنبی ہو۔ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں یہاں کی زبان نہیں آتی اور اب کتر کتر زبان چل رہی ہے — تم کتنے چالاک ہو — اور کتنے —"

بوسے سے فقرہ نامکمل رہ گیا۔

"چلو باغ میں بیٹھ کر باتیں کریں۔"

"نہیں میرا خاوند مجھے تلاش کر رہا ہوگا۔"

"تمہارا خاوند مدہوش ہے اور ایک نوعمر لڑکی کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔"

وہ باتیں کرتا رہا۔ اس نے دنیا بھر کی باتیں کیں۔ ہر موضوع پر۔ اور وہ سنتی رہی۔

جب آخری مرتبہ وہ مادام کے ساتھ رقص کر رہا تھا تو اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا — مسرت — افسردگی — بہجت — تکان، خمار — کچھ بھی تو نہیں۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ مادام کے بوسوں میں مٹھاس تھی اور آغوش میں آگ اور اس نے بار بار عرق پیا تھا۔

جب وہ اپنے دوست کے ساتھ واپس لوٹا تو رات کافی گذر چکی تھی وہ اسے ہوٹل میں چھوڑ گیا۔ وہ کچھ دیر کمرے میں بیٹھا رہا۔ سڑک کے پار سے موسیقی سنائی دے رہی تھی۔ سامنے قہوہ خانہ تھا جہاں گھٹیا قسم کا رقص ہوا کرتا تھا۔ اوباش لوگ آتے تھے۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے قدم اسے لے گئے نہ جانے وہ کیوں، وہاں چلا گیا۔ ہلکا ہلکا معطر دھواں پھیلا ہوا تھا۔ مدھم سی پراسرار روشنیاں جل رہی تھیں۔ عجیب سے ساز پر عجیب گت بج رہی تھی۔ سُر کے زیر و بم پر ساز تھرتھراتے۔ گھنٹیاں بجتیں۔ ایک چھریرے جسم کی حسین لڑکی نے رقص کر رہی تھی۔ اس کا رواں رواں پھڑک رہا تھا۔ وہ موسیقی اور اس مسحور ماحول کا ایک جزو معلوم ہوتی تھی۔ یہ پتہ چلانا مشکل تھا۔ پہلے رقص موسیقی سے ہم آہنگ ہوا تھا یا موسیقی رقص سے۔ ایسا رقص اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ رقاصہ کی نگاہیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ اسے بار بار دیکھتی تھی۔ تماشائیوں سے ہٹ کر وہ پردے کے پیچھے چلا گیا اور اوٹ سے دیکھنے لگا۔ زور کی جھنجھناہٹ کے ساتھ موسیقی ختم ہوئی تالیاں بجیں۔ رقاصہ تماشائیوں کے سامنے جھک کر پردے کی طرف چلی۔ پردے کے پیچھے دو بازو منتظر تھے۔ وہ تھکی ہوئی تھی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کوئی مدافعت نہ کی پینے کی دعوت پر پہلے انکار رہا پھر مسکرا کر اقرار۔ دونوں ہوٹل میں جا بیٹھے۔

"نزدیک بیٹھو — اتنی دور کیوں ہو؟"

اس نے جنبش کی

"اتنی دور —؟"

وہ سرک کر کچھ اور قریب آگئی
"اب بھی بہت دُور ہو"
وہ اور قریب آگئی۔ اس نے گلاس اس کے ہونٹوں کو لگایا، رقاصہ نے ایک گھونٹ بھر کر اسی گلاس سے اسے پلائی۔
"تمہارا نام کیا ہے؟"
اس نے نام بتایا
"میں نے آج تمہیں کئی مرتبہ دیکھا تھا"
"میں نے بھی تمہیں دیکھا تھا" اس نے جھوٹ بولا
"کیا تم سب اجنبی ایک جیسے ہوتے ہو — نڈر اور بے باک"
"اور یہاں سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں — حسین اور چنچل"
"سب لڑکیاں؟" وہ اٹھلا کر بولی۔ "تم یہاں اور کس کس کو جانتے ہو"
"کیتوں کو"
وہ دور جا بیٹھی "کون ہیں وہ؟"
وہ انگلیوں پہ گننے لگا "ایک تم ہو، دوسری تم ہو، تیسری تم ہو، چوتھی، پانچویں، چھٹی سب تم ہو"
وہ کھلکھلا کر ہنسی اور قریب آگئی "مجھے اپنے ملک کے گیت سناؤ"
اور اس نے اپنے ملک کے گیت گا کر سنائے۔
آہستہ آہستہ نشہ اتر رہا تھا، طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ رقاصہ کے ہونٹ پھیکے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کی باتیں ناگوار معلوم ہو رہی تھیں۔ اس نے رومال سے وہ رنگ و روغن پونچھا جو اس کے چہرے پہ لگ گیا تھا۔ وہ بہت جلد رقاصہ کو واپس چھوڑ آیا۔ پھر ایک عجیب سی پشیمانی دل پر چھا گئی۔ اسے ملامت محسوس ہونے لگی۔ یہ بوسے کتنے پھیکے اور بدمزہ تھے۔ اُس عرق کے ذایقے کی طرح کسیلے تلخ — مادام اور رقاصہ دونوں کے بوسے ایک جیسے تھے۔ ان کی باتیں کس قدر عامیانہ تھیں۔ یہ سب کچھ کس قدر عامیانہ اور سستا تھا — یہ آج اُسے ہو کیا گیا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے ایسی حرکتیں کی تھیں۔ جن کا وہ عادی نہیں تھا جو ویسے وہ کبھی نہ کرتا۔ وہ سو نہ سکا نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔ سدرح کی تشنگی اور بھی بڑھ گئی۔ زندگی کا یہ تجربہ ناکام رہا۔

●

راستے میں ایک چوراہے پر اس نے شہروں کے نام پڑھے۔ ایک نام مانوس معلوم ہوا۔ دیکھا تو وہاں کے لئے ایک تعارفی خط تھا۔ کچھ ناصلے پر جنگلات کے محکمے کے ایک افسر تھے، ان کے نام۔ اس کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ سفر ملتوی کر کے اس طرف چل دیا۔ یہ نیا دوست بہت اچھی طرح ملا۔ اس کا بنگلہ گھنے

جنگلوں کے وسط میں تھا۔ آس پاس بالکل آبادی نہیں تھی۔ اتنے بڑے جنگل میں صرف دو انسان رہتے تھے۔ وہ اور اس کا ملازم۔ پہاڑوں طرف نہایت خوشنما نظارے تھے۔ قسم قسم کے پھول اور پرندے تھے۔ پھر بھی وہ دو تین دن کے قیام کے بعد تنگ آگیا۔ وہاں ایسی دلدوز تنہائی تھی کہ ہول آتا تھا۔ اس کے دوست نے بتایا کہ وہ اس جگہ لگاتار دس سال سے ہے۔ ایک مرتبہ اس کا تبادلہ آبادی کے قریب ہوا۔ لیکن وہ کچھ عرصے کے بعد پھر یہاں چلا آیا۔ اسے جنگل بے حد عزیز ہیں۔ تنہائی کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ خاموشی پر وہ جان دیتا ہے۔ جب کبھی اسے شہر جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ تو ایک ایک لمحہ گذارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہے۔ وہ کنوارا ہے۔ اس کے عزیز و اقارب بھی ہیں۔ وہ ان سے کبھی کبھار ملتا بھی ہے۔ لیکن زیادہ دیر ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ جنگلوں میں اس کا خوب جی لگتا ہے۔ وہ اپنا کام دل لگا کر کرتا ہے اور پھر خاموشیوں اور تنہائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ اب کسی کی رفاقت نہیں چاہتا۔ وہ سب سے دور بھاگنا چاہتا ہے۔

اس کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں۔ شاید اسے غموں سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ شاید زندگی نے اس کے ساتھ برا سلوک کیا ہو۔ شاید اسے کسی عزیز ہستی نے دھوکہ دیا ہو۔۔۔ اس کا اشتیاق بڑھتا گیا۔ اس نے اپنا قیام طویل کر دیا۔ آخر ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

اس نے بتایا کہ نہ اسے ناکامیوں کا سامنا ہوا۔ نہ ٹھوکریں لگیں۔۔۔ نہ کچھ اور ہوا۔ بس ایک ذرا سا واقعہ پیش آیا تھا جس نے اس کے خیالات پر اس قدر اثر کیا کہ وہ بالکل بدل گیا۔ پہلے وہ دوستوں اور عزیزوں کے بغیر پل بھر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ محفلوں کی جان تھا۔ احباب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ پھر ایک دن اس نے سنا کہ اس کی محبوبہ مر گئی۔ محبوبہ جسے اس نے دل کے معبد میں برسوں بٹھائے رکھا جس کی اس نے برسوں پرستش کی۔ وہ ایک حادثے سے مر گئی۔ اس نے جا کر دیکھا۔ وہ ایک مسلے ہوئے ہار کی طرح پڑی تھی۔ ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرح بے بس اور حقیر۔ پھر جیسے برسوں کی محبت اور پرستش ختم ہو گئی۔ وہ لطیف جذبات ختم ہو گئے۔ تب اسے معلوم ہوا۔ کہ اسے اس کے ہونٹوں سے محبت نہیں تھی بلکہ دہکتے ہوئے آتشیں بوسوں سے تھی۔ ان رخساروں اور زلفوں سے محبت نہیں تھی بلکہ ان کے لمس سے تھی۔ ان آنکھوں کی خوشنما بناوٹ پسند نہیں تھی بلکہ نگاہوں کے وہ پیغام پسند تھے جو روح میں بجلیاں بھر دیتے تھے۔ اسے ہرگز اس سے الفت نہیں تھی۔ نہ جانے اسے کیا شے عزیز تھی۔ وہ کسی غیر مرئی شے پر مفتون تھا۔ اور وہ شے نہ زندگی تھی نہ حسن۔ وہ بجلیوں کی چمک تھی۔۔۔ لپکتے ہوئے شعلوں کی تڑپ تھی۔۔۔ ایسی شے جو محسوس کی جا سکتی ہے۔ چھوئی نہیں جا سکتی۔

اس کے سامنے جو جسم پڑا تھا۔ وہ بے جان اور کریہہ تھا۔ اس نے نفرت محسوس کی۔۔۔ اپنے اس جذبے سے جسے وہ محبت سمجھتا رہا۔ اس نے اپنے آپ سے نفرت محسوس کی۔ اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔

نہ بالکل بدل گیا۔ وہ تنہا رہنے لگا۔ اسے حُسن سے دلچسپی رہی۔ لیکن مستقل طور پر نہیں۔ طویل عرصے تک وہ اپنے کام میں منہمک رہتا۔ جب صنفِ لطیف کی رفاقت کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگتی تو چپکے سے کر شہروں میں نکل جاتا۔ جہاں وہ کچھ عورتوں کو جانتا تھا۔ وہ واپس آکر ایک طویل عرصے کے لئے سب کچھ بھلا دیتا۔ اس کے خیال میں عورت کی رفاقت ضروری تھی۔ لیکن ہر وقت نہیں — محض کبھی کبھی۔۔ ہر وقت کی رفاقت سے انسان اکتا جاتا ہے۔ اس کی ذہنی نشوونما پر برا اثر پڑتا ہے۔

مگر یہ تنہائی؟

”اتنے دنوں متواتر تنہا رہ کر اب میں تنہائی کو سمجھنے لگا ہوں اور وہ مجھے۔ اب ہم ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہیں۔ اب مجھے پرندوں اور جانوروں کی زبان آتی ہے۔ درختوں، ہواؤں اور ستاروں کی زبان آتی ہے جب چیڑھ کے درختوں میں سے ہوائیں گزرتی ہیں تو میں گھنٹوں سنتا رہتا ہوں۔ جب پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھوتے ہوئے بادل مختلف شکلیں بناتے ہیں تو میں جان جاتا ہوں کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ صبح صبح جب ننھے ننھے پرندے دریچوں میں چہچہاتے ہیں تو میں ان کی ایک ایک بات سمجھتا ہوں۔ پھول کھلتے ہیں تو شہد کی مکھیاں آکر بہار کے نغمے سناتی ہیں۔ جب جنگل سو جاتا ہے تو خاموشی میں رات کی ہزاروں آنکھیں مجھے تکتی ہیں —— میں تاروں کو دیکھتا رہتا ہوں اور وہ مجھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں محفل میں بیٹھا ہوں۔ رات کی گہری خاموشی میں میں نے طرح طرح کی صدائیں سنی ہیں۔ ایسی صدائیں جنہیں صرف انتہائی خاموشی پیدا کرتی ہے۔ کئی مرتبہ یہ صدائیں میرے دل سے نکلی ہیں۔ بارہا خاموشیوں میں میں نے اپنی روح سے نکلے ہوئے نغمے سنے ہیں۔ ہر صبح پرندوں کی سیٹیاں مجھے جگاتی ہیں۔ پرندے میرے تکئے پر آبیٹھتے ہیں اور مجھے سست، کاہل، آرام طلب اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ ان رفیقوں کے علاوہ میری لائبریری بھی ہے۔ جہاں کئی پرانے دوست ہر وقت منتظر رہتے ہیں۔ جب میں پائپ سلگا کر کتابوں کی الماریاں کھولتا ہوں تو ادبی محفلیں جمتی ہیں۔ میرے محبوب شاعر مجھے اپنی نظمیں سناتے ہیں۔ اپنے پسندیدہ مصنفین سے میں بحث کرتا ہوں —— میری تنقید پر وہ برا نہیں مانتے۔ دوران گفتگو میں اونگھنے لگوں یا سو جاؤں تو وہ اٹھ کر چلے نہیں جاتے، وہ ہر وقت میرے منتظر رہتے ہیں —— کون کہتا ہے کہ میں تنہا رہتا ہوں۔“

رخصت ہوتے وقت اس نے راستے میں آنے والے ایک مقام کا ذکر کیا۔ جہاں تہوار پر جشن منایا جا رہا تھا۔ ایک تعارفی خط دیا اور اصرار کیا کہ وہ ضرور وہاں قیام کرے۔ اگلے روز وہ پہنچا۔ شہر سے باہر پہاڑی پر باغوں میں جشن ہو رہا تھا۔ آج جشن کی آخری رات تھی۔ اس کا میزبان شام کو اسے باغوں میں لے گیا جب وہ پہاڑی پر پہنچا تو اسے یوں معلوم ہوا جیسے پریوں کے ملک میں پہنچ گیا ہو۔ بادام، شفتالو اور سیب کے درخت سفید اور گلابی کلیوں سے لدے ہوئے تھے۔ سوکھی سوکھی ٹہنیوں پر یہ حسین کلیاں نہایت پیاری

معلوم ہو رہی تھیں۔ پھولدار پودوں میں رنگ برنگے قمقمے روشن تھے۔ روشوں کے ساتھ ساتھ گلاب کھلا ہوا تھا۔ قسم قسم کا گلاب — سرخ، زرد، سفید، آبی، سیاہی مائل — سرو کے اونچے درختوں کی قطاریں دور دور تک چلی گئی تھیں۔ ہوا کا ہر جھونکا اپنے ساتھ ایک نئی خوشبو لاتا۔ کبھی کلیوں سے، کبھی پھولوں سے، کبھی کسی پیراہن سے۔

باغوں کے وسط میں نازک ستونوں اور نفیس محرابوں کی ایک سفید عمارت تھی۔ جہاں سب جمع تھے ایک گوشے میں سازوں پر موسیقی ہو رہی تھی۔ اس کا تعارف کرایا گیا۔ اسے بطور اجنبی دوست کے شامل کر لیا گیا۔ ایک خاتون آئیں اور اسے نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کے گروہ میں لے گئیں۔ جہاں کھیل ہو رہے تھے۔ سب اس اجنبی کو حیرت سے دیکھنے لگے جو باوجود غیر ملکی ہونے کے ان سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ گروہ میں کچھ شمالی حصوں کے لڑکے لڑکیاں بھی تھے۔ جن کے خدوخال مختلف تھے۔ زبان مختلف تھی۔ شور مچا ہوا تھا۔ سرو کی قطاروں میں سے گذر کر آگے میدان تھا جس میں سنگ مرمر کا مجسمہ تھا۔ مجسمے کے شانے پر صراحی تھی جس سے فوارہ رواں تھا قمقموں کی روشنی میں پانی کے قطرے مختلف رنگوں میں رنگے جاتے اور نہایت پیاری آواز کے ساتھ نیچے گرتے پہلے تاش کے کھیل ہوتے رہے پھر سازوں کے کھیل شروع ہوئے۔ وہ اجنبی تھا اور سب کی نگاہوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اسے بہت سی مسکراتی ہوئی نشیلی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ آنکھیں حسین تھیں مگر سب ایک جیسی تھیں۔ دمکتے ہوئے چہرے بھی ایک جیسے تھے۔ پھر دو آنکھیں اس کی طرف اٹھیں۔ ان نگاہوں میں عجب نرالا پن تھا۔ انفرادیت تھی۔ اس چہرے میں عجب کشش تھی۔ ان لبوں میں انوکھی جاذبیت تھی۔ لٹیں جو ماتھے پر پریشان تھیں، شانوں پر پریشان تھیں۔ وہ رسیلے گلابی ہونٹ جو صرف چومنے کے لئے تخلیق ہوئے تھے۔ وہ اجلی پیشانی اور رخسار جو صرف پیار بھرے لمس کے لئے بنے تھے۔ تیز جھونکا آیا۔ لٹیں بکھر گئیں اور کانوں میں پہنے ہوئے تاروں کی وضع کے آویزے چمکنے لگے۔ اس نے باتیں کرنی چاہیں۔ جواب ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے ملا۔ وہ اس کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ اگلے کھیل میں وہ پارٹنر بنے۔ درختوں میں بھاگتے ہوئے دور چلے گئے۔ فوارے کے پاس اس نے جان بوجھ کر دیر لگا دی اور اسے غور سے دیکھا۔ یہ کیسا حسن تھا — یہ کیسی دلربائی تھی۔ اس حسن سے تو وہ پہلے کبھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ یہ اجنبی حسن جس میں ہزاروں شعلوں کی تپش تھی۔ چاندنی کرنوں جیسی ملائمت تھی اور سپیدۂ سحر کی نفاست۔ کنول کے پھولوں کا نستعلیق پن تھا۔ اس حسن میں میں صحراؤں میں یکایک نظر آ جانے والے سراب کی کشش تھی۔ شاید اسے نظر بھر دیکھنے کے لئے اس نے اتنا طویل سفر کیا تھا۔ جب وہ واپس لوٹے تو بہت سی لڑکیاں باغ کے دوسرے گوشے سے آ گئیں اور وہ اس ہجوم میں اوجھل ہو گئی۔ تلاش کرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ وہ ایک گوشے میں کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اگلے کھیل کے لئے پارٹنر چنے جا رہے تھے۔ سب کو کہا گیا کہ باغ میں دور دور نکل جائیں۔ ہر ایک اپنے لئے ایک پھول توڑے۔ جن جن کے پھول ایک سے ہوں گے۔ وہ پارٹنر بن جائیں گے۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ چلی گئی جب لوٹی تو پاس سے گذرتے ہوئے ایک پھول اس کی طرف پھینک گئی جب پھول پیش کئے گئے تو

اس کا پھول نیلے رنگ کا تھا پھولوں کے ڈھیر میں صرف ایک اور پھول اس قسم کا تھا۔

تاروں کو گننے کا کھیل شروع ہوا۔ اس نے باتیں کرنی چاہیں۔ لیکن سر کی جنبش سے جواب ملا کہ وہ اس کی زبان نہیں سمجھتی۔ اسے مقامی زبان بھی نہیں آتی تھی۔ اسے کھیل کی ہدایتیں کسی اور زبان میں دی جاتی تھیں درختوں میں چلتے چلتے وہ دور نکل گئے۔ اتنی دور جہاں قمقموں کی روشنی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جہاں موسیقی کی آواز اتنی مدھم ہو چکی تھی کہ محض تخیلی شے معلوم ہوتی تھی۔ اس کی پیشانی پر زلفیں پریشاں تھیں۔ بل کھاتی ہوئی لہراتی زلفیں جن میں دو تارے جیسے آویزے چمک رہے تھے

آسمان سے تارے جھانک رہے تھے ــ سرو کی چوٹیوں سے لٹکے ہوئے تارے، پتوں اور ٹہنیوں میں الجھے ہوئے تارے، ٹمٹماتے، جگمگاتے تارے، نیلے سبز سرخ ــ گول نوکیلے تارے ــ ننھے منے بڑے بڑے تارے، تارے جو ساکن تھے جو متحرک تھے۔

لب خاموش تھے اور آنکھیں گویا تھیں۔ آنکھیں محسوس کر رہی تھیں ــ وہ احساسات جو زبان سے ادا نہیں کئے جا سکتے جنہیں صرف موسیقی ادا کر سکتی ہے۔ موسیقی جو دھیمے سروں میں نغمہ زن تھی۔ موسیقی جو اسمانی معلوم ہوتی تھی۔

تب اس کے اجڑے ہوئے دل میں محبت جلوہ گر ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کا نور سما گیا ــ اور اس کی روح محبت کے کیف آور بار تلے دب گئی۔

کئی مرتبہ وہ ہجوم میں شامل ہوتے۔ کھیلوں میں شریک ہوئے۔ پھر واپس کنجوں میں لوٹ آتے۔ فوارے کے قریب گننے، مجسمہ مسکرا رہا تھا۔ پھواریں رنگ برنگے قطروں میں بکھری جا رہی تھیں۔

رباب کے تار سانس لے رہے تھے۔ نغمے کی دھڑکن سنائی دینے لگی۔ موسیقی زندہ ہو گئی۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی زبان نہیں آتی تھی۔ پھر بھی نگاہوں سے جی بھر کے باتیں ہوئیں۔ زندگی بھر کی کہانیاں ایک دوسرے کو سنائیں ــ وہ اجنبی نہیں رہے تھے۔

اس کے ذہن میں طرح طرح کے نقوش ابھرنے لگے ــ ایک خوشنما گوشہ، چھوٹا سا مکان، چمنی سے بل کھاتا ہوا دھواں ــ سکون ــ اور یہ چہرہ۔ پھر صبح کا ہنگامہ، غنچوں کی چٹک، خنک ہوائیں، خوش الحان طیور کی نغمہ سرائی ــ اور یہ چہرہ ــ معطر چاندنی راتیں ــ خاموشیاں ــ تنہائیاں اور یہ چہرہ چہرہ جو عمر بھر دعوت نظارہ دیتا رہے۔ جس کی دلآویزی اور دلربائی کبھی کم نہ ہو ــ کاش یہ خواب حقیقت بن جائے ــ یہ پل تھم جائے۔ جس کی خاموشی میں اتنا جادو ہے۔ اس کی گویائی کیسی ہوگی۔

مدتوں کے بعد اس کی زندگی کے ویرانے میں بہار آئی جو شعلہ برسوں سے بجھ چکا تھا آج بھڑکا۔ ظلمتوں کے افق پر معصوم محبت طلوع ہوئی ــ نور عود کر آیا۔

محبت کے شدید احساس کے ساتھ مستقبل کے پیارے خواب رنگین تعبیریں، سہمی ہوئی امنگیں — وہ سب سحر کاریاں بھی عود کر آئیں۔ اسے عجیب عجیب خوشگوار حادثوں کی توقع تھی — جیسے نگاہوں کے پیغام کبھی ختم نہ ہوں گے۔ اب یہ چہرہ کبھی اوجھل نہیں ہوگا۔ تپتے ہوئے صحراؤں میں جو کبھی کبھی سراب دکھائی دیا کرتا تھا، آج حقیقت بن گیا تھا۔ آج اس نے سراب کو پا لیا تھا۔

تارے جھلملاتے رہے۔ رباب پر وہ آسمانی دھن بجتی رہی، خوشبوئیں مہکتی رہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر نئے کھیلوں کے لئے بلایا گیا۔ وہ کچھ دیر کے لئے جدا ہو گئی۔ چلتے چلتے اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس نے کھیل میں شرکت نہیں کی اور انتظار کرتا رہا۔ — کھیل کے اختتام پر وہ واپس نہ لوٹی۔ وہ منتظر رہا۔ لیکن وہ نہ آئی۔ لمحے گزرتے گئے۔ دیر ہو گئی — وہ اب بھی نہ آئی۔

اس نے باغ کے گوشے گوشے میں تلاش کیا۔ ہجوم میں ڈھونڈا۔ اپنے میزبانوں سے پوچھا۔ لیکن وہ نہ ملی۔

پھر اس نے دیکھا کہ رات ڈھل چکی ہے۔ جشن ختم ہونے والا ہے اور لوگ جا رہے ہیں۔ آنکھوں میں جستجو اور دل میں امید و بیم لئے وہ بدستور تلاش کرتا رہا۔ پہاڑی کے نشیب سے جب وہ باغ میں واپس آیا تو وہاں کوئی نہ تھا — سب جا چکے تھے۔

وہ درختوں کے جھنڈ میں گیا۔ لمبے لمبے تنہا درخت اداس کھڑے تھے، فوارہ خاموش تھا۔ پانی کی بوندیں صراحی سے گر رہی تھیں — پانی کے یہ قطرے مجسمے کی آنکھوں سے بہتے ہوئے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ ٹپ — ٹپ — ٹپ — یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مجسمہ رو رہا ہو۔

دفعتہً اسے اپنا خواب یاد آیا۔ خواب جسے وہ مدتوں سے دیکھتا آیا تھا۔ اس مبہم سی پگڈنڈی پر ملنے والی حسینہ کے خد و خال بالکل ایسے ہی تو تھے۔ یہ وہی تو تھی جو اسے ویرانیوں میں کچھ دیر کے لئے مل کر جدا ہو جاتی تھی — اس کا دل تلملانے لگا۔

خدایا یہ اجنبی کون ملا تھا — یہ اجنبی کون جدا ہوا تھا — یہ خواب تھا یا حقیقت — یہ کیا تھا؟ اس اجنبی آسمان کا کوئی فسون؟ یا ان پراسرار خوشبوؤں کا جادو — یا موسیقی کا طلسم —؟ وہ فسوں کہاں گیا — وہ موسیقی کہاں گئی — وہ خوشبوئیں کیا ہوئیں — وہ خوابوں کی حسینہ کہاں گئی؟ — کاش کہ اس نے پہلے پہچان لیا ہوتا۔ شاید۔ لیکن نہیں، یہی ہونا تھا۔ اب وہ زندگی میں دوبارہ نہیں ملے گی۔

اس نے پچھلی رات کے زرد چاند کو نکلتے دیکھا۔ تاروں کی شمعیں مدھم ہوتی دیکھیں، پھیکی افسردہ چاندنی پھیلتی گئی۔ ہلکی ہلکی دھند کہیں سے آ کر چھا گئی۔ بادلوں کے کالے اژدہے جا رہے تھے — پھر تنہائی نے اسے گھیر لیا۔ وہ تنہائی جس سے سیاح آشنا ہوتے ہیں جو بے پاؤں آتی ہے اور دفعتہً دبوچ لیتی ہے خلوت ہو یا محفل۔ جس کا وار کبھی خطا نہیں جاتا

اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح خیالات کا رخ بدل دے۔ اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کی۔ ابھی کچھ دیر کے بعد سورج نکلے گا۔ زندگی کی روشنی پھیل جائے گی۔ چاروں طرف چہل پہل ہوگی۔ وہ نئی نئی چیزیں دیکھے گا۔ یا وہ سرحد کی طرف لوٹ جائے گا۔ اپنے وطن چلا جائے گا۔ وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ اور سورج نکلنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

لیکن وہ تنہائی بڑھتی گئی، وہ اداسی گہری ہوتی گئی۔ شدتِ غم سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔۔۔ وہ کیوں اس طرح مارا مارا پھرا کرتا ہے۔ وہ کون سی بے چینی ہے۔ کون سا کرب ہے جو اسے سیاحت پر مجبور کیا کرتا ہے۔ کس درد کو وہ دل میں چھپائے یوں آوارہ پھرتا ہے۔ سکون سے وہ کیوں خوفزدہ ہے۔ آخر یہ فرار کیوں؟ اور یوں کب تک ہوگا۔

وہ اس شور مچاتی متحرک دنیا کا ایک بے حس جزو کیوں نہیں بن جاتا۔ وہ اس انبوہِ کثیر میں کیوں نہیں شامل ہو جاتا۔ کیا شے ہے جسے وہ یوں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ وہ اتنے انسانوں کو جانتا ہے۔ لیکن ان میں کوئی اس کا ہمدم و رفیق بھی ہے۔۔۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جسے وہ اپنی کہہ سکتا ہو۔ وہ ہمیشہ سراب کی تلاش میں رہا۔۔۔ ہمیشہ سراب اسے کیوں کھینچتا ہے۔ یہ کیسی کشش ہے۔ وہ حقیقت سے کیوں گریزاں ہے۔ حقیقت اسے کیوں چونکا دیتی ہے۔

نشیب میں شہر کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ دھند نیچے اتر آئی تھی۔۔۔ روشنیاں مدھم ہو کر چھپ گئیں۔ بادلوں سے بے نور چاند نکلا۔ بے نور تارے جھانکنے لگے۔ دھند میں طرح طرح کے سائے پھیل گئے۔ ہیولے متحرک ہو گئے۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس سیارے کا پہلا انسان ہے۔ جیسے وہ اس سیارے کا آخری انسان ہے۔۔۔ وہ انسان جو تخلیق کو فنا سے ملاتا ہے۔۔۔ انسان جو صدیوں سے تنہا ہے، صدیوں سے بے تاب ہے۔

اس نے دیکھا کہ سامنے افق پر بادلوں نے ایک خوشنما قصر بنا رکھا ہے۔ جس کی فصیلیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مینارے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ قصر کے بڑے دروازے تک بل کھاتا ہوا راستہ جاتا ہے۔ بادلوں کے کناروں کو چھوتا، حاشیوں کے ساتھ ساتھ چلتا، دھند میں سے گزرتا۔

اسے یاد آ گیا۔۔۔ یہی قصر تو اس نے خوابوں میں دیکھا تھا۔۔۔ ہو بہو یہی تو تھا۔ وہ اجنبی حسینہ پھر یاد آ گئی۔ کوئی چیز اس کے دل کو مسوسنے لگی۔ اس کی روح میں چٹکیاں لینے لگی۔ وہ اداسی شدید ہوتی گئی۔ احساسِ تنہائی بڑھتا گیا۔۔۔ وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

دفعتہً بادلوں نے جنبش کی۔ قصر میں شگاف آ گئے۔ برج منہدم ہو گئے۔ فصیلیں مسمار ہو گئیں۔ بل کھاتا ہوا راستہ شق ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ عمیق گہرائیوں میں اترتا جا رہا ہے۔۔۔ ایسی فضاؤں میں جہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جہاں صرف دلدوز تاریکی تھی۔

وہ ظلمتوں میں گرتا چلا گیا۔۔۔ جہاں صرف خلا تھا، ہولناک نہ ختم ہونے والا خلا۔۔۔

ناہید عالم

رخشی

وہ شاید بہت جلد اٹھ کھڑی ہوئی تھی ——— لان کے گرد بل کھاتی ہوئی بجری کی سنہری سڑک پر ٹہلتے ہوئے اس نے محسوس کیا جیسے کائنات ابھی تک رات کے اچھوتے سکوت کے پردے میں ملفوف ہے۔ کالونی کی تمام کوٹھیاں خاموش پڑی تھیں، اس نے کالونی کے پھاٹک میں گم ہوتی ہوئی اس سیدھی اور شفاف سڑک پر نظر ڈالی جو بیدار ہونے سے پہلے کی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی ——— وہ سوچنے لگی، گھنٹہ بھر بعد اس سڑک کی شکل کتنی مختلف ہوگی، ڈیری والے کا تانگہ جس میں جُتا ہوا خچر نہایت بے تکلفی سے ہر تیسری کوٹھی کے پھاٹک پر غلاظت بکھیر دینے کا عادی ہے، اس ستھری اور شفاف سڑک کے چہرے پر کوڑھ کا داغ بن جائے گا۔ مکھن، کریم اور ڈبل روٹی بیچنے والے کی ہوٹر نا گاڑی قدم قدم پر تیل کے بڑے بڑے دھبے بکھیرتی جھپاکے کے ساتھ ہر کوٹھی میں گھسنے لگے گی اور اپنے بے ڈھنگے چپلوں سے سڑ پڑ سڑک کو روندتی ہوئی آیائیں، بچوں کو گاڑیوں میں بٹھلائے پیڑیوں کے آخری سرے اور کہیں کہیں پان کی پیک پھینکتی ہوئی ایک ذو بسرے سے ٹھٹھے کرتی گذر جائیں گی ——— لیکن ایک گھنٹہ اور گزر جانے پر یہی سڑک پھر پہلے کی طرح سنوار دی جائے گی۔ پیک اور تیل کے دھبے دھو ڈالے جائیں گے۔ اور جنوں کی سی پھرتی سے کام کرنے والے مہتر تمام غلاظت کو مال غنیمت کی طرح سمیٹ لے جائیں گے ——— سڑک پھر گہری گہری سانسوں کے درمیان افسروں کی چمکیلی کاروں کا انتظار کرنے لگے گی۔ اور یکے بعد دیگرے تیس چالیس کاریں، اس سے دھیمی دھیمی سرگوشیاں کرتی ہوئی گزر جائیں گی، اور ایک بار پھر تمام کالونی پر خاموشی طاری ہو جائے گی۔ شوہروں کو دفتر بھیج دینے کے بعد عورتیں کیسی فضول سی مخلوق دکھائی دینے لگتی ہیں۔ بالکل بیکار، جیسے ان کا کوئی مصرف ہی نہ ہو۔ لیکن ایسا کیوں ہے؟ شوہر ان کے احساسات پر اس بری طرح کیوں چھائے ہوئے ہیں۔ وہ ان سے آخر ایسا کیا حاصل کر لیتی ہیں کہ اس کے بدلے میں ہر چیکی اور بے کیفی

چیز بھی ان کے لئے زحمت بن جاتی ہے۔ شوہر ـــــــ خاصا اکتا دینے والا لفظ ہے۔ شوہر اور بیوی۔ ان کی زندگی کا پروگرام ہی کیا ہے۔ ہر روز وہی گھسے پٹے جملے، وہی گھسی پٹی باتیں، وہی ہر روز بننے والے نئے پروگرام، اوہ! مگر اس نئے پن میں بھی کس قدر پرانا پن ہے۔ ہر روز ایک نیا پروگرام ـــــــ ورنہ کبھی ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ کوئی پروگرام ہی نہ ہو اور شام اطمینان سے گھر بیٹھ کر گزار دی جائے۔ لیکن ان تمام گھسی پٹی باتوں کے باوجود، اس تمام بے کیف تسلسل کے باوجود، ہر عورت اتنی مطمئن اور آسودہ دکھائی دیتی ہے جیسے اپنی زندگی کا مقصد پا لیا ہو۔ اور یہاں روز بروز بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس نے سوچا، نفرت نئے نئے ڈھنگوں سے میرے دل میں سر اٹھا رہی ہے، شاید اس لئے کہ عظیم مجھے ہر قسم کے آرام کے باوجود اب تک وہ نہ دے سکا جو باقی عورتوں نے اپنے شوہروں سے حاصل کیا۔
"اُف! میری گود اب تک خالی ہے ـــــــ!" اس نے مضطرب ہو کر ایک بیزار سی انگڑائی لی۔ سامنے باڑ کے ساتھ ہالی ہاکس کے بلند قامت پودے گلابی، سرخ اور سفید سفید پھولوں سے بے طرح لد چکے تھے۔ بہار بہت تیزی سے اپنی جوانی کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ باغ میں ہر قسم کے پھولوں کی بہتات تھی۔ لیکن اس کے دل پر مردنی سی چھائی تھی۔ چند سال پیشتر اسے ایک ایسے باغ کی کتنی تمنا تھی۔ باغ ـــــــ جو فلاکس، پینزی، ڈیلیا اور گلاب کے پھولوں سے پٹا پڑا ہو۔ اور اس کی یہ تمنا شاید اپنی حدود سے اس لئے بڑھ گئی کہ وہ اپنے گھر میں اس قسم کا باغ کسی بھی صورت نہ لگا سکتی تھی ـــ کچھ یہ وجہ نہ تھی کہ اس کا گھر چھوٹا سا تھا۔ بلکہ زمین تو اتنی تھی کہ اگر زرخیز ہوتی تو وہ وہاں ایک بہترین باغ لگا لیتی۔ اس نے سینکڑوں مرتبہ بلاوجہ ہی جھنجلا کر اپنے بوڑھے مالی کو جو اس کے ابا کے انتقال کے بعد، بیک وقت مالی اور بیرے کی خدمت انجام دیتا تھا بے نقط سنا ڈالی تھیں "کھوسٹ کہیں کا ـــ جس پودے کو ہاتھ لگاتا ہے مرجھا کر سوکھ دیتا ہے۔" لیکن اس کے جوان ہاتھ بھی وہاں اپنی طرح شگفتہ پھول نہ کھلا سکے۔ زمین بنجر ہو تو بیچارے مالی کا کیا دوش۔ لیکن وہ اپنی نادانی کی وجہ سے یہی سمجھتی رہی کہ قصور مالی کا ہے۔ اس کے بڑھاپے کا ہے۔ بڑھاپے میں انسان چاہنے کے باوجود وہ نہیں کر سکتا جو جوانی میں غیر ارادی طور پر ہو جاتا ہے ـــــــ یکایک اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ڈیری والے کا تانگہ کھڑکھڑاتا ہوا سامنے کی کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا ـــــــ معاً اسے یاد آیا کہ آج اس کے شوہر کی سالگرہ ہے۔ ۳۴ ویں سالگرہ، اور وہ دل ہی دل میں اندازہ لگانے لگی کہ اس سلسلے میں کی جانے والی دعوت میں اسے کتنے دودھ اور کتنی کریم کی ضرورت ہوگی؟ اس نے باورچی کو بلوا کر اسے ضروری ہدایات دیں۔ اور کچھ کھوئی کھوئی سی ٹہلنے

گئی ـــــ وہ آج اچھی طرح وعدہ کر چلی تھی کہ شام کو عظیم سے پھوپی اماں کے ہاں جانے کا بہانہ کر کے اس کے گھر آئے گی ـ وہ ہمیشہ پھوپی اماں کے ہاں جانے کا بہانہ اس لئے تراشا کرتی تھی کہ اسے اس بات کا یقین تھا کہ عظیم پھوپی اماں سے قدیم خاندانی دشمنی ہونے کی بنا پر اسے لینے وہاں نہیں آ سکتا۔ ہاں چاہے کیسا ہی ضروری کام کیوں نہ آن پڑے مگر تو وہ اسے وہاں جانے ہی کیوں دے گا۔ "بوڑھا بکرا!" وہ یکایک بپھر گئی "اسے کیا حق ہے کہ میرے راستے میں رکاوٹ ڈالے! میں آج اسے صاف صاف بتا دوں گی کہ میرے اندر ایک عورت اور بیوی کے علاوہ، ارمان بھرا دل لئے ایک ماں بھی بیٹھی ہے ـ اور مجھے اس کی خواہشات کا احترام کرنا ہوگا ـ خواہ اس کے لئے مجھے کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے ـ ہاں کتنی ہی بڑی ـــــ!" مگر وہ اپنی اس قربانی کا خیال کر کے کانپ گئی جو وہ بغیر سوچے سمجھے دے چکی تھی ـ اسی روز سے اس نے اپنے شوہر کا حد سے زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا تھا ـ وہ اسے دفتر جانے کے لئے تیار ہونے میں مدد دیتی ـ اس کے کھانے کا خیال رکھتی، اس کے دوستوں کی حد سے زیادہ تواضع کرتی ـ اس کی وہ تمام باتیں جو پہلے بے پروائی سے ٹال دیا کرتی تھی، خاموشی سے مان لیتی ـ اس کے دل میں ایک چور سا بیٹھ گیا تھا ـ گو وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر اتنا شکی ہرگز نہیں ہے ـ اور اگر اسے شک ہو بھی گیا تو وہ اتنا عالی ظرف ہے کہ اس کا اظہار ہی نہ ہونے دے گا ـ مگر پھر بھی اس کے دل میں ہر گھڑی ایک عجیب سی بے چینی رہتی ـ ـــــ "تو نے جرم کیا ہے ـ شوہر سے بے وفائی عورت کا سب سے مکروہ جرم ہے!" کوئی اسے ہر وقت کچوکتا رہتا ـ مگر اس کے اندر چھپی ہوئی تشنہ ماں، اسے دھیرے دھیرے تھپک دیتی "ٹھیک ہے ـ ٹھیک ہے! عورت کا اولین فرض ماں بننا ہے، ماں! اب یہ اور بات ہے کہ طریقہ جائز ہو یا ناجائز ـــ" وہ گھنٹوں ایک عجیب سی کشمکش میں پھنسی رہتی ـ اور آخر جائز و ناجائز کے جھگڑے ہی کو مہمل قرار دے دیتی ـ

درختوں کے اوپر سے سرکتا سرکتا سورج جھانک رہا تھا ـ باورچی خانوں کی چمنیوں سے میلے میلے دھوئیں کے بادل نکلنے لگے ـ اپنے جسم کو خوبصورت بنانے کا شوقین ناصر سے بھاگتا ہوا "آداب عرض" کا احسان اس کے سر رکھ کر تیزی سے سامنے کے موڑ پر غائب ہو گیا ـ کانونٹ میں پڑھنے والی لڑکیاں نہانے کا لباس پہنے، سائیکلنگ کرتی سیٹیاں بجاتی ہوئی ـ اور ہنستے ہوئے شگفتہ چہروں پر ایک بھولپن لئے، کالونی کے کلب میں گھسنے لگیں ـ یہ لڑکیاں بھی کتنی معصوم اور بے خبر ہیں ـ اسے خیال آیا ان میں کتنی ننھے ننھے سینوں میں آئندہ کی خوش گوار زندگی کے ارمان لئے ہوں گی، ایک اور بچے

کے شوہر کا ارمان ــــــ خوب صورت کوٹھی، چمکیلی کار اور جم خانے میں ناچ کے حسین خواب دیکھتی ہوں گی۔ معصوم آرزوئیں مچلتی ہوں گی۔ دھیمی دھیمی خوشگوار آگ ہوگی جو انہیں گرم رکھتی ہوگی۔ حالانکہ بعض اوقات حقیقت انتہائی تلخ ثابت ہوتی ہے! مگر اس کا علم انہیں کیسے ہو؟ شادی سے پہلے وہ خود بھی تو یہی خواب دیکھا کرتی تھی۔ ایک حسین باغ کے حصار میں بنی سجائی پُرتکلف کوٹھی۔ پانی کی سی روانی سے بہنے والی چمکیلی اور شاندار کار، اور اسی قسم کے بے شمار خواب۔ جو ہر وقت اسے نیم خوابیدہ حالت میں رکھتے۔ اوہ، مگر وہ کتنی بدقسمت تھی کہ ان تمام خوابوں کے پورا ہو جانے کے باوجود خوش نہ تھی، مطمئن نہ تھی ــ حقیقت اس کے لئے انتہائی تلخ ثابت ہوئی تھی ــ لیکن خدا نہ کرے کہ ان نوخیز کلیوں کی زندگی بھی اس کی طرح بے سود ثابت ہو۔ خدا کرے کہ انھیں صحت مند اور نوجوان شوہر نصیب ہوں! وہ نہایت پیار سے ان لڑکیوں کو جاتے دیکھنے لگی۔ اور پھر نہ جانے کیوں یکایک اس کے دل پر ایک چوٹ سی پڑی ــ "اللہ! میں نے عظیم سے شادی کیوں کی ــ کیوں کی ــ کاش میں کسی نوجوان کلرک سے شادی کر لیتی۔ ایک ننھا سا کھلونا ہماری تمام تلخیوں کا علاج ہوتا۔ اس حویلی وعریض سونے گھر سے وحشت ہوتی ہے۔ اوہ!" مگر وہ اپنی غلطی کی ذمہ دار خود تھی۔ اس کی امی تو خود بھی نہ چاہتی تھیں کہ وہ عظیم سے بیاہی جائے۔ سب سے بڑا سوال عمر ہی کا تھا جو انھوں نے اٹھایا تھا۔ مگر اس کی خالہ اماں نے کچھ اس طرح پٹی پڑھائی کہ وہ بالکل اندھی ہوگئی۔ "اے ہٹ بھی، تو نے تو ہزار بار دیکھا ہی ہے، اپنے عظیم کی عمر زیادہ ہے تو کیا ہوا صحت تو ماشاء اللہ اتنی اچھی ہے کہ مشکل سے اٹھائیس برس کا معلوم ہوتا ہے۔ اے ہاں اور سچ تو یہ ہے کہ اتنے بڑے عہدہ پر اس سے کم عمر میں کوئی پہنچ بھی کیسے سکتا ہے! اور پھر مردوں کی عمر کا ہے ہی کیا۔ یہ عمر بھی خدا رکھے جوانی ہی کی ہوتی ہے۔ وہ مثل ہے نا کہ ساٹھا سو پاٹھا آ"۔

توخالہ اماں نے کچھ ایسی تجنیں لگائی کہ وہ جال میں پھنس گئی۔ اور امی کے کہنے سننے کے باوجود اس شادی پر اڑ گئی۔ دراصل اسے عظیم کی نئی "بیوک" اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس کوٹھی کو بھی اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس کا اعلیٰ عہدہ اور اس کی پُرتکلف زندگی۔ اور وہ اپنے خواب پورے ہونے پر بے حد خوش تھی۔ شادی کے بعد اس نے اپنے دل میں عظیم کے لئے شدید محبت محسوس کی تھی۔ وہ واقعی ایک اٹھائیس برس کا حسین اور نوجوان مرد دکھائی دیتا تھا۔ جس کی معیت میں وہ ایک عجیب سا فخر محسوس کرتی ــ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اسے اپنی محبت سے بھرپور زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ ایک کانٹا سا ہر وقت کھٹکنے

گا۔ وہ عظیم کے متعلق بڑی عجیب عجیب سی باتیں قائم کرنے لگتی۔ اور اکثر بے حد طفلانہ حرکتیں کر بیٹھتی
لگتی۔ عظیم مسکرا دیتا "آخر تمہیں جھنجھلاہٹ کیوں اس قدر بیتاب کیوں ہے۔ مجھے تو سخت نفرت ہے
بچے کہتا ہوں" اور وہ بپھر کر کہتی "ہاں۔ ہاں میں جانتی ہوں ہارے کا ایک ہی ہتھیار ہوتا ہے"
مگر عظیم برا نہ مانتا اور مسکرائے جاتا جس سے وہ اور بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی۔ عظیم سوچتا ابھی
بچی ہے۔ سنجیدگی سے کسی مسئلہ پر غور کرنا نہیں سیکھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ ہی تو دماغ پختہ ہوتا ہے نا۔
میری گڑیا رخشی!" وہ دھیرے دھیرے اسے تھپکنے لگتا۔ مگر اب تو اسے اس کے لمس سے بھی
چڑ ہونے لگی تھی۔ وہ ہلکے ہلکے ہاتھ جیسے اب سرد ہو گئے تھے، جوانی کی حدت سے عاری
بڈھے اور پژمردہ! ــ اور کبھی کبھی تو اسے اپنی غلطی کا بہت ہی شدت سے احساس ہونے
لگتا۔ وہ بھی بیوقوف تھی۔ بھلا اڑتیس انتالیس سال کا مرد بھی کہیں جوان ہوتا ہے۔ وہ حساب
لگاتی، گویا جب اس کی شادی ہوئی تو وہ آہستہ آہستہ اپنی جوانی کی طرف جا رہی تھی۔ انیسویں
سال کی طرف اور عظیم تیزی سے بڑھاپے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ شادی کے چند مہینے بعد ہی اس نے
چالیسویں سال میں قدم رکھ دیا تھا۔ آج اس کی تینتالیسویں سالگرہ ہے۔ وہ سوچنے لگی "ہماری
شادی کو تین سال ہو چکے ہیں ــ مگر میں اب تک ــ اوہ، اونہہ!" اس نے جھنجھلا کر سر جھٹک
دیا۔ آخر وہ اس قدر بیتاب کیوں ہے؟ کیا ایک بچے کے بغیر عورت کی زندگی ادھوری رہ جاتی
ہے۔ اس کی سہیلیاں تو اس پر رشک کرتی ہیں۔ وہ خوش قسمت لڑکیاں جو شادی کے اگلے
سال ہی مائیں بن گئیں ــ! پھر شادی کے ایک سال بعد تک خود اس کے دل میں بھی تو یہ
بے تاب تمنا نہ تھی۔ بلکہ وہ خوش تھی کہ اتنی جلدی اس جنجال میں نہ پھنسی۔ مگر آہستہ آہستہ نہ
جانے کیسے، اس کے اندر ایک ماں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اور اس تمنا کو زیادہ سرکش
بنانے میں عظیم کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مصروفیات کا بھی ہاتھ تھا۔ کبھی کبھی اس کا جی
چاہتا کہ کوئی ہر وقت اس کے پاس رہے۔ تمام دن! مگر عظیم تو صبح آٹھ بجے دفتر چلا جاتا۔
اور ۸ یا ۹ بجے گھر لوٹتا۔ تمام وقت ایک اذیت ناک وحشت سی رہتی۔ ایک عجیب سا احساس
تنہائی بے چین رکھتا۔ اور وہ اکثر گھبرا کر سوچنے لگتی "کاش! میرا ایک بچہ ہوتا۔ ایک ننھا سا
کھلونا۔ جسے میں اپنا سمجھ کر سب کچھ کہہ سکتی ــ ہاں سب کچھ، بہت سی ایسی باتیں جو میں عظیم
سے بھی نہیں کہہ سکتی۔ وہ میرا ضرور ہے۔ لیکن پھر بھی ــ پھر بھی، میرا بچہ تو میرا اپنا ہوتا، بالکل
میرا ــ!" اور اس وقت اس کے دل میں عظیم کے متعلق وہ شبہے اور بھی زیادہ زور پکڑ لیتے
اور وہ مایوس ہو کر کہتی "کیا ہو سکتا ہے، کچھ بھی نہیں۔ بس میں عمر بھر یونہی ترستی رہوں گی۔
اف۔ اوہ!" وہ اب گھر ہی میں بند رہنے لگی تھی۔ کالونی میں کسی سے ملنے جاتی تو اس کا

احساسِ محرومی اور بھی بڑھ جاتا۔ کلب میں تمام عورتوں کو مطمئن دیکھ کر اسے اپنی بے چینی بڑھتی معلوم ہوتی۔ اور جب کوئی اپنے بچوں کا ذکر اس کے سامنے کرتا تو اسے یوں محسوس ہوتا گویا وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ اسے ذلیل کر رہا ہو: "تم بانجھ ہو۔" اسے محسوس ہوتا کہ ہر شخص ہی کو الزام دے رہا ہے۔

وہ چڑچڑاتی اور اس رات عظیم کو اس کے طعنوں کی بوچھار سے گھبرا کر سوتا بن جانا پڑتا۔ پھر ایک دن تو، جب تجربہ کار مسز خان نے اسے رائے دی کہ اسے کسی ڈاکٹر سے مشورہ لینا چاہیے تو وہ بالکل ہی بپھر گئی: "میں دکھا دوں گی انھیں کہ قصور وار کون ہے؟ دراصل وہ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ ایک نامعلوم سا اندیشہ اس کے پاؤں پکڑ لیتا تھا: "اگر ڈاکٹر نے اس کو قصور وار ٹھیرا دیا تو ـــ تو کیا ہوگا؟" وہ خود کو فریب میں ہی مبتلا رکھنا چاہتی تھی۔ دن گذرتے گئے اور اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔ جب وہ کچھ بھی نہ سوچ رہی ہوتی تب بھی یہی سوچتی کہ کاش وہ وہ ایک بچے کی ماں ہوتی۔" اور چند مہینے پیشتر جب سے اطہر یہاں آیا تھا اس کی یہ خواہش اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ بار بار اسے یونہی چھیڑ دیتا۔ اور وہ چونکہ اس کی شخصیت سے بڑی حد تک متاثر ہو گئی تھی، اس لئے مذاق میں کہی ہوئی باتوں کو بھی اہمیت دے بیٹھتی۔ اطہر تھا بھی بہت مختلف! اُفوہ! گویا کوئی فولادی چٹان ہو۔ عظیم اس کے سامنے کیسا لگتا تھا۔ بالکل ڈھیلا ڈھالا سا، دراصل وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ وہ سوچنے لگتی اور جھٹ سے فیصلہ بھی کر لیتی۔ اور پھر جب اپنی طرف دیکھتی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگتا۔ اس کا جوان جسم بغاوت پر آمادہ ہو جاتا۔ وہ اطہر کے لئے اپنے دل میں ایک انوکھا سا جذبہ پاتی۔ اور تمام تمام رات عظیم کا مقابلہ اطہر سے کرتی رہتی۔ اطہر بہر صورت عظیم سے بہتر ہے: وہ سوچتی: "کم از کم اس کی صحت عظیم سے کہیں اچھی ہے اور عظیم سے کم عمر بھی ہے لیکن شکل و صورت میں تو وہ کسی طرح بھی عظیم سے لگا نہیں کھاتا۔ اور پھر شرافت کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو ان میں اور ایک بازاری کتے میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ اونہہ! تو اس سے کیا!" وہ جھنجھلا کر سوچنے لگتی: "میں کون سا اس سے سدا کے لئے ناطہ جوڑ رہی ہوں!" وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے!

لیکن کئی مہینے گذر جانے پر اس نے دیکھا کہ لاٹھی ٹوٹ گئی ہے اور سانپ نہیں مرا۔!

ـــ لوگوں کی معنی خیز مسکراہٹیں اور بھی بڑھ گئی تھیں۔

کسی کی کار کے ہارن نے اسے چونکا دیا۔ اب سڑک جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگائی جا رہی تھی۔ لڑکیاں غسل کر کے واپس آنے لگیں۔ آیاؤں نے اپنی اپنی گاڑیاں سنبھال لیں، اور جب ملازم نے اسے آ کر اطلاع دی کہ "صاحب چائے پر اس کا انتظار کر رہے ہیں" تو وہ بے چینی سے سر

جھلکتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیاں طے کرنے لگی۔

اس نے اندازہ لگایا کہ اس کا جسم روز بروز پھیلتا جا رہا ہے اور اس کا اظہار اطہر کرتے ہوئے اس نے کہا کل میں ٹینس کورٹ ٹھیک کروالوں گی۔ کیا تم دفتر سے سیدھے یہیں نہ آ جایا کروگے؟ مدتیں گذر گئیں کھیلے ہوئے۔ عظیم کو تو شوق ہی نہیں!"

"ضرور! لیکن رخشی، سنا ہے یہ نقصان دہ ہے، تم ابھی ناتجربہ کار ہو نا!" وہ اس سے بہت بے تکلف تھا۔

"اوہو، ایسے ہی سو رہا ہوتا!" اس نے اس بار بھی اپنا پہلو بچانا چاہا لیکن الزام اطہر پر ہی رکھا۔

اطہر تلملا اٹھا اور اس کی گہری سرخ آنکھوں نے وار کیا: "مگر اچھی طرح جانتی ہو رخشی کہ مسز گارڈنر کی گود میں کلکاریاں مارتا ہوا بچہ کس کا ہے؟"

اس نے کھسیا کر اپنے بال نوچ لئے۔ ایسے ہی جیسے کھسیانی بلی کھمبا نوچ رہی ہو۔ "کون جانتا ہے، کون جانتا ہے؟" مگر اس طرح اس کی تسکین نہ ہوئی۔ مانتے ہوئے بھی وہ اپنا قصور ماننے پر تیار نہ تھی۔

— پھر چند مہینے اور گذر جانے پر، جب ایک شام عظیم کی غیر موجودگی میں وہ اور رضا لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تو یکایک وہ چڑ گئی۔

"تم میرے شوہر کی توہین مت کرو!"

"تو گویا آپ کو اس سے بڑی محبت ہے نا؟"

"کیوں نہیں وہ میرا شوہر ہے اور میرے دل میں اس کے لئے احترام ہے۔"

"اوہو! مگر تمہارے دل میں میرے لئے بھی تو احترام ہے۔" رضا نے طنز کا تیر پھینکا

"نہیں، وہ دھوکا تھا میں تم سے وہ حاصل کرنا چاہتی تھی جو عظیم مجھے نہ دے سکا۔ مجھے اطہر سے بھی محبت نہیں تھی۔"

"ذلیل بھکارن!" یکایک وہ دیوانے کتے کی طرح غرایا۔ "میں یہ پہلے ہی جانتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی میرا خیال تھا کہ تم شاید مجھ سے محبت بھی کرتی ہو۔ لیکن میرا خیال غلط تھا۔

اوہ —!"

"مگر رضا اس میں میرا قصور ہی کیا ہے۔ ہر عورت فطرتاً ماں ہوتی ہے۔"

"مگر بھکارن نہیں —" وہ زہریلے سانپ کی طرح پھنکارا — "تم اس جوش میں بہت نیچے چلی گئیں۔ کاش تم ایک عورت ہوتیں، ایک بیوی ہوتیں، ماں نہیں۔"

"پر رضا ـــــــــ"

"اور تم سب کچھ جانتے ہوئے خود کو بھی فریب دیتی رہیں اور مجھے بھی ۔ حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ بنجر زمین میں بیج نہیں پھوٹتے مگر بضد ہو کہ ـ "

ـــ اور پھر رات کو اس کے کانوں میں عجیب وحشت ناک آوازیں سائیں سائیں کرتی رہیں۔ رضا اس کا منہ چڑا رہا تھا اور اسکا سر چڑا رہا تھا عظیم اس کا منہ چڑا رہا تھا ـــــ "بنجر زمین میں بیج نہیں پھوٹتے ـــــ"

وہ رات گئے تک سلجھی سلجھائی گتھیوں کو الجھا ہوا جان کر سلجھاتی رہی۔ خود فریبی کا وہ طلسمی محل جو اس نے تعمیر کیا تھا، اب اسے زیادہ استوار رکھنا اس کے بس میں نہ تھا۔ آخر کار وہ کہنے لگی: "واقعی سچ تو ہے زمین بنجر ہو تو بچارے مالی کا کیا دخل !"

اور اگلی شام کچھ غیر ذمہ دار لوگ، اسے کلب میں عظیم کے ساتھ نہایت محبت اور چاہت سے پیش آتے دیکھ کر تمسخر بھرے انداز میں مسکرا دیئے۔ مگر آج ایک بار پھر وہ خود کو سب سے ارفع سمجھنے پر اکسا رہی تھی۔ اپنے شوہر کی وفادار بیوی ـ وفادار، ہُنھ !! یکایک اس کے دل کا چور جاگ اٹھا ۔ (۱)۔ اسے محسوس ہوا جیسے ہر شخص اس پر ہنس رہا ہے۔ مذاق اڑا رہا ہو۔

اس نے گھبراتے ہوئے انداز میں میز پر سے شراب کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا گویا اس طرح وہ لوگوں کی ہنستی ہوئی نگاہوں سے بچ جائے گی !

جائزے

پیارے مجاز!
تمہارا ذاتی خط سویرا میں شائع کر رہا ہوں
یہ بد اخلاقی ضرور ہے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر
یہ ضروری تھا، امید ہے کہ تم خفا نہیں ہوگے
اور خط لکھتے رہوگے۔ تمہارا ساحر

ایک خط

لکھنؤ
۳۰ جنوری ۴۸ء
میں ہوں مجاز ———

بھیا ساحر! پہلے تو یونہی سا ایک بند سُن لو ——

میں کہ بربادِ نگارانِ دل آرا ہی سہی
میں کہ رسوائے مے و ساغر و مینا ہی سہی
میں کہ مقتولِ گل و نرگسِ شہلا ہی سہی
پھر بھی خاکِ رہِ صاحب نظراں ہوں اے دوست!

اس کے بعد بہت کم لکھنے کو رہ جاتا ہے —— مگر لکھنا ہے۔

ہاں تو بھیا ساحر!

اپنی جملہ "سحر طرازیوں" کے ساتھ زندہ رہو۔ زندہ بھی رہو اور خوش بھی۔ کل تمہارا خط ملا اور "سویرا ابھی سویرا" کی ایک کاپی اس سے دو چار روز قبل ایک جگہ نظر نواز کی جا چکی تھی۔ مع ان تمام ملامتوں کے جو میرے حصہ میں ودیعت کی جا چکی ہیں۔ جن کا علاج نہ تمہارے پاس ہے نہ میرے پاس اور نہ کسی اور کے پاس۔ تم اس تصوف طرازی سے تنگ نہ ہو۔ اس کی تشریح آخری سطور میں کر دوں گا۔ فی الحال تو میں یہ بتا دوں کہ تمہارے خط ملنے سے کئی روز قبل سے تمہیں بے اختیار لکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ بنے بھائی نے جب سے لاہور سے واپسی پر بتایا کہ تم نے کس اشتیاق اور چاؤ سے مجھے یاد کیا ہے تو اور زیادہ تحریک ہوئی —— سویرا دیکھا تو یہ جذبہ ناقابل ضبط سا ہو گیا۔ اب خط ملا تو لکھے بغیر رہا نہیں جا رہا ہے۔

سویرا میں 'جان پہچان' کے سلسلہ میں تم نے دو ایک باتیں (خواہ وہ کتنے ہی خلوص کی بنا پر لکھی ہوں) ایسی لکھ دی ہیں جن کا 'جانتا' اور 'پہچانتا' —— دونوں میرے حق میں مزید تلخیاں پیدا کر سکتا ہے۔ تفصیل کی بدمذاقی میں نہیں جانا چاہتا۔ اور بغیر احتجاج اور شدید طور پر دوستانہ احتجاج کے رہ بھی نہیں سکتا۔ ہاں تو وہ دو ایک باتیں یوں ہیں:

"وہ دو دفعہ دیوانگی کے مراحل طے کر چکا ہوں" واقعاتی طور پر غلط ہے۔ ہاں دو بار میرا Nervous Break Down —— ضرور ہو چکا ہے۔ جسے کسی حد تک اور بہت حد تک دوستوں نے جنون سے

تعبیر کیا ہے۔ بایں ہمہ یہ کہنے کی چیز نہیں تھی۔ جنون کی تشبیہ بس شعر کی حد تک ٹھیک ہے۔

دوسری بات: "قدم بہ قدم خودکشی کی طرف بڑھ رہا ہوں" اگر یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے تو تمہیں لکھنے کا پورا حق ہے۔

"دن رات شراب پیتا ہوں اور گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا ہوں" اس کا پہلا ٹکڑا تو سر تا سر غلط ہے میری جان! شراب میں پیتا تھا اور پیتا ہوں۔

بمبئی میں جسم و روح و دل سے اس قدر قریب رہنے کے بعد — تم مجھے ہر حال میں دیکھ چکے ہو۔ کم بھی پی ہے، زیادہ بھی پی ہے، نہیں بھی پی ہے۔ اس رویّہ میں کسی غیر معمولی تبدیلی کی خبر تمہیں کس سے ملی —!

شراب ہے، کسی زمانہ میں زیادہ ہو گئی کسی زمانہ میں کم۔ مگر بقول کسے ؎

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

غلط افواہوں پر اس قسم کا فیصلہ صادر کر دینا اور اس کا اس طرح اعلان کر دینا۔ کہ جو لوگ ادبی حیثیت سے مجھے صبر کر چکے ہوں۔ ان کو معلوم ہو جائے کہ ابھی میں زندہ ہوں۔ مگر اس طرح زندہ ہوں نہ ان لوگوں کے لئے خوش گوار ہو سکتا ہے نہ میرے لئے۔ اور "اپنوں" کے لئے تو تم جانو خوش گوار ہو ہی نہیں سکتا۔

تمہیں شاید معلوم ہو کہ جب عصمت نے میری بادہ خواری کا ذکر کیا ہے اس کے بعد جب بھی میں ان سے ملا ہوں طرح طرح کی خوشامدیں کی ہیں کہ یہ واقعہ نہ آنے پائے۔ مگر ان کی بے رحم صاف گوئی اس کی متحمل نہ تھی کہ — وہ جملے کاٹ دیئے جائیں — ابھی اسی کا رونا تھا کہ تمہاری "بے پناہ دوست نوازی" اور "بے پایاں خلوص" نے جنون اور بادہ خواری کے ڈنکے پٹوا دیئے۔

تم کو حیرت ہوگی کہ میں اس قدر Serious کیوں ہو رہا ہوں۔ تو بھیا صاحب بات تو سچ ہی ہے نا۔ نہ تو میں اپنی بادہ خواری کے اعلان سے جھجکتا ہوں نہ کسی اور رسوائی سے — خواہ وہ کیسی ہی شدید کیوں نہ ہو۔ مگر غلط — یا صحیح طور پر تمہاری — اور تم لوگوں کی ایک ایسی انجمن[1] سے وابستگی کی سعادت حاصل ہے۔ جس کا ساتھ دیتے رہنے کی (سکت ہو یا نہ ہو) خواہش اپنے دل میں ضرور پاتا ہوں — اگر تم ہی۔ (قدت باز دئے دوست) نہیں رہے تو ساتھ کیسے دے سکوں گا۔ تمہیں یاد ہی ہوگا احمد آباد کا وہ دن یاد ہے جب اسی قسم کے الزام کی بنا پر مجھے پوری "ادبی تحریک" سے دامن کش ہو جانے کا الٹی میٹم دے دیا گیا تھا اور کرشن نے میری حمایت کر کے اس عتاب ناگہانی سے بچا لیا تھا۔ دوستوں کا عتاب تھا اور کون کہہ سکتا ہے کہ ناجائز و نا روا عتاب تھا۔ اپنا پوائنٹ کمزور ہو تو دبنا ہی پڑتا ہے نا — سو مندرجہ بالا سطور پر جب تم اس

---

[1] انجمن ترقی پسند مصنفین۔

،، نغمہ کی روشنی میں دوبارہ غور کرو گے تو میری کیفیات کا صحیح اندازہ کر سکو گے ۔

بہرحال تم میری ان خرافات سے اور اس ہذیان سے بددل کیوں ہو ۔ میں جانتا ہوں تیر جب کمان سے نکل چکا ہو ۔۔ پھر مداوا تو ممکن نہیں ۔ لیکن یہ سب اس لئے لکھ ڈالا کہ ۔۔ اپنے محسوسات اگر تم تک نہ پہنچاتا تو خود اپنے سامنے بے ایمانی کرتا ۔۔ خیر چھوڑو اب کہاں تک تمہیں bore کروں !

یہاں کے حالات ؟

یہاں حالات ہوتے ہی نہیں ۔ اور جو کچھ ہیں وہ لکھنے کے نہیں بتانے کے ہیں ۔ ننّے[1] بھائی آجکل یہیں ہیں ۔ انھوں نے ایک بچی کا اضافہ اور کر دیا ہے ۔ وہ بھی ایک روز میں لاہور کی طرف رخ کرنے والے ہیں ۔ ہاں ننّے بھائی سے یہ معلوم کر کے کہ تم لوگ غیر معمولی تنظیمی اور تعمیری صلاحیتوں سے انجمن کا کام کر رہے ہو ۔۔ جی چاہ رہا ہے کہ لاہور آ کر تمھاری تنظیم میں ایک خوش گوار برہمی اور تمھاری تعمیر میں مناسب تخریب کا اضافہ کر دوں ۔ یہ بہت جلد ہو بھی سکے گا یا نہیں ۔ ابھی نہیں کہا جا سکتا ۔ بہرحال فروری کا پورا ماہ مجھے یہیں لکھنؤ میں گذارنا ہوگا ۔

مارچ میں لکھنؤ ویران ہو جاتا ہے ۔۔ اس زمانہ میں یا تو پہاڑ یا صحرا یہی دو منزلیں رہ جاتی ہیں ۔ اس وقت تمھاری حدود میں پہنچنے کی کوشش کروں گا ۔

شعر لکھنے کو ان دنوں بے حد جی چاہتا ہے ۔ جونہی کوئی بات بنی سب سے پہلے تمھیں بھیجوں گا ۔

فیض کے باہر جانے کی خبر سنی تھی ۔ اگر ابھی نہ گئے ہوں تو سلام اور پیار کہنا ۔ اور ۔۔ لکھو !

کونسی منزل میں ہے کونسی مشکل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

وہاں کے حالات لکھو تو میں بھی کچھ ادھر کی سناؤں ۔ اب کے ایسا بد مذاقی کا خط نہیں لکھوں گا وعدہ کرتا ہوں ۔ حمید اختر کہاں ہوتے ہیں ، ملیں تو اس شکستہ پا کا سلام کہنا ۔

تمھارا اپنا
مجاز

---

[1] سید سجاد ظہیر ۔

کشمیر نے حالیہ جشنِ آزادی میں شمولیت کے لئے مدیر سویرا کے نام سرکلر لیٹر بھیجا گیا تھا، معلوم ہوا ہے کہ اسی قسم کا سرکلر لیٹر پاکستان میں ابوالاثر حفیظ جالندھری اور بعض دوسرے شعراء کو بھی ملا ہے - ہم وہ دعوتی خط اور اس کا جواب ذیل میں درج کر رہے ہیں •
(ادارہ)

شیخ عبداللہ کا ایک مکتوب

سری نگر
۱۰- اپریل ۴۸ء

مائی ڈیر ساحر!

جموں اور کشمیر کے عوام نے سترہ سال تک آزادی کے لئے سخت جدوجہد کرنے کے بعد ریاست میں ذمہ دار حکومت قائم کر لی ہے - اگرچہ آج ہمیں ایک ایسے بے اماں اور وحشی دشمن کے خلاف جنگ لڑنی پڑ رہی ہے جو ہمیں آزادی کی نعمت سے محروم کرنے پر تلا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود ہم نے ۲۰ مئی سے شروع ہونے والے ہفتے میں آزادی کی تقریب منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم دنیا کو دکھا دینا چاہتے ہیں کہ کشمیر کا ایک عام مرد اور ایک عام عورت کس عزم و استقلال کا مالک ہے اور کشمیر کے عوام کس بے جگری سے کام لے کر اپنی آزادی کی حفاظت کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں -

آپ نے کشمیر کو آزاد کرنے کی کوششوں میں ہمیشہ ہمیں مدد دی ہے اور آج بھی جبکہ ہمارے ملک کو بیرونی حملے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے آپ کشمیر کی نصرت کے کچھ کم خواہاں نہیں -

آج جبکہ ہم آزادی کا جشن منا رہے ہیں۔ اگر آپ تشریف لا کر اس جشن کی مختلف تقاریب میں شرکت کر سکیں تو ہم بہت ممنون ہوں گے۔ آپ کی شمولیت ایام جدوجہد کی رفاقت کے اس رشتے کو اور مضبوط بنانے کی، جس نے ہمیں اب تک متحد رکھا ہے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگرچہ ہمیں بہت سختیوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ پھر بھی ہم آپ کا خیر مقدم کرنے اور کشمیر میں آپ کے قیام کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار اور آرام دہ بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔

آپ براہ نوازش کشمیر کے ٹریڈ کمشنر متعینہ نئی دہلی کو مقام پرتھوی راج روڈ کے پتے پر اس بات کی اطلاع دے دیں، کہ آپ سری نگر کس تاریخ کو پہنچیں گے۔ ٹریڈ کمشنر آپ کو یہاں پہنچنے اور دوسری باتوں کے متعلق مناسب امداد دیں گے۔

بصد احترام
آپ کا مخلص
شیخ محمد عبداللہ

شیخ صاحب کی خدمت میں

دفتر "سویرا" لاہور
۶ ؍ مئی ۱۹۴۸ء

محترمی!

تسلیم، گرامی نامہ موصول ہوا، شکریہ آپ نے مجھے کشمیر کے جشن آزادی میں شامل ہونے کی دعوت دی ہے اور اپنے خط میں میری اور میرے دوسرے ادیب ساتھیوں کی ان خدمات کو سراہا ہے، جو انھوں نے کشمیر کی ۱۷ سالہ جنگ آزادی کے دوران میں سرانجام دیں۔ میں اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں،

اس برعظیم کے باحس ادیب ہمیشہ سے انسانی آزادی اور طبقاتی برابری کے لئے جد وجہد کرتے رہے ہیں، اس ضمن میں انھوں نے کبھی بھی رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود کی تفریق روا نہیں رکھی، چنانچہ کشمیری عوام کی جنگ آزادی کو ہم نے ہمیشہ اپنی جنگ سمجھا، اور انہیں اپنی تحریروں سے حتی المقدور متحرک کیا، ۱۹۴۶ء میں جب آپ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے، اور کانگریس اور لیگ کے مقتدر رہنما کشمیری عوام کا ساتھ دینے کے بجائے قانونی موشگافیوں میں اُلجھے ہوئے تھے، ترقی پسند ادیبوں نے تحریر و تقریر کی پوری قوت کے ساتھ ڈوگرہ شاہی کے خلاف پروپیگنڈہ کیا۔ اور کشمیری سرفروشوں کے لئے فنڈ جمع کئے۔

آج بھی جبکہ کشمیری عوام پر بے محابا فوجی دباؤ پڑ رہا ہے، اور قتل و غارت کا ہنگامہ برپا ہے، ہماری تمام تر ہمدردیاں کشمیری عوام کے ساتھ ہیں، لیکن میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ کشمیر میں آزادی آگئی ہے، ۱۵ ؍ اگست کو پاکستان اور ہندوستان میں بھی جشن آزادی منایا گیا تھا، گھر گھر چراغاں ہوا تھا، پرچم لہرائے گئے تھے، پھر بھی کسانوں کو زمین نہ مل سکی، کارخانے عوامی ملکیت نہ بن سکے، اور سرمایہ داری اور جاگیرداری کا بوسیدہ نظام بدستور اپنی جگہ قائم رہا۔

آج اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کشمیر ہندوستان میں شامل ہوتا ہے یا پاکستان میں، کیونکہ جہاں تک ہندوستان اور پاکستان کی موجودہ حکومتوں کا تعلق ہے، ان کی تگ و دو کا مقصد کشمیری عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنا نہیں، بلکہ اپنی اپنی مملکت کی توسیع کرنا ہے، جہاں تک ان ملکوں کی عوام دوستی کا تعلق ہے وہ اس چیز سے واضح ہے کہ آج بھی ہندوستان میں عوامی تحریکوں

کو فوجی طاقت کے بل پر دبایا جا رہا ہے، اور شہر تالی مرتضعوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کئے جا رہے ہیں، اور پاکستان میں تیس لاکھ مسلمان پناہ گزین ابھی تک سڑکوں پر زندگی گزار رہے ہیں، اور دونوں حکومتیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ انسانوں کی اتنی بڑی تعداد موت کے دہانے پر کھڑی ہے، زمینوں کو قومی ملکیت بنانے اور پناہ گزینوں کو از سرِ نو بسانے پر تیار نہیں ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کشمیری عوام کی زندگی اور مستقبل کو سدھارنے کی کیا صورت ہے، ان کے لئے اچھی زندگی، اچھی خوراک اور اچھے گھر کیونکر مہیا ہو سکتے ہیں؛ ظاہر ہے کہ جب تک کشمیر میں مہاراجہ ہری سنگھ کا اقتدار قائم ہے اور جاگیرداری کا گلا سڑا پرانا نظام باقی ہے، کشمیر کی آزادی اور خوشحالی کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتے۔

آپ اس وقت جو آزادی کا ہفتہ منا رہے ہیں۔ اس پنڈت راج کی نحوستوں کی چھاپ بدستور قائم ہے۔ جبین زعفران زاروں کے چہرے پر ہندوستانی فوجوں، ڈوگروں اور قبائلیوں کے بوٹوں کی گرد جمی ہوئی ہے، اور کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کشمیری عوام نہیں بلکہ یو۔این۔او کے سامراجی ایجنٹ کر رہے ہیں۔ یہ آزادی کے آثار نہیں ہیں، اور نہ کوئی جمہوریت پسند اسے آزادی کہہ کر پکار سکتا ہے۔

جس دن کشمیر فی الواقع آزاد ہو جائے گا۔ اور وہاں کے عوام اپنی جدوجہد اور اپنی قربانیوں سے بیرونی اور اندرونی لوٹ کھسوٹ سے نجات پا لیں گے، اس دن میں کشمیر کی سرزمین پر حاضر ہوں گا اور کشمیر دلیس میں بسنے والے عام مردوں اور عورتوں کو، ان کے آہنی عزم کو، ان کی تحریک کو، اور ان کی تحریک کے رہنماؤں کو خلوصِ نیت سے سلام کروں گا، وہ دن صرف کشمیر کی زندگی کا ہی نہیں، میری اپنی زندگی کا بھی مبارک دن ہوگا۔

—— میری دعا ہے کہ وہ دن جلد آئے ——

مخلص

ساحر لدھیانوی

عبداللہ ملک

ادیب اور ریاست سے وفاداری

پچھلے کئی مہینوں سے اس برِ اعظم کی دونوں نوزائیدہ مملکتوں کے حکمران طبقے اور ان کے حالی موالی ادیب یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ ادیب کو ریاست کا وفادار ہونا چاہئے یا نہیں۔ ممکن ہے بہت سے لکھنے والوں کے لئے یہ مسئلہ ایک علمی مسئلہ ہو اور وہ وکیلانہ انداز میں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کریں لیکن میرے نزدیک اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ اور پیچیدہ ہو جائے گا۔ پیشتر اس کے کہ ریاست اور اس کے چلن کو دیکھا جائے یہ ضروری ہے کہ ہم اس سمت بھی نگاہ اٹھائیں جدھر سے یہ نعرے بلند ہو رہے ہیں۔

آج صرف ان دو نوزائیدہ مملکتوں میں ہی یہ سوال نہیں اٹھایا جا رہا بلکہ اس دنیا میں اور بھی کئی ملک ہیں جہاں کے لکھنے والے آج اپنے حکمران طبقے کے معتوب ہیں۔ دراصل جس ملک کی حیثیت پر مٹھی بھر انسانوں کا قبضہ ہوگا وہاں پر یہ سوال ضرور اٹھیں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ مٹھی بھر انسان جمہور کے ایک ابھرتے ہوئے سیلاب کو بند باندھ کر روکنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ مختلف سیاسی جماعتوں کو خلافِ قانون قرار دیا جائے، مظلوم طبقوں کی آواز کو دبا دیا جائے، لاٹھی گولی سنگین اور جیل عام کر دی جائے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ان لکھنے والوں کو مطعون و معتوب ٹھہرایا جائے جو عوام کی خواہشات کی ترجمانی کریں۔ چنانچہ آج یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ امریکہ میں ایک "ان امریکن کمیٹی" عالمِ وجود میں لائی گئی ہے۔ اس کمیٹی کا کام ادیبوں، فن کاروں اور فلم ڈائرکٹروں پر نگرانی کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ وہ امریکی روایات سے انحراف تو نہیں کر رہے اور آج امریکی روایات سے مطلب ہے جنگ کی حمایت، جمہوریت دشمنی، دوسرے ملکوں کو غلام بنانے کی خواہش۔ اس کمیٹی نے چپلن کو امریکہ سے نکل جانے کا حکم دیا ہے۔ اس کمیٹی نے ہالی وڈ کے بہترین فن کاروں، کہانی لکھنے والوں اور ہدایت کاروں کو کام سے جواب دلوا دیا ہے۔ اسی سرزمین سے امریکہ میں ہنری والیس کو قتل کی دھمکی دی جا رہی ہے کیونکہ وہ پاگل نہیں کیونکہ وہ جنگ کا حامی نہیں، وہ دوسرے ملکوں کو غلام نہیں بنانا چاہتا۔ عورتوں کو گھر واپس بھیجنے کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ غرضیکہ آج ہر اس انسان کو جو "وال سٹریٹ" کے خداؤں کا ہم آواز ہو کر جنگ کا نعرہ نہیں لگاتا یا پھر امن کا ذکر کرتا ہے، اس کی وفاداری کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کیا آج یہاں بھی کچھ اسی قسم کے حالات نہیں ہیں؟ جو ادیب آواز بلند کرے کہ یہ نظام صدیوں پرانا ہے، ظلم و جبر کو ختم ہونا چاہیے۔ سماجی ترقی کے لئے جاگیرداری نظام کا خاتمہ ضروری ہے، اسی کی مخالفت اور کونسل

کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کو ریاست کا باغی قرار دیا جاتا ہے۔

ریاست کیا ہے؟ اس لفظ کے معنی بھی زمانے کے تیوروں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں ہر حکمراں طبقے نے اس لفظ کو اپنے مخصوص انداز میں اپنایا ہے، سرمایہ دارانہ نظام کے سیاسی مفکروں اور فلسفیوں نے تو اس سلسلے میں اچھی خاصی موشگافیاں کی ہیں، ان فلسفیوں نے زبردست التزام کے ساتھ حکومت اور ریاست میں تمیز کرنے کی کوشش کی ہے اور انہوں نے ریاست کی تقدیس کو منوانے میں زور قلم اور زور بیان دونوں صرف کئے ہیں۔ سرمایہ داری نظام میں گنتی کے انسان حکومت چلاتے ہیں اور وہی ریاست کے مالک ہوتے ہیں۔ ہر طبقہ اپنے غیر جمہوری اور عوام دشمن چلن سے اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے اس لئے جب بھی اس طبقے کی زندگی خطرے میں ہوتی ہے وہ ریاست کی دہائی دیتا ہے۔

تاریخ کے اس زمانے میں ہمیں ریاست کا وجود نظر نہیں آتا جبکہ انسان ابھی قبائلی زندگی بسر کرتا تھا، ریاست طبقوں کے وجود کے ساتھ ہی ظہور میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب سماج میں دو متحارب طبقے ہوں گے اور ان کے مفاد متضاد ہوں گے تو ہر وہ طبقہ یا ادارہ جو غیر جانبداری کا اعلان کرتا ہے حقیقت میں حکمراں طبقے کا پشت پناہ ہوتا ہے، اس ادارے کا کام ان دو مخالف اور متحارب طبقوں کی جنگ کو امن کی حدود میں رکھنا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب حکومت ایک طبقے پر مشتمل ہو اور فوج اور پولیس اس طبقے کی محافظ و نگران ہو، تو ریاست سے وفاداری کا مطلب حکمراں طبقے کی چاکری کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے، کیا اس بات سے وفاداری کا مطلب چند جاگیرداروں سے وفاداری نہیں، کیا یہ وفاداری ۹۵ فیصدی عوام سے بے وفائی نہیں۔ اس لئے کہ ۵ فیصدی اور ۹۵ فیصدی انسان ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہیں اور ریاست ان ۵ فیصدی انسانوں کے طبقے کی محافظ و نگراں ہے۔

ترقی پسند ادیب کو ریاست سے وفاداری کا مسئلہ پریشان نہیں کرتا اس کا لائحۂ عمل عوام سے وفاداری ہے۔ ترقی پسند ادیب اپنے عوام کا وفادار ہوتا ہے کیونکہ انہی عوام نے اسے جنم دیا ہے اسے پالا ہے، پروان چڑھایا ہے، اور انہی کی آسوں اور پیاسوں کا اظہار اس کے نغموں میں ہوتا ہے۔

اسی حکمراں طبقے اور اسی ریاست سے بغاوت کا اظہار تھا جب براؤننگ نے حکومت کا اعزاز قبول کرنے پر ورڈس ورتھ کے بارے میں لکھا تھا ——

For a handfull of silver he left us

مٹھی بھر سکوں کے لئے وہ ہمیں چھوڑ گیا۔ نہ جانے براؤننگ پر بھی اس وقت انگلیاں اٹھی تھیں یا نہیں۔

سیاست کے ثنا خوان اس ضمن میں ایک اور سوال اٹھاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وفاداری اور نادارلی میں جنگ سے ریاست کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا اور ملک بیرونی طاقت کی غلامی میں چلا جائے گا۔

اس لئے ملک خطرے میں نہیں پڑے گا ۔ البتہ حکمران طبقہ ضرور خطرہ میں پڑ جائے گا کیونکہ جب عوام
بے پناہ طوفان امنڈ آتا ہے، تو حکمران طبقے کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے۔ اس کی فوج کو نا
اور اس کی پولیس کو بے کار کر دیتا ہے، اور عالم یہ ہوتا ہے کہ ؎

شور برپا ہے خانہ باندھوں میں ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا غصب شدہ حق انسانوں کے

تو پھر اس سیل کو روکے گا کون ؟ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کوئی قوت اس سیل سے ٹکرائی ہے اسے
کی کھانا پڑی ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال روس کے انقلاب کی ہے ۔ جب انقلاب کا یہ سیلاب ا
تو چودہ شہنشاہی طاقتوں نے روس کے انقلابیوں پر حملہ کیا لیکن آج سوویت روس زندہ ہے اور شہنشاہیت
اپنے چہیتے شہنشاہوں کے دم توڑ رہی ہے ۔

ساحر لدھیانوی

اغوا شدہ عورتیں

اگست کے فسادات میں مخالف فرقوں کی لاتعداد عورتیں اغوا کی گئی تھیں، سرکاری طور پر ان کی
ایک لاکھ کے قریب بیان کی جاتی ہے، ان عورتوں کے ساتھ مملکت خداداد پاکستان اور گوردوں کے
مشرقی پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہمارے اخلاقی دیوالیہ پن کا ایسا شرمناک مظاہرہ ہے، جس سے ہر
انسان کا سر ندامت سے جھک جاتا ہے

پچھلے دنوں دونوں حکومتوں نے مل کر "عورتوں کا ہفتہ" منایا تھا، لیکن اس ہفتہ کے دوران میں دو
مملکتوں کے لیڈر اخلاق اور مذہب کے نام کی دہائی دینے سے آگے نہ بڑھ سکے - اور پھر عورتوں کا
کا مطالبہ کرنے کا ڈھنگ کچھ اس قسم کا تھا جیسے بھیڑ بکریوں کے تبادلے کی بات چیت کی جا رہی ہو،
جہاں اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس برعظیم میں عورت کی حیثیت ابھی تک ایک استعمال کی شے سے
زیادہ نہیں ہے، وہاں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ پاکستان اور ہندوستان کی آزاد مملکتیں عورت کو آزاد کیا
دینا چاہتی ہیں ۔

آج ہماری قومی حکومتوں کو قائم ہوئے دس ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور دونوں حکومتیں اپنے
طبقاتی مفاد کی روشنی میں اپنے لئے لائحہ عمل بھی وضع کر چکی ہیں اور بھوک، بیکاری اور سماجی عدم
کے خلاف آواز اٹھانے والے پانچواں کالم بھی قرار دئے جا چکے ہیں لیکن ان مظلوم اور بے بس عور

رہائی کے لئے ابھی تک کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا گیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر جمہوری تحریکوں کے خلاف فوج اور پولیس استعمال کی جا سکتی ہے تو ان غنڈوں کے خلاف کیوں استعمال نہیں کی جا سکتی جنہوں نے پورے پنجاب کی سرزمین کو چکلہ بنا رکھا ہے دونوں حکومتوں کا محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کونسا کمیونسٹ کہاں روپوش ہے اور کونسا ب امریکی سامراج اور مارشل پلان کی مخالفت کر کے روس اور اس کے ایجنٹوں کے ہاتھ میں کھیل رہا ہے ان قاتلوں لٹیروں اور وحشیوں کا سراغ کیوں نہیں لگا سکتا جو بھری بستیوں میں آباد ہیں، اور اعلانیہ طور پر انون، اخلاق اور شرافت کا منہ چڑا رہے ہیں۔

حکومت پاکستان عرصے سے ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے کہ وہ مغربی پنجاب میں خالص اسلامی حکومت قائم کرے گی کیونکہ عام جمہوریت شاید ان کے آئیڈیل پر پوری نہیں اترتی۔ اسی طرح مشرقی پنجاب کے سکھ لیڈر ان خالصہ راج قائم کرنے کے منصوبے باندھ رہے ہیں، لیکن وہ صوبہ جس میں ستر اسی ہزار لڑکیوں کے ساتھ روزانہ بالجبر ہوتا ہو، وہاں اسلام اور سکھ دھرم کا کون تصور قائم ہو سکتا ہے، اخلاق اور کلچر کی کونسی دنیا بسائی جا سکتی آزادی اور جمہوریت کے کون سے محل تعمیر کئے جا سکتے ہیں۔ جو حکومتیں لاکھوں بے گناہ انسانوں کے قتل م کا تماشہ دیکھنے کے بعد بھی اسلام اور سکھ دھرم کا نام لے سکتی ہیں، وہ ان مجرموں کا خون اپنی گردن لینے سے کیوں ہچکچاتی ہیں، جو سماج کے لئے لعنت اور قانون کے لئے باعث ننگ ہیں۔ کیا ہمارے حکمرانوں بلند بانگ دعووں میں اتنا کس بل بھی نہیں کہ وہ لوگوں کی بہو بیٹیوں کو اس عذاب سے نجات دلا سکیں ان شب و روز کی عصمت ریزی نے انہیں گذشتہ دس ماہ سے مبتلا کر رکھا ہے۔

ان لڑکیوں کی عصمتیں یونین جیک کے تلے نہیں، ترنگے اور ہلالی پرچموں کے سائے میں لٹی ہیں، ان عصمتوں کے خون کا کون ذمہ دار ہے؟ — یہ ہندو سکھ اور مسلمان عوام کی بیٹیاں ہیں جنہوں نے اس کی جنگ آزادی میں لاتعداد قربانیاں دی ہیں اور ان گنت مصائب جھیلے ہیں۔ جواہر لال نہرو اور جناح اور ماسٹر تارا سنگھ نے جو چاہا تھا انہیں مل گیا۔ لیکن ان لڑکیوں کے ان خوابوں کا کیا ہوگا جو ہ نے آزاد ملک کی آزاد بیٹیاں، آزاد بہنیں اور آزاد مائیں بننے کے بارے میں دیکھے تھے۔ ان دلہنوں ہوگا جو انہوں نے خیال ہی خیال میں اپنے لئے چنے تھے، ان براتوں کا کیا ہوگا جن کی شہنائیاں اب ان گن میں کبھی نہ گونجیں گی، ان سے تو شہری زندگی کے وہ ابتدائی حقوق بھی چھن گئے جو کسی بھی نیم سوسائٹی میں عورت کو حاصل ہوتے ہیں۔ حکومتیں ان لڑکیوں کی کھوئی ہوئی عصمتیں واپس نہیں تیں، اور ان کی مسخ شدہ شخصیتوں کو از سر نو بحال نہیں کر سکتیں، ان کے دل میں، روح میں اور ضمیر میں محبت اور خلوص کی بجھی ہوئی شمعوں کو روشن نہیں کر سکتیں لیکن انہیں اس تکلیف دہ زندگی سے فوراً نجات دلا سکتی ہیں جس میں ان کی روحیں جل رہی ہیں اور جسم گل رہے ہیں۔

یہ بات انتہائی شرمناک ہے کہ دونوں حکومتیں اب تک بمشکل دس ہزار عورتوں کو برآمد کر سکی ہیں۔ بقیہ بھی کسی کے لواحقین انہیں واپس لینے سے انکار کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہماری حکومتیں جب تک عورت کا کوئی سماجی درجہ متعین نہیں کرتیں اور ان کا کوئی سماجی مصرف نہیں ڈھونڈتیں، انھیں خود کفیل نہیں بناتیں اس وقت تک انہیں بسانا ناممکن ہے۔ اگر اب بھی عورت اور سماج کے بارے میں ملاؤں کے ہذیانی تصورات کو قائم رکھا گیا اور ان پر عمل کیا گیا تو ان عورتوں کی پوری زندگی نفرت، حقارت اور کس مپرسی کے جہنم میں کٹے گی سوسائٹی کو عورت کی جوانی ہی کی نہیں ہستی کی بھی ضرورت ہے، عصمت ہی کی نہیں محنت اور تخلیقی قوت کی بھی ضرورت ہے اور ملک کی آئندہ ترقی اور سوسائٹی کے ارتقا کا تقاضہ ہے کہ اس کی ان صلاحیتوں کو ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ پردے کی رسم کو قانوناً ممنوع قرار دے کہ عورت کی انفرادیت کو تسلیم کرے اور اسے آزادانہ طور پر مردوں کے دوش بدوش چلنے کا حق اور موقع دے۔ اسی طرح ہم اپنی سوسائٹی کے نصف حصے کو ایام جہالت کی غلامی سے آزاد کر سکتے ہیں اور اسی طرح واپس آئی ہوئی اغوا شدہ عورتوں کے لئے کام کرنے اور زندہ رہنے کی سبیل نکال سکتے ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان عورتوں کے لئے دستکاری کے مراکز اور ٹریننگ سنٹر کھولے۔ تاکہ یہ عورتیں خود کفیل بن کر سماج میں اپنے لئے جگہ پیدا کر سکیں۔ مسئلہ کا صحیح حل یہ نہیں ہے کہ حکومت انھیں جیل خانے کی چار دیواری میں محصور رکھے۔ جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے یہ دلیل انتہائی احمقانہ ہے کہ چونکہ برآمد کی ہوئی عورتوں میں سے بہت سی عورتیں مشرقی پنجاب واپس جانا چاہتی ہیں اور بہت سی عورتیں عام مسلمان شہریوں کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑی گئی ہیں اس لئے انہیں جیل خانہ کی چار دیواری میں رکھنا ضروری ہے جو لڑکیاں بالغ ہیں اور اپنی مرضی سے، یا اپنے حالات کی مجبوری سے واپس مشرقی پنجاب جانا چاہتی ہیں انہیں اس کی آزادی ہونی چاہئے اسی طرح جو سکھ لڑکیاں مغربی پنجاب میں لوٹ آنا چاہتی ہیں انہیں بھی اس کا حق ملنا چاہئے اور دونوں حکومتوں کو ان کا یہ حق تسلیم کرنا چاہئے

سعادت حسن منٹو

محبوس عورتیں

تقسیم ہندوستان اور قیامِ پاکستان کے بعد اس قدر مجلسی و معاشری مسائل پیدا ہوئے ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ یوں تو ہر شخص انہیں سلجھانے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شور زیادہ ہے اور کام بہت ہی کم ہو رہا ہے

برطانوی سامراج کی حکمت عملی نے وہ شاطرانہ چال چلی کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈے دماغوں کو بھی سوچنے کا موقع نہ ملا۔ ہندوستان کو اس چابکدست جراح نے پتھر کی سرد سلوں پر لٹا کر چیرا پھاڑا۔ ایک سنگین سکون و اطمینان کے ساتھ اس کے حصے بخرے کئے اور یہ جا وہ جا۔ اور وہ جن کے تدبر۔ وہ جن کی دقیقہ رسی۔ وہ جن کی شاہین نگاہی کی سارے عالم میں دھوم تھی۔ آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

پچھلے چند مہینوں میں اس سرزمین پر جس کا نام کبھی ہندوستان تھا خون کے وہ دریا بہے کہ جس پر چشمِ فلک بھی حیران ہے۔ فنا کو بادۂ ہر جام بنایا گیا۔ دوسری اجناس نایاب تھیں۔ مگر انسانی گوشت پوست کی دکانیں عام کھلی تھیں۔ ہر بازار میں ایک عام ٹکٹکی نصب تھی۔ ہر چوک میں ایک مقتل تھا۔ چنگیز اور ہلاکو امیر تیمور گورگانی احمد شاہ درّانی اور بہیمیت و بربریت کا تازہ ترین علمبردار اسا ڈولف ہٹلر بھی اگر ان خونیں مناظر کو دیکھتا تو یقیناً خود کو نا چیز سمجھتا۔ لہو اور لوہا۔ جنگ اور تفنگ انسان کی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں۔ اولادِ آدم ان کھیلوں میں ہمیشہ دلچسپی لیتی رہی ہے۔ مگر وہ کھیل جو پچھلے دنوں کھیلا جاتا رہا ہے اس کی مثال ابن آدم کے رنگین افسانے میں کہیں بھی نہیں ملتی۔

خود کو حیوانوں سے کچھ اونچا رکھنے کے لئے انسان نے قتل و غارتگری کے لئے بھی کچھ آداب و قواعد بنا رکھے ہیں لیکن جس قتل و غارت گری کا ہم ذکر کرتے ہیں ان آداب و قواعد سے بے نیاز تھی بلکہ یوں کہئے کہ حیوانیت سے بھی یکسر معرا تھی جس کی تصویر شاید یہ قتل و غارتگری خود بھی نہ کھینچ سکے۔

اس وقت ہماری نظروں کے سامنے خون کی سوکھی ہوئی پپڑیاں کٹے ہوئے اعضا جھلسے ہوئے چہرے روندے ہوئے گلے مشتری بدلی جائیں لٹے ہوئے مکان۔ جلے ہوئے کھیت، ہلے کے ڈھیر اور بھرے ہوئے ہسپتال ہیں۔ ہم آزاد ہیں۔ ہندوستان آزاد ہے پاکستان آزاد ہے اور ہم سب گرسنگی و برہنگی بے سروسامانی بے حالی کی ویران سڑکوں پر چل پھر رہے ہیں۔ گندم نہیں ہے سوئی نہیں ہے۔ چاول نہیں ہے۔ گرانی ہے۔ قحط ہے۔ بیماریوں کی یلغار ہے۔ سردیوں میں آگ نہیں۔ گرمیوں میں پانی نہیں۔ زمینیں سکڑ گئی ہیں آسمان سمٹ گئے ہیں۔ تعمیر کے گھسے ہوئے ناخن بے چیدہ گرہیں کھولنے میں مصروف ہیں ادھم مچا رکھا ہے

ٹھنڈی زمینوں پر لیٹی ہوئی ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ کے آخری قطرے منجمد ہو رہے ہیں۔ قانونِ قدرت کا بے رحم ہاتھ بچوں کو ان کے آخری اثاثہ سے محروم کر رہا ہے۔ لیکن ایسی حویلیاں بھی ہیں جہاں ننھے کا بچا ہوا دودھ موریوں میں بہایا جاتا ہے۔ لاکھوں ستم رسیدہ تن ڈھانکنے کیلئے ایک چیتھڑے کو ترس رہے ہیں لیکن وہ بھی ہیں جو فیشن کی نوک پلک درست رکھنے کے لئے طرح طرح کے ملبوسات سے اپنی الماریاں سجائے بیٹھے ہیں۔

یہ تماشا کب تک جاری رہے گا؟ کب تک مظلوم انسانیت کپڑے کے پھٹے ہوئے خیموں میں قید رہے گی۔ کب تک مجبور نسوانیت تحفظ کی نام نہاد چار دیواری میں شہوانیت کی شکار ہوتی رہے گی۔ کب تک عزت و بیچارگی سرمائے کے ہاتھوں فروخت ہوتی رہے گی ـــــ کب تک؟

ہماری بٹی ہوئی تہذیب، ہمارا تقسیم شدہ تمدن۔ ہمارا بچا ہوا فن ـــــ ہر وہ چیز جو ہمارے ہاں جسم سے کٹ کر ہمیں ملی ہے مغربی سیاست کے بوجھل پیروں تلے دفن ہے۔ ہمیں ان سب کو نکالنا ہے جھاڑنا پونچھنا ہے۔ تر و تازگی بخشنا ہے۔ اور اس طوفان میں جس جس شے سے ہم محروم ہوئے ہیں۔ اسے دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ لیکن سب سے پہلے ہمیں ان زخموں کی دیکھ بھال کرنا ہے جو ہماری غفلت پر ناسور بن جانے والے ہیں سب سے بڑا اور گھناؤنا زخم ان عورتوں کا وجود ہے جن میں سے کچھ ہماری بزدلی کے باعث بے لگام شہوانیت کا شکار ہوئیں اور کچھ مخالفین کی "تشنہ زندگی" کا نشانۂ مشق بنیں۔ کہا جاتا ہے ایسی پچاس ہزار عورتیں موجود ہیں، مائیں، بہنیں اور بچیاں۔ ان میں سے بہت ہی قلیل تعداد کی بازیابی ہو چکی ہے۔ جو باقی ہیں ابھی تک شہوت کے تنوروں میں ایندھن کا کام دے رہی ہیں۔

پچھلے دنوں قائدینِ ملت کے ایما پر ان مظلوم و مقہور عورتوں کی بازیابی کی مہم بڑے زور سے شروع ہوئی تھی مگر افسوس ہے کہ اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمیں اس کا اتنا زیادہ گلہ نہیں اس لئے کہ اس مہم کا انحصار زیادہ تر فریقِ ثانی کے دل پگھلنے پر تھا لیکن اس بات کی شکایت ہمیں ضرور ہے کہ ان عورتوں کے متعلق جو ہمیں واپس مل چکی ہیں نفسیات کی روشنی میں بہت کم غور کیا گیا ہے۔ ان گھائل عورتوں کے لئے کسی جیل میں ایک وارڈ مخصوص کر دینے سے اور تفریح کے لئے وہاں ایک عدد ریڈیو سیٹ لگا دینے سے یا کسی خوش پوش امیرزادی کے معائنہ سے ان کی تقدیر کی رفوگری نہیں ہو سکتی اور بیچاریوں کے تاریک مستقبل کو روشن بنانے کے لئے یہ بھی کوئی حل نہیں کہ ان کو سپاہیانہ تعلیم دے کر فوجی گوروں کی تانیث بنا دیا جائے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے اس نشان کو مٹانے کی کوشش کی جائے جو ان تقدیر کی بیٹیوں کی پیشانی پر حادثات کی سیاہی لگا گئی ہے۔ اور اس کے بعد ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے لئے اپنی معاشرت میں صحت افزا جگہ پیدا کی جائے۔

یہ عورتیں غریب ہوں یا امیر، کنواری ہوں یا بیاہی ہوئی - مال گاڑیوں کا نقصان رسیدہ اسباب نہیں جو انہیں کچھ دنوں گودام میں رکھ کر نیلام پر چڑھا دیا جائے اور اگر کچھ مصرف سمجھ میں نہ آئے تو انہیں تلف کر دیا جائے۔ ہزاروں عورتوں کا سوال ہے جو کبھی ماؤں کی بیٹیاں - بھائیوں کی بہنیں اور شوہروں کی بیویاں تھیں جس حالت میں یہ اب ہیں اس کی ذمہ دار سیاست کی اکھاڑے بازی ہے۔ مذہب کا وہ جنون ہے جس کی مثال انسانوں کی پچھلی تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتی اور کچھ نہیں تو ان عورتوں کے وجود کو اپنا ہی گناہ سمجھ کر ہمیں پردہ پوشی کرنی چاہیے۔

اگر فوری طور پر کچھ نہ کیا گیا تو ان عورتوں کا شکستہ حال ایک بہت ہی خوفناک خواب میں تبدیل ہونے والا ہے سیکڑوں بلکہ ہزاروں قحبہ خانے منہ کھولے ان کے استقبال کے لئے تیار ہیں ہمیں اس کے تصور ہی سے کانپ جانا چاہیے۔ اور پھر وہ بچے ہیں جو کئی عورتوں نے اپنی مجبور کوکھ سے پیدا کئے ہیں۔ اس خود رو پود کے سر پہ ہاتھ رکھنے والا کون ہوگا اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ آپ کو سوچنا ہے۔ یہ مجھے سوچنا ہے۔ یہ ہمارے سماج رہنماؤں کو سوچنا ہے جو اس سرزمین کے خداوند ہیں۔ اور سب سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ وہ لوگ جو صرف سوچنے کی خاطر سوچتے ہیں عملی زندگی میں ان کا کیا مصرف ہے؟ یہ مسائل ایسے ہیں کہ ان پر فوری تدبر اور عمل کی ضرورت ہے۔ کرسی نشین فکر و عمل اور تن تنہا تدبیر و تنظیم سے ہمارے مجلسی دائرے کا یہ چاک ہرگز ہرگز رفو نہ ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ملک کے تمام ماہرین نفسیات مل کر ان مظلوم عورتوں اور ان کی جبری اولاد کے لئے زندگی میں ایک صاف اور ہموار راستہ تلاش کریں تاکہ یہ سماج کے جذباتی قوانین کی ٹھوکروں سے بچ سکیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور یہ نازک مسئلہ اناڑیوں کے سپرد رہا تو اندیشہ ہے کہ حالات تاریک سے تاریک تر ہو جائیں گے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اخباروں میں ان عورتوں کے فوٹو شائع کرنے سے کس قسم کا اثر پیدا کرنا مقصود ہے۔ دیکھنے والے ان کے چہروں کی مصنوعی مسکراہٹیں ضرور دیکھتے ہیں لیکن سمجھنے والے بخوبی سمجھتے ہیں کہ یہ کاغذ ان کی آنکھوں کے وہ آنسو جو وہ بہا چکی ہیں اور جو آئندہ بہانے والی ہیں۔ ہرگز خشک نہیں کر سکتے۔ اسکے علاوہ ان عورتوں کے وجود کی رسمی عامیانہ تشہیر غایت درجہ قابلِ اعتراض ہے۔ افسوس ہے کہ جو کام ہمیں خاموشی سنجیدگی اور متانت سے کرنا چاہئے تھا اس میں غیر ضروری بلند آہنگی برتی جا رہی ہے۔ یہ سراسر سوقیانہ پن ہے جو حقیقت ہے: وہ ایک بہت ہی تلخ حقیقت ہے ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں رہنی چاہئے اور یہ تلخ حقیقت انسانیت کی اس ذلت آمیز افتاد کے سوا اور کیا ہے جس نے ان معصوم عورتوں سے ایسا گھناؤنا سلوک کیا ہمیں جاننا چاہئے کہ اس انسانیت کو مجروح کرنا چاہئے تاکہ اپنے پہنچائے ہوئے نقصان کی تلافی کر سکے۔ انسانیت کا گناہ سب انسانوں کا گناہ ہے۔ وہ عظیم ترین گناہ جو چند گمراہ انسانوں سے سرزد ہو چکا آئیے ہم سب مل کر اس کا کفارہ ادا کریں کہ اسی میں ہماری، ان عورتوں کی ان کے بچوں کی پاکستان کی اور ہندوستان کی بھی نجات مضمر ہے۔ ہم جانور پال سکتے ہیں۔ حیوانوں کو اپنے سینے سے لگا سکتے ہیں کیا ہم ان عورتوں اور ان کے بچوں کو اپنے گھروں میں جگہ نہیں دے سکتے؟ یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب سب سے پہلے ہمارے رہنماؤں کو دینا چاہئے تاکہ عوام کو جو تقلید کے عادی ہیں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کا موقع ملے۔

سرکاری ادب — ریویو

ہفتہ وار استقلال

محکمہ تعلقات عامہ مغربی پنجاب نے حال ہی میں ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا ہے جس کے اب تک چار نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ اخبار کی اشاعت کا مقصد کم و بیش وہی ہے جو یونینسٹ وزارت کے زمانہ میں اخبار "ہمارا پنجاب" کا تھا یعنی برسر اقتدار طبقے کی حمایت اور وزارت کی مدح سرائی۔

سرکاری خزانہ سے اس اخبار کے خرچ کے لئے جو رقم منظور ہوئی ہے اس کی تفاصیل یہ ہیں:—

ایک ایڈیٹر		تنخواہ ۴۲۵ روپیہ مع الاؤنس
دو سب ایڈیٹر	(۲۶۰ روپیہ فی کس)	" ۵۲۰ " " "
ایک منیجر		" ۲۲۰ " " "
ایک پروف ریڈر		" ۱۳۵ " " "
ایک اکاؤنٹنٹ		" ۱۲۰ " " "
" جونیئر کلرک		" ۸۰ " " "
" "		" ۷۵ " " "
" ریسٹورر		" ۶۵ " " "
" دفتری		" ۴۵ " " "
۴ چپراسی	(۴۰ روپے فی کس)	" ۱۶۰ " " "

اس کے علاوہ امدادی اسٹاف بھی رکھا گیا ہے جو براہ راست استقلال کے ادارہ میں شامل نہیں لیکن اس کا کام استقلال کے لئے لکھنا اور مواد فراہم کرنا ہے۔

ایک ریسرچ آفیسر		۴۲۵ روپے
دو کیمرہ مین	(۳۰۰ روپیہ فی کس)	۶۰۰ روپے
ایک آرٹسٹ		۴۲۵ روپے

اس اخبار کی اشاعت، کاغذ اور چھپائی کے لئے ۹۵ ہزار روپیہ کی رقم الگ منظور کی گئی ہے جسے ملا کر سال بھر کا خرچ ایک لاکھ ۳۴ ہزار ۴۵ روپے بنتا ہے۔

اگر پورے محکمہ تعلقات عامہ کے اخراجات کا جائزہ لیا جائے تو کل رقم نو لاکھ روپیہ

سے اوپر جا پہنچی ہے۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ پاکستان کی عام آبادی بھوکوں مر رہی ہو اور لاکھوں پناہ گزیں مرد، عورتیں اور بچے سڑکوں پر زندگی گزار رہے ہوں کسی وزارت کے لئے محض اپنے مفاد کی ترجمانی پر اتنی بڑی رقم خرچ کرنا قابل اعتراض بھی ہے اور شرمناک بھی، خصوصاً اس حالت میں جبکہ وہ اپنے کو عوام کی نمائندہ وزارت کہتی ہو۔

پچھلے دنوں جب ڈاکخانہ کے ملازموں، ریلوے کے مزدوروں، صوبے کے کلرکوں اور مرکزی حکومت کے دو لاکھ ملازموں نے بڑھتی ہوئی گرانی کے باعث تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ کیا تھا اور چھانٹی کے خلاف تحریک چلائی تھی تو اسی حکومت نے انھیں پانچواں کالم کہا تھا اور دشمنان پاکستان کے لقب سے نوازا تھا۔ مگر آج حکومت جن مدوں پر روپیہ خرچ کر رہی ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوامی مسائل کا حل ڈھونڈنے کی بہ نسبت وزارت اپنی حقوق یافتہ حیثیت کے استحکام و تحفظ کو زیادہ ضروری سمجھتی ہے۔ اور غریب اور ان پڑھ کسانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی ان کی تعلیم و ترقی پر صرف کرنے کی بجائے پڑھے لکھوں کو ورغلانے کے کام پر صرف کر رہی ہے۔

پچھلے ہی شمارے میں "مغربی پنجاب میں زرعی پیداوار" کے عنوان سے طفیل احمد خاں کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے پیداوار کے اعداد و شمار دیتے ہوئے مندرجہ ذیل نتیجے نکالے ہیں :-

۱۔ ہم اناج باہر بھیج سکتے ہیں۔

۲۔ پارچہ بافی اور شکر سازی کی عظیم الشان صنعت قائم کر سکتے ہیں۔

۳۔ دواسازی کی بعض شاخیں اپنے ہاں جاری کر سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

طفیل صاحب خود اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جب تک ہمارے زرعی اور اقتصادی نظام میں بعض بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں رونما نہیں ہوتیں اس وقت تک نہ تو پیداوار بڑھ سکتی ہے اور نہ کسانوں کا معیار زندگی بلند ہو سکتا ہے۔ آج جن کسانوں کو زمینوں سے بے دخل کیا جا رہا ہے اور جن مزارعوں کو ایک طرف حکومت کے ٹیکس اور دوسری طرف زمیندار کی بیگار مارے جا رہی ہے ان سے یہ توقع کیونکر رکھی جا سکتی ہے کہ وہ مٹھی بھر جاگیرداروں کے منافع میں اضافہ کرنے کے لئے دن رات اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہیں گے طفیل صاحب نے اپنے مضمون میں جن صنعتوں کا ذکر کیا ہے ان کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں۔ وہ قائم بھی کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو اپنے ہاں معیشت کا ڈھانچہ بدلا جائے، اور ذرائع پیداوار کو انفرادی

ملکیت سے نکال کر قومی تحویل میں دے دیا جائے، یا امریکہ کے آگے دامن پھیلایا جائے اور وہاں کے سرمایہ داروں اور امپیریلسٹوں سے ملوں کے عوض آزادی کا سودا کیا جائے۔

یہ چیزیں چ فضیل صاحب سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ لیکن ان اقتصادی مجبوریوں کو کیا کیجیے۔ یہ مجبوریاں آج سے پہلے بھی بہت سے اہل قلم کو مصلحت کوشی کی راہ پر لے گئی ہیں۔

اسی پرچے میں شیخ محمد صاحب اختر کا بھی ایک مضمون ہے۔ جس میں انھوں نے مہاجرین کے مسئلے کو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بھوک، بیکاری، غریب الوطنی اور عزیز و اقربا کی موت کے صدموں کو ذہنی بیماری ثابت کرکے گمراہ کن پروپیگنڈا کیا ہے۔ حالانکہ اگر وہ دیانت داری سے سوچتے تو انھیں یہ سمجھنے میں دقت نہ ہوتی کہ بیمار پناہ گزینوں کی ذہنیت نہیں، وہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ سیاست ہے جو پچھلے دس برس سے اس ملک کے رگ و پے میں زہر پھیلاتی رہی ہے۔

اس کے بعد بدر المتین صاحب عارف کی نظم "مفلس دوست کے نام" پر نگاہ پڑتی ہے جس میں انھوں نے مفلس کی عظمتیں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

تیری عسرت سے نہاں ہیں تیری عظمت کے نقوش　　اپنی عسرت کو نہاں رکھ کے تجھے کیا لینا؟

شکر معبود بجا لا کہ بصد فخر و غنا　　اس نے یہ پھول بکھیرے ہیں ترے قدموں پر

یہیں کہیں ممتاز مفتی بھی نظر آتے ہیں، اب کے وہ "پالتو شکایت" لیکر آئے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں انھوں نے ان لوگوں پر پھبتیاں کسی ہیں جو حکومت کی شکایتیں کرتے ہیں۔ شکایت کرنے والوں سے یہ شکایت یقیناً پالتو ہے۔ اور اس لحاظ سے مضمون کا عنوان نہایت مناسب ہے۔

نوجوان ادیبوں میں ہاجرہ بنشو، ندیم اور قتیل بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اور ایک اور صاحب بھی جو ادب میں سیاست کا نام آتے ہی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے۔ ہماری مراد قیوم نظر صاحب سے ہے۔ اب کے انھوں نے پاکستان کے نوجوانوں سے خطاب کیا ہے۔ اور وہی گھٹیا قسم کی نعرہ زنی کی ہے جس کی وہ آج تک مخالفت کرتے چلے آئے ہیں۔ وجہ سرکار پرستی ہو یا معقول معاوضہ کی توقع ——

بہرحال ع یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے۔

۳۲ صفحے کا یہ اخبار جو آفسٹ پر چھپتا ہے اور جس میں متعدد دو رنگی اور سہ رنگی تصاویر بھی شامل ہوتی ہیں ایجنٹوں کو پونے گیارہ پیسے میں دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس اخبار پر کسی صورت بھی ایک روپے فی کاپی سے کم لاگت نہیں آتی، یہ چیز جہاں وسیع پیمانہ پر لوگوں میں گمراہی پھیلانے کا موجب بنتی ہے وہاں پرائیویٹ اداروں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہی ہے۔ جہاں تک وزارت کا تعلق ہے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے تبلیغی مقاصد کے پیش نظر اس اخبار کو زیادہ سے زیادہ خسارہ برداشت

کر کے بھی کم سے کم لاگت پر فروخت کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور ادیبوں کی بیباک نگاری اور ان کے عوامی رجحان کو مجروح کرنے کے لئے انھیں معقول معاوضے بھی پیش کرے گی، لیکن ہمارے ادیبوں کو آج ضرور اس بات کا فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ کس کے ساتھ ہیں۔ مٹھی بھر جاگیرداروں کے ساتھ یا لاکھوں کروڑوں محنت کش عوام کے ساتھ، وہ پاکستان کو ایک سچی اور عوامی جمہوریت بنانا چاہتے ہیں یا امرا اور رؤسا کی شکارگاہ، وہ عوامی صفوں میں شامل ہیں یا عوام دشمن طبقوں کی صف میں۔ ان کا فن جمہوری تحریکوں کا ہمنوا ہے یا رجعت پرستوں کا ہتیار ہے؟ تاریخ ان کے جواب کا انتظار کر رہی ہے۔

(ادارہ)

اردو ادب کا مرکز ● لاہور

::(اور)::

لاہور میں ایک نئے ادارے کا قیام

کتابی دنیا

ہمارا کتب خانہ علمی، ادبی، سیاسی اور اقتصادی
مذہبی، سماجی اور ہر مذاق کی کتابیں آپ کیلئے مہیا کر سکتا ہے

★

اسکولوں، کالجوں، لائبریریوں اور تجارتی اداروں کے لئے
کتابوں کا انتخاب کرنے سے قبل ہمیں طلب کریں ہمارا نمائندہ آپ کی
خدمت میں بہترین اور منتخب کتابوں کا ذخیرہ لیکر حاضر ہوگا۔
اور انتخاب کتب میں اپنا تعاون پیش کرے گا

★

تمام حضرات اگر ہمیں صرف پوسٹ کارڈ کے ذریعے اپنی
فرمائش سے آگاہ کریں تو ہمارا نمائندہ سب کتابیں
لے کر آپ کی جائے رہائش پر پہنچ سکتا ہے۔

★

آپ کے ارشاد کی تعمیل [illegible] خوش قسمتی [illegible]

منیجر کتابی دنیا

آپ کے تعاون کا منتظر